Title-Cov Processed by LASER Printed by Hamdard Press Tel. 214124

حال احوالِ چہار سُو
نکتہ جُو کی گفتگو

ایک پڑھے لکھے آدمی کا قصہ۔ اُسے
آوارہ گردی کا جنوں تھا اور اُس
جنوں نے اُسے سدا بے قرار رکھا۔

محمود احمد مودی
موت اور مصنفہ
٩٩

حقیقی کرداروں پر مشتمل ایک منفرد کہانی،
اُن نئے مصنفین کی دلچسپی کے لیے جو ہر
حال میں شائع ہونا چاہتے ہیں۔

سسپنس کی مجلس مشاورت، قارئین
کی تلخ و شیریں باتیں جو ہمارے لیے
مشعلِ راہ ہیں۔

منشیات کے پھیلتے ہوئے زہر کے لیے
تریاق تحریر۔ سسپنس کا ایک تعمیری سلسلہ

ایک لڑکے کی رُوداد جو حالات کی بھٹی
میں کندن بن گیا۔ ایک ماں کا ظالمانہ
رویّہ۔ ایک عبرت انگیز واقعہ۔

ماضی کا آئینہ۔ ایسے واقعات جو بیناؤں
کی رہنمائی کے لیے کتابوں میں محفوظ کر دیے گئے۔

ایک مکان کے دو دعوے داروں کا واقعہ،
وہ دونوں ہی سچے تھے مگر یہ ایک تضاد حسیں

اُس کا ایک آدرش تھا، ایک ہدف تھا جس
کے حصول میں وہ ہر خطرے سے نبرد آزما رہا۔
کامیابی کے بعد ایک ازلی ناکامی اس کی منتظر تھی

پبلشر: ماہ مبین ایم اے ○ پرنٹر: ابن حسن ○ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی ○ یکے از مطبوعات: جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز سید منیشن بلیریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

Faisal Ahmed

لڑکپن کی دلہیز پر کھڑے ہوئے ایک کمسن بچے
کے جذبات اُس پر بلوغت کا در بہت غیر محسوس
طور پر وا ہوا۔ ہنرمندی سے لکھی گئی کمال تحریر

دو ہم شکل بہنوں کے عشق کا قصہ۔ وہ
دونوں اپنی اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں
تھیں۔ یاد رہ جانے والی ایک کتھا۔

یہ بات عشق پیشہ لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ
محبت کتنی جان لیوا چیز ہے۔ محبت میں رقابت
ایک لازمی عنصر ہے۔ ایک من موہنا احوال۔

ایک فسوں کار کی خود نوشت۔ سسپنس
کا مقبولِ عام سلسلہ جو ایک سو پینتیس
ماہ سے جاری ہے۔

سسپنس کے معتبر و محترم صفحات،
ایک مردِ کامل کے حالات و واقعات

اس لڑکی کی قربانی جس نے اپنی محبت کی
خاطر بھیس بدلا۔ دلوں کے تاروں کو چھیڑنے
والا ایک فسانہ۔

ناز و نعم میں پلی بڑھی دوشیزہ کا ایثار و وفا۔
اُس نے محبت کی سُرخروئی کے لیے ایک نیا
راستہ دریافت کیا۔

ذہانت سے ترتیب دی ہوئی ایک حکمتِ
عملی کا مثبت نتیجہ۔ یہ منفرد سی کہانی خیال
کے اعتبار سے بہت طوالت رکھتی ہے۔

زندگی کے سفر میں ہر صعوبت کو اس لڑکی نے
مشعلِ راہ بنا لیا۔ مصائب میں اُلجھی ہوئی
دوشیزہ کی داستان عجب آخری صفحات کی سوغات

جلد: ٤٩ ○ شمارہ: ٩ ○ قیمت فی پرچا: ١٨ روپے ○ زرِ سالانہ: ٢٦٠ روپے ○ مقامِ اشاعت: سید منیشن بلیریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ○ خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس ٢١٥ کراچی۔ پوسٹل کوڈ ٧٤٢٠٠

ہم نے ابھی کچھ دن پہلے چالیس واں روز آزادی منایا ہے۔ قوموں کی زندگی میں تینتالیس برس کچھ نہیں ہوتے، کچھ بھی نہیں ہوتے تاریخ کی کسی بھی کتاب میں تینتالیس برس کو ایک یا ڈیڑھ جملے میں بھگتا دیا جاتا ہے اور اکثر اوقات تو مورخ کا قلم اس مدت سے زقند لگا کر بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ تو تاریخی عہد کی بات ہوئی۔ جہاں تک نیم تاریخی عہد کا تعلق ہے، اس کے ہزاروں سال بھی ایک جملے کے حقدار قرار نہیں پاتے۔ اب رہا تاریخی اور نیم تاریخی زمانے سے پہلے کا زمانہ تو اس کے لاکھ دو لاکھ سال بھی، کبھی کبھی یک لفظی بیان تک سے محروم رہتے ہیں۔

یہ جو کچھ کہا گیا، وہ اپنی جگہ درست ہے۔ اس سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا مگر اس کے باوجود تینتالیس برس، تینتالیس لمحے، تینتالیس گھنٹے، تینتالیس دن یا تینتالیس ہفتے نہیں ہوتے، تینتالیس برس، تینتالیس برس ہی ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے تینتالیس برس میں مشرق اور مغرب کی قومیں کہیں سے کہیں جا پہنچی ہیں۔ مغرب تو ان تینتالیس برسوں میں زمین سے آسمان تک پہنچ گیا ہے۔ خیال کی یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، ہم اس مدت میں کہاں پہنچے؟ کیا ہم میں سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے، یہ کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ ہم کہیں پہنچے۔ ہم چلے تو ضرور تھے مگر وائے ہو ہم پر کہ ہم پہنچے کہیں نہیں۔ ہم ایڑی اور پنجوں کا ایک جھوٹ اور قدموں کا ایک دھوکا نکلے۔ ہاں تم نے فنا میں قدم بڑھائے اور عدم میں سفر کیا۔

ہمارا پڑوسی بھی اسی وقت چلا تھا جس وقت ہم چلے تھے۔ دیکھو اور عبرت حاصل کرو، وہ کہاں ہے اور تم کہاں ہو۔ ایسا کیوں ہوا، سوچو اور اپنے ہونے کا دکھ اٹھاؤ، اپنے پائے جانے کا عذاب جھیلو۔ ایسا کیوں ہونا چاہیے تھا۔ میں اور ہم میں سے بہت سے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہونا چاہیے تھا؟ ہمارا تو معاملہ ہی عجب ہے۔ ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور دو قدم پیچھے ہٹ آتے ہیں۔ ہم وقت کے ساتھ ٹھٹول کرتے رہے ہیں اور ہم میں سے جو گروہ بنانے اور بگاڑنے کی سب سے زیادہ طاقت رکھتا ہے وہی وقت کے ساتھ سب سے زیادہ ٹھٹول کرتا آیا ہے۔ سن لیا جائے کہ زندگی کے ساتھ یہ مضحکہ خیز برتاؤ ہمارا اور تمہارا حلیہ بگاڑ کر رکھ دے گا۔ زمین پر کوئی بھی نہیں ہوگا جو ہمارے خد و خال پہچان سکے۔ وقت نے اب تک جتنی چھوٹ ہمیں دی ہے، اتنی چھوٹ بنو اسرائیل کو بھی نہیں دی تھی۔ تباہی کا ایک کھیل ہے جو ہم اندھا دھند کھیلے جا رہے ہیں۔ یہ کیا طور ہے جو تم نے اختیار کیا ہے، یہ کیا طریقہ ہے جو تمہیں پسند آیا ہے؟ سنو، سمجھو اور پھر آ جاؤ۔ کہنے والا کہتا ہے .....

کیا تم سورج کے بیٹے ہو، کیا تم کسی دیوتا کے جنے ہو؟
بادلوں کے اوپر رہنے والے
دھنک کی کمان سے شکار کھیلنے والے
تمہارے نخروں سے تو کچھ ایسا ہی جانا جاتا ہے
نہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ تم نہ آج میں ہو
اور نہ آنے والی کل میں
بڑی بڑی قومیں سینہ تانے ہوئی آئیں مگر
ان کی سرنوشت یہ ہے کہ وقت نے ان کے بخیے ادھیڑ دیے اور انہیں، ان ارجمند اور سربلند قوموں کو بری طرح ادھیڑ دیا۔ تم بھلا کیا ہو اور تم بھلا وقت کے ایسے کون سے لاڈلے ہو، جن کے بھونڈے ناز نخرے اٹھانے کا وقت نے عہد کیا ہو اور تاریخ نے جن کے اوندھے وجود کو جھولا جھلایا ہو؟

میں کہتا ہوں کہ تم نے دانستہ جرم کوشی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ کیا اب تک یہی دیکھنے میں نہیں آیا، کیا کبھی سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ کیا کبھی سوچا کہ تمہاری سرنوشت کیا ہونی چاہیے؟ اپنی سرنوشت کا خیال کرو اور وقت کے ساتھ ٹھٹول اور تحول کرنے سے باز آؤ۔

سسپنس، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ کے بعد ایک اور معتبر نام
"سرگذشت"
تفریحی ادب کے افق پر طلوع ہونے والا ایک اور روشن ستارہ شبستانِ لیلائے اردو کا ایک منفرد اور باوقار مینارہ
زندگی آمیز و زندگی آموز تحریروں کا نمائندہ
صفحہ بہ صفحہ، لفظ بہ لفظ، نقطہ بہ نقطہ تابندہ
انسانی دکھوں اور سکھوں کا آئینہ
عنقریب شائع ہو رہا ہے
ماہنامہ سرگذشت
تمام شعبہ ہائے زندگی کے نامور وں کی سچی کہانیاں، سحر بیانیاں، شعلہ بیانیاں
زمین پر بسنے والوں کی بے قراریاں، حشر سامانیاں
آشفتہ سواجیاں
سیاست، صحافت، سیاحت، فنونِ لطیفہ اور اسپورٹس کے مشہور و نمائندہ افراد کی آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
انٹرویوز، رازِ درونِ خانہ، حقیقتیں، فسانہ اور وہ سب ماہنامہ سرگذشت میں ملاحظہ کیجیے جس کے آپ طلب ہیں
اعتراف رازِ نشانہ
روح کے کرب، دلوں کی اذیت اور دماغوں کی آگ سینوں میں مستور داستانیں اور واقعات جو عمر بھر کسک دیتے رہتے ہیں جنہیں بھولنا ممکن نہیں رہتا
آپ بھی اپنی زندگی کے غیر معمولی واقعات، آپ بیتی، جگ بیتی ماہنامہ "سرگذشت" میں اشاعت کے لیے روانہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ ایک اچھے ادیب بھی ہوں۔ آپ صرف اپنے غیر معمولی واقعات جس انداز میں بھی ممکن ہو سکے تحریر کر کے ہمیں روانہ کر دیں۔ ہم انہیں مناسب ترتیب اور اصلاحِ زبان و بیان کے بعد شاملِ اشاعت کر لیں گے۔ اگر آپ اس سلسلے میں اپنا نام یا دیگر کرداروں کے نام ظاہر نہ کرنا چاہیں تو ہم اس کا بھی خیال رکھیں گے۔
اپنے مسودات مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کریں
ماہنامہ "سرگذشت" ۳۱ رمضان چیمبر بلیمو ریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ ۷۴۲۰۰

مدیرِ اعلیٰ

پیارے قارئین!

اس لمحے دنیا تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے - دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بالآخر چھوٹے چھوٹے ممالک کو بھی اس منزل تک لے آئی ہیں جہاں سے ایک قدم کے فاصلے پر انسانی تباہی کے مہیب غار ہیں جو نوعِ انسانی کو ہڑپ کرنے کے لیے منہ کھولے کھڑے ہیں - کویت پر عراق کے قبضے سے جو نئی عالمی صورت حال سامنے آئی ہے ' اس نے پس ماندہ ممالک اور ان چھوٹے چھوٹے ملکوں کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے جو عالمی برادری کے رکن ہونے کے باوجود اپنے تحفظ سے محروم ہیں - یہ صورت حال دنیا کے ہر اس شہری کے لیے تشویش ناک ہے جو اس ایٹمی دور میں امن و آشتی کے خواب دیکھتا ہے - وہ پر امن شہری جس کے خواب کی تعبیر بارود کے دھوئیں کی زد پر ہے - اس عالمی شہری کو اپنے خواب اسی طرح عزیز ہیں جیسے ہر آنکھ رکھنے والوں کو اپنی بینائی۔

عالمی طاقتوں نے مل کر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب جنگ ان کی سرزمین پر نہیں لڑی جائے گی - نہ روس میں ' نہ یورپ میں ' نہ امریکہ میں ' نہ آسٹریلیا میں - وہ اب یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ جنگ تیسری دنیا میں اور خصوصاً اسلامی ممالک کے خطے میں لڑی جائے اگرچہ ہم سیاسی معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتے کہ یہ نہ صرف بڑوں کے مسائل ہیں بلکہ بہت حد تک اختلافی بھی ہیں لیکن یہاں مجبوری یہ ہے کہ اگر مشرقِ وسطیٰ میں جنگ ہوتی ہے تو آگ اور خون کے اس کھیل سے پاکستان . . . بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح متاثر ہوگا' خدا انہیں بھی اتنی عقل دے کہ جب یورپ متحد ہورہا ہے تو ہم ایک ہو کر کیوں نہیں رہتے - اتحاد میں طاقت ہے اور انتشار میں کمزوری - خدا سے دعا ہے کہ وہ اس خطے میں رہنے والوں کے دلوں میں محبت اور گنجائشیں پیدا کرے ' تاکہ ایک دوسرے کا زیادہ سے زیادہ خیال کیا جاسکے اور اپنے تحفظ کو دوسرے کی حفاظت سے مشروط سمجھا جائے - (آمین)

آیئے اب چلتے ہیں خطوط کی اس بزم رنگا رنگ میں جہاں نالے اور قیامت نامے برسرِپیکار ہیں -

پیر خان اور محمد عارف نے سینٹرل ہانگ کانگ سے لکھا ہے:" انکل ہم کچھ لطائف بھیج رہے ہیں - انہیں آئندہ شمارے میں ضرور شامل کیجیے گا!" پیر خان اور محمد عارف! معلوم نہیں آپ ایک ہیں یا دو یا چار بہرحال جتنے بھی ہوں آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ - امید ہے کہ آپ سسپنس کے متعلق اپنی رائے بھی بھیجیں گے -

فرحانہ رشید فرحی ' مسقط سے رقمطراز ہیں :" آج جس بات نے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا وہ یہ ہے کہ سسپنس کا معیار روز بروز گرتا کیوں جارہا ہے ؟ ہم جب اتنے پیسے خرچ کرکے رسالہ خریدتے ہیں تو دو تین کہانیاں ایسی نکل آتی ہیں جو ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہوتے ہیں - مثال کے طور پر اگست ۹۰ء کے رسالے میں دو کہانیاں ایسی ہیں جو انہی رسالوں یعنی سسپنس اور جاسوسی میں چھپ چکی ہیں - ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ کہانیاں نئی ہوں اور معیاری ہوں ' اس کے علاوہ یہ کہ اب سسپنس ڈائجسٹ کے نام میں ہی سسپنس رہ گیا ہے ' کہانیاں سسپنس سے خالی ہوتی جارہی ہیں - (نوٹ ' خط شائع ہونے کی امید نہیں ہے کیوں کہ یہ سبق میں پہلے بھی کئی دفعہ حاصل کر چکی ہوں)" بی بی فرحانہ رشید ! آپ کے شکایت آمیز خط سے محسوس ہوا کہ ہمارے قارئین واقعی پرچوں میں کتنی دلچسپی لیتے ہیں - پہلی بات تو یہ کہ آپ کا اس سے پہلے کوئی جواب طلب خط موصول نہیں ہوا - مزید براں آپ کا یہ کہنا کہ رسالے میں ہر بار دو تین طبع شدہ کہانیاں شائع ہوتی ہیں ' خاصی زیادتی کی بات ہے - ہم اس امر پر بہت توجہ دیتے ہیں کہ کہانیاں پہلے کہیں شائع نہ ہوئی ہوں ' چہ جائیکہ ہمارے ہی ادارے کے پرچوں میں - درست ہے کہ اپنی کوشش کے باوجود بھی بھول چوک ہوجاتی ہے ' مگر اس میں دانستہ عمل نہیں ہوتا ایک کام یہ ضرور کیا کریں کہ اس پرچے کا نام اور مہینہ ضرور لکھیں جس میں کہانی شائع ہو چکی ہو تاکہ ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوسکے - رہ گیا سسپنس کے معیار کا سوال تو یہ آپ کا حق ہے کہ اس ضمن میں آپ جو رائے قائم کریں مگر بخدا ہماری نیت پر شبہ نہ کریں ' ہم ہر لمحے اسے اچھے سے اچھا بنانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں - آپ کی عنایت کا شکریہ -

ایم صدیق انجم ' وادیٔ کونش ٹبل سے لکھتے ہیں :" اچھے انکل ! پچھلے تین چار ماہ سے میں دیکھتا آرہا ہوں کہ ہماری بزم میں لوگ ایک یا حربہ " میں دو سال بعد خط لکھ رہا ہوں ' رہی ہوں " جیسے ترکش پھینک کر آپ کو موم کررہے ہیں - تو لیجیے ' ہم کیوں کسی سے پیچھے رہیں. آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عرصہ چالیس سال سے پرچے کا قاری ہوں اور پورے چھبیس سال بعد خط لکھ رہا ہوں اور اکیلا نہیں ہوں - میرے ساتھ میرا دوست اور پرچے کا بالکل نووارد قاری رزاق سرحدی بھی موجود ہے اور ہم بالکل اجڈ لوگ ہیں - منہ سے کم اور ہاتھوں سے زیادہ باتیں کرتے ہیں - آپ ہمارے ساتھ بنا کر ہی رکھیں تو آپ کا بھلا ہوگا۔" عزیزم صدیق انجم ! بات یہ ہے کہ ہم قارئین کی باتوں کا یقین کرتے ہیں ' ان کو کسی حربے سے تعبیر نہیں کرتے - آپ نے اپنے بارے میں جو تعارفی کلمات لکھے ہیں ' ہمارے پاس ان پر اعتبار نہ کرنے کا کوئی سبب نہیں - خوشی ہوئی کہ آپ چالیس سال سے رسالے کے قاری ہیں - آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چالیس سال سے آپ کا یہ پسندیدہ رسالہ آپ کا کتنا خیال رکھ رہا ہے - آپ نے چھبیس سال سے کوئی خط ہی نہیں لکھا حالانکہ ہم تو ہر ڈاک میں گزشتہ چھبیس برس سے آپ کے خط تلاش کررہے ہیں - خط ملا تو خوشی ہوئی - یہ نہ ہو کہ اب آپ پھر چھبیس برس کے لیے غائب ہوجائیں - خدا آپ کی عمر دراز کرے -

محمد یونس عمران ' کا تبصرہ ربوہ سے ' لکھتے ہیں :" انکل ! انجمہ مودی کی " سینے میں برف زار " اس شمارے کی سب سے فضول کہانی تھی - اس

کہانی کو پڑھ کر انجمہ صاحبہ کی کرکٹ سے مکمل طور پر ناواقفیت کا اندازہ ہوتا ہے - آج تک ون ڈے میں سب سے زیادہ اسکور تین سو ساٹھ ہے جبکہ یہاں انہوں نے چار سو تین تک پہنچا کر اپنے خیال میں اعجاز رشید کی وساطت سے کوئی بہت بڑا معرکہ مار لیا ہے - جب اتنے اوور گزر جائیں اور بیٹسمین بھی پانچ آؤٹ ہوچکے ہوں تو پھر چار سو کا ہندسہ کیسے ممکن ہے جبکہ ابتدا سے اچھا کھیلنے کے باوجود ٹیمیں تین سو تک قسمت سے پہنچتی ہیں - حتیٰ کہ بنگلہ دیش کی ٹیم کے خلاف بھی شارجہ میں تین سو چھتیس رنز ہوئے تھے ۔" عمران میاں ' اگر ہم کہانی کو کہانی کے بجائے کوئی رپوتاژ سمجھیں تو آپ کے اعتراض کو درست تسلیم کیا جاسکتا ہے جبکہ آج کل تو کھیل کا میدان بھی ایک افسانوی رنگ اختیار کرچکا ہے - میدان میں وہ وہ کارنامے سرانجام پارہے ہیں جن کا ماضی میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا - آپ کی موقر رائے کا احترام کرتے ہوئے یہ عرض ہے کہ کرکٹ کی دنیا میں تو خاص طور پر آئے روز ریکارڈ ٹوٹتے رہتے ہیں اور اگر میاں داد اور مدثر نذر ایک وکٹ کی شراکت میں پانچ سو اکیاون رنز بناسکتے ہیں تو کہانی کا ہیرو آخری پانچ وکٹوں کی مدد سے اپنی ٹیم کو کیوں نہیں بچاسکتا - آپ کو تو یاد ہوگا کہ آسٹریلیا کے خلاف نویں وکٹ کی پارٹنرشپ میں آصف اقبال اور اقبال قاسم نے دو سو سے زائد رنز بنائے تھے - دوسری اہم بات یہ ہے کہ کہانی اور حقیقت کا آپس میں بہت اختلاف ہوتا ہے - ویسے آپ کا استدلال پسند آیا -

نیلم رضا ' مظفر گڑھ سے یوں گویا ہیں :" ڈیئر انکل ! پہلی بار خطوط کی محفل میں شرکت کی غلطی کررہی ہوں ' امید ہے کہ آپ حوصلہ افزائی کریں گے - مجھے رسالہ بہت پسند ہے - اس رسالے نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا حالانکہ مجھے لکھنا ہی نہیں آتا - بڑی ہمت کی ہے - شاباش دیں گے نا ؟ پتا ہے ' میں نے تیسری کلاس سے رسالہ پڑھنا شروع کیا تھا - انکل ! اب میں نویں کلاس میں پڑھتی ہوں - ڈینجر رائٹر نے لکھا ہے ناکہ سرورق پر ہمیشہ عورت کی تصویر کیوں ہوتی ہے ' مرد کی کیوں نہیں ہوتی - بھئی ' ظاہر ہے ' مرد اتنے خوبصورت تو ہوتے نہیں کہ سرورق پر انہیں سجایا جاسکے - خواہ مخواہ ہی قارئین بور ہوکر رسالہ خریدنا ترک کردیں گے - کیوں جی ! ٹھیک کہا نا میں نے ؟" نیلم بی بی ! ہمیں چاہیے تو نہیں کہ آپ کی غلطیوں کی حوصلہ افزائی کریں مگر چونکہ آپ نے ڈینجر رائٹر کی رائے سے اختلاف کیا ہے لہٰذا یہ سمجھانا ضروری سمجھتے ہیں کہ خطرناک لوگوں سے زیادہ ہم کلامی مناسب نہیں ہوتی - یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ جہاں آپ رہتی ہیں وہاں کے مرد خوبصورت نہیں ہوتے - اگر یہ بات آپ نے مذاق میں کی ہے تو اپنے الفاظ واپس لیں کیونکہ مظفر گڑھ تو وجیہہ و شکیل لوگوں کا شہر ہے -

کامران شفیق ' گوجرانوالہ سے رقمطراز ہیں :" پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے ڈائجسٹ کے سرورق نے لڑکوں کا ذوق کافی اچھا کردیا ہے جو لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہورہا ہے کیونکہ عالمِ حقیقت میں ایسی لڑکی ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے - اپنی اس تلاش میں ناکام رہ کے عمران خان بے چارہ کنوارہ رہ گیا ہے اور ڈر ہے ' کامران بھی کنوارہ رہ جائے گا - ویسے کیا ہی اچھا ہو کہ ایسی لڑکی نہ ہی ملے اور میرے جیسے کافی لڑکے بچ جائیں جو قناعت پسند نہیں ہوتے ' ورنہ عام لڑکے تو زلیخا کے خواب دیکھتے دیکھتے کسی جیماں ' رحیماں کے ساتھ رو رو کر ساری زندگی گزارتے ہیں ۔" کامران میاں ! آپ کے خیالات سے آپ کے جذبات کے بارے میں معلوم ہوا - وہ لڑکے جو کنوارے رہ جاتے ہیں ' اس کا سبب غالباً خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں بلکہ قسمت کی لکیر ہے - وہ لوگ جو زلیخا کے خواب دیکھتے ہیں ' کچھ برا نہیں کرتے کیونکہ خواب دیکھنا ہر اس شخص کا حق ہے جسے بھرپور نیند آتی ہو - حقیقی زندگی جیماں کے ساتھ گزاری جائے یا رحیماں کے ساتھ ' ہنس ہنس کر بہرحال پوری زندگی گزارنا دشوار ہے - آپ کی قناعت پسندی اچھی لگی -

شہاب الدین شاہانی بلوچ ' دادو سے یوں گویا ہیں :" انکل ! عرض یہ ہے کہ آپ شاید شہر کے رہنے والوں کو ہی اپنا بھتیجا سمجھتے ہیں اور گاؤں کے رہنے والوں کو گنوار سمجھتے ہیں - خدارا یہ ظلم نہ کریں - تمام بھتیجوں اور بھتیجیوں کے ساتھ یکساں سلوک کریں - دو سال پہلے میں نے آپ کو چھ سات خط لکھے لیکن آپ نے صرف دو خطوں کے جواب دیئے وہ بھی صرف نام شائع کرنے کی حد تک - اس لیے ڈیڑھ سال کے لیے خط نہ لکھنے کی قسم کھائی تھی - اب جبکہ مقررہ مدت پوری ہوگئی ہے تو دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر پھر خط لکھ رہا ہوں ۔" عزیزی شہاب الدین ! بھتیجے اور بھتیجیاں چاہے شہر میں رہیں یا گاؤں میں ' ہمیں برابر عزیز ہیں بلکہ گاؤں والوں سے کچھ زیادہ ہی قربت ہوگی - آپ نے جو خط نہ لکھنے کی قسم کھائی تھی ' اس کے بارے میں ہمیں تو اعتماد میں لے لیا ہوتا - ہم تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہمارا بھتیجا غالباً دادو سے نکل کر خیرپور ناتھن شاہ ' سیتا روڈ یا میہڑ چلا گیا ہے جو کہ دادو کے مقابلے میں واقعی گاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں - آپ دل کے ہاتھوں مجبور ہیں اور ہم آپ کے ہاتھوں -

جاوید شیخ ' منگلا سے رقمطراز ہیں " انکل ! آپ کے شمارے کی جو کہانی مجھے سب سے زیادہ قابلِ غور لگی ' وہ مہتاب جلیل کی " آوارگیٔ حسن " ہے جس میں لڑکیوں خصوصاً منگیتروں کے طرزِ عمل کی بہت صحیح ترجمانی کی گئی ہے - میں اسے پڑھ کر اس لیے زیادہ متاثر ہوا کہ مستقبل قریب میں میری بھی شادی ہونے والی ہے - دعا کریں کہ مجھے کسی " گوریلا لک آؤٹ موٹیل " کی ضرورت نہ پڑے - ویسے میں نے بطورِ احتیاط ربڑ سول کے جوتے خرید لئے ہیں کیونکہ ان منگیتروں کا کیا بھروسا " جاوید میاں ! آوارگیٔ حسن واقعی اچھی کہانی تھی مگر جس نقطۂ نظر سے آپ نے اسے پڑھا ' وہ واقعی دلچسپ ہے - اپنی منگیتر سے اتنی دل برداشتگی اچھی نہیں - آپ نے ربڑ سول کے جوتے خرید کر بہت اچھا کیا - یہ نرم اور پائدار ہوتے ہیں جبکہ ان سے چوٹ بھی کم آتی ہے - شادی کی تیاریاں مبارک ہوں !

زبیر چوہان 'کامراسلہ راولپنڈی سے 'لکھتے ہیں "انکل! عرض ہے کہ فدوی چھ سال کے عرصۂ دراز کی ریاضت کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ سسپنس ڈائجسٹ اب لاعلاج مرض بن چکا ہے۔ کئی مرتبہ اسے چھوڑنے کی جسارت کی مگر کم بخت دل کے بے حد اصرار پر پھر خریدنا پڑ گیا۔ خط وکتابت کا سلسلہ بھی اسی وجہ سے شروع نہیں کیا کہ مزید دلدل میں نہ پھنسا جائے مگر اب دل کے ہاتھوں مجبور کہ ناچیز مجبور و ناچار ہے۔" عزیزم زبیر چوہان! محبت تو واقعی روگ ہوتا ہے اور روگ کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ یقین کریں 'جو محبت آپ کو رسالے سے ہے 'رسالہ بھی اپنے قارئین پر اسی طرح مرتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ جیسے بھی حالات ہوں 'یہ وقت پر پہنچ جاتا ہے حالانکہ محبت میں ایفائے عہد کی رسم کا کچھ بہتر حال نہیں ہے۔

سحریہ عروس 'کا اظہارِ رائے راولپنڈی سے 'لکھتی ہیں "اس بار یعنی اگست کا شمارہ مجموعی طور پر بہترین تھا۔ دیوتا سب سے اچھی تھی۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی ٹھیک ہی تھیں۔ ذاکر صاحب سے کہیں کہ کسی حسینہ کے بال کبھی کبھار کٹے ہوئے بھی بتادیا کریں۔ اب لمبے بال اتنے عام نہیں۔ نعیم احمد سیاح کے لیے مشورہ ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ سیاح کی جگہ آوارہ گرد لگالیں اور دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی خصوصاً لڑکیوں کے معاملات میں دخل دینا بند کردیں اور اپنی آوارہ گردی پر توجہ دیں۔" رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ 'حسینہ کے بالوں کے سلسلے میں آپ اور ہم تو کیا خود ذاکر صاحب بھی مجبور ہوتے ہیں۔ یہ تو حسینہ کی اپنی مرضی ہے۔ جیسے اس کے بال ہوں گے 'ویسے ہی ٹائٹل پر منتقل ہوجائیں گے۔ آپ کو کٹے ہوئے بال پسند ہیں 'یہ بات البتہ اب ذاکر صاحب کے علم میں آجائے گی۔ دیکھیے 'اب وہ کیا کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے کام میں ہم دخل اندازی اسی لئے نہیں کرتے کہ آپ تو نعیم احمد سیاح کی دخل اندازی پر معترض ہیں 'کل کو ہمیں بھی ٹوکیں گی۔ نعیم احمد سیاح کی آوارہ گردی کا جو ہمدردانہ ذکر آپ نے کیا ہے 'وہ قابلِ تعریف ہے۔

محمد اصغر شہزاد 'گوجرانوالہ سے رقمطراز ہیں "ہائے انکل! میرا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہ رہا ہے کیونکہ میری منگنی ہوگئی ہے اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی سے جو کہ مستقبل میں سیاستدان بننا چاہتی ہے اور ہر وقت وہ سیاسی گفتگو جھاڑتی رہتی ہے۔ اس پر ستم بالائے ستم کہ مجھے اپنی منگیتر کے گھر میں گھر داماد بن کر رہنا پڑے گا۔ انکل! خدا کے لیے مجھے اس ظالم سماج سے بچالیں کیونکہ میرے گھر والے مزاج کے بہت سخت ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں نے شادی سے انکار کیا ہے تو انکل 'میرا وہ حال ہوگا' وہی کہ آ بیل مجھے مار۔ انکل! آپ میری ساس کو کوئی نیک مشورہ دے سکتے ہیں کیونکہ وہ سسپنس بڑے شوق سے مگر مجھ سے مانگ کر پڑھتی ہیں۔" عزیزم اصغر شہزاد! آپ منگنی سے اتنے پریشان ہیں تو شادی کے بعد کیا ہوگا؟ اگر آپ کی ہونے والی بیوی سیاست دان بننا چاہتی ہیں 'تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ آدمی کو کچھ نہ کچھ تو مستقبل میں بننا ہی ہوتا ہے اور کچھ نہ بننے سے بہتر ہے کہ سیاست دان بن جایا جائے اور ایسے گھر میں گھر داماد بننے کا کوئی حرج نہیں جس کا ماحول سیاسی ہو کیونکہ وہاں تو زیادہ تر ہدف عوام بنیں گے 'گھر داماد تو آزاد ہی رہے گا۔ آپ کی ساس نے آپ کے ساتھ نیکی کی ہے 'لہٰذا انہیں کسی مزید نیک مشورے کی ضرورت نہیں 'سوائے اس کے کہ وہ رسالہ مانگ کر نہ پڑھا کریں اور وہ بھی ہونے والے داماد سے۔

متین راشد 'کا نامۂ صد خلوص چیچہ وطنی سے 'لکھتے ہیں "انکل! سنا تھا کہ مرنے کے بعد روح جسم کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور زبان بند ہوجاتی ہے لیکن یہ محفل تو ایسی ہے کہ مردے بھی کفن پھاڑ کر بولنے لگے ہیں اور حیرت 'فریاد 'نجانے وہ فریاد کس چیز کی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بلیوں اور چوہوں کی دوڑ الگ ہے۔ اچھا خاصا مردہ خانہ اور چڑیا گھر بنا کر رکھ دیا ہے خطوط کی محفل کو۔" راشد میاں! درست ہے کہ مرنے کے بعد روح انسانی جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے لیکن بہت سے جسم تو ایسے ہوتے جو بے روح ہوں 'لہٰذا وہ مردہ ہی ہوتے ہیں اور ایسے مردہ جسموں میں زبان اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ آپ کو دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی مردہ آپ کا حق تو نہیں مار رہا اور پھر یہ کہ مردے کبھی زندہ لوگوں کا حق نہیں مارتے۔ حق تو زندہ انسان ہی زندہ انسانوں کا مارتے ہیں۔ رہ گئیں بلیاں اور چوہے تو ان کی دوڑ بہرحال ازل سے جاری ہے۔ کبھی بلیاں آگے نکل جاتی ہیں 'کبھی چوہے۔ غرض جو جتنی محنت کرے گا 'وہ زیادہ ثمر پائے گا۔ بہتر ہے کہ اِدھر اُدھر کی باتوں پر کڑھنے کے بجائے آدمی اپنی کارکردگی بہتر بنائے۔

بشریٰ مختار نبنی 'منڈی بہاؤالدین سے مدح سرا ہیں "پیارے انکل! میں عرصہ بارہ سال سے آپ کے پیارے رسالے سسپنس کا مطالعہ کررہی ہوں۔ صبح رسالہ لے کر بیٹھتی ہوں اور رات گئے اس کی جان چھوڑتی ہوں۔ سوتے وقت سرہانے رکھ کر سوجاتی ہوں پھر صبح اٹھ کر دوبارہ اسی کام میں محو ہوجاتی ہوں۔ یہی نہیں 'ایک بار رسالہ پڑھنے کے بعد دوبارہ شروع ہوجاتی ہوں۔ اسی شغل میں مہینہ گزر جاتا ہے اور پھر اگلے ماہ کا شمارہ مل جاتا ہے۔ پھر وہی شب و روز۔ پچھلے بارہ سال سے میرا یہی وتیرہ رہا ہے لیکن پیارے انکل! آپ یقیناً حیران بلکہ پریشان ہو رہے ہوں گے کہ اتنی پرانی قاری ہونے کے باوجود میں پہلی بار محفل میں شرکت کیوں کررہی ہوں! تو انکل 'بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آنٹی تسنیم رانا جہلم والی سے بہت ڈر لگتا ہے کیونکہ ان میں مردوں کی حمایت کا مادہ کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔ اسی لیے میں نے آج تک خط نہیں لکھا۔" ننھی بھتیجی! وہ تو اچھا ہے کہ آپ کو سوتے وقت پڑھنے کی عادت نہیں 'ورنہ رسالے کو آپ اپنے ساتھ خواب میں بھی لے جائیں۔ آپ نے پہلی بار خط لکھا۔ بہت اچھا کیا۔ آپ اپنی آنٹی تسنیم رانا جہلم والی سے ڈرتی ہیں 'یہ بھی بری بات نہیں۔ بڑوں سے چھوٹوں کو ڈرنا ہی چاہیے۔ ان میں اگر مردوں کی حمایت کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے تو یہ بھی فطری ہے کیونکہ مرد آج کی دنیا میں جس مقام

پر پہنچے ہیں 'وہ عورت کی حمایت ہی کی بدولت ہے۔ آپ نے سن ہی رکھا ہوگا کہ دنیا کے ہر بڑے آدمی کی ترقی میں کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ممکن ہے 'آپ کی آنٹی بھی مردوں کی حمایت اسی لیے کرتی ہوں!

قاسم سعید کا اظہار خیال لاہور سے 'فرماتے ہیں "اس مرتبہ تو ٹائٹل پر آپ نے بالکل واضح انداز میں لڑکیوں کو شکست فاش دے دی ہے کیونکہ لڑکے تو صرف بدنام ہوتے ہیں۔ اصل قصوروار تو لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو معصوم لڑکوں کو بے وقوف بنانے میں ماہر ہوتی ہیں۔ ویسے جب بھی لڑکیاں دلربا انداز میں کھڑکی کے سامنے بال خشک کرتی ہیں تو معصوم لڑکے نجانے اسے کیا سمجھ کر بے وقوف بن جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرا چھوٹا بھائی سسپنس بھی ہر ماہ ان حسین لڑکیوں کے فریب میں آجاتا ہے اور دوسرے ہی صفحے پر لڑکیوں کی حمایت میں اتر آتا ہے اور پھر لڑکے تو طنز ہی کرتے رہ جاتے ہیں لیکن نمبر لڑکیوں کو مل جاتے ہیں۔" عزیزم قاسم سعید! اس ضمن میں کوئی آخری بات آج تک طے نہیں کی جاسکی کہ کون کس کو بیوقوف بناتا ہے 'کون معصوم ہے اور کون قصوروار؟ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوکر اشارے کرنے سے بہتر ہے کہ لڑکی اپنے بال ہی خشک کرلے تاکہ وہ لوگ جن کی ایسے موقع پر زبان خشک ہوجاتی ہے اور پھر یہی خشکی بعد کو سر میں چڑھ جاتی ہے 'انہیں چاہئے کہ وہ ایسے مناظر سے دوچار نہ ہوں تاکہ خشک کھانسی کا مرض لاحق نہ ہو۔ آگے جو مزاجِ یار میں آئے!

زاہدہ خان 'حاصل پور سے لکھتی ہیں "پیارے انکل! اس دفعہ جس وقت ڈائجسٹ آیا 'اس وقت میں اپنے کورس کی انگلش کی کتاب کا کوئی سوال یاد کررہی تھی۔ ابھی آدھا سوال ہی یاد کیا تھا کہ ڈائجسٹ کو دیکھتے ہی کتاب بند کردی اور فوراً پڑھنا شروع کردیا۔ امی کہنے لگیں 'رسالہ آنے کی دیر ہوتی ہے بس پھر تو یہ لڑکی گئی کام سے۔' میں نے کہا 'امی کیا کروں 'رسالے کو دیکھ کر (میرا پڑھنے میں نہیں لاگے دل 'کوئی یہ تو بتادے مجھے سسپنسر یا تو نہیں ہوگیا) میں نے کہا۔ باقی پڑھائی اور کام میں بعد میں اطمینان سے کرلوں گی 'ورنہ میرا دھیان ڈائجسٹ ہی کی طرف لگا رہے گا 'اس لیے پہلے اسے پڑھنے دیں۔ خیر جی 'بڑے مزے سے رسالہ پڑھا۔ کالج کھلے ہوتے تو ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے یکسوئی نصیب نہ ہوتی۔ اسی لیے اس مرتبہ میں نے صرف ایک دن میں پورا پرچا ختم کرلیا۔ میرا کالج بند تھا اور بڑے بھائی کی یونیورسٹی کھلی ہوئی تھی اور ہماری آپا بھی خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھیں لہٰذا رسالہ مکمل طور پر میرے اختیار میں تھا۔" زاہدہ بی بی! اگر آپ کی والدہ یہ کہہ دیں کہ "لڑکی گئی کام سے" تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہے لہٰذا کوشش کی جانی چاہئے کہ آدمی کام سے نہ جائے بلکہ بے غرض جائے تاکہ اسے طعنے نہ سننے پڑیں۔ یہ خوشی سے زیادہ حیرت کی بات ہے کہ آپ نے پورا رسالہ ایک دن میں پڑھ لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ پورا سالانہ نصاب تو آپ دس بارہ دن میں پڑھ کر فارغ ہوجاتی ہوں گی۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کی آپا ان دنوں خالہ کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ یہ لڑکیوں کو ایک نہ ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ آج وہ کل تمہاری باری ہے۔

محمد سبطین 'خوشاب سے یوں گویا ہیں "چچا جانی! اسٹیشن کے اسٹال سے میں نے اپنا محبوب رسالہ خریدا اور اس خوشی کے ساتھ سیٹ پر جا بیٹھا کہ اس رفیقِ سفر کے ساتھ سفر اچھا گزرے گا۔ ابھی میں مصور کے تخلیق کردہ شاہکار سے کوئی تنقیدی پہلو نکالنے کی ناکام کوشش کررہا تھا کہ ایک بھاری بھرکم آواز سماعت سے ٹکرائی۔ یہ رسالہ دکھانا ذرا 'آواز کسی فلمی ولن سے مشابہ تھی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جہاں سے وہ آواز آئی تھی وہاں ایک خاتون براجمان تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں رسالہ ان کو دیتا 'انہوں نے رسالہ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ مجھے ان کی اس دیدہ دلیری پر غصہ تو بہت آیا لیکن پھر وہی عورت ذات والا مسئلہ آڑے آگیا۔ غرضیکہ راولپنڈی تک نہ میں نے رسالہ مانگا نہ انہوں نے خود دیا۔ راولپنڈی اسٹیشن پر جب مسافر اترنے لگے تب میں نے ہمت کرکے خاتون سے رسالہ واپس کرنے کی درخواست کی۔ خاتون نے مجھے کھاجانے والی نظروں سے گھورا۔ ہوش میں تو ہیں آپ! کون سا رسالہ 'کس رسالے کی بات کررہے ہیں؟ نان سینس! اور یہ کہتی ہوئی وہ خاتون اسٹیشن پر اتر گئیں اور مجھے یہ گانا یاد آگیا۔ اک خاتون مجھ سے سسپنس لے گئی۔ جاتے جاتے مجھ کو نان سینس کہہ گئی" عزیزم سبطین! ایک عقلمند کا قول ہے کہ کتاب دینے والا بیوقوف ہوتا ہے اور کتاب لے کر واپس کرنے والا اس سے بڑا بیوقوف۔ روئے سخن آپ کی طرف ہرگز نہیں مگر سوچیے تو کہ جب رسالہ آپ نے نہیں پڑھا تھا تو بندۂ خدا 'اسے دینے کی تک کیا تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رسالہ دینے میں آپ خود زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں کہ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے۔ راولپنڈی اسٹیشن پر آپ کی افسردگی واقعی قابلِ دید ہوگی۔ کاش اس وقت کوئی آپ کی تصویر کھینچ لیتا۔ عموماً اس قسم کی مایوسیاں نوجوانی میں ہوجاتی ہیں۔ دل تھوڑا نہ کریں اور کسی نئی منزل کے لیے سفر کی تیاریاں کریں۔ خدا مشکل آسان کرے گا۔

اب مفید آراء اور پر خلوص مشوروں پر مبنی وہ خطوط جو بلا تبصرہ شائع کئے جارہے ہیں۔

عامر حسین طور 'منڈی بہاؤالدین "کہانیاں سب ہی بہترین ہیں۔ خواہ مخواہ تنقید نہیں کروں گا 'البتہ دیوتا میرے دل کی دھڑکن ہے۔ عزیز اللہ سومرو کا اتنا گھسا پٹا مشورہ ہم کو بالکل پسند نہیں آیا کیونکہ وہ "میرا خیال" کے ساتھ سراسر ناانصافی کررہے ہیں۔ شعروں کے لیے اور کچھ نہیں تو کم از کم چار پانچ صفحات تو رسالے میں ضرور ہونے چاہئیں۔ اسی طرح جن قارئین کے آپ کے ساتھ مراسم نہیں ہیں وہ خط نہیں تو کم از کم شعر تو شائع کرواسکیں گے۔"

چوہدری مظفراقبال گجر، مظفرگڑھ "خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ میرے خیال میں سسپنس ڈائجسٹ کی تعریف نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی کیونکہ اس سے زیادہ مکمل اور جامع ڈائجسٹ شائع نہیں ہوسکتا۔ ویسے تو ڈائجسٹ میں موجود ایک ایک کہانی کی تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے کیونکہ ہر کہانی اپنی جگہ مکمل ہے۔ موت کے سوداگر اور دیوتا' یہ وہ کہانیاں ہیں جو سسپنس کو چار چاند لگاتی ہیں۔ ایک دفعہ پڑھنا شروع کریں تو جب تک ختم نہ ہوں' ڈائجسٹ رکھنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ الیاس سیتاپوری صاحب کی تعریف نہ کرنا گویا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ الیاس سیتاپوری صاحب نے جس طرح تاریخ کے صفحات الٹے ہیں' یہ ان کا ہی کمال ہے۔"

راجیہ ظفر ٹونکی، میرپور خاص "اس ماہ سرورق پر تصویر بہت اچھی تھی۔ مائی ڈیئر انکل! میں آپ کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کررہی ہوں۔ یوں تو میں بہت عرصے سے اس پرچے کی قاری ہوں مگر آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کررہی ہوں۔ انکل' اس ماہ بہت اچھی کہانیاں تھیں جس میں دیوتا اپنے جوبن پر تھا۔ محی الدین انکل کئی ماہ سے آخری صفحات پر نظر نہیں آرہے۔ موت کے سوداگر بھی بہت اچھی جارہی ہے۔ اقلیم علیم صاحب نے اپنی تحریر سے منشیات کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ ان ہی کا کارنامہ ہے۔ میری طرف سے اتنی اچھی تحریر پر اقلیم انکل کو مبارکباد پہنچادیں۔"

نعیم عالم، سلطان کالونی "کوشش کے باوجود سرورق کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کرسکا۔ اس کی بڑی وجہ ذاکر صاحب کی عمر کا علم نہ ہونا ہے اور پھر ان کے ذوق کا بھی تو کوئی پتا نہیں چلتا کیونکہ کبھی کبھی تو ان کے ذوق کو داد دینے کو بہت جی چاہتا ہے۔ خیر یہ تو ان کا ذاتی مسئلہ ہے لیکن پھر بھی انہیں نوجوان طبقے کے جذبات سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں جیسے یہ ندیم الدین کراچی والے تو خاص کر سرورق پر ہی گزارہ کرتے ہیں۔"

محمد ارشد سعید درانی "اگست کے شمارے میں ٹائٹل ہمیشہ کی طرح اچھا رہا اور کہانیوں میں دامِ مرگ، ممنوعہ لفظ' آوارگی حسن اچھی رہیں جبکہ دیوتا ہمیشہ کی طرح سپر رہا لیکن اگست کے شمارے میں فرہاد علی تیمور اتنی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بھی مجبور سا لگ رہا ہے۔"

سید سجاد علی بخاری، بائکوال "انکل! سسپنس اپنی پوری آب و تاب سے دنیا کے کونے کونے میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارا رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے (آمین)۔ انکل! اس مرتبہ دیوتا نے اپنی ۷ سالہ پرانی یاد تازہ کردی۔ فرہاد صاحب کے میدان میں آنے سے دیوتا کی دلچسپی دوبارہ بحال ہوگئی ہے۔ سونیا کے کارنامے اپنے مثال آپ ہیں۔"

اثمار احمد مٹو، گوجرانوالہ "آپ کی تمام کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں مگر دیوتا ایک منفرد شاہکار ہے۔ آپ تو اس کی تعریفیں سن سن کر بور ہوتے ہوں گے مگر ہمیں بہت لطف آتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نک ویلوٹ کے کارنامے بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور دوستوں کے خطوط پڑھنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔"

ہارون رشید، قصبہ کالونی کراچی "میرا شعبہ ادب ہے مگر اس کے باوجود بھی مجھے ڈائجسٹوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کبھی ڈائجسٹ نہیں پڑھتا مگر ٹھہریے' اس کے باوجود بھی میں یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کررہا ہوں کہ میں باقاعدگی سے سسپنس ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتا ہوں اور کافی عرصے سے کررہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ اس ڈائجسٹ میں بے حد معیاری کہانیاں پیش ہوتی ہیں جو سلجھے ہوئے ذہن کے افراد کے لیے بہت فرحت افزا بات ہے۔ یہ زیادتی ہوگی کہ اس ڈائجسٹ کی تعریف نہ کی جائے جس میں محی الدین نواب جیسے ادیبوں کی تحریریں شامل ہوں۔ اس لیے یہ بوجھ میں آج اپنے سر سے اتار رہا ہوں۔ آپ اور آپ کا ادارہ لائق تحسین ہے کہ اس نفسانفسی کے دور میں جبکہ گھٹیاپن آجکل طرۂ امتیاز کے طور پر استعمال ہوتا ہے' آپ نے پرچے کا معیار اسی طرح برقرار رکھا ہے۔"

رخسانہ ناز قمر، لاہور "دیوتا پڑھے بغیر سکون نہیں ملتا اور جب کہانی جلد ہی ختم ہوجاتی ہے تو دکھ ہوتا ہے۔ فرہاد صاحب بڑھاپے میں حد سے زیادہ عاشق مزاج ہوگئے ہیں اور عمل سے گریز ہی فرمارہے ہیں۔ کہانی ذرا طویل کریں اور پارس' علی تیمور اور سونیا کے واقعات تفصیل سے بیان کیا کریں۔ سسپنس کی ہر کہانی نگینوں کی طرح ہے۔"

واصل خان آفریدی، دوبئی "اس ماہ تقریباً سبھی کہانیاں اچھی تھیں' خاص کر تردامن' آوارگی حسن' اثبات' دیوتا اور موت کے سوداگر کا تو جواب نہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی نوک جھونک سے بھی محظوظ ہوئے۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ پرچا دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔"

الفت خان حاصل پور "مہتاب جلیل کی آوارگی حسن پڑھی' بہت اچھی لگی۔ ملک صفدر حیات کی تردامن پڑھی تو ثریا پر بہت غصہ آیا۔ انسان کو زیادہ کا لالچ نہیں کرنا چاہئے۔ زیادہ کے لالچ میں وہ کم سے بھی جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کا یہی انجام ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں آپ میری بات سے متفق ہوں گے۔ واقعی خوبصورتی انسان کو سکھ کم اور دکھ زیادہ دیتی ہے۔ محمود احمد مودی کی ممنوعہ لفظ پڑھ کر بہت لطف آیا۔"

کیپٹن مشتاق، لاہور "آوارگی حسن' اثبات اور بوڑھا سپاہی کے سوا کوئی بھی متاثر نہ کرسکی۔ سلسلہ وار کہانیوں میں "دیوتا" پہلے نمبر پر رہی۔ ڈیمی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دے سکا۔ بارشوں کا موسم اچھا آیا ہے کہ سرورق کی حسینہ آرام سے کھڑکی کا پٹ کھولتی ہیں

چند قطرے زلفوں میں جذب کرتی ہیں اور تولئے سے خشک کرتی ہوئی پرچے کے سرورق پر نمودار ہوجاتی ہیں۔ اگر محترمہ کو زکام ہوگیا تو رسالے کی خواتین کو الرجی ہوجائے گی۔"

چوہدری محمد محبوب، گاؤں ڈھیری کیالہ لورہ "سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا۔ محترمہ خشک بالوں کو تولئے سے صاف کررہی ہیں اور شیشے پر پانی کے نقطے نظر آرہے ہیں۔ برسات کے موسم میں مان لیتے ہیں کہ باہر بارش ہورہی ہوگی لیکن کمرے کے اندر بارش کے بغیر بال کیوں صاف کئے جارہے ہیں؟ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیوتا پڑھی' بے حد پسند آئی' دوسرے نمبر پر موت کے سوداگر۔ پھر قسمت کی لکیر پھر تردامن اور باقی کہانیاں پڑھی۔ مجموعی طور پر ساری کہانیاں پسند آئیں۔"

خان محمد کھوسو، بلوچستان "میں سسپنس ایک مدت سے پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ مجھے اس کی ایک ایک کہانی اچھی لگتی ہے لیکن میں زیادہ تر پرچے کی پہلی کہانی پہلے پڑھتا ہوں۔ اگست کی کہانیوں میں مجھے آوارگیِ حسن بہت پسند آئی جس کو مہتاب جلیل نے ایک خوبصورت انداز سے پیش کیا۔"

منزہ اختر، گوجرانوالہ "انکل! ایک دلچسپ بات بتاؤں آپ کو' میں جب بھی تصدق حسین کا خط یا نام پڑھتی ہوں تو مجھے "طالوت" والے تصدق صاحب یاد آجاتے ہیں۔ ہائے بے چارے! کیا حال ہوتا تھا ان کا بوا کے ہاتھوں۔ اس بار "موت کے سوداگر" اور "دیوتا" عروج پر تھیں۔ پیار کے قابل بہت مزہ دے گئی جبکہ تردامن بھی اچھی تحریر تھی۔"

محمد ارشد انیل گوندل، منڈی بہاؤالدین "فرہاد علی تیمور عشق و محبت کی دلالی میں پھنستے جارہے ہیں۔ بڑا خوش نصیب ہے جسے اتنی ڈھیر ساری محبوبائیں بڑھاپے میں بھی میسر ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ قیامت کی جوانی' تنہائی کی نذر ہوئی جارہی ہے۔ موت کی سوداگر میں ڈیمی اور غزالہ کا تعاقب بہت مزہ دے رہا ہے۔ الیاس صاحب اس بار بھی عروج پر رہے۔ باقی کہانیوں میں مشرق و مغرب' اثبات' بوڑھا سپاہی' عجوبۂ روزگار اور قسمت کی لکیر بہترین کہانیاں تھیں۔ تمام مصنفین کو فرداً فرداً مبارکباد۔"

طارق علی شہزاد، گرین ٹاؤن لاہور "اگست کا شمارہ وقت پر ملا' سرورق بہت خوبصورت تھا۔ تمام کہانیاں خوب تھیں۔ دیوتا حسب معمول پہلے نمبر پر رہی۔ باقی کہانیوں میں بوجھ' اثبات' پیار کے قابل اور ممنوعہ لفظ بہت پسند آئیں۔ ابوالمنصور کی خوبصورت تخلیق دامِ مرگ پڑھ کر دل پر بہت اثر ہوا کہ دولت کس قدر بری چیز ہے۔ اس کی خاطر باپ اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں پہنچا سکتا ہے۔ فضہ ہاشمی کی بوڑھا سپاہی ایک اچھوتی تخلیق تھی۔ اسے پڑھ کر یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ اس ظالم دور میں جہاں بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے' وہاں ایک جانور اپنے مالک کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک قربان کرسکتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی تردامن بہت پسند آئی۔ ناہید سلطانہ اختر کی قسمت کی لکیر اگرچہ کم صفحات کی تھی مگر پھر بھی ایک خوبصورت تحریر تھی۔"

سید قمر عباس نقوی بخاری' سید جعفر حسین بخاری، گجرات "کل میں نے اگست ۱۹۹۰ء کا شمارہ بازار میں دیکھا لیکن پاپا کے ڈر سے خرید نہ سکا' صرف سرورق پر نظر پڑی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سرورق کی تعریف کن الفاظ سے کروں اور خود اس شمارے کی تعریف کے لیے میرے پاس تو کیا' کسی شاعر کے پاس بھی الفاظ نہ ہوں گے کہ اس کی تعریف کا حق ادا ہو۔"

شجاع اللہ بٹ، مالاکنڈ ایجنسی "یگانہ بیگانہ الیاس سیتاپوری کی اچھی کاوش ہے جس میں مسلمانوں کے اس دور کی جھلکیاں ہیں جب انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھاما تھا اور تفرقے میں نہیں پڑے تھے۔ بدقسمتی سے ملک میں بھی آشوری والا معاملہ ہے۔ جب ایک باصلاحیت لڑکا دیکھتا ہے کہ کوئی اپنا اس سے استفادہ نہیں کررہا ہے تو وہ غلط ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور دوسروں کے کام آتا ہے۔ آج کل اپنے غیر بن گئے ہیں۔ طاہر جاوید مغل کی مشرق و مغرب پڑھی' پسند آئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں کس قدر مختلف ہیں۔ مشرق کی علیحدہ اپنی تہذیب و ثقافت ہے اور مغرب کی اور۔"

محمد عارف سعد، موسیٰ پور ضلع گوجرانوالہ "کہانیوں میں دیوتا اور موت کے سوداگر اپنی کارکردگی کو مزید بہتر بنارہی ہیں۔ معتبر صفحات پر ضیاء تسنیم بلگرامی صاحبہ نے ایک شاندار تحریر پیش کی جس پر وہ بہت زیادہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ان کے علاوہ امجد بیگ صاحب کی تحریر بھی اچھی تھی۔"

ملک محمد اسلم طاہر، منڈالی "اس مرتبہ سرورق بہت خوب تھا۔ سرورق پر لڑکی شاید باہر سے آئی اور صرف بال گیلے ہوئے ہیں کیونکہ باہر بارش کا منظر ہے تو تولئے سے بال صاف کررہی ہے۔ بہرحال' سرورق بہت خوب تر ہے۔ شاید کہیں صنف نازک کے ہمراہ کسی مرد کی تصویر کشی بھی ہوجائے لیکن لگتا ہے' شمارے کا سرورق صنف نازک سے ہی خوبصورت لگتا ہے۔ ویسے انکل! معلوم ہوتا ہے' ہلاکو خان جاتے وقت اپنے خاندان کو منڈی بہاؤالدین میں چھوڑ گیا تھا اور کیونکہ یہ ہمارا بہت قریبی شہر ہے اور آنا جانا بھی بہت ہے ہمارا اس شہر میں لہٰذا اس خوفناک اوراک کے بعد وحشت سی محسوس ہونے لگی ہے۔"

انعام اللہ ورک، شیخوپورہ "اگست کے شمارے کا سرورق سسپنس کی سابقہ تاریخ کے مطابق ہی تھا' بہرحال اچھا تھا۔ اگلے صفحے پر فہرست براجمان تھی۔ دیکھنے میں کشادگی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک لانگ جمپ مار کر ہم نے دیوتا کو پکڑا جس نے سسپنس پڑھنے والوں کے

دلوں میں نقب لگا رکھی ہے۔ ہمارے دلوں کو اسیر کر رکھا ہے۔ دیوتا کی تعریف جتنی بھی کی جائے، کم ہے۔ اب ہم نے الٹی قلابازی کھائی تو اپنے آپ کو موت کے سوداگروں میں پایا۔ کہانی موت کے سوداگر بھی اچھی جارہی ہے۔ اس کے بعد ہم کو ایک اور الٹی قلابازی کھانی پڑی تو اپنے آپ کو الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی میں پایا۔ تاریخ میرا پسندیدہ مضمون ہے، اس لیے تاریخی کہانی کو کافی شوق سے پڑھتا ہوں۔ کہانی کافی دلچسپ جارہی ہے۔"

عابدہ انور، اوکاڑہ "سب سے زیادہ متاثر علیم الحق حقی نے اثبات کے ذریعے کیا۔ بلاشبہ، یہ کہانی لازوال حقیقت پر مبنی ہے۔ باقی کہانیوں میں پیار کے قابل، دام مرگ، بوجھ وغیرہ اچھی کہانیاں تھیں۔ تردامن اور آوارگی حسن متاثر کن تھیں۔ قسمت کی لکیر نے بہت متاثر کیا، بالخصوص انجام بے حد مناسب تھا۔"

اصغر خان، خانیوال "ٹائٹل اچھا تھا۔ یوں لگا جیسے حسینہ، ساون سے لطف اندوز ہو کر آئی ہے۔ انشائیہ نے قیمت پوری کردی رسالے کی موت کے سوداگر، مفرور کے جیسی لگنے لگی ہے۔ خدارا! ہم پر ظلم مت ڈھایئے۔ اور دیوتا کے بارے میں یوں لگتا ہے جیسے نواب صاحب اب اسے گھسیٹ رہے ہیں۔ اس بار سب سے عمدہ کہانی حقی صاحب کی "اثبات" رہی۔ اس نے بہت متاثر کیا۔ بوجھ، پیار کے قابل، تردامن اور ممنوعہ لفظ بھی اچھی رہیں۔ اس کے علاوہ دام مرگ بھی بہت مناسب تحریر تھی۔ ابوالمنصور صاحب کو مبارکباد۔"

روحی، شبنم، روبی عرف تھری اسٹار، سرگودھا "جس چیز پر پہلے نظر پڑی، وہ سرورق کی حسینہ تھیں۔ شاید باتھ لے کر آئی ہیں اور تولیے سے بال سکھارہی ہیں۔ محترمہ نے بال بڑی بری طرح بکھرائے ہیں حالانکہ ان کے بالوں سے پانی بہتا ہوا نظر نہیں آرہا۔ پتا نہیں کیوں سکھارہی ہیں۔ انہی محترمہ نے ہمیں خطوط کی محفل میں آنے کی دعوت دی ہے۔ بہن بھائیوں کی نوک جھونک سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ہم گاؤں میں رہتے ہیں، رسالہ بعض اوقات دیر سے ملتا ہے۔ چونکہ جلدی مل گیا ہے اس دفعہ تو سوچا، خط ہی لکھ دیں۔ ہم سب سے پہلے دیوتا پڑھتے ہیں۔ یہ ہماری اول نمبر کی پسند ہے۔ اس کے بعد موت کے سوداگر کی باری آتی ہے۔ مرزا امجد بیگ کی نہ صرف کہانی اچھی ہوتی ہے بلکہ وکالت کرنے کا طریقہ ہمیں بہت پسند ہے۔"

رانا محمد اشرف، رتوڈیرو "اگست ۹۰ء کا شمارہ ملا۔ ہم نے تولیے والی حسینہ کو دیکھنے کے بعد سوچا، آپ کے خط پڑھیں مگر خط پڑھنے کے بعد ہم یگانہ اور بیگانہ ہوگئے اور یکایک مشرق اور مغرب کی طرف چل پڑے۔ وہاں پر موت کے سوداگروں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمیں حسن آوارگی میں مبتلا کردیا۔ جیسے ہی اثبات کا پتا چلا تو ہم تردامن ہوگئے۔ اس طرح ہم پیار کے قابل ہوئے تو ہم پر ایک بوجھ ہوا اور مزید براں دیوتا نے ہم کو دام مرگ تک پہنچادیا۔ جب ممنوعہ لفظ سے نجات ملی تو دو صوفی صاحبان نے کاوش کرکے ہم کو بوڑھے سپاہی کے حوالے کیا۔ اس طرح قسمت کی لکیریں ہم پر مہربان ہوئیں جو پہلے کترا کر کے نکل جاتی تھیں۔"

ساحرہ شمع رحیم جونیجو، کوٹری "اس بار کا سرورق موقع کے مطابق تھا۔ وہ خاتون شاید باہر کی بارش سے بھیگ کر کمرے میں کھڑی تھیں اور بال سکھارہی ہوں گی کہ ذاکر صاحب کی نظروں میں آگئیں۔ ویسے اس سال تو بارش ہی نہیں ہوئی۔ مگر ہوسکتا ہے کہ کراچی میں ہوئی ہو ویسے ٹھیک ٹھاک قسم کا سرورق تھا، متاثر کن نہیں تھا۔ ارے انکل، کمال ہے! وہ اپنے مروہ صاحب بھی اب التجاؤں پر اتر آئے۔ ویسے خطوط میں پہلا خط ان کا چھپا اور یہ ان کا حق بھی تھا۔ اتنی طویل غیر حاضری کے بعد۔"

مس غیم ناز، ضلع بہاول نگر "آپ یقین کریں، ہمارے گاؤں میں یہ رسالہ اتنی بڑی تعداد میں پڑھا جاتا ہے کہ شاید ہی کسی اور جگہ اس کی اتنی مانگ ہو۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو میرے ابو یہ رسالہ پڑھا کرتے تھے اور ہمارے گاؤں کے لوگ باری باری یہ میگزین لے جاکر پڑھتے۔ پھر سب نے اپنا اپنا خریدنا شروع کردیا کیونکہ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ یہ رسالہ پہلے پڑھے۔ اب تو اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی اس رسالے کے معیار میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس کے قارئین کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اب تو میرے بھائی اور میں خود اس کی قاری ہوں۔"

شگفتہ ناز نیازی، حیدرآباد ضلع بھکر "کہانیوں میں سب سے پہلے "دیوتا" پڑھی۔ ایک ہی سانس میں ختم کی، پتا ہی نہیں چلا۔ کہانی میں حالات وواقعات کا تسلسل اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ آدمی کی دلچسپی اور تجسس برقرار رہتا ہے۔ دوسرا نمبر "موت کے سوداگر" کا تھا۔ اقلیم علیم کے قلم سے تراشی ہوئی یہ تحریر بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر "قسمت کی لکیر" بھی لافانی تحریروں میں سے تھی۔ کہانی کا پلاٹ بہت خوبصورت تھا۔ کہانی کی اٹھان اور کرداروں پر مصنفہ کی مکمل گرفت نے اس کہانی کو شاہکار بنادیا۔ لفظ لفظ تجسس اور سطر سطر اشتیاق نے کہانی کو چار چاند لگادیئے۔ یہ تحریر اس ماہ کا تحفہ خاص ثابت ہوئی۔"

ایم شریف خان نیازی اختر، کراچی "آپ کی محفل میں نیا ضرور ہوں لیکن آپ کے ڈائجسٹ کو میں تقریباً ۸ سال سے پڑھ رہا ہوں۔ ہر ماہ بے چینی سے اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کا انتظار رہتا ہے، اسی بے چینی کی بنا پر قلم اٹھانے پر مجبور ہوا ہوں کہ اپنے محبوب سسپنس کی محفل میں شریک ہونا چاہیے۔ آپ کے تمام سلسلے شاندار ہوتے ہیں جن میں آخری صفحات پر جو فن پارے چھپتے ہیں، ان کو میں بڑے غور سے پڑھتا ہوں۔ نک ویلوٹ، موت کے سوداگر شاندار سلسلے ہیں۔"

مقبول احمد شاہین، کوٹلہ ماہو رام "پرچا اس ماہ ۱۸ روپے میں خریدا لیکن قیمت بڑھنے پر ہم قطعاً حیران یا پریشان نہیں ہوئے کیونکہ اس کی امید تو بہت پہلے سے تھی۔ ویسے بھی باقی پرچوں کی قیمتیں عرصہ ہوا، بڑھ چکی ہیں۔ سرورق ہمیشہ کی طرح اپنے اندر ایک انوکھی خوبصورتی سموئے ہوئے تھا۔ بزم سسپنس میں پیارے پیارے قارئین کی نوک جھونک، طنز و مزاح، خوبصورت باتیں اور پرخلوص جھڑپیں کتنی دلربا سی ہیں اور اسی وجہ سے اس پرچے سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ انکل! زیادہ تر قاری تو "دیوتا" اور "موت کے سوداگر" کے لیے پرچا پڑھتے ہیں۔ حالانکہ باقی کہانیوں کی حیثیت اپنی جگہ مسلمہ ہے مگر یہ بات اپنی جگہ اٹل کہ پرچے کی جان و دل کا درجہ ان دونوں سلسلوں ہی کو حاصل ہے۔"

بشیر احمد بھٹی، بہاولپور "جون ایلیا کا انشائیہ ایک اچھا سلسلہ ہے۔ "آپ کے خط" میں عوام کے خطوط بھی دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتے جارہے ہیں۔ خصوصاً آپ کا جواب جو ہر خط کے آخر میں ہوتا ہے، کافی دلچسپ ہوتا ہے۔ یگانہ بیگانہ، الیاس سیتاپوری کسی قدر تاریخی عجائب خانے کو ہوا دیتے ہیں۔ مشرق ومغرب، طاہر جاوید کی دلچسپ تحریر ہے۔ موت کے سوداگر، خوفناک عکاسی ہے، ان کے لئے جو منشیات کے عادی ہیں یا پھر منشیات کی خاطر پر تول رہے ہیں۔ آوارگی حسن، مہتاب جلیل کی لاجواب کاوش ہے۔ اثبات، علیم الحق حقی کا تحفہ ہے۔ تردامن، ملک صفدر حیات رسالے کی ضرورت بنتے جارہے ہیں۔ پیار کے قابل، بوجھ، دام مرگ، ممنوعہ لفظ، بوڑھا سپاہی، عجوبہ روزگار، اچھی تحریریں ہیں۔ دو صوفی، کا کیا کہنا! ایک گلاب سلسلہ ہے۔ قسمت کی لکیر، ناہید سلطانہ اختر نے ایک دھماکا کیا ہے۔ ویسے بھی پرچے کی سماجی کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں۔"

چوہدری ش ا، دوحہ قطر "سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں۔ خیر پہلے اپنے پرچے کی باتیں ہوجائیں۔ دیوتا پھر سے ساتویں آسمان کی بلندیوں کو چھورہی ہے۔ موت کے سوداگر نے ابھی تک بور نہیں کیا۔ (الحمدللہ) سب سے زیادہ قسمت کی لکیر اچھی لگی۔ ذاکر صاحب کو ذرا سمجھاویں کہ آپ جیسے آدمی کو کسی آنسہ کی تنہائی میں جھانکنا "چنگا" نہیں لگتا۔ دو سال پہلے سے ہمارے چہرے پر ایک عدد عینک کا اضافہ ہوچکا ہے جس کا سائز روز بہ روز موٹا ہوتا جارہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹیلی پیتھی پر سے ہمارا ایمان بھی اٹھتا جارہا ہے اور ہاں، یاد آیا، خطوط کے صفحات میں سب "بہن بھائیوں" کی تکرار ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔ آخر سسپنس فیملی میں بہن بھائی نہیں لڑیں گے تو کیا انکل لڑیں گے۔"

آصف محمود، گجرات "میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، اس وقت میں نے ڈائجسٹ گھر والوں سے چھپ کر پڑھنا شروع کیا اور اب بی اے فائنل کا طالب علم ہوں اور مسلسل رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پرچے نے اپنا معیار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتر ہی بنایا ہے۔ اس ماہ سے آپ نے رسالے کی قیمت میں اضافہ کردیا ہے۔ بہت اچھا کیا ہے۔ آپ بے شک اس کی قیمت میں مزید اضافہ کردیں لیکن اس کا معیار اور سائز برقرار رہنا چاہئے کیونکہ ہمارے لیے قیمت نہیں بلکہ معیار مسئلہ ہے۔ اس ماہ کی کہانیوں میں دیوتا کے بعد دام مرگ بہت پسند آئی۔"

آخر میں ان عشاق کے نام جن کے خط جگہ کی کمی کے سبب شریک اشاعت نہ ہوسکے۔

عکروز خان خٹک، گوجرانوالہ - زاہد حسن، ہزارہ - راجا محمد شکیل طاہر، چوک طاہر پیر - اللہ دتہ ساجد، چنیوٹ - حافظ محمد حسین چشتی، ملتان - آفتاب شاہد، راولپنڈی - محمد شکیل شہباز، مردان - نثار محمد، ڈگر سوات - محمد طارق، پشاور - آفتاب الدین، سوڈھیر - لطیف عرف رانجھا، علی پور چٹھہ - محمد یونس، تلہ گنگ - رشید احمد، ملتان - عفت جیا، بنوں سٹی - محمد اشرف، کوٹ سلطان - خالد محمود میرانی، لیہ - ایم صدیق انجم، کونش تویلی بٹل - عارف منیر، لاہور - وردہ طفیل، گوجرانوالہ - عبدالرشید مغل، مظفر گڑھ - محمد عابد، تلہ گنگ - سید قیصر، لیاقت آباد کراچی - طارق محمود بھٹی، گوجر خان - ملک اعظم خان، سکھر - خلیل احمد، گوجرانوالہ - حبیب خان، ملتان - ممتاز علی، کنڈیارو - سائرہ منظور بخاری، خان پور - عدم آزاد، فیصل آباد - خالد حسن چیمہ، لیبیا - محمد احسان شاہد، کھیالہ شیداں۔ راہا محمد نذیر، لاہور - محمد طارق فاروق، وہاڑی - ایم جمیل رفیقی کھوکھر، کھاریاں - غلام اختر شاہین، چکوال - قیصر جمال، پشاور - شازیہ حطاب، ڈیرہ اسماعیل خان - خالد نواز عامر، کوہاٹ - محمد الیاس خان، مسقط - امجد ایک ملک، تلہ گنگ - سہیل، کراچی - رضا مشہدی، علی پور چٹھہ - ایس جے بخاری، گوجرانولہ - کے ایم ایس چشتی، چارسدہ - جاوید اقبال تبسم، انگلینڈ - تصدق حسن علی پور چٹھہ - زیڈ اے ظہور، چکوال - ابراہیم تنولی، ایبٹ آباد - ایم اے خان، دستگیر - شفیع محمد بھٹی، دین پور - اکرام اللہ خان، ناظم آباد - شرافت علی، رسالپور - سید رحمٰن تاج، شاہ فیصل کالونی - ابراہیم، سعودی عرب - سید اظہار باچہ، عربی بانڈہ مردان - عطیہ ارم، خداداد کالونی - شاہد بٹ بلیک، ملتان - شمس العالم، تیلوس الائی - اشفاق، نامعلوم - اللہ دتہ، خوشاب - مزمل حسین، فیصل آباد - ذوالفقار احمد، نامعلوم - انوار عاصم، بہاء الدین - سردار محمد، کراچی نمبر ۸ - فرزانہ عزرا، چک نمبر ۶۵ جنوبی - جاوید اقبال، کوئٹہ - عامر خان، حکیم آباد - مظہر وسالوی، چکوال - ایم ایم ارشد شدی، چکوال - شمیم اختر، چک ۶۵ جنوبی - محمد صابر شاہ، ایبٹ آباد - محمد مظفر، جیکب لائن محمد شکیل، ریلوے کالونی - سید نجف عباس، اٹک جی پی او - مہر آشنا، لنگڑیال - شاہد فیروز ریحان، پشاور - پیر غلام سرور، داوو - ظہور الرحمان، نامعلوم - این اے نور، پشاور - امجد ایچ ملک، تلہ گنگ - گلشن عثمان، رحیم یار خان - شعیب اللہ چیمہ، رحیم یار خان - فرزانہ صابر، کورنگی نمبر ۲ - پرویز خان، سول لائن کراچی۔

وہ اپنے پندرہ گنا عساکر کے ساتھ آندھی طوفان کی طرح اسلامی مطلع
پر نمودار ہوئے اور پندرہ ہزار مسلمانوں کو حقیر اور استہزا سے دیکھنے
لگے۔ حلم اور مفاہمت کا مذاق اڑایا اور طاقت کے نشہ میں ایسے مطالبے کیے
کہ مسلمان تنگ آمد بجنگ آمد پر آمادہ ہو گئے۔ جنگ ہوئی
خوفناک جنگ۔ صلیب و ہلال کی جنگ۔ اور صلیب ٹوٹ گئی ۔
عیسائیوں کی متحدہ قوت کا پرچم سرنگوں ہو گیا۔ بازنطینی سلطنت
کا قیصر ایک کمزور اور بدہیئت عام آدمی کے ہاتھوں گرفتار ہوا ۔
فاتح اور مفتوح آمنے سامنے ہوئے۔ تکلیف دہ اور تہدید آمیز باتوں
نے قیصری کو خاک میں ملا دیا۔ اس ماحول میں ایک اور کہانی بھی جاری تھی
حدیث قدسی کے مصداق دو شاخیں عمل کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ دلچسپ اور نتیجہ
خیز داستان جو اپنے نام کی طرح راہی بھی ہے اور گمراہی بھی۔
راہی اور گمراہی
الیاس سیتاپوری

Faisal Ahmed

روسی بادشاہ نے سلطان سے کہا "تو نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم تیری سرزمین پر قتل وغارت گری کرنے آئے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آرمینیا اور جارجیا ہمارے علاقے تھے' ان کے پورے معاشرتی اور مذہبی ماحول کو دیکھو تو میری بات سمجھ میں آجائے گی۔ ان پر تو نے بزورِ قوت قبضہ کرلیا یا انہیں اپنا مطیع بنالیا' جارجیا کی شہزادی سے شادی کرلی اور پھر اسے طلاق دے کر اپنے وزیر خواجہ حسن کے حوالے کردیا۔ یہاں کی مظلوم مسیحی آبادی نے فریاد کی اور ہم سے مدد مانگی تو ہم آگئے۔ تیری سرزمین پر ہم نہیں' تو ہماری سرزمین میں زبردستی داخل ہوا ہے اور ہم تو تجھے نکالنے آئے ہیں۔"

سلطان نہایت صبرو تحمل سے بادشاہ کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جواب دیا "سرزمین کا مسئلہ پرانا اور متنازعہ ہے' اس پر کبھی تم لوگ غالب اور برسرِ اقتدار رہے اور کبھی اس پر ایرانیوں نے قبضہ کرلیا۔ ایران کا قبضہ تادیر رہا اور ایرانیوں کی نیابت جب مسلمانوں نے کی تو یہ علاقے ہمارے پاس آگئے اور ہم سے تم لوگوں نے جبرا یا تو لیے یا پھر چھین لینے کی کوشش کی۔ آج ہم بزورِ قوت اپنی کھوئی ہوئی زمین حاصل کررہے ہیں تو' تو یا تیری قوم اس کی دعویدار نہیں بن سکتی۔"

روسی بادشاہ کا خیال تھا کہ سلطان کو قیصر اور اس کے اتحادیوں کی شاندار قوت کا علم ہوچکا ہوگا اور وہ عیسائیوں کی تعداد اور قوت سے بخوبی آگاہ ہوگا اس لیے وہ روسی بادشاہ اور اس کے امیر سرداروں کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچائے گا اور معذرت کرکے چھوڑ دے گا یا پھر انہیں درمیان میں لاکر قیصر سے معاملت کی گفتگو کرے گا۔

سلطان نے کہا "تو اپنی تعداد پر نازاں ہے اور میں اپنی قلت پر ذرا بھی پریشان نہیں۔"

روسی بادشاہ نے پوچھا "تو ہم سے کیا سلوک کرے گا؟"

سلطان نے جواب دیا "میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا۔"

روسی بادشاہ کسی قدر پریشان ہوگیا۔ بولا "تو مجھے قتل نہیں کرسکتا کیونکہ تو ہمارے ذریعے قیصر سے معاملہ کرسکتا ہے۔"

سلطان نے جواب دیا "ہم جنگ نہیں چاہتے لیکن اگر ہم پر جنگ تھوپی گئی تو پیچھے بھی نہیں ہٹیں گے اور زندگی کی آخری سانسوں تک مقابلہ کریں گے۔"

روسی بادشاہ نے سلطان کے گردوپیش کھڑے ہوئے ان محافظوں کو دیکھا جو بے حد گرانڈیل اور تنومند تھے۔ ان کے سر بشرے سے جاں بازی اور بے باکی ٹپک رہی تھی۔ شاہ کے ساتھیوں کو اپنی موت کا یقین ہونے لگا تھا۔ انہوں نے بادشاہ کو سمجھانا چاہا "آپ یہاں بات اس طرح نہ کریں۔"

روسی بادشاہ نے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹ دیا "تم خاموش رہو' میں بادشاہ ہوں اور تم میرے ملازم' ماتحت' تم میرے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔"

سلطان نے صنداق ترک کو حکم دیا "ان کے ناک کان کاٹ کر بغداد روانہ کردیے جائیں۔"

روسی بادشاہ مشتعل ہوگیا "تو میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کرسکتا کیونکہ تو خوب جانتا ہے کہ قیصر تجھ سے اس کا حساب لے گا اور تجھے اور تیرے ساتھیوں کو اپنے شرمناک کرتوتوں کا جواب دینا ہوگا' حساب دینا ہوگا۔"

سلطان کو غصہ آگیا "احمق انسان! یہ تو کیا بکواس کررہا ہے' دیکھ میں تجھے کیا سزا دیتا ہوں۔" سلطان نے صنداق ترک کو حکم دیا "اس کے ناک اور کان کٹوادیے جائیں۔"

روسی بادشاہ گھبرا گیا "مجھ کو قتل کردیا جائے' میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

بادشاہ نے سختی سے کہا "مجھے تیری آمادگی یا رضامندی سے کوئی سروکار نہیں" اور صنداق ترک کو دوبارہ حکم دیا "میرے حکم کی تعمیل کی جائے۔"

صنداق ترک اسے گھسیٹ کر خیمے کے باہر لے گیا۔ روسی بادشاہ نے مزاحمت کی لیکن وہ بندھا ہوا تھا۔ اس نے صنداق ترک کی خوشامد کی "تو مجھے قتل کردے لیکن میری شکل نہ بگاڑ۔"

صنداق ترک نے جواب دیا "تو نے سلطان کو ناراض کردیا' ورنہ سلطان اپنے دشمنوں اور مفتوحوں سے ایسا سلوک نہیں کرتا۔"

سلطان کا بھیجا ہوا سیاف بھی ان دونوں کے پاس پہنچ گیا اور اس نے روسی بادشاہ کو اپنی تحویل میں لے لیا "اس کی ناک اور دونوں کانوں کی صفائی میں کروں گا کیونکہ یہ کام میرا ہے۔"

صنداق ترک نے روسی بادشاہ کو اس کے حوالے کردیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔

سیاف نے روسی بادشاہ کو نیچے گرا کر ایک ہی وار میں اس کی ناک صاف کردی۔ روسی بادشاہ چیخ چیخ کر رحم کی درخواست کررہا تھا۔ سیاف نے دوسرے مرحلے میں اس کے دونوں کان کاٹ لیے۔ پاس ہی سلطان کے طبیب اور جراح موجود تھے۔ انہوں نے بہتے ہوئے خون کو دوا اور پٹی کی مدد سے روک دیا اور اسے ایک خالی خیمے میں پہنچادیا۔ روسی بادشاہ کی شکل بگڑ چکی تھی۔ اس حال میں اسے سلطان کے روبرو دوبارہ پیش کیا گیا۔ کٹی ہوئی ناک اور دونوں کان ایک طشت میں رکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کردیے گئے۔

سلطان کے پاس ایک بڑی صلیب بھی رکھی ہوئی تھی۔ یہ

صلیب ہراولی فوج سے چھینی گئی تھی' اس کے بارے میں عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ وہی صلیب ہے جس پر حضرت مسیح مصلوب ہوئے تھے۔

بادشاہ سسک رہا تھا۔ سلطان نے کہا "اب تو آزاد ہے' جہاں جانا چاہے چلا جا۔"

بادشاہ نے جواب دیا "اس سے بہتر تو موت تھی۔ اب میں کہاں جاسکتا ہوں؟"

سلطان نے صنداق ترک کو حکم دیا "یہ صلیب اور بریدہ اعضاء خواجہ حسن کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کردیا جائے کہ انہیں جملہ جنگی کیفیات اور تفصیلات کے ساتھ خلیفہ المسلمین کو بغداد بھیج دیا جائے کیونکہ یہ ایک اچھی ابتداء ہے اس مہم اور جہاد کی جو آیندہ ہمیں پیش آنے والی ہے۔"

بادشاہ نے کہا "مجھے بھی بغداد بھیج دیا جائے۔"

سلطان نے اس کے بارے میں حکم دیا "اسے اس کے گرفتار سرداروں کے سپرد کردیا جائے۔ وہ اسے قیصر کے پاس لے جائیں گے۔"

بادشاہ بے بس تھا اگر اسے اپنی ذات پر اختیار ہوتا تو خودکشی کرلیتا۔

سلطان کے حکم کی تعمیل کی گئی اور بادشاہ کو اس کے سرداروں کے سپرد کرکے آزاد کردیا گیا "اب تم جاسکتے ہو' جہاں بھی جانا چاہو۔" سرداروں کو اپنے بادشاہ کی یہ صورت ناگوار گزری اور بعض کو ہنسی بھی آئی۔

صنداق ترک نے سلطان کو دوسری خوش خبری سنائی "جنابِ والا! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ایک دوسری خوش خبری بھی لایا ہوں۔"

سلطان سوالیہ نظروں سے صنداق کی شکل دیکھ رہا تھا۔ صنداق ترک نے کسی تمہید کے بغیر دونوں کا ذکر کردیا "وہ دونوں یعنی آشوری ہنرمند اور شاعر اسماعیل ہمیں اچانک اور اتفاقاً مل گئے۔"

سلطان چونک گیا "دونوں کہاں ہیں؟"

صنداق نے دونوں کو سلطان کی خدمت میں پیش کردیا۔ درباری امراء اور منصب داران دونوں کو شک وشبے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ سلطان بھی انہیں کچھ دیر بڑے انہماک سے دیکھتا رہا۔ دونوں کی نظریں اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر تھیں۔ اچانک آشوری جوان اپنی صفائی پیش کرنے لگا "سلطانِ محترم! ہم نے کیا سوچا تھا اور اللہ نے کیا طے کیا تھا۔ قسمت بھی کیا شے ہے۔"

سلطان نے پوچھا "تم دونوں نے میرے لیے کیا کیا؟"

آشوری نے اپنی روداد سنانا چاہی تو سلطان نے روک دیا۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے" پھر شاعر اسماعیل کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن میں جانتا ہوں کہ اس نے اپنے دینی بھائیوں سے ہمدردی کی اور یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوگیا تھا۔"

شاعر اسماعیل گڑگڑانے لگا "وہ میری بھول تھی اور میں اپنی اسی بھول پر زندگی بھر شرمندہ رہوں گا۔"

سلطان نے اس کی باتیں بڑی بے پروائی سے سنیں اور صنداق کو حکم دیا "خلاط کا مخبر پیش کیا جائے۔"

آشوری نے درخواست کی "مجھ کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔" خلاط کا مخبر سلطان کے سامنے پیش کردیا گیا۔ آشوری نے اسے دیکھا تو اسے یاد آیا کہ خلاط کے والی کے ساتھیوں میں یہ بھی موجود تھا اور آشوری سے معاہدہ کرنے میں یہ پیش پیش تھا۔ آشوری کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

سلطان نے مخبر سے پوچھا "خلاط میں کیا پیش آیا سب کے سامنے بیان کر۔"

مخبر کی عمر پچاس سال کی لگ بھگ تھی اور وہ باربار آشوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آشوری کی طرف اشارہ کیا "فرینکوں کے بادشاہ نے اسے والی خلاط کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے معاہدہ کرایا تھا۔ اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر شہر کے دروازے کھول دیے جائیں تو عیسائی شہریوں سے جنگ نہیں کریں گے۔ یہ وعدہ انجیل پر ہاتھ رکھ کر کیا گیا تھا۔"

سلطان نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

مخبر نے جواب دیا "اس کے وعدے پر بھروسا کیا گیا اور شہر کے دروازے عیسائیوں کے لئے کھول دیے گئے۔ فرینکوں کا بادشاہ اپنے سرداروں کے ساتھ خلاط کے دروازے پر آیا۔ والیِ شہر اپنے امراء اور عمائدین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور اپنے دشمنوں کا استقبال کیا۔ فرینکوں کے سردار نے کوئی ایک بات کیے بغیر والیِ شہر اور اس کے ساتھیوں کو قتل کردیا۔ فرینکوں کا بادشاہ یہ دیکھتا رہا اور اپنے ساتھیوں کو روکا تک نہیں۔"

سلطان نے آشوری کی طرف دیکھا "اس وقت یہ کہاں تھا؟"

مخبر نے جواب دیا "فرینکوں کے بادشاہ کے ساتھ یہ بھی تھا۔"

آشوری نے جلدی سے کہا "اور یہ بھی تو بتا کہ میری اس بات پر فرینکوں کی بادشاہ سے ان بن ہوگئی اور میں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

مخبر اپنی روداد سنائے چلا جارہا تھا "پھر تو وہاں وہ خون خرابا ہوا کہ اللہ کی پناہ۔ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا اور ان کی املاک کو لوٹ کر نذرِ آتش کردیا گیا۔"

آشوری اپنی صفائی پیش کئے جارہا تھا "جب میں نے یہ دیکھا کہ میرے دینی بھائی اس قدر بد عہد اور جھوٹے ہیں تو میں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور خلاط میں، میں نے جو کچھ بھی کیا مسلمانوں کی بھلائی اور ہمدردی میں کیا تھا لیکن یہ الزام بھی اپنے سر آیا۔"

سلطان نے ذرا ترش لہجہ اختیار کیا "میں تیری صفائی پر کوئی توجہ نہیں دے رہا اس لیے جب تک تجھے بولنے کی اجازت نہ دی جائے تو خاموش رہ۔"

آشوری کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ اس نے التجا کی جنابِ والا! مجھے مطمئن کیا جائے کہ جب تک میں اپنی بے گناہی ثابت کردوں مجھے سزا نہیں دی جائے گی۔"

سلطان نے مخبر سے پوچھا "تجھ کو کچھ اور کہنا ہے یا نہیں؟"

مخبر نے جواب دیا "اس کے بعد خلاط میں کچھ بچا ہی نہیں، کہنے کے لیے کچھ رہا ہی نہیں۔"

سلطان کو خلاط کی بربادی کا بڑا دکھ ہوا۔ اس نے آشوری اور شاعر اسماعیل کو سردست اپنے خیمے میں ٹھہرنے دیا اور انہیں وہاں سے رخصت کردیا، اس ہدایت کے ساتھ کہ ان دونوں کو بہ وقتِ طلبی دوبارہ پیش کیا جائے۔"

آشوری اور شاعر اسماعیل اپنے خیمے سے ان قیدیوں کو دیکھ سکتے تھے جن کا تعلق شکست خوردہ ہراولی فوج سے تھا۔ اس وقت وہاں بنی اور گوش بریدہ بادشاہ کی وجہ سے کچھ زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ عام مسلمان سپاہی بھی روسی بادشاہ کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ انہی میں وہ مسلمان بھی شامل تھے جنہیں سلطان کی یہ حرکت گراں گزری تھی۔ وہ روسی بادشاہ کے حال پر متاسف تھے۔ آشوری اور اسماعیل نے بھی کان ناک کے بغیر روسی بادشاہ کو دیکھا اور لرز گئے۔ شاعر کو اپنا حشر بھی ایسا ہی نظر آرہا تھا۔ اس لئے اس نے آشوری سے کہا "یہاں سے بھاگ چلو کہیں ہمارا بھی یہی حشر نہ ہو۔"

آشوری کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ سلطان ایسا بھی کرسکتا ہے زخمی بادشاہ، سلطان اور مسلمانوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس طرح کوئی مسلمان یا خود سلطان برہم ہوکر اسے قتل کردے۔

سلطان کے وہ حکم بردار جو بادشاہ اور دوسرے قیدیوں پر متعین تھے اور انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ انہیں اسی حال میں یہاں سے رخصت کردیا جائے۔ وہ بادشاہ اور اس کے صحیح سلامت سرداروں کو وہاں سے فرار ہوجانے پر مجبور کررہے تھے جبکہ بادشاہ جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

آشوری بھی بادشاہ کے پاس گیا اور اسے بغور عبرت سے دیکھتا رہا۔ بادشاہ نے آشوری کو قیصر کے دربار میں دیکھا تھا۔ اسے ایک نظر میں پہچان لیا اور پوچھا "اے ہنرمند جوان تو یہاں کہاں؟"

آشوری نے پوچھا "آپ نے مجھے کہاں دیکھا تھا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "ملاطیہ میں، قیصر کے دربار میں۔"

آشوری نے کہا "ہاں، وہاں میں تماشے کی طرح سب کے سامنے کھڑا کردیا گیا تھا مگر میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔"

بادشاہ نے پوچھا "کیا تو بھی قیدی ہے؟ مگر تو کیوں قید کیا گیا؟ تو نے تو مسلمانوں سے جنگ نہیں کی تھی؟"

آشوری نے جواب دیا "میں ایک خبطی اور دیوانہ انسان تھا، مسلمان مجھے فرزانہ سمجھتے ہیں اس لیے میں یہاں چلا آیا۔"

بادشاہ کو اپنے اعضاء کے خسارے کا احساس ہوا تو تڑپ گیا آشوری کو ملامت کرنے لگا "تو مسلمانوں کی تعریف کررہا ہے حالانکہ یہ اس لائق نہیں ہیں، دیکھ ان کے سلطان نے میری شکل ہی بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ میں انہیں زندگی بھر معاف نہیں کروں گا۔"

آشوری نے اسے مشورہ دیا "تیری زبان نے ہی تجھے یہ دن دکھایا ہے اور وہی زبان پھر آزادی سے بولے جارہی ہے۔ تو بادشاہ ہے اپنی حیثیت کا خیال کر۔"

بادشاہ کے سرداروں کو اپنی رہائی اور آزادی عزیز تھی۔ اب وہ سلطان کے لشکر میں لمحہ بھر بھی رہنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو وہاں سے فوری نکل چلنے پر مجبور کردیا اور مسلمانوں کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے نکل بھاگے۔ ناک اور دونوں کانوں سے محروم بادشاہ ان کے ساتھ ان کے درمیان بھاگ رہا تھا۔

☆☆

قیصر نے اپنے لشکر کو خلاط کے شمال میں جھیل دان کے کنارے ملازگرد نامی شہر میں اتار دیا۔ ملازگرد والوں نے مزاحمت کی مگر وہ ناکام رہے۔ الزہرہ کا میدان قیصر کی افواج سے آباد ہوگیا۔ سلطان بھی بہ سرعت قیصر کی طرف بڑھا اور اس سے ایک فرسخ کی دوری پر ایک نہر کے کنارے اپنی پندرہ ہزار فوج کے ساتھ فروکش ہوگیا۔ سلطان کے فوجی سردار صنداق ترک اور سعد اللہ گوہر آئین سلطان کے قریب تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ پیش امام فقیہ ابونصر محمد بن عبدالملک بخاری حنفی کو بھی زحمت دی جائے۔

کچھ دیر بعد پیش امام صاحب بھی آگئے۔ سلطان نے ساوتگین نامی فوجی سردار کو بھی اپنے روبرو طلب کرلیا۔ ساوتگین بھی آگیا۔ سلطان نے اسے بڑی عزت دی اور اپنے دوسرے سرداروں سے پوچھا "تم سب مجھے بتاؤ ساوتگین کیسا آدمی ہے؟"

سبھی نے ساوتگین کی بڑی تعریفیں کیں اور جواب دیا "یہ عقل مند بھی ہے اور بہادر بھی، سرداری کی خوبو اس کی رگ وپے میں موجود ہے۔"

سلطان نے کہا "میں اس سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہوں۔"

پیش امام نے سب کی طرف سے جواب دیا "سلطان کی مردم شناسی سب پر فوقیت رکھتی ہے اور جو سلطان کی رائے وہ ہم سب کی رائے۔"

سلطان نے ساوتگین سے پوچھا "میں تجھ کو قیصر کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں، سفیر بنا کے، کیا تو یہ خدمت انجام دے گا؟"

ساوتگین نے جواب دیا "میں سلطان کا غلام ہوں، میرے ذمے جو بھی خدمت ہوگی میں انجام دوں گا۔"

سعد اللہ گوہر آئین کو سلطان کی رائے سے اختلاف تھا، اس نے دبے لفظوں میں پوچھا "اس سے سلطان کو کیا فائدہ ہوگا؟ دو ڈھائی لاکھ کا ٹڈی دل لانے والا پندرہ ہزار کی فوج کو کیا خاطر میں لائے گا۔ وہ تو ہمارا مذاق اڑائے گا اور ہماری سفارت کو ہماری کمزوری پر محمول کرے گا۔"

صنداق ترک نے بھی سعد اللہ گوہر آئین سے اتفاق کیا۔ "جنگ کسی سفارت کے بغیر ہی ہونی چاہیے۔ ہمیں سفارت بھیج کر عیسائیوں کو اس خوش فہمی میں نہیں مبتلا کرنا چاہئے کہ ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے قیصر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔"

سلطان نے پیش امام کی طرف دیکھا "آپ کیا کہتے ہیں؟"

پیش امام نے جواب دیا "اتمام حجت کے لیے یہ سفارت ضروری ہے۔"

سلطان نے آہنی عزم ظاہر کیا "میں سفارت ضرور بھیجوں گا۔ تم سب جاسکتے ہو" اور حکم دیا "کاتب عماد کو میرے پاس بھیج دیا جائے۔"

پیش امام، سعد اللہ گوہر آئین، صنداق ترک اور ساوتگین سلطان کے خیمے سے نکل گئے۔ راستے میں سعد اللہ گوہر آئین نے کہا "یہ سلطان کو آخر ہو کیا گیا ہے؟"

پیش امام نے اسے منع کیا "سلطان سے اختلاف مت کرو، اس کی رائے ہم سب پر مقدم ہے۔"

ساوتگین نے بھی پیش امام سے اتفاق کیا "آپ درست فرماتے ہیں۔"

صنداق ترک نے کہا "ہم تعداد میں بہت کم ہیں اور اس سے ہمارا دشمن بھی واقف ہے۔ پھر جب سلطان کا وفد اس کی طرف صلح کا پیغام لے کر قیصر کے پاس جائے گا تو وہ اسے سلطان اور مسلمانوں کی کمزوری سمجھ کر شیر ہوجائے گا اور جواب میں ہمیں ذلیل بھی کرسکتا ہے۔"

سعد اللہ گوہر آئین نے اس سے اتفاق کیا "بالکل یہی ہوگا۔ ایسا ہی ہوگا۔"

ساوتگین خاموش رہا لیکن پیش امام نے ان دونوں کو پھر منع کیا "سلطان جو کچھ کر رہا ہے اسے کرنے دو، اس میں دخل مت دو۔"

یہ چاروں سلطان کے مہمانوں والے خیمے میں بیٹھ گئے اور سلطان کے دوبارہ بلانے کا انتظام کرنے لگے۔ اندر خیمے میں سلطان عماد کاتب سے لکھوا رہا تھا۔

"رومانوس دیوجینس قیصرِ قسطنطنیہ کو معلوم ہو کہ میں سلطان الپ ارسلان خلافتِ عباسیہ بغداد کا مجاز نمائندہ ہوں۔ میں تجھ سے جو بات کروں گا وہ خلافت کی بات سمجھی جائے گی۔ تو تعداد میں ہم سے پندرہ گناہ زیادہ ہے لیکن جنگی معارکوں میں ہم تجھ سے کہیں زیادہ نامور اور تجربے کار ہیں، اس لیے میرا یہ صائب مشورہ ہے کہ ہم سے صلح کرلے اور واپس چلا جا۔ بحالتِ صلح تم سب کو امان دی جائے گی اور ممالکِ روم میں کسی پر بھی دست اندازی نہیں کی جائے گی اور اگر جنگ مقصود ہو تو ہم بھی اس ارادے میں مستقل ہیں۔"

عماد کاتب نے اس مفہوم کو نہایت دلچسپ اور مؤثر انداز میں لکھ دیا۔

سلطان نے دوبارہ صرف ساوتگین کو طلب کیا اور اسے حکم دیا "ہمارا یہ خط قیصر کے پاس تو لے جائے گا۔ تو معاملہ فہمی اور مردم شناسی میں بے مثل ہے۔ جب قیصر اس خط کو پڑھے یا سنے گا تو تو اس کے چہرے پر بھی نظر رکھے گا اور دربار میں موجود دوسرے بادشاہوں اور فوجی سرداروں کو بھی دیکھے گا تو یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرے گا کہ وہ آپس میں کس حد تک متفق یا مختلف ہیں۔ کون قیصر کا دوست ہے اور کون اس کا حاسد، اگر تو یہ دیکھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ بھی سمجھ لے کہ تو اپنی قلت کے باوجود یہ جنگ جیت لے گا۔"

ساوتگین نے عرض کیا "میں کوشش کروں گا کہ سلطان کے مقصد اور خواہش پر پورا اتروں۔"

سلطان نے اس کے ساتھ پانچ آدمی اور کردیے۔ یہ سب کے سب ذہین اور مردم شناس تھے اور اپنی اس خوبی کا بارہا مظاہرہ کرچکے تھے۔

چھ آدمیوں کا یہ وفد قیصر کے پاس ملازگرد الزہرہ روانہ ہوگیا۔ نہر کے اس پار مسیحی لشکر اس طرح روپوش تھا کہ مسلمان اسے دیکھ نہیں سکتے تھے اور مسیحی مسلمانوں کو کسی طرح بھی اپنے حصار میں لے کر بے بس کرسکتے تھے۔

عیسائیوں نے چھ مسلمانوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہیں ہوشیاری سے اپنے حصار میں لے لیا اور پوچھا۔

کیا تم مسلمانوں کے جاسوس ہو؟

ساوتگین نے جواب دیا "ہم جاسوس نہیں سلطان کے سفیر

ہیں اور اس کی طرف سے امن و صلح کا پیغام لائے ہیں" عیسائیوں کو ہنسی آگئی "امن و صلح کا پیغام وہ کیوں؟ کیا تم مسلمان یہ سمجھتے ہو کہ ہم اپنے ملک اور وطن سے دو لاکھ کی تعداد میں سلطان کی امن و صلح کی پیشکش کی خاطر آئے ہیں؟"

ساوتگین نے جواب دیا "ہمارے سلطان کا مخاطب قیصر ہے' ہمیں اس کے پاس پہنچادو وہیں بات ہوجائے گی۔"

عیسائی آپس میں ہنس رہے تھے اور مسلمانوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔

ساوتگین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ انسانوں کے جنگل میں سفر کر رہا تھا۔ ہر طرف خیمے' ہر طرف انسان ایسے انسان جن کے گردنوں میں صلیبیں لٹکی ہوئی تھیں اور ان کے خیموں کے سامنے لکڑی کی صلیبیں ایستادہ تھیں۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کا شور ہر طرف بپا تھا۔

وہ خیموں کی درمیانی پگڈنڈیوں سے گزر کر قیصر کے شاندار خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں دربانوں کو بتایا گیا کہ مسلمانوں کا وفد قیصر سے بات کرنا چاہتا ہے۔

قیصر نے انہیں اپنے روبرو طلب کرلیا۔ وہ مسلمانوں کے اس وفد کو پرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ساوتگین اور اس کے ساتھیوں نے بھی قیصر کے دربار کا عمیق نظروں سے جائزہ لیا۔

قیصر نے انہیں اپنے روبرو طلب کرلیا۔ وہ مسلمانوں کے اس وفد کو پرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ساوتگین اور اس کے ساتھیوں نے بھی قیصر کے دربار کا عمیق نظروں سے جائزہ لیا۔

قیصر نے اپنے خدمت گاروں کو کوئی حکم دیا۔ وہ وہاں سے چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہی وہاں آنے والوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ انہی میں ناک کان سے محروم بادشاہ بھی شامل تھا۔ یہ سب قیصر کے سامنے اور دائیں بائیں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

قیصر نے ساوتگین سے سلطان کا خط مانگا جو اس کو دے دیا گیا۔

اسی عالم میں ناک کان سے محروم بادشاہ اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور قیصر سے پوچھا "یہ مسلمانوں کا وفد یہاں کیوں آیا ہے؟"

قیصر نے جواب دیا "امن و صلح کی بات کرنے مسلمان جنگ نہیں چاہتے۔"

بادشاہ نے پوچھا "کیا سلطان کی بات ہم نے مان لی ہے؟"

قیصر نے جواب دیا۔ "یہ فیصلہ میں تنہا نہیں کرسکتا۔ تم سب کو اسی لیے بلوایا گیا ہے۔"

وفد نے آنے والوں کو جاننے کی کوشش کی اور قیصر سے درخواست کی۔ "سلطان کے سفیر کی حیثیت سے ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم درباری حاضرین کا تعارف حاصل کریں۔"

قیصر نے رعونت سے جواب دیا۔ "ہم تمہیں اور تمہارے سلطان کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ تمہیں ان سے متعارف کرایا جائے۔"

بنی و گوش بریدہ بادشاہ' قیصر کو منع کر رہا تھا "ان سے کوئی بات نہ کی جائے' ان سے جنگ کی جائے صرف جنگ اور سلطان کو گرفتار کرکے میرے حوالے کردیا جائے۔ میں اس سے بدلہ لوں گا اور اس کے ناک کان کاٹ کر بغداد بھیجوں گا۔"

دربار کے حاضرین روسی بادشاہ پر ہنس رہے تھے۔ قیصر نے اسے حکم دیا "بیٹھ جا اور ہمیں ان سے بات کرنے دے۔"

بادشاہ اپنی جگہ بیٹھ تو گیا لیکن وہ چیخ چیخ کر قیصر اور مسلمانوں سے یہی کہہ رہا تھا کہ یہ جنگ ہوگی اور ضرور ہوگی۔

قیصر نے بادشاہ کو منع کیا کہ وہ زیادہ باتیں نہ کرے' خاموش رہے اور خود اسے بات کرنے دے لیکن زخم خوردہ باشاہ وفد کی طرف بڑھا اور ساوتگین کو دھکا دے کر وفد کے دوسرے ارکان پر گرادیا لیکن ساوتگین نے سنبھل کر اسے پکڑلیا اور اسے سمجھایا۔ "ہم سفیر ہیں اور سفیر سے ایسا سلوک روا نہیں۔"

بادشاہ نے اپنی ناک اور کان کی طرف اشارہ کیا "اور یہ جو تیرے سلطان نے ہمارے ساتھ کیا ہے؟"

ساوتگین نے جواب دیا "تو نے' ہم سے جنگ کی اور گرفتار ہوا' سلطان نے تجھے سزا دی پھر گلہ کس بات کا؟"

قیصر نے بادشاہ کو سختی سے منع کیا "تو اپنی بکواس بند کر اور ہمیں بات کرنے دے۔"

قیصر کا لہجہ روسی بادشاہ اور ایک شہزادے کو گراں گزرا زخمی بادشاہ اپنی جگہ واپس گیا اور قیصر کو متنبہ کیا۔ "قیصر کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میں بادشاہ ہوں اور اس جنگ میں اس کے حلیف کی حیثیت رکھتا ہوں' قیصر مجھے حکم نہیں دے سکتا۔"

ایک شہزادہ اینڈرونیکس بھی اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور قیصر کو آگاہ کیا "قیصر کو ہماری حیثیت معلوم ہونی چاہئے۔ ہم اپنی فوج کے ساتھ اس کے حلیف ہیں۔ وہ ہم پر حکم نہیں چلائے گا۔ قیصر کو اپنے سخت لہجے پر روسی بادشاہ سے معذرت کرنا چاہئے۔"

قیصر نے ان دونوں کی ذرا پروا نہ کی "اور تم دونوں کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میں جملہ عساکر کا سپہ سالارِ اعظم بھی ہوں اور اپنی اس برتری کی وجہ سے میں ہر کسی کو حکم بھی دے سکتا ہوں جس کو میری اس حیثیت سے انکار ہو وہ واپس جاسکتا ہے کیونکہ کسی کی کمی کی وجہ سے اس مقدس جنگ کے نتائج پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

شہزادہ منہ بنا کر بیٹھ گیا اور اعلان کردیا۔ "مجھ پر تیرا حکم نہیں چلے گا۔"

روسی بادشاہ نے بھی اعلان کیا "میں اپنے حصے کی جنگ لڑ چکا ہوں' اس لیے اب اس میں حصہ نہیں لوں گا۔"

قیصر کی پیشانی پر غصے اور نفرت کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اس نے ساوتگین اور وفد کے دوسرے ارکان سے کہا "تم اپنی کمزوری کو کس طرح چھپاؤ گے؟ تم نے یہاں آنے میں جلدی کی اور ہمیں دھمکی دے رہے ہو حالانکہ ایک ایسے ہی پیغام کے ساتھ ہمارا وفد سلطان کے پاس جانا چاہئے تھا۔"

ساوتگین اور دوسرے ارکان پورے دربار کا جائزہ لے رہے تھے۔ قیصر جیسے جذبات کسی اور چہرے پر نہیں پائے جاتے تھے۔

قیصر نے ساوتگین کو حکم دیا۔ "میں تجھ کو لکھ کر کوئی جواب نہیں دوں گا۔ تو خود لکھ لے' میں تیرے سلطان کو زبانی جواب دوں گا۔"

ساوتگین نے جواب دیا "زبانی جواب زبانی ہی پہنچادیا جائے گا۔ قیصر کا جواب ہم نہیں لکھیں گے۔"

قیصر نے وفد کے ہر رکن کو تنبیہہ کی۔ "دیکھو' تم سب میرا جواب ذہن نشین کرلو۔ اگر کوئی کچھ بھول جائے تو دوسرا یاد دلائے۔"

ساوتگین نے کہا "جواب دیں اور وقت نہ ضائع کریں۔"

قیصر نے کہا "اگر وحشی سلطان صلح کا خواہش مند ہے تو اپنی فوج کو نہتا کردے۔ پوری فوج کو ہماری نگرانی میں دے دیا جائے اور مسلمانوں کی فوج میرے حکم سے پیچھے ہٹ جائے اور موجودہ پڑاؤ ہمارے لئے خالی کردے۔ اپنا شہر اور اپنا محل ہمارے حوالے کردے۔ اس کے بغیر سلطان کی درخواستِ صلح پر غور بھی نہیں کیا جائے گا۔"

قیصر خاموش ہوگیا اور مسلمان اس کی طرف دیکھتے رہے کہ شاید وہ کچھ اور کہے۔

قیصر نے حالتِ اشتعال میں پاس رکھی ہوئی صلیب پر اپنا داہنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "روح القدس کی قسم' میں سلطان اور مسلمانوں سے وہ سلوک کروں گا کہ وہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔" اس کے بعد اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔ ان ذلیلوں کو دھکے دے کر دربار سے نکال دیا جائے۔"

خدمت گاروں نے مسلمانوں کو دھکیل دھکیل کر اور دھکے دے کر دربار سے انہیں باہر نکال دیا۔

قیصر کے اس سلوک کو شہزادہ اینڈرونیکس نے پسند نہیں کیا اور قیصر کو یاد دلایا۔ "مسلمان سفرا سے ہتک آمیز سلوک قیصر کو زیب نہیں دیتا۔"

لیکن روسی بادشاہ بہت خوش ہوا اور قیصر سے شکایت کی۔ اگر میں قیصر کی جگہ ہوتا تو ان سفرا کے ناک' کان کٹوا کے یہاں سے رخصت کرتا۔ پھر بھی ان سے جو سلوک کیا گیا میں اس سے بے حد خوش ہوں۔"

☆☆

ساوتگین اور وفد کے دوسرے ارکان نے سلطان کو اس ناشائستہ جواب سے مشتعل کردیا۔ وہ ساوتگین کو تخلیے میں لے گیا اور پوچھا "اور کیا دیکھا تو نے وہاں؟"

ساوتگین نے جواب دیا "ان کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں اتفاق نہیں ہے۔ یہ بادشاہوں اور شہزادوں کا اتحاد ہے اور اس اتحاد کا ہر بادشاہ اور شہزادہ اپنی انا کے حصار میں قید دوسروں کا احترام نہیں کرتا۔ وہ مسلمانوں کی طرح کسی ایک سلطان کے ماتحت نہیں ہیں' وہ ہم خیال اور ہم آراء بھی نہیں۔"

سلطان کو یہی باتیں وفد کے دوسرے ارکان نے بھی بتائیں۔

سعد اللہ گوہر آئین کو قیصر کے جواب نے دکھ پہنچایا۔ اس نے کہا "میں اس سفارت ہی کو پسند نہیں کرتا۔"

صنداق ترک نے کہا "جنگ ناگزیر ہے اور ہماری تعداد کم ہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔"

یہ جمعرات کا دن تھا۔ سلطان نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور کہا "میں جنگ میں تاخیر نہیں چاہتا۔ جنگ ابھی اور اسی وقت ہونا چاہیے۔"

سعد اللہ گوہر آئین نے کہا "سلطان محترم! اتنی جلدی نہ کریں۔"

اس موقع پر پیش امام نے اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ "جناب والا! کل جمعہ ہے جہاد کے لئے بہترین مناسب دن۔ نماز جمعہ کے بعد جنگ شروع کردینی چاہیے۔ نماز میں اللہ سے فتح و نصرت کی دعا مانگی جائے اور ہمیں یقین ہے کہ دعائیں ہماری سپر بن جائے گی اور ہم یہ جنگ جیت لیں گے۔"

سلطان کو پیش امام کا مشورہ پسند آیا۔ اس نے حکم دیا۔ "جنگ کے لیے تیار رہا جائے اور لوازمِ جنگ ہر وقت اختیار میں رہیں۔"

پورے لشکر میں سلطان کا حکم پہنچادیا گیا۔

آشوری اور شاعر اسماعیل اس ہنگامی اعلان سے خوفزدہ ہوگئے۔ شاعر کو سلطان کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ اس نے آشوری کو مشورہ دیا کہ یہاں سے بھاگ نکلو اور درباروں کا خیال دل سے نکال دو۔"

آشوری نے جواب دیا "میں نے سلطان کے لیے بڑا کام کیا ہے اس لیے میں کہیں اور نہیں جاؤں گا۔"

شاعر نے کہا "اور جب مسلمانوں کی شکست کے بعد ہم ان

کے اسیروں کے ساتھ اپنے دینی بھائیوں کے قید میں چلے جائیں گے پھر؟"

آشوری نے جواب دیا۔" پھر کیا۔ میں سلطان کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا کیونکہ یہ آئین وفاداری کے خلاف ہے۔"

اسی دوران سلطان کا بلاوا آگیا۔ سلطان نے آشوری کو طلب کرلیا تھا۔

شام ہورہی تھی۔ میدان میں جگہ جگہ نماز کے لیے صفیں کھڑی تھیں۔ عصر کا وقت تھا۔ ان میں سلطان بھی تھا۔

آشوری کو سلطان کے غلام نے خیمے کے باہر روک دیا اور اپنے پاس بٹھالیا۔ شاعر اسماعیل مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھ رہا تھا۔ آشوری کو صرف یہ پریشانی لاحق تھی کہ اسے سلطان نے کیوں بلایا ہے؟ وہ سلطان کے غلام سے معلوم کرنے لگا۔ "سلطان غصے میں تو نہیں ہے؟"

غلام نے جواب دیا" وہ فکر مند تو ہے مگر غصے میں نہیں ہے۔"

آشوری نے دوسرا سوال کیا" سلطان کے پاس میرے آنے سے پہلے کون تھا؟"

غلام نے جواب دیا" پیش امام اور ساوتگین۔"

آشوری نے اس کے جواب دینے میں بیزاری اور دباؤ محسوس کیا۔ شاید سلطان کا غلام آشوری سے باتیں کرتے ہوئے کسی خوف یا دباؤ کا شکار تھا۔

کچھ دیر بعد سلطان اپنے خیمے میں واپس آگیا۔ اس نے آشوری پر سرسری نظر ڈالی اور کہا" مغرب کی نماز باقی ہے تو ابھی جائے گا نہیں۔"

سلطان کے ساتھ جو سردار اور جنگجو تھے' آشوری ان میں صرف سعد اللہ گوہر آئین اور صنداق ترک سے واقف تھا' باقی کو نہیں جانتا تھا۔ سلطان ان سب کے ساتھ اپنے خیمے میں گیا اور کچھ دیر بعد ان ہی کے ساتھ باہر آگیا۔ میدان میں اسی جگہ مغرب کی نماز باجماعت پڑھی گئی۔ پیش امام نے امامت کی۔ آشوری نے مسلمانوں میں کوئی بے چینی یا کسی قسم کا ہیجان نہیں محسوس کیا۔

نماز کے بعد مسلمانوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان سب میں ایک خاص قسم کی بے قراری نظر آئی پیش امام دعا مانگ رہا تھا اور اس کے مقتدی با آواز بلند آمین کہہ رہے تھے۔ شاید وہ نصرانیوں پر غلبے کی دعا مانگ رہے تھے۔

نماز کے بعد سلطان انہی سرداروں کے ساتھ واپس آیا لیکن اس بار ساوتگین۔ سلطان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سلطان نے اشارے سے آشوری کو حکم دیا کہ وہ بھی خیمے میں آجائے۔

خیمے میں چاروں طرف شمع دان ایستادہ تھیں اور ان پر دس دس شمعیں روشن تھیں۔ ان چالیس شمعوں نے خیموں کو بقعہ نور بنادیا تھا۔

یہاں سلطان کی نشست گاہ ایک تخت تھا اور سرداروں اور جنگجو حضرات کے لیے تخت کے سامنے کرسیاں بچھادی گئی تھیں سلطان کے ہمراہی ان پر براجمان ہوگئے۔ آشوری کو ان پر بیٹھنے میں تامل تھا لیکن جب سلطان نے نہایت نرم اور مشفقانہ لہجے میں آشوری کو حکم دیا کہ اس کرسی پر تو بھی بیٹھ جا تو آشوری بھی بیٹھ گیا۔ آشوری کی کرسی سلطان کے قریب بالکل عین اس کے سامنے تھی۔ اس کے برابر بلکہ متصل ساوتگین کی کرسی تھی۔

سلطان نے اپنے سرداروں سے کہا" یہ آشوری ہنر مند قیصر کی عساکر میں کچھ دن رہ کر ہمارے پاس آیا ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں' تم لوگ اس گفتگو سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنا' کل کی جنگ انہی سوالوں اور جوابوں کے پیشِ نظر لڑی جائے گی۔"

ساوتگین آشوری میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔

سلطان نے آشوری کو اچانک مخاطب کیا" ہاں' تو اے آشوری ہنر مند! میں تجھ سے چند سوال کروں گا۔ اور تو ان کے سیدھے سچے جواب دے گا۔ امید ہے تو اپنے دینی بھائیوں کی وکالت یا طرف داری نہیں کرے گا۔"

آشوری نے جواب دیا" میں سچ بولوں گا اور کسی کی طرف داری بالکل نہیں کروں گا۔"

سلطان نے پوچھا" تو نے نصرانی عساکر میں کیا دیکھا اور وہاں کون کون سی بات قابلِ توجہ نظر آئی؟"

آشوری نے جواب دیا" سلطان محترم! وہاں سب کچھ تھا مگر آپس کا اتحاد نہیں تھا۔ ان کی سردار' بادشاہ اور شہزادے انا کا شکار ہیں' وہ قیصر کو اپنا سردار یا شہنشاہ ماننے کو تیار نہیں۔ نصرانی افواج میں یکجہتی یا اتحاد نہیں ہے اور دورانِ جنگ ان کی یہ پھوٹ اور انتشار ان کے حق میں برا اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔"

یہ وہی معلومات تھیں جو ساوتگین اور دوسرے ارکانِ وفد بیان کرچکے تھے۔

سلطان نے دریافت کیا" تو نے وہاں اور کیا دیکھا؟"

آشوری نے جواب دیا" میں نے ایک ایسی فوج دیکھی ہے جس میں نظم وضبط مفقود ہے اور میں نے ایسے سپاہیوں کا جمِ غفیر دیکھا ہے جو فنونِ حرب سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ جس میں جوش تو ہے لیکن نصب العین نہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں

جن کے وطن اور گھر یہاں سے دور ہیں' بہت دور' اس لیے ان کے دلوں میں خوف نہیں ہے اگر وہ ہار گئے تو ان کے شہر اور گھر ان سے چھین لیے جائیں گے' وہ اگر جیت جائیں گے تو اپنی جیت کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے کیونکہ یہ اسلام اور مسلمانوں کی سرزمین ہے' وہ یہاں سکون سے نہیں رہ سکیں گے۔ یہ باتیں وہ بھی جانتے ہیں۔"

سلطان کو آشوری کا تجزیہ اچھا لگ رہا تھا' پوچھا" اور.... اور؟ اس کے علاوہ؟"

آشوری نے جواب دیا" اس کے علاوہ یہ کہ ان کے پاس مسلمانوں جیسا سامانِ حرب بھی نہیں۔"

سلطان نے دریافت کیا" یعنی؟ یعنی؟"

آشوری نے جواب دیا" ان کے پاس منجنیقیں ہیں لیکن زیادہ خطرناک اور کار آمد صرف ایک ہے۔ اس میں آٹھ درجے ہیں جن میں بارہ سو سپاہی بیٹھ کر سنگ باری کرتے ہیں اور اس کو ایک سو بیل کھینچ کر ادھر ادھر لے جاتے ہیں' اگر کسی طرح اس منجنیق کو برباد کردیا جائے یا سو بیلوں کو بے کار کردیا جائے تو ان پر کاری ضرب لگ سکتی ہے۔"

سلطان نے ساوتگین سے کہا" اس کی باتیں غور سے سن اور مقابلے کے دوران ان پر عمل کرنے کی کوشش کر۔"

ساوتگین نے پوچھا" صرف میں یا دوسرے بھی؟ دوسرے بھی تو جنگ میں شریک ہوں گے۔"

سلطان نے جواب دیا" ہاں' لیکن وہ سپہ سالارِ عساکرِ اسلامی نہیں ہوں گے' ان سب کا سپہ سالار تو ہی ہوگا۔"

ساوتگین کے لیے یہ انکشاف بڑے اعزاز اور فخر کا باعث تھا' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پوچھا" سپہ سالارِ عساکرِ اسلامی وہ تو آپ ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا" میں سلطان ہوں۔ تو سپہ سالارِ افواجِ اسلامی۔" اس کے بعد دوبارہ آشوری سے مخاطب ہوا" اور تو کیا بتائے گا؟"

آشوری نے مزید بتایا" وہ بدعہد اور جھوٹے لوگ ہیں۔ ان کے جھوٹ اور بدعہدیاں ان کے چھوٹوں پر عیاں ہیں اس لیے ان کے چھوٹوں کے دلوں میں ان کی وہ عزت نہیں ہوگی جو اس قسم کے معرکوں میں فتح مندی کے لیے ضروری ہے۔"

سلطان نے مزید پوچھا" اور کچھ؟"

آشوری نے جواب دیا" اور یہ کہ انہیں معلوم نہیں کہ منفی سوچ' منفی فکر اور منفی اعمال اچھے نتائج کے حامل نہیں ہوسکتے۔"

سلطان نے اسے رخصت کردیا اور کہا" اب تو جاسکتا ہے اور ہمیں کل کی فکر لاحق ہے۔"

آشوری نے سلطان کو اتنا سنجیدہ اور فکر مند پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ خیمے میں داخل ہوا تو وہاں شاعر اسماعیل نہیں تھا۔ سلطان نے ساوتگین کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کے لیے جو احکام ضروری سمجھے صادر کرنا شروع کردے۔ اس کے بعد سلطان نے ساوتگین کی سپہ سالاری کا اعلان کردیا۔ اگر خواجہ حسن وہاں ہوتا تو یہ اعلا منصب اسے مل جاتا۔

صنداق ترک اور سعد اللہ گوہر آئین نے ساوتگین کو مبارک باد دی۔ اس کا دبلا پتلا منحنی مملوک اس کے ساتھ تھا۔

ساوتگین نے اس کے بارے میں پوچھا" یہ کون ہے؟"

گوہر آئین نے جواب دیا" میرا مملوک اس جنگ میں یہ بھی حصہ لے گا۔"

ساوتگین ہنسنے لگا" یہ مچھر تو جنگ کے طوفانی جھونکے میں کہیں نابود ہوجائے گا۔"

گوہر آئین نے جواب دیا" خواجہ حسن نے اس کا انتخاب کرلیا تھا اور یہ پیش گوئی کی تھی کہ قیصر کو یہی گرفتار کرے گا۔"

ساوتگین مسکرانے لگا" بے شک' جنگ کے طوفانی جھکڑ اس کو قیصر کی ناک تک لے جائیں گے اور پھر یہ مچھر اس کے نتھنے کی راہ سے دماغ تک پہنچ جائے گا اور نمرود کی طرح یہ مچھر قیصر کو عاجز و پریشان کردے گا۔"

منحنی مملوک نے عرض کیا" آپ بہادر سپہ سالار ہیں اس لیے آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ میرا یا کسی اور کا مذاق اڑائیں۔"

لوہاروں نے اپنا کام شروع کردیا۔ سائیس گھوڑوں کی مالش کرنے لگے' سپاہی اپنے جنگی ساز و سامان کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔ فوج کے خالی اطراف میں الاؤ روشن کردیے گئے۔

سلطان نے حکم دیا کہ اس کو پوری رات تنہا رہنے دیا جائے۔ وہ اس رات کسی سے بھی نہیں ملنا چاہتا تھا۔ وہ نصف شب کے بعد سجدے میں گر کر گڑگڑانے لگا۔ وہ بارگاہِ ایزدی میں ناک رگڑ کر التجا کر رہا تھا کہ اللہ اسے عیسائیوں کے عساکرِ گراں پر فتح دلوادے۔ وہ اپنے برے اعمال اور گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ وہ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں پر نادم اور شرم سار تھا۔ وہ اللہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ جنگ اپنے لیے نہیں اسلام اور مسلمانوں کے لیے لڑے گا۔ اس لیے اس میں سرخ رو فرما۔"

اس شب سلطان کو جس نے بھی دیکھا' اس کو سربسجود ہی دیکھا' اس نے پوری رات اس حال میں گزار دی۔ صبح فجر کی نماز میں وہ اپنے امراء اور سرداروں کے ساتھ پیش امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

نماز کے بعد سلطان نے پیش امام کو وہاں سے ہٹادیا اور اس کی جگہ خود بیٹھ گیا اور رو رو کر دعا مانگنے لگا۔" اے اللہ تو جانتا ہے

کہ میں جنگ اپنی ذات یا فتوحات کے لیے نہیں لڑ رہا' اس جنگ کی جو غایت ہمیں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کردیا جائے' تیرا اور تیرے محبوب کا نام مٹادیا جائے اگر تیری اعانت شاملِ حال رہی تو ہم دشمنوں کی اس ناپاک کوشش کو ناکام بنادیں گے ۔ اے اللہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی ذمے داری میرے سپرد کی گئی ہے تو مجھے اس کا اہل بھی بنا ۔"

سلطان رو رو کر دعائیں مانگ رہا تھا اور مقتدی آمین آمین کہہ کر بابِ اجابت وا کررہے تھے ۔

دعا کے بعد سلطان نے کسی سے بات نہیں کی اور خاموشی سے اپنے خیمے میں چلا گیا۔

ساوتگین نے تیاری کا حکم دے دیا اور فوج اسلحہ سے اپنے اعضاء کو سجانے لگی ۔

سعد اللہ گوہر آئین اور صنداق ترک کو میمنہ اور میسرہ پر روانہ کردیا گیا' خود قلب میں رہا لیکن جب سلطان کو اس ترتیب کا علم ہوا تو اس نے ساوتگین کو حکم دیا کہ وہ قلب کو سلطان کے لیے چھوڑ دے اور ساوتگین خود ہر جگہ آتا جاتا رہے کیونکہ وہ سپہ سالارِ اعلیٰ ہے اور اسے جنگ لڑوانا ہے ۔

سلطان نے آشوری اور شاعر اسماعیل کو بلوایا اور دونوں سے کہا "اگر تم دونوں یہاں سے جانا چاہو تو چلے جاؤ ۔"

آشوری نے کہا "سلطانِ محترم ! میرا جینا مرنا آپ کے ساتھ ہے ۔"

شاعر اسماعیل نے کہا "میں یہاں سے چلا تو جاتا لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میری قسمت جب ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ رہے گی تو اب میں یہیں رہنے کو ترجیح دوں گا ۔"

سلطان نے انہیں دعائیں دیں "تم دونوں ناصری ہو لیکن میرے بچوں کی طرح ہو ۔ اللہ تمہیں دولتِ ایمان سے بھی مالا مال کرے ۔"

ان دونوں کے بعد سلطان نے اپنے امراء اور فوجی سرداروں کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔

ان سب نے سلطان کو بے حد سنجیدہ اور فکر مند دیکھا ۔

سلطان نے ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اعلان کیا۔

"ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے ۔ میرے دوستو ! اس حقیقت اور امرِ ربی کو ہر وقت ذہن نشین رکھو ۔"

لوگوں نے بیک زبان عرض کیا "اس پر ہمارا ایمان ہے ۔"

سلطان نے مزید کہا "اور دوسری بات یہ کہ غرور سے بچو' تکبر صرف اللہ کو زیب دیتا ہے ۔"

گوہر آئین نے پوچھا "ہم غرور کیوں کریں گے ؟ کیا اپنی قلت پر ؟ "

سلطان نے جواب دیا "نہیں' بلکہ اپنی فتوحات پر جو اب تک حاصل کرتے رہے ہو ۔"

صنداق ترک نے عرض کیا "ہم غرور نہیں کرتے' اللہ ہم پر رحم فرمائے ۔"

سلطان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں "اور اگر میں مارا جاؤں۔ یعنی میں سلطان الپ ارسلان قتل کردیا جاؤں تو میرا بیٹا اور تم سب کا شہزادہ ملک شاہ میرا جانشین اور تم سب کا سلطان ہوگا۔ وہ اس جنگ اور جہاد کو جاری رکھے گا ۔"

سلطان کی آواز کا سوز سامعین کے دلوں میں اتر گیا۔ ان کے دل بھی بھر آئے ۔

گوہر آئین نے عرض کیا "اللہ سلطان کا سایہ ہم سب پر برقرار رکھے اور یہ فتح ہمیں سلطان کی معیت میں حاصل ہو۔"

ساوتگین نے وہاں شہزادے کو نہیں دیکھا' پوچھا "شہزادہ کہاں ہے ؟"

سلطان نے جواب دیا "نہر کے کنارے' وہ اپنے دشمن کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے ۔"

افسردہ اور رنجیدہ ماحول سب کی زبانوں کو ان کے فضول استعمال سے روکے ہوئے تھا۔

سلطان نے کہا "مجھ کو جو کہنا تھا' کہہ چکا' تم میں سے کسی کو کچھ کہنا ہو تو کہہ سکتا ہے ۔"

پیش امام نے گرمی کی شکایت کی "آج جتنی گرمی ہے کئی سال سے ایسی گرمی نہیں پڑی ۔"

سلطان نے جواب دیا "بے شک ! گرمی بہت زیادہ ہے اور یہ گرمی اللہ کی جانب سے ایک نعمت ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس سے ہم غیر معمولی فائدہ اٹھاسکتے ہیں ۔"

ساوتگین نے پوچھا "وہ کس طرح ؟"

سلطان نے جواب دیا "ہم اس گرمی کے عادی ہیں جبکہ ہمارے دشمن اس کے عادی نہیں ہیں اور وہ اس سے عاجز آجائیں گے ۔"

پیش امام نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ دوسروں نے اس کا جواب دیا تو فضا تھرا گئی ۔

سلطان نے ایک ایک کو اپنے گلے لگایا اور سب کے ساتھ سپاہیوں میں پہنچ گیا۔ وہاں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ وہ جمعہ کی نماز کے وقت تک سپاہیوں میں گھومتا پھرتا رہا اور ان کے جوش اور ولولے کو اپنی باتوں سے بڑھاتا رہا۔

اس روز سپہ سالار لشکر اسلام ساوتگین نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر جمعہ کی اذان دی ۔ یہ آواز دشمنوں نے بھی سنی ۔

آسمان پر چیل کوے پہلے سے آگئے تھے اور وہ ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے ۔

سلطان نے شہزادے کو نصف فوج یہ کہہ کر دے دی کہ وہ بعد میں نماز ادا کرے گا' اس وقت تک وہ لشکر اسلام کی پاسبانی کرے ۔

گوہر آئین کا منحنی مملوک سلطان کے برابر کھڑا ہوگیا۔ سلطان کے بالکل مقابل پیش امام تھا' وہ جمعہ کی نماز پڑھا رہا تھا۔ سلطان کی رقت نے اس کی لمبی داڑھی کو تربتر کردیا تھا۔ دوسرے نمازیوں کا بھی یہی حال تھا۔ خود پیش امام بھی رو رہا تھا۔

دوسری طرف مسیحی افواج بھی میدان میں اتر پڑیں اور قیصر ان کی صف بندی کرنے لگا۔

شہزادہ ملک شاہ چاق و چوبند ان پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔

سلطان کے بعد اس نے اور اس کی سپاہ نے نماز ادا کی ۔ اس موقع پر سلطان نے پوری فوج کو مخاطب کیا اور اس سے کہا۔

"دوستو ! آج اور اس وقت یہاں نہ کوئی سلطان ہے اور نہ کوئی اس کی رعایا یا ملازم ۔ یہاں ہم سب برابر ہیں ۔ تم لوگوں نے ہمیشہ میرا بہت ساتھ دیا اور اس وقت بھی میرے ساتھ کھڑے ہو لیکن تم یاد رکھو کہ میں کوئی ظالم و جابر سلطان نہیں ہوں ۔ میں تم سب کو یہ اجازت دیتا ہوں' اگر کوئی شخص یا سپاہی اس جنگ میں حصہ نہ لینا چاہے تو چلا جائے' میں اس سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ اس نے ہمارا ساتھ کیوں چھوڑ دیا... جو نہیں جانا چاہتا وہ یہیں ہمارے ساتھ رہے ۔ میں نے تو یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی آخری سانس تک نصاریٰ کا مقابلہ کروں گا ۔"

اس کے بعد فوج نے پوچھا "جنت یہاں سے کتنی دور ہے؟"

گوہر آئین نے جواب دیا "بہت نزدیک' بہت قریب ۔ جہاد کرو' اللہ کی راہ میں مارے جاؤ اور جنت میں داخل ہو جاؤ گویا ایک جست کا فاصلہ ہے ۔"

سلطان نے گوہر آئین کا شکریہ ادا کیا "اللہ تجھ کو جزائے خیر دے' تو نے بڑی سچی بات کہی ہے ۔"

ساوتگین کی نظریں اس منجنیق کو تلاش کررہی تھیں جس کے آٹھ درجوں میں بارہ سو سپاہی سنگ باری کے لیے تعینات تھے اور اس کو ایک سو بیل کھینچ رہے تھے۔

دوسری طرف قیصر نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو نہر کے پانی سے محروم کردیا جائے ۔ عیسائیوں کی فوج سامنے سے آگے بڑھی اور مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔ مسلمانوں نے بھی آگے بڑھ کر گرمجوشی سے استقبال کیا۔ عیسائیوں کے دوسرے لشکر نے مسلمانوں کی خالی جگہ پر کردی اور مسلمانوں کو پانی سے محروم کردیا۔ قیصر اپنی اس کامیابی پر مسکرایا اور اعلان کیا "یہ میری پہلی کامیابی ہے' اب میں ایک بڑا اور فیصلہ کن حملہ کرکے انہیں شکستِ فاش دے دوں گا ۔"

سلطان نے نمازِ جمعہ کے بعد اپنا لباس اتار دیا' اپنے عمامے کو پھاڑ دیا اور اس کی ایک پٹی سر پر باندھ لی اور فوج سے کہا۔ "یہ میرا کفن ہے ۔"

اس کے بعد سلطان نے احرام کی طرح چادر کو جسم پر لپیٹ لیا اور اس پر خوشبو چھڑک دی ۔

جو سلطان کررہا تھا وہی اس کے سپاہی کررہے تھے ۔ انہوں نے بھی سروں پر عماموں کو کفن میں بدل دیا اور کفن کو سر اور جسم سے لپیٹ کر خوشبو میں بسادیا ۔

ساوتگین نے مطلوبہ منجنیق کا پتا چلالیا تھا اور اس شہزادے کو دیکھ لیا تھا جس کی قیصر سے چل رہی تھی اور اس پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے منصوبے سوچ رہا تھا۔

سلطان نے ایک بار پھر اعلان کیا "اب نہ تو یہاں کوئی سلطان ہے اور نہ کوئی سلطان کا غلام اور ملازم.... ہم سب آج کے دن برابر ہیں ۔"

شہزادہ ملک شاہ سلطان کے عقب میں تھا کہ اس پر پیچھے سے حملہ نہ کردیا جائے ۔

سلطان نے حکم دیا کہ گھوڑوں کی دموں میں گرہیں لگادی جائیں ۔ سب سے پہلے سلطان نے اپنے گھوڑے کی دم میں گرہ لگائی پھر اپنی داڑھی میں گرہ لگادی ۔ سلطان کی داڑھی اس کی حرکات و سکنات میں مزاحم ہورہی تھی ۔

سلطان نے ساوتگین کے پاس جاکے اس کو حکم دیا "ہم اپنی

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات و احادیث طبع ہیں، اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جنگی حکمت عملی اور جوش وجذبے سے عیسائیوں کو شکست دے سکتے ہیں اس لیے اس کو نہایت ہوشیاری سے کام میں لا اور نصاریٰ کے کمزور حصوں پر ضرب لگا۔"

اچانک ہوا میں شدت کی حدت پیدا ہوگئی اور گرم ہوا کے جھونکے مسلمانوں کو جاں بلب کرنے لگے۔ مسلمانوں کا پیاس سے برا حال تھا لیکن نہر پر عیسائیوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔

کفن پوش مسلمانوں کے حلیے نے عیسائیوں کو پریشان کردیا۔ سلطان بھی عیسائیوں کی نظر میں تھا۔ انہوں نے سلطان کو زمین پر سربسجود دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ سلطان زمین کی مٹی اپنے چہرے پر مل رہا ہے۔ قیصر نے اپنے آدمیوں سے پوچھا "مسلمانوں نے یہ کس قسم کا لباس پہن رکھا ہے اور سلطان اوندھے منہ زمین پر کیوں گرگیا، اس کے علاوہ وہ اپنے چہرے پر مٹی کیوں مل رہا ہے؟"

مشرق اور مسلمانوں کے مزاج سے واقف ایک عیسائی نے کہا "سلطان اپنے اللہ سے فتحیابی کی دعائیں مانگ رہا ہے اور زمین کی خاک اپنے چہرے پر مل کر یہ عہد کررہا ہے کہ یا تو وہ اس خاک میں مل جائے گا یا پھر اس خاک میں وہ اپنے دشمن کو ملادے گا۔"

قیصر نے پوچھا "اور ان کا یہ عجیب وغریب لباس، پیشانی سے بندھی ہوئی پٹیاں، یہ کیا ہیں؟"

عیسائی نے جواب دیا "یہ ان کا کفن ہے ان سب نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ یا تو مرجائیں گے یا پھر دشمن کو کفن پہنادیں گے۔"

قیصر نے حیرت سے کہا "تو یہ اس طرح لڑتے ہیں... اس طرح جنگ کرتے ہیں!"

قیصر کے علاوہ جن عیسائیوں نے بھی یہ بات چیت سنی تھی، ان پر اس کا شدید نفسیاتی اثر پڑا۔ وہ مسلمانوں سے مرعوب ہوگئے۔

قیصر نے اپنی فوج کو حملے کا حکم دے دیا اور کہا "ان کو برباد کردیا جائے۔"

قیصر کے بائیں طرف شہزادہ اینڈریونیکس تھا۔ اس کو حکم دیا گیا کہ سلطان کے میمنہ کو ختم کردیا جائے۔

شہزادے کو اس میں اپنی بے عزتی محسوس ہوئی کہ قیصر نے اس کو اپنے بائیں جانب رکھا تھا اور اس پر قیصر کا کوئی حکم دینا اور بھی گراں گزرا۔ اس نے کہا "میں براہ راست مسلمانوں کا مقابلہ کیوں کروں۔ جس کو اس فتح کا سہرا اپنے سر باندھنا ہو وہ آگے جائے، ان کا مقابلہ کرے۔"

قیصر کو شہزادے کے جواب سے مطلع کیا گیا تو وہ بہت جزبز ہوا اور سختی سے حکم دیا "شہزادے کو میرا حکم ماننا چاہیے۔"

شہزادے نے مسلمانوں پر حملہ کردیا، لیکن گوہر آئین نے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ کفن پوش دیوانہ وار شہزادے کی صفوں میں داخل ہوگئے۔

ساوتگین نے اپنی منجنیقوں سے قیصر کی سب سے بڑی منجنیق کا نشانہ بنایا اور اس کی بیلوں کی کثیر تعداد کو ہلاک کردیا۔ اس حملے نے ان میں انتشار پیدا کردیا۔ ساوتگین نے اس منجنیق پر دھواں دھار حملہ کرکے اسے توڑ پھوڑ ڈالا۔

صنداق ترک قیصر کے داہنے بازو پر حملہ آور ہوگیا اور اس میں دور تک گھستا چلا گیا۔

قیصر کے بائیں بازو کا علم بردار زخمی ہوگیا اور اس کے ہاتھ سے جھنڈا چھوٹ کر زمین پر گرگیا۔ شہزادے نے اپنے پرچم کو غائب دیکھا تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ شاید اس کی فوج نے ہمت ہار دی اور فرار ہونے پر مائل ہے۔ اس نے اپنی جان کی فکر کی اور اپنے گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔

قیصر نے یہ منظر دیکھا تو چیخ کر پوچھا "شہزادے! یہ کیا کررہے ہو؟"

گوہر آئین نے دشمنوں کے پاؤں اکھڑتے دیکھے تو مسلمانوں کو حکم دیا "ان کو بھاگنے مت دو، قتل کردو یا گرفتار کرلو۔"

مسلمانوں نے خود کو ہلاکت میں ڈال دیا اور شہزادے کی صفوں میں داخل ہوکر مار کاٹ شروع کردی۔ گرم ہوا کے جھونکوں نے مسلمانوں کو بہت پریشان کررکھا تھا۔ سلطان الپ ارسلان نے اس عرصۂ دارو گیر اور جدال قتال میں گھوڑے سے اتر کر سر سجدے میں رکھ دیا اور ایک بار پھر گڑگڑایا۔

"الٰہ العالمین! میں اور میری فوج نصاریٰ سے جنگ کرسکتی ہے، اپنے سے بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرسکتی ہے لیکن تجھ سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تیز اور گرم ہواؤں کے جھکڑ جو تیرے حکم سے چل رہے ہیں، میں ان کا رخ نہیں پھیر سکتا۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تو ان کو حکم دے کہ یہ اپنا رخ بدل دیں اور نصاریٰ کی طرف چلنے لگیں۔"

سلطان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے۔ اس نے جیسے ہی سجدے سے سر اٹھایا، شدید گرم اور تیز ہوا کے جھونکوں نے اس کا منہ پھیر دیا۔ سلطان کو اپنے چہرے پر آگ کی لپٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے آسمان کی طرف شاکی نظروں سے دیکھا اور اپنا سر جھکالیا۔

لیکن ذرا دیر بعد ہواؤں کا رخ بدل گیا۔ اب یہ قیصر کی طرف چل رہی تھیں۔ سلطان کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ عیسائیوں نے اپنے چہروں پر تیز لُو کے جھونکے محسوس کیے تو

ان کا حال ہی کچھ اور ہوگیا۔ وہ جنگ بھول گئے اور گرمی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے۔ مسلمانوں نے انہیں دم چراتے دیکھا تو ان کے حملوں میں شدت پیدا ہوگئی۔

کئی گھنٹے بعد شہزادے نے راہِ فرار اختیار کی کیونکہ اس کی فوج نے گرم ہواؤں کے جھونکوں اور کفن پوش مسلمانوں کے حملوں کی تاب نہ لاکر بھاگنا شروع کردیا تھا۔ گوہر آئین اور اس کی سپاہ نے ان کو قتل کرنا شروع کردیا۔

ساوتگین نے عیسائیوں کی منجنیقوں... کو بیکار کردیا تھا۔ عیسائیوں کو مسلمانوں کی ایسی سرفروشی کا اندازہ نہیں تھا۔

ساوتگین نے شہزادہ ملک شاہ سے کہا "شہزادے! آپ گوہر آئین کی مدد کریں اور بھاگتے ہوئے مسیحی شہزادے کو گرفتار کرلیں۔"

شہزادہ برق رفتاری سے شہزادے کی طرف گیا اور اس کا پیچھا کیا۔ گرم ہواؤں کے تیز جھونکے قیصر پر حملہ آور ہوگئے اور وہ ان حملوں کی تاب نہ لاسکا۔ اس نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔ "یہ کب تک یوں ہی چلتے رہیں گے؟"

خدمت گار نے جواب دیا "شاید سارا دن شام تک۔"

قیصر کو پیاس ستانے لگی۔ اس نے پانی مانگا جو فوراً پیش کردیا گیا۔ وہ ہوا کے جھونکوں سے اپنے چہرے کو بچانا چاہتا تھا لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔

شہزادے کی فاش شکست نے مسلمانوں کو قیصر کی طرف متوجہ کردیا اور وہ قیصر پر حملہ آور ہوگئے۔

قیصر کو دوسرے مسیحی سرداروں اور سالاروں پر غصہ آرہا تھا کہ وہ اس کی مدد کو نہیں آرہے تھے۔ سلطان نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ قیصر کو شکست دے کر تم فتح حاصل کرسکتے ہو۔

ساوتگین بھی اس نکتے سے متفق تھا۔ عیسائیوں کا مرکزی جھنڈا اور صلیب قیصر کے ساتھ تھے اور وہ ہر طرف سے دیکھے جاسکتے تھے۔

گرمی اور لُو نے قیصر کو اس حد تک تنگ کیا کہ اس کا میدانِ جنگ میں ٹھہرنا دشوار ہوگیا۔ اس نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔ "مجھے میرے خیمے تک پہنچادو کیونکہ میں مزید گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔"

ایک سمجھدار خدمت گار نے عرض کیا "آپ کا اس وقت اپنے خیمے میں جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

قیصر نے جواب دیا "اگر میں کچھ دیر اور اس میدان میں رہا تو مرجاؤں گا۔ میں یہ گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔"

قیصر نے اپنے محافظ دستے کو حکم دیا "مجھے میرے خیمے تک بحفاظت پہنچادیا جائے۔"

قیصر اور اس کے محافظوں کے ساتھ مرکزی پرچم اور صلیب بھی حرکت میں آگئے اور قیصر کے خیمے کی طرف روانہ ہوگئے۔

مسیحی لشکر نے پرچم اور صلیب کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو انہیں اپنی شکست کا یقین ہوگیا اور انہوں نے ایک دم جنگ بند کردی اور میدان چھوڑ کر بھاگنا شروع کردیا۔

اس بھگدڑ میں قیصر کا دستہ بھی شامل تھا۔ مسلمانوں نے قیصر کا پیچھا کیا محافظوں نے قیصر کو بچانے کی کوشش کی اور ان میں بیشتر کام آگئے۔

قیصر کو اپنی غلطی کا احساس ہوچکا تھا اس نے بہ آوازِ بلند اعلان کرایا۔ "میں کہ قسطنطنیہ کا قیصر رومانوس جینس ہوں، اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ میری فوج کو شکست نہیں ہوئی اور میرا پرچم اور صلیب میرے ساتھ میرے خیمے تک جارہے ہیں جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔"

لیکن عیسائیوں کو اس پر یقین نہیں آیا وہ فرار ہوتے رہے۔

قیصر کی اپنی جان خطرے میں پڑگئی۔ اس نے بچے کھچے محافظوں کی پروا کیے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن مسلمانوں نے اس پر ہر طرف سے حملہ کردیا اور فرار کی راہیں مسدود کردیں۔ اس پر ہر طرف سے حملہ کردیا گیا بھاگنے بھی نہیں دیا۔ گوہر آئین قیصر کو نہیں پہچانتا تھا اس لیے قیصر اس کو ایک سپہ سالار سے زیادہ نہیں نظر آرہا تھا۔

کسی نے دور سے قیصر پر تیر اندازی کردی جس سے وہ زخمی ہوکر گھوڑے سے گرگیا۔ اس کے گرتے ہی فوج نے بھاگنا شروع کردیا۔

قیصر نے اپنے سپاہیوں کو روکنے کی کوشش کی "بھاگ کیوں رہے ہو؟ میں زخمی ہوں مجھے اٹھا کر خیمے تک پہنچادو۔"

لیکن اس کی کسی ایک نے بھی نہیں سنی اور وہ مسلسل بھاگتے ہی رہے۔

قیصر اپنی سپاہ سے مایوس ہوچکا تھا۔ اس نے ران میں پیوست تیر نکال کر پھینک دیا۔ تیر کے مثلث پھل نے قیصر کی ران کو پھاڑ ڈالا اور قیصر نے اس حال میں بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس سے بھاگا نہیں جارہا تھا۔ شہزادہ اینڈریونیکس اس کو اس برے حال میں دیکھ کر مسکراتا ہوا فرار ہوگیا۔

سعداللہ گوہر آئین کا مملوک اس عرصۂ محشر میں دونوں فریقوں کو حد درجہ مشغول دیکھ رہا تھا۔ ایک کو فرار ہوتے ہوئے دوسرے کو ان کا تعاقب کرتے ہوئے اور قتل کرتے ہوئے۔ اس نے قیصر کو تیر کھا کر گھوڑے سے گرتے اور مدد کے لیے چیختے چلاتے دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کوئی اس کی مدد

نہیں کررہا۔ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ قیصر ہے۔ وہ قیصر کو معمولی سپاہی سمجھ رہا تھا۔ چھوٹے قد اور نحیف و نزار بدصورت مملوک نے فیصلہ کرلیا کہ وہ بے کس و بے بس، مجبور اور لاچار زخمی کو گرفتار کرکے کچھ تو کارنامہ انجام دے گا۔ وہ قیصر کے سر پر پہنچ گیا اور اسے للکارا "کہاں بھاگتا ہے، تیرا دشمن تیرے سر پر آپہنچا اب فرار کی کوشش بے سود ہے۔"

قیصر نے اس بدہیئت اور مکروہ سپاہی کو دیکھا اور برا سا منہ بنا کر بھاگ جانے کی کوشش کی۔ مملوک شادی نے اس پر کمند پھینکی، اس کمند میں قیصر کا پاؤں پھنس گیا اور وہ زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ شادی نے اسے قابو میں کرکے باندھ دیا۔

کسی مسلمان نے شادی کو مشورہ دیا "اس زخمی کو کہاں لے جائے گا؟ اس کو قتل کرکے چھٹکارا حاصل کر۔"

یہ بات مملوک شادی کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اس نے قیصر کو قتل کرنا چاہا تو ایک عیسائی نے ایسا کرنے سے منع کردیا۔ اس نے کہا "ایک زخمی کو قتل کرکے تو کیا پائے گا، اس کو گرفتار کرلیا، تیرے لیے یہی بہت کافی ہے۔"

عیسائی نے مملوک شادی کو یہ نہیں بتایا کہ اس کا زخمی قیدی قیصر ہے اور خود قیصر بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا تعارف کرایا جائے۔ مملوک شادی، قیصر کو باندھ کر اپنے خیمے میں لے گیا۔ عیسائیوں کی بڑی تعداد قید کی جاچکی تھی۔ انتظامی سہولت کی خاطر قیصر کو مملوک شادی کے خیمے سے ایک ایسے خیمے میں پہنچادیا گیا جہاں دوسرے مسیحی بھی موجود تھے۔ ان لوگوں نے قیصر کا احترام کرنا چاہا مگر قیصر نے اشارے سے انہیں ایسا کرنے سے منع کردیا۔

مملوک شادی بھی اپنے قیدی سے ملا، قیصر اس کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا "اے بدہیئت انسان! میں زخمی ہوں اور یہاں مجھ پر فوری توجہ نہیں دی جائے گی کیا تو مجھ کو یہاں سے نکال نہیں سکتا؟ میں اپنی رہائی کا تجھ کو معقول معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔"

مملوک شادی قیصر کی زخمی ران پر جھک گیا، اس پر قیصر نے پٹی باندھ کر بہتا ہوا خون روک دیا تھا۔ اس نے قیصر سے ہمدردی کی "بیشک تو بہت زخمی ہے اور یہاں تجھ پر فوری توجہ بھی نہیں دی جائے گی اور یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ اگر کوئی قیدی یہاں سے نکال دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میں نے تیرا یہ حل سوچا ہے کہ تیری یہاں مرہم پٹی کردی جائے۔ میں رقم لے کر تجھ کو رہا نہیں کرسکتا۔"

دوسرے عیسائیوں نے قیصر کی سفارش کی "ہمارا یہ دینی بھائی بڑی پریشانی میں ہے تجھ کو اس کی بات مان لینی چاہیے اور رقم لے کر اس کو نکال دینا چاہیے۔"

قیصر نے بھی اصرار کیا "تو جتنی رقم چاہے مطالبہ کردے۔"

مملوک شادی نے جواب دیا "مجھ کو سوچنے دے۔ میں ابھی آیا۔"

باہر جاکر کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں مرہم پٹی کا سامان تھا وہ قیصر کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا "افسوس کہ میں سعداللہ گوہر آئین کا غلام ہوں اور اس کی سفارش پر مجھے فوج میں شامل کیا گیا ہے۔ اب میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتا۔"

قیصر اداس ہوگیا "تیری مرضی۔"

مملوک شادی وہاں سے چلا گیا لیکن مرہم پٹی کرنے کے بعد۔ دوسرے عام عیسائی قیدیوں کو قیصر کی اسیری کا دکھ تھا۔ انہوں نے قیصر کو تسلی دی اور وعدہ کیا "آج رات کو کوشش کرکے آپ کو یہاں نکال دیا جائے گا۔"

قیصر بہت اداس اور دل گرفتہ ہو رہا تھا۔ اس کو یقین نہیں تھا کہ اس کو رہا کردیا جائے گا۔ "کام آسان ہے مگر مجھ کو یقین نہیں کہ یہ بدصورت اور کمزور انسان ہماری بات مان جائے گا۔"

ایک عیسائی نے کہا "پوری رات ہمارے درمیان ہے اور مجھے یقین ہے کہ رات کے اندھیرے میں بات بن جائے گی۔"

جنگ ختم ہوچکی تھی۔ سلطان الپ ارسلان سجدے میں گرچکا تھا اور رو رو کر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ ساوتگین کو اس بات کا دکھ تھا کہ قیصر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ صنداق ترک اور گوہر آئین بھی سلطان کو یہی بتانے آئے تھے کہ قیصر کا کہیں پتا نہیں، وہ فرار ہوجانے میں کامیاب ہوچکا ہے۔

سلطان نے سجدے سے سر اٹھایا اور قیصر کے فرار ہوجانے پر تعجب کا اظہار کیا۔

شہزادہ ملک شاہ بھی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بتایا "مجھے انتہائی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ قیصر کو شہزادہ اینڈریونیکس نکال لے گیا جبکہ قیصر ران میں تیر لگ جانے کی وجہ سے اپنے گھوڑے سے گر گیا تھا۔"

سلطان نے پوچھا "اور یہ شہزادہ اینڈریونیکس فرار ہوکر کہاں گیا؟"

جواب دیا گیا "اوپر قفقاز کی طرف۔"

سلطان نے حکم دیا "ان کا تعاقب کیا جائے وہ زیادہ دور نہیں جاسکتے ہمارے آدمی اب بھی انہیں گرفتار کرسکتے ہیں۔"

سلطان نے فوجی دستہ ان کے دروازے میں روانہ کردیا۔

پھر سلطان ان خاص قیدیوں کو دیکھنے چلا گیا جو بادشاہ تھے، فوجی سردار تھے، بطریق تھے یعنی ہزاری فوجی سالار، شہزادے تھے اور قیصر کے مصاحب یا مشیر تھے۔ وہ قیدیوں سے قیصر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان میں فرینکوں کا بادشاہ بھی تھا۔ فرینکوں کا بادشاہ جس نے خلاط والوں سے بدعہدی کی تھی اور آشوری کو بہت زیادہ ذلیل وخوار کرکے رخصت کردیا تھا۔ سلطان کو یہ ساری باتیں معلوم ہوچکی تھیں۔

سلطان ان قیدیوں سے ملنا چاہتا تھا۔ صرف ان قیدیوں سے جو بادشاہ کے شہزادے بطریق یا سپہ سالار تھے۔ عام عیسائیوں سے نہیں۔

اس نے آشوری، گوہر آئین، ساوتگین اور صنداق ترک کو ساتھ لیا اور فرینکوں کے بادشاہ کے پاس گیا۔ اس کے ساتھ کئی بطریق اور فوجی سالار بھی تھے۔ رات ہوچکی تھی۔ ایک طویل وعریض خیمے میں ان سب کو رکھا گیا تھا۔ خیمے میں دو شمعیں روشن تھیں اور ان کی روشنی اتنی مدھم تھی کی سب کے چہرے زیادہ صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ یہاں زیادہ روشنی کی جائے۔ اس حکم پر فوری عمل کیا گیا۔

فرینکوں کا بادشاہ سلطان الپ ارسلان کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ ساوتگین نے قیدیوں کو سلطان کے بارے میں بتایا اور حکم دیا کہ سلطان کا احترام کیا جائے۔

سب بندھے ہوئے تھے اور اس حال میں نہیں تھے کہ سلطان کے ساتھ احترام سے پیش آتے۔ انہوں نے اپنی نظریں جھکالیں۔ فرینکوں کے بادشاہ نے نہایت ادب واحترام سے عرض کیا "ہم بندھے ہوئے ہیں اس لیے ہم تعظیماً جھک بھی نہیں سکتے۔"

سلطان نے کہا "صرف اس کو کھول دیا جائے"

فرینکوں کا بادشاہ رسیوں کی بندش سے نجات پاگیا اور وہ فوراً سلطان کے سامنے دو زانو بیٹھ کر سلطان کا احترام بجالایا۔

سلطان نے اس کے بال پکڑ لیے اور کئی بار سر ہلایا ....

"ان بالوں کے پیچھے وہ دماغ ہے جو بدعہدیاں کرتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے، تنگ نظر اور مغرور ہے۔"

فرینکوں کا بادشاہ شدتِ کرب سے منہ بنا رہا تھا۔

سلطان نے اس کے بال چھوڑ دیے اور اس کو خبردار کیا "تو نے خلاط کے مسلمانوں سے جو ظالمانہ اور سفاکانہ سلوک کیا تھا اس کا تجھ سے حساب لیا جائے گا۔"

فرینکوں کا بادشاہ اس سے منحرف ہوگیا کہ اس نے خلاط کے مسلمانوں سے کوئی ناروا سلوک بھی کیا تھا۔ اس نے ابھی آشوری کو نہیں دیکھا تھا۔

سلطان نے اس سے پوچھا "تو آشوری ہنرمند سے واقف ہے؟"

فرینکوں کا بادشاہ اپنے ذہن پر زور دینے لگا۔ آشوری ہنرمند، یہ کون ہے کہیں وہی تو نہیں خبطی سا، مخبوط الحواس؟

سلطان نے آشوری کو قریب بلایا اور بادشاہ سے کہا "اس کو دیکھ۔ کیا اس نے تیری طرف سے خلاط کے والی سے صلح نہیں کی تھی؟"

فرینکوں کا بادشاہ آشوری کو دیکھ کر گھبرا گیا "میں اس کو بس یونہی جانتا ہوں مگر یہ غلط ہے کہ میں نے اس کے توسط سے والیِ خلاط سے کوئی معاہدہ کیا تھا۔"

آشوری کو اتنے بڑے بادشاہ کی زبان سے اتنا بڑا جھوٹ بہت زیادہ شرم ناک لگا۔ اس نے سلطان سے کہا "میں اسے جھٹلاؤں۔ مجھے شرم آرہی ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ میں نے خلاط والوں سے جو بات کی تھی وہ اس بادشاہ کی طرف سے کی تھی اور اس نے اس پر عمل نہ کرکے مجھ کو جھوٹا کردیا اور خلاط میں مسلمان ناحق مارے گئے۔"

فرینکوں کا بادشاہ اپنے جھوٹ پر ڈھٹائی سے ڈٹا رہا "یہ جھوٹا اور خبطی ہے میرے اس قول کی تصدیق قیصر سے کی جاسکتی ہے۔"

قیصر کے ذکر سے سلطان اور اس کے ساتھی چوکنا ہوگئے۔ گوہر آئین نے پوچھا "مگر یہ قیصر ہے کہاں؟ اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا ہے۔"

قیصر کے ذکر نے دوسرے قیدیوں کو بھی ہوشمند اور ہوشیار کردیا۔ وہ سب اپنی پوری توجہ اور انہماک سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

فرینکوں کے بادشاہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا "قیصر کہاں چلا گیا یا قیصر کس حال میں ہے یہ میں نہیں جانتا، میں نے قیصر کو میدان چھوڑ کر بھاگتے ضرور دیکھا تھا۔"

سلطان نے کہا "ہم نے قیصر کی تلاش میں اپنے سپاہی روانہ کردیے ہیں۔ وہ کہاں تک بھاگے گا؟ وہ ہم سے بچ نہیں سکتا۔"

فرینکوں کے بادشاہ نے سلطان سے رحم کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ میری رہائی کے سلسلے میں میرے ذمے جو رقم یا مال وزر ہوگا میں اس کی ادائیگی کا پابند رہوں گا۔

سلطان نے اس کی رہائی سے انکار کردیا "تو رہا نہیں کیا جاسکتا۔"

اس کے بعد سلطان ان کو ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر

متنبہ اور خبردار کرتا رہا "تم تعداد میں ہم سے کس قدر زیادہ تھے لیکن پھر بھی ہار گئے اور ہماری قید میں بھی آگئے ۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تم آپس میں متحد نہیں تھے ۔"

سلطان نے دوسرے خیموں میں جاکے قیصر کو تلاش کیا' حناو تگین اور آشوری قیصر کو پہچانتے تھے 'ان دونوں نے قیصر کو ان قیدیوں میں نہیں دیکھا اور عام سپاہیوں میں یہ لوگ گئے نہیں ۔

گوہر آئین کا مملوک شادی اپنے زخمی قیدی کے پاس کئی بار گیا اور اس سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا اور جب بھی مملوک شادی اس خیمے سے نکلتا قیصر عام قیدی سپاہیوں کی خوشامد کرنے لگتا کہ مجھے دوسرے کے سامنے پہچاننا مت ' مجھے مخاطب بھی نہ کرنا' میری عزت بھی نہ کرنا ۔

رات کے پچھلے پہر مملوک شادی اپنے قیدی کے پاس گیا اور اس سے پوچھا "اگر میں تجھ کو چوری چھپے رہا کردوں تو اس رہائی کے عوض کیا دے گا ؟"

"پچاس ہزار دینار تک دے سکتا ہوں ۔"

مملوک شادی کے ہوش اڑ گئے' پوچھا "مگر ان پچاس ہزار دیناروں کو رکھوں گا کہاں ؟"

قیصر نے کہا "تو بھی میرے ساتھ چل میں تجھ کو یہ بھی بتادوں گا کہ تو میرے دیے ہوئے پچاس ہزار دیناروں کو رکھے گا کہاں ۔ میں وہ جگہ بھی فراہم کردوں گا ۔"

ایک دوسرے عام مسیحی قیدی نے کہا "تو اپنے اس قیدی کو رہا کرکے بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے اے کاش! تیری جگہ میں ہوتا ۔"

مملوک کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے آہستہ سے کہا "میں تجھ سے کماؤں گا ۔ میں تجھ کو چھوڑ دوں گا لیکن یہ پچاس ہزار دینار تو دے گا کہاں سے ؟"

قیصر نے جواب دیا "میں باہر نکلتے ہی پچاس ہزار دینار ادا کردوں گا ۔"

مملوک شادی نے قیصر کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا ۔ قیصر نے کہا "میں مسیحی قیدی یہ وعدہ کررہا ہوں کہ میں تجھ کو اس کے علاوہ بہت کچھ دے سکتا ہوں لیکن فی الحال یہاں دوسری باتیں نہیں ہوسکتیں ۔

مملوک شادی خیمے سے نکل کر سیدھا اپنے آقا گوہر آئین کے پاس پہنچا سعد اللہ گوہر آئین اس وقت سویا ہوا تھا مملوک نے اسے جگادیا اور قیصر سے ہونے والی باتوں کا ذکر کردیا "وہ تو کوئی خاص قیدی معلوم ہوتا ہے ۔ میں اس کی پیشکش سے گھبرا گیا ہوں ۔"

گوہر آئین بھی حیرت زدہ رہ گیا "اس نے پچاس ہزار دینار کی پیشکش کی ہے یہ ضرور کوئی شہزادہ یا بادشاہ ہوگا ۔ وہ کہاں ہے ؟"

مملوک شادی نے جواب دیا "میرے آقا! وہ عام قیدیوں کے ساتھ میرے خیمے کے قریب قید ہے ۔"

گوہر آئین کی نیند اڑ گئی اور کھڑا ہوگیا اور اپنے مملوک سے کہا "چل میرے ساتھ میں اس سے بات کروں گا اور بہت جلد معلوم کرلوں گا کہ وہ کون ہے ۔ وہ کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتا ۔"

جب یہ دونوں اس خیمے کے پاس پہنچے تو گوہر آئین نے غلام شادی کو مشورہ دیا کہ تو اس قیدی کو دوسروں سے الگ کرکے اپنے خیمے میں لے آ' یہ کہہ کرکہ تجھ کو جلد باہر کردیا جائے گا بس پچاس ہزار دینار کا جلد انتظام کردے ۔

غلام شادی قیصر کے پاس گیا اور اس کے کان میں یہ خوش خبری کہ میں نے تیری رہائی کا فیصلہ کرلیا ہے ۔ میرے میں چل اور پچاس ہزار دیناروں کا انتظام کردے میں تجھ کو باہر کردوں گا ۔ قیصر بہت خوش ہوا اور غلام شادی کو یقین دلایا کہ تو پچاس ہزار دیناروں کی فکر ہی نہ کر میں ان کا انتظام جلد از جلد کردوں گا ۔ غلام شادی قیصر کو اپنے خیمے میں لے گیا اور اس کے جاتے ہی سعد اللہ گوہر آئین عام قیدیوں کے خیمے میں داخل ہوا اور ان سے پوچھا "دیکھو' یہ میں جان چکا ہوں کہ تم لوگ اس قیدی کی حیثیت اور اہمیت سے اچھی طرح واقف ہو جو ابھی ابھی یہاں سے ہٹایا گیا ہے ۔ مجھ کو اس کے بارے میں بتاؤ ۔"

قیدیوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی "ہم اس کے بارے میں بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ کوئی مال و زر والی ہستی ہے ۔ بس اور کچھ نہیں ۔"

گوہر آئین نے شمع اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسے ایک مسیحی قیدی کے پاس لے گیا ۔ اس کے چہرے پر شمع کی روشنی ڈالی اور کہا "ہاں تو بتا کہ وہ کون ہے ؟"

اس قیدی نے نظریں چرائیں اور جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے' یہ سوال دوسروں سے کر ۔"

گوہر آئین نے شمع کی روشنی دوسرے قیدی کے چہرے پر ڈالی اور اس سے بھی یہی سوال کیا "بتا' وہ کون ہے ؟ میں جانتا ہوں کہ تو اس سے اچھی طرح واقف ہے ۔"

اس نے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے ۔"

گوہر آئین تیسرے قیدی کو دور کونے میں لے گیا اور شمع اس کے چہرے کے سامنے کردی ۔ پھر سرگوشی میں سوال کیا میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ تو اس قیدی کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اب مجھے بھی بتادے وہ کون ہے ؟"

اس تیسرے نے بھی جواب دیا "وہ کوئی دولت مند ہے جو قید کرلیا گیا ہے ۔"

گوہر آئین نے زور سے بآواز بلند کہا "تو سچا ہے تو درست کہتا ہے ۔ واہ وا کتنی ذرا سی بات یہ لوگ نہیں بتارہے تھے ۔" اس قیدی کو وہیں چھوڑ کر وہ چوتھے کو دوسرے کونے میں لے گیا اور شمع کی روشنی اس کے چہرے پر ڈال کر کہا "اس تیسرے نے سب کچھ بتادیا ہے' اب تو اس کی تصدیق کردے کہ کیا یہ صحیح ہے ؟"

اس چوتھے نے غصے سے پوچھا "تو اس غدار نے سب کچھ بتادیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا ۔"

گوہر آئین نے بڑے تحمل سے کہا "میں صرف تصدیق چاہتا ہوں اور کچھ نہیں' کیا وہ سچا ہے ؟"

اس چوتھے نے پوچھا "اس نے آپ کو کیا بتایا ہے' پہلے یہ تو بتائیں ؟"

گوہر آئین نے اسے جھڑک دیا "تو خوب جانتا ہے کہ اس نے مجھے کیا بتایا ہے ۔ تو صرف یہ بتادے کہ وہ اتنی بڑی بات بتانے میں کہاں تک سچا ہے ۔"

وہ پھر بڑبڑایا "اس نے غداری کی ہے جب ہم سب نے اپنی زبانیں بند کر رکھی ہیں تو وہ کیوں ڈر گیا ۔"

گوہر آئین نے اسے بھی چھوڑ دیا اور بآواز بلند بولا "تو بھی سچا ہے' تم دونوں سچے ہو' میں تم دونوں کا شکر گزار ہوں اور اس سچ کی وجہ سے تم دونوں رہا کردیئے جاؤ گے ۔"

اس کے بعد وہ پانچویں کے پاس گیا اور اس کو بھی الگ لے گیا اور شمع کی روشنی اس کے چہرے پر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا "ان دونوں کی طرح تو بھی رہائی حاصل کرسکتا ہے لیکن سچ بول کر ان دونوں نے اس قیدی کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے تو بھی واشگاف لہجے میں بتادے اور رہائی حاصل کرلے ۔"

پانچواں رونے لگا "تو ان دونوں نے قیصر کے بارے میں بتادیا شہنشاہ تو کتنا بدقسمت ہے کہ تیرے جاں نثار تیرے خلاف ہوگئے ہیں اور تیری شناخت کررہے ہیں' تیرا تعارف کرا رہے ہیں ۔"

اس انکشاف نے گوہر آئین کو لرزا دیا ۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تو وہ قیصر ہے جس کو ہم کل شام سے تلاش کررہے ہیں اور جس کی تلاش میں ہمارے سپاہی ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں ۔"

جن قیدیوں سے اب تک نہیں پوچھا گیا تھا ۔ حیرت اور خوف سے ان کے منہ کھل گئے ۔

گوہر آئین نے ان سب کو یکجا کردیا اور شمع کو کونے میں رکھی ہوئی شمع دان پر رکھ دیا اور سب کو مخاطب کیا "وہ قیصر ہے' ہم نے اسے پہچان لیا ہے ۔ تم سب نے اس کی شناخت کو مشکل بنادیا تھا لیکن ہم نے اسے پہچان لیا ۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس کئی ایسے آدمی موجود ہیں جو قیصر کو شناخت کرسکتے ہیں اور وہی اس کی تصدیق بھی کریں گے ۔"

قیدی رونے لگے ۔ وہ رو رہے تھے اور بین کررہے تھے "اے ہمارے شہنشاہ یہ کیا ہوگیا اب کیا ہوگا؟ ہم بے قصور ہیں' ہم نے تیرے خلاف زبان نہیں کھولی یسوع مسیح کی قسم' خداوند مسیح کی قسم اے روح القدس! تم گواہ رہو کہ ہم بے قصور ہیں ۔"

گوہر آئین اس خیمے سے نکل کر اپنے غلام شادی کے خیمے میں پہنچا' اس وقت وہ بہت خوش تھا اور وہ یہ خبر جلد از جلد سلطان کو پہنچانا چاہتا تھا ۔

مملوک شادی قیصر سے باتیں کررہا تھا "میرے پاس ہیرے جواہرات کے قیمتی ہار موجود ہیں' پچاس ہزار دینار نقد اور ہیرے جواہرات کے دو ہار میں اپنی رہائی کا یہ حقیر نذرانہ پیش کرسکتا ہوں ۔"

غلام شادی نے عرض کیا "جناب والا! پھر وہی مسئلہ زیر غور آگیا ۔ میں ان پچاس ہزار دیناروں کو رکھوں گا کہاں؟ اور اب یہ ہیرے جواہرات کے ہار میرے لیے مصیبت ہی بن جائیں گے ۔"

اسی وقت گوہر آئین خیمے میں داخل ہوا اور اپنے غلام سے

دو فائدے

اگر آپ جاسوسی ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل مراعات سے فائدہ اٹھائیں۔

۱۔ پرچے کی قیمت میں تین روپے کے اضافے کے باوجود ہم نے ابھی تک زرِ سالانہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے نئے خریداروں کو سابقہ زرِ سالانہ میں ہی پورا سال پرچا ملتا رہے گا۔

۲۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی نئی سلسلے وار کہانی "سرکش" کی اس ماہ تیسری قسط شائع ہورہی ہے۔ نئے خریداروں کو وہ دو شمارے جن میں پہلی اور دوسری قسط شائع ہوئی تھی اعزازی طور پر روانہ کیے جائیں گے۔

سالانہ خریدار بننے کا طریقہ اور زرِ سالانہ کی تفصیل اسی شمارے کے کسی صفحے پر پڑھیے

پوچھا" تیرے پاس خیمے میں کتنی شمعیں موجود ہوں گی؟"
مملوک شادی نے جواب دیا" یہی کوئی بارہ تیرہ۔"
گوہر آئین نے کہا" ان سب کو جلادے پھر میں بتاؤں گا کہ کیوں؟"
غلام نے ساری شمعیں روشن کردیں' جس سے وہاں کی ایک ایک چیز روشنی میں نہاگئی۔
گوہر آئین آہستہ آہستہ چل کر قیصر کے پاس پہنچا اور اپنے مملوک شادی سے کہا" شادی! کچھ جانتا ہے کہ تیرا خیمہ چراغاں کیوں ہے۔"
غلام نے نفی میں سر ہلایا" نہیں' میں نہیں جانتا۔"
گوہر آئین نے قیصر کی ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں میں لے لیا اور اس کا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کرلیا" تو تو نے شادی! ابھی تک ان بزرگوار کو نہیں پہچانا؟"
شادی نے جواب دیا" ہاں' میں نے ابھی تک اس کو نہیں پہچانا۔"
گوہر آئین نے قیصر سے پوچھا" تو اپنی رہائی اپنی آزادی کی کیا قیمت ادا کرے گا؟"
شادی نے جواب دیا" پچاس ہزار دینار نقد اور دو ہار ہیرے جواہرات کے۔"
گوہر آئین نے حیرت سے کہا" بس! یہ تو اس کی حیثیت سے بہت کم ہے۔"
قیصر نے گوہر آئین کی خوشامد کی" آپ کون ہیں' میں نہیں جانتا لیکن یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ کوئی معزز اور صاحب اختیار مسلمان ہیں۔"
گوہر آئین نے پوچھا" تو اپنی رہائی کی کیا قیمت ادا کرے گا؟
قیصر نے جواب دیا" میں تمہارا قیدی ہوں' کیا قیمت ادا کرسکتا ہوں؟"
گوہر آئین نے طنز کیا" پچاس ہزار دینار کوئی معمولی رقم ہے؟ اتنی بڑی رقم قیصر کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا؟"
قیصر کے دل ودماغ پر بجلی سی گری۔" یہ آپ قیصر کس کو کہہ رہے ہیں؟"
گوہر آئین نے جواب دیا" تجھ کو جو واقعی قیصر ہے۔"
قیصر نے انکار کیا" لیکن میں قیصر نہیں ہوں۔"
گوہر آئین نے کہا" تو قیصر ہے' تجھ کو تیرے آدمیوں نے پہچانا ہے' وہ کہہ رہے ہیں کہ تو قیصر ہے۔"
قیصر نے پھر انکار کیا" وہ کون ہیں جو مجھ کو پہچان رہے ہیں' کیا وہ مجھے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں؟"
گوہر آئین نے اپنے مملوک شادی کو حکم دیا" یہ قیصر ہے' تو اس کی نگرانی میں مستعدی اور ہوشیاری سے کام لے' ویسے میں یہاں اپنی طرف سے بھی پہرا بٹھادوں گا۔"
گوہر آئین نے وہاں پہرا بٹھادیا اور خود سلطان کے پاس چلا گیا۔ سلطان اپنے ان آدمیوں کا منتظر تھا جو قیصر کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ وہ اپنی کامیابی اور فتح مندی کے لیے اللہ کا شکر گزار تھا۔ وہ شکرانے کی نمازیں بھی پڑھ چکا تھا اور اب وہ ساوتگین اور صنداق سے باتیں کررہا تھا۔ وہ ان اسباب پر بحث کررہا تھا جن سے وہ کامیاب ہوگیا تھا اور کثرت پر نازاں مسیحی ناکام رہے تھے۔
جب گوہر آئین سلطان کے پاس پہنچا اور سلطان کو باتوں میں مشغول دیکھا تو وہ سلطان کو خوش خبری نہ سنا سکا جو وہ سنانا چاہتا تھا۔ گوہر آئین اپنی اس خوشی میں کسی اور کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سلطان سے درخواست کی کہ وہ سلطان کے ساتھ کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہے۔"
سلطان نے اسے سمجھایا کہ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح فوج کے ہر شخص نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کچھ دیر سلطان کے ساتھ تنہا رہنا چاہتا ہے تو وہ ان میں سے کسی کی خواہش پوری نہیں کرسکے گا۔
سلطان کو اس پر اعتراض ہوا اور گوہر آئین سے پوچھا" کیا بات ہے تو مجھ سے کس قسم کی باتیں تخلیے میں کرنا چاہتا ہے؟
گوہر آئین نے جواب دیا" میں آپ کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں اور وہ خوش خبری یہاں نہیں سنائی جاسکتی۔"
سلطان ایک عام مسلمان کی طرح اٹھ کر گوہر آئین کے پاس کھڑا ہوگیا" ہاں' تو وہ کیا خاص بات یا خوش خبری ہے جو تو مجھے سنانا یا دکھانا چاہتا ہے؟"
گوہر آئین نے جواب دیا" اس کے لیے آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔"
سلطان نے پوچھا" کہاں؟"
گوہر آئین نے جواب دیا" وہاں جہاں میں لے چلوں۔"
سلطان نے حاضرین کو رخصت کردیا" اب تم جاسکتے ہو لیکن جہاں بھی رہو ہوشیار رہو' شکست خوردہ دشمن کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔"
ساوتگین کو گوہر آئین کا رویہ ناگوار گزرا۔ وہ دوسروں کے ساتھ وہاں سے چلا تو گیا مگر بادل ناخواستہ وہاں سے نکلتے ہی صنداق ترک سے کہا" کیا گوہر آئین کو یہ نہیں معلوم کہ میں سلطان کا مقرر کردہ سپہ سالار افواج اسلامی ہوں؟"
صنداق نے جواب دیا" یہ بات کون نہیں جانتا' سب ہی جانتے ہیں۔"

ساوتگین نے پوچھا" پھر وہ کون سی خوش خبری ہے جو ہمارے سامنے نہیں سنائی جاسکتی؟"
سلطان اپنی جگہ بیٹھ گیا اور خالی خیمے کی طرف اشارہ کرکے کہا" اب یہاں کوئی بھی نہیں اب یہ بالکل خالی ہے' اب بتا وہ خوش خبری کیا ہے؟"
گوہر آئین ذرا الجھ سا گیا" اس خوش خبری کی لذت سے آپ اسی وقت لطف اندوز ہوسکیں گے جب میرے ساتھ آپ میرے مملوک شادی کے خیمے تک چلیں گے۔"
سلطان نے منہ بنایا" یہ عجیب سی شرط ہے' کچھ معلوم بھی تو ہو؟"
گوہر آئین نے تھک ہار کر بدرجہ مجبوری عرض کیا۔ میرے مملوک شادی نے جو مسیحی گرفتار کئے ہیں ان میں قیصر بھی ہے۔"
سلطان تڑپ سا گیا اور اپنے ہوش وحواس پر قابو پاتے ہوئے کہا" قیصر! اس کو کس نے گرفتار کیا؟"
گوہر آئین نے جواب دیا" اس کو میرے غلام شادی نے گرفتار کیا ہے اور وہ اس وقت بھی اس کی قید میں ہے۔"
سلطان کو ہنسی آگئی" اور یہ انتہائی اہم اور تہلکہ خیز خبر تجھ کو دی کس نے؟"
گوہر آئین نے عرض کیا" حضور والا! میری باتوں پر ہنسیں نہیں' آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔"
سلطان نے جواب دیا" دیکھ گوہر آئین! جو شخص عام عیسائیوں میں گرفتار ہوا ہو اور جس کو علی الاعلان گرفتار نہ کیا گیا ہو وہ قیصر نہیں ہوسکتا۔ کیا عام عیسائی قیدیوں نے اس کی تصدیق کردی ہے کہ وہ قیصر ہے؟"
گوہر آئین نے جواب دیا" ہاں' ان میں سے ایک نے اس کی تصدیق کردی ہے۔"
سلطان کو پھر ہنسی آگئی" سب نہیں صرف ایک نے اس کے قیصر ہونے کی تصدیق کردی ہے! اس نے تجھے بے وقوف بنایا ہوگا۔"
سلطان اس کے ساتھ قیصر کے پاس نہیں گیا" میں صبح تیرے ساتھ اس کے پاس جاسکتا ہوں' اس وقت نہیں۔"
گوہر آئین کے چلے آنے کے بعد قیصر نے اس کے غلام شادی سے کہا" میں نے تجھ سا بدنصیب اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔"
مملوک شادی واقعی پریشان ہوگیا۔ پوچھا" میں بدنصیب ہوں' وہ کس طرح؟"
غلام شادی نے دیکھا کہ قیدی نے اپنے لباس کے اندر سے دو ہار نکالے' ہیرے جواہرات سے مزین اور آراستہ ہار۔ اور کہا" یہ دونوں ہار اور پچاس ہزار دینار نقد' یہ تجھے مل رہے تھے مگر تو ان سے محروم ہوگیا۔"
مملوک شادی نے جواب دیا" بے شک' میں بدقسمت اور بزدل انسان ہوں' میں انہیں حاصل کرکے رکھوں گا کہاں؟"
قیصر نے اسے مشورہ دیا" تو مسلمانوں کے دربار سرکار سے نکل کر کہیں بھی جاسکتا ہے' کہیں بھی رہ سکتا ہے۔"
مملوک شادی نے باہر نکل کر دیکھا۔ یہاں گوہر آئین کے آدمی موجود تھے جو پہرا دے رہے تھے۔ اس نے اندر واپس آکر بتایا" اب اگر میں تجھ کو نکالنا بھی چاہوں تو نہیں نکال سکتا۔ باہر میرے آقا گوہر آئین نے اپنے آدمیوں کا پہرا بٹھادیا ہے۔"
قیصر ہمت نہیں ہارا' اس نے مشورہ دیا" تو چاہے تو ہمت سے کام لے کر پہرے داروں کو قتل کردے اور میرے ساتھ خود بھی نکل چل۔"
غلام شادی نے دونوں ہار قیصر سے نہیں لے اور خیمے سے نکل گیا۔ باہر موجود پہرے داروں سے کہا" دیکھو' صبح تک نہایت ہوشیاری سے پہرا دو' قیدی فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔"
رات بھر وہ خود بھی پہرا دیتا رہا۔ وہ پھر اندر نہیں گیا اور قیصر بے بس اور مجبور غلام شادی کا انتظار کرتا رہ گیا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد سلطان گوہر آئین کے ساتھ قیصر کے پاس آیا۔ سلطان کی تیز اور دل میں اتر جانے والی نظریں قیصر کے وجود میں اتری جارہی تھیں۔ قیصر ان نظروں کی تاب نہ لاسکا۔ سلطان نے قیصر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا" تو کون ہے' سچ سچ بتادے' تیرے آدمیوں نے تجھے قیصر بتایا ہے۔"
قیصر نے ہمت سے کام لیا اور جواب دیا" میرے جو آدمی آپ کے بقول اگر میرے ہیں اور مجھے قیصر قرار دے رہے ہیں انہیں میری شناخت کے لئے میرے سامنے لایا جائے۔"
سلطان نے گوہر آئین کی طرف دیکھا" گوہر آئین دو قیدی سپاہیوں کو لے آیا اور انہیں ڈانٹ کر حکم دیا" سچ سچ بتاؤ' یہ کون ہے؟"
دونوں نے سلطان کی طرف دیکھا اور جواب دیا" یہ ہمارا شہنشاہ قیصر ہے۔ شاہوں کا شاہ اور ہمارے دین کا محافظ ہے۔
سلطان کو کسی قدر یقین آگیا لیکن دل میں یہ شبہ بھی موجود تھا کہ کہیں گوہر آئین نے ان دونوں سے یہ بیان جبرانہ دلوادیا ہو۔ سلطان نے شانہ پکڑ کے قیصر کو ہلا دیا۔" دیکھ' اب تو مکر نہیں سکتا۔ قیدیوں میں شہزادے' بادشاہ اور فوجی سردار بھی ہیں' وہ سب تجھے پہچان لیں گے اس لئے تیرے حق میں یہی بہتر

ہے کہ اپنے بارے میں خود ہی سچ سچ بتادے ؟"
قیصر نے جواب دیا "میں جو ہوں' وہی رہوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ دوسرے میری گواہی دے دیں کہ میں کون ہوں۔"
سلطان نے گوہر آئین کو الگ لے جاکر حکم دیا "اس کی شناخت کے لئے بس دو آدمی کافی ہیں۔ آشوری ہنرمند اور شاعر اسماعیل۔ ان دونوں کو میرے خیمے میں لے آ' اس کو بھی وہیں لے چل۔"

سلطان یہ حکم دے کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ اس قیدی کی شناخت کے لیے بہت بے چین تھا۔ قیصر کو اس کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔"

سلطان بے چینی کے عالم میں خیمے میں ٹہل رہا تھا۔ کسی کسی لمحے رک کر قیصر کی طرف دیکھتا اور پھر ٹہلنے لگتا۔ قیصر کو شہزادوں اور بادشاہوں پر یقین تھا کہ وہ قیصر کو نہیں پہچانیں گے اور اس کو بچالیں گے لیکن جب کچھ دیر بعد سلطان کے خیمے میں آشوری اور شاعر اسماعیل داخل ہوئے تو قیصر کی ہمت جواب دے گئی۔"
سلطان نے ان دونوں کو پکڑ لیا۔ خود دونوں کے بیچ میں آگیا اور اس کے دونوں ہاتھ دونوں کے کاندھوں پر پہنچ گئے اور کہا۔ "اس قیدی کو پہچانو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں اس سے اچھی طرح واقف ہو۔"
آشوری اور شاعر اسماعیل نے اس کو پہلی نظر میں پہچان لیا کیونکہ دونوں اسے بہت قریب سے دیکھ بھی چکے تھے اور باتیں بھی کرچکے تھے۔ قیصر بھی ان دونوں کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس خبطی اور مخبوط الحواس جوان کو اس کی پہچان کے لئے اس کے سامنے لایا جائے گا۔ وہ اس خطرناک گواہ کو اپنے دربار میں قتل کرسکتا تھا۔
سلطان نے ان دونوں سے کہا "اسے پہچانو اور بتاؤ یہ کون ہے ؟"

آشوری نے آگے بڑھ کر قیصر کی تعظیم کی "شاہوں کے شاہ، قسطنطنیہ کے قیصر! آج میں آپ کو کس حال میں دیکھ رہا ہوں۔"
شاعر اسماعیل نے بھی تصدیق کردی "افسوس کہ ہمارا قیصر بھی گرفتار کرلیا گیا۔"
قیصر نے آنکھیں بند کرلیں اور سر جھکا لیا۔
سلطان نے قیصر کو حکم دیا "اگر تجھے اپنے پہچانے جانے کا دکھ ہے تو لیٹ جا مگر اب تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔"
قیصر کی شناخت سے ایک تہلکہ مچ گیا' سلطان کا خوشی اور غم و غصے سے حال ہی کچھ اور ہوگیا۔ اس نے آشوری سے کہا۔ آشوری ہنرمند! میں نہیں جانتا تھا کہ تو اس حد تک ہمارے کام آئے گا اور شاعر اسماعیل تو بھی۔ میں تیرا بھی شکر گزار ہوں۔"
قیصر خاموش تھا گویا اس کی قوتِ گویائی سلب ہوچکی تھی۔
سلطان نے اس کی گدی پر اپنی لات رکھ دی۔ "تو نے مکرنے کی کوشش کی لیکن میرے آدمیوں نے تجھے پہچان لیا۔"
قیصر نے جواب دیا "یہ آدمی آپ کے نہیں' میرے ہیں۔ میرے اپنے دینی بھائی۔ میں ان سے کوئی کام نہیں لے سکا اور آپ نے ان سے کام لے لیا۔"
سلطان نے گوہر آئین کو اشارے سے حکم دیا کہ وہ خیمے کی دیوار سے لٹکا ہوا کوڑا اتار لائے۔
گوہر آئین نے حکم کی تعمیل کی اور کوڑا اتار کر سلطان کے حوالے کردیا۔
سلطان نے آہستہ آہستہ دو کوڑے رسید کردیے "تو سچ بول سکتا تھا' تو اقرار کرسکتا تھا لیکن تو نے ایسا نہیں کیا۔"
قیصر نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا اپنی قسمت کے تابع رہ کر۔ میں چاہتا تو اپنے دونوں مضبوط' پختہ اور یقینی گواہوں کو قتل کرچکا ہوتا مگر میں نے اس آشوری کو خبطی اور مخبوط الحواس قرار دے کر اپنے دربار سے نکال دیا تھا اور یہ شاعر مجھے اس لیے پسند نہیں آیا کہ یہ مشرقی ہے اور باتیں مبالغہ آمیز کرتا ہے۔"
سلطان کو قیصر پر بہت غصہ آرہا تھا۔ اس نے قیصر کو اس کے حال پر چھوڑا اور اپنے تخت پر جا بیٹھا اور گوہر آئین کو حکم دیا "قیصر کو کہہ دے کہ میرے تخت کو بوسہ دے۔"
گوہر آئین نے قیصر کو سمجھایا "یہ سلطانی دستور ہے کہ زیر ہونے والے فرماں روا تخت سلطانی کو بوسہ دیتے ہیں۔ آپ کو بھی یہ رسم انجام دینا ہوگی۔"
قیصر آہستہ آہستہ سلطانی تخت کی طرف بڑھا۔ ذلت کے شدید احساس سے اس کا دل بھر آیا' دماغ کی نسیں پھٹی جارہی تھیں' آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
سلطان نے حکم دیا "جہاں موجود ہے وہیں کھڑا رہ۔"
قیصر سیدھا ہوکر کھڑا ہوگیا۔
سلطان نے پوچھا "کیا تو بتا سکتا ہے کہ تو نے یہ برا دن کیوں دیکھا؟"
قیصر نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا "ہاں' بتا سکتا ہوں اور اس سوال کا جواب مجھ سے بہتر کوئی دوسرا دے بھی نہیں سکتا۔"
سلطان نے پوچھا "بتا' تو نے یہ شرمناک اور ذلت آمیز دن کیوں دیکھا؟"
قیصر نے جواب دیا "اپنی بدقسمتی کے سبب۔ میری اقبال مندی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔"

سلطان نے سختی سے تردید کردی "نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تیری طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا' تو نے رعونت سے جھٹک دیا۔ میں تجھ سے نرمی اور عاجزی سے مخاطب ہوا' تو نے اس کا جواب رعونت اور تکبر سے دیا۔ تو مردم شناس بھی نہیں' جن فوجی سرداروں اور سالاروں پر تو نے بھروسا کیا وہ تجھے میدانِ جنگ میں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔" اس کے بعد اس نے آشوری اور اسماعیل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دونوں تیرے پاس خلوص لے کر گئے مگر تو نے انہیں نہیں پہچانا۔ یہ آشوری ہنرمند جس کو تو نے خبطی اور مخبوط الحواس قرار دے کر رخصت کردیا تھا اس سے میں نے وہ کام لیا کہ تیری منجنیقیں اور دبابے بیکار کردیے گئے۔"
قیصر نے جواب دیا "ان سب کے پیچھے میری بدقسمتی کارفرما تھی۔"

سلطان نے سختی سے تردید کردی "بدقسمتی اسے نہیں کہتے۔ بدقسمتی تو وہ شے ہے جو انسان کی اعلیٰ تدابیر اور اس کے عاقلانہ فیصلوں کو ناکامی اور مایوسی میں تبدیل کردیتی ہے۔ تو نے جو کچھ بویا تھا وہ فصل تیار ہوگئی ہے اب تو وہ فصل کاٹنے پر مجبور ہے۔"
قیصر نے درخواست کی "اے سلطان والا نشان! اب اور ذلیل نہ کریں اور میرے لیے جو سزا مقرر ہو اس سے مجھے نواز دیا جائے۔"

قیصر نے پوچھا "تیرا کیا خیال ہے' میں تیرے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟"

قیصر نے جواب دیا "معلوم نہیں۔ ممکن ہے' آپ مجھے قتل کردیں اور اگر زندہ رکھیں تو اسلامی حدود میں ایک قیدی کی طرح گشت کرائیں اور مجھے ذلیل کریں کہ قسطنطنیہ کا قیصر آپ کا معمولی قیدی ہے۔"
سلطان تخت سے نیچے آگیا "بے شک' میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی سلوک کرتا' بلکہ اس سے بدتر سلوک بھی کرسکتا تھا مگر میں یہ سلوک نہیں کروں گا۔"
قیصر سلطان کو اپنے روبرو کھڑا دیکھ کر لرز گیا' وہ رحم طلب نظروں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔
سلطان نے مصافحہ کی خاطر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا "تو قیصر تھا اور قیصر ہے۔ میں تجھ سے تیرا اعزاز نہیں چھین سکتا۔"
قیصر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ سلطان سے ہاتھ ملائے یا نہ ملائے۔ کہیں سلطان اسے مزید خوار کرنے کے لیے کوئی چال تو نہیں چل رہا۔
سلطان نے اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ کو حرکت دی "اپنا ہاتھ بڑھا' سوچ کیا رہا ہے ؟"

سلطان نے تذبذب و بے یقینی کی کیفیت سے اپنا ہاتھ سلطان کی طرف بڑھا دیا۔ سلطان نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ "اس کو قسمت کہتے ہیں۔ تو اپنے بقول' اپنی دانست میں اس عزت افزائی اور سلوک کا مستحق نہیں تھا مگر قسمت نے تجھے اس سے نواز دیا۔ اسے کہتے ہیں خوش قسمتی تو قیصر تھا' قیصر ہے اور قیصر رہے گا۔"

قیصر کو اپنے ساتھ اس حسن سلوک کی توقع نہیں تھی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔
سلطان نے قرآنی آیت پڑھی جس کا مطلب تھا اللہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔ اس کے بعد سلطان قیصر کو اپنے ساتھ تخت پر لے گیا اور اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا "تو یہاں میرے ساتھ بیٹھ' تو میرا بھائی ہے۔"
اس کے بعد ساوتگین' صنداق ترک' شہزادہ ملک شاہ اور دوسرے امراء اور سرداروں کو بلوا کے قیصر کا ان سے تعارف کرایا گیا۔

یہ لوگ قیصر میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ ایک ایسے مسیحی کے سامنے موجود تھے جو مغربی دنیا سے مسیحی قوت کے عساکر لے کر اس لیے آیا تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کردیا جائے اور اسلام کی جگہ مسیحیت کو فروغ دیا جائے۔
سلطان نے مملوک شادی کو دربار میں طلب کیا اور اسے انعام و کرام سے نوازا۔ سلطان اور قیصر کو مملوک شادی کے بارے میں بتایا گیا کہ جب خواجہ حسن کے سامنے اس پست قامت اور بدہیت شخص کو سپاہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تو اس نے اس کو فوج میں شامل کرنے سے انکار کردیا تھا لیکن جب گوہر آئین نے اس کی شمولیت پر اصرار کیا تھا تو خواجہ حسن نے اسے فوج میں شامل کرلیا تھا مگر طنز سے یہ کہتے ہوئے کہ اس کو فوج میں شامل کرلیا جائے' شاید یہی قیصر کو گرفتار کرلے۔
خواجہ حسن کا مزاق درست ثابت ہوچکا تھا۔
قیصر نے مملوک شادی کی تعریف کی "میں نے اپنی رہائی کے لیے اسے پچاس ہزار دینار کی پیش کش کی تھی لیکن اس نے میری پیش کش ٹھکرا دی تھی۔
گوہر آئین اپنے غلام کی تعریف سن کر بہت خوش ہوا۔
سلطان نے قیصر سے پوچھا "کیا تو ان اسباب سے واقف ہے جس نے تجھ کو ناکام کردیا؟"
قیصر نے جواب دیا "صرف اس وجہ سے کہ میں جب گرم ہواؤں سے بچنے کے لیے اپنے خیمے کی طرف واپس جارہا تھا تو میرے ساتھ میرا علم اور صلیب بھی واپس ہوئے اور میری

فوج کو اس سے میری شکست کا یقین ہوگیا۔ وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی اور میں اپنے گھوڑے سے زخمی ہوکر گر گیا اور بھاگتے ہوئے اس بدہیت کی کمند میں پھنس کر گرفتار ہوگیا۔"

سلطان نے جواب دیا "نہیں، تیری شکست اس طرح نہیں ہوئی، تیرے ساتھی اور حلیف چاہتے تو جنگ جاری رکھتے لیکن انہوں نے بھی تیرا ساتھ چھوڑ دیا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تم لوگ دل سے متحد اور متفق نہیں تھے۔ تمہارے سامنے کوئی بڑا نصب العین نہیں تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کو ختم کردینا، یہ کوئی نصب العین نہیں اور اگر یہ نصب العین تھا تو یہ دلوں میں جوش اور گرمی پیدا نہیں کرسکتا تھا۔"

قیصر نے سرد آہ بھری "اب تو میں ایک ناکام حملہ آور ہوں اور آپ کامیاب اور فاتح۔ آپ جو کچھ کہیں گے وہ درست اور سچ اور میں جو کچھ کہوں گا وہ نادرست اور جھوٹ۔"

سلطان نے قیصر کی آواز سے نقاہت اور تکان محسوس کی۔ اس نے قیصر کو آرام کا مشورہ دیا اور کہا "بقیہ باتیں دو چار دن کے بعد کروں گا، اب تو آرام کر۔"

قیصر کو آراستہ اور پر آرائش خیمہ دے دیا گیا۔

قیصر کے جانے کے بعد سلطان کو مبارک باد دینے والوں نے حاضریاں دینا شروع کردیں۔

مسلمان سپاہی قیصر کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ سلطان کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ قیصر کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کیا جائے جس سے وہ اپنی ذلت اور تحقیر محسوس کرے۔ اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا "میں عنقریب قیصر کے ساتھ فوج کا معائنہ کروں گا۔ بس اس وقت تم لوگ قیصر کو دیکھ لوگے۔"

سلطان کو اپنی زندگی میں شاید پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک طاقتور ترین سلطان ہے۔ وہ اپنے سرداروں کے ساتھ نہایت شان اور آن بان سے پیش آیا۔ اس نے گوہر آئین کو یقین دلایا "یہ معجزاتی فتح میری اقبال مندی کی دلیل ہے۔ میں اپنے عہد کا ایک غیر معمولی فاتح ہوں۔"

گوہر آئین نے تائید کی "بے شک، میں اس کی گواہی دوں گا۔"

سلطان نے قیصر کو کئی دن آرام کرنے دیا۔ وہ اس دوران سلطان سے کئی بار ملا لیکن باتیں نہیں ہوئیں۔ ایک ہفتہ بعد سلطان نے قیصر کو دعوت دی کہ وہ اس کے اسلامی لشکر کا معائنہ کرے۔

قیصر کو کب اس سے انکار تھا۔ سلطان نے اس سے کہا "ہم دونوں اپنے اپنے لباسوں میں نکلیں گے۔"

قیصر نے سلطان کی خواہش پر اپنا قیصری لباس زیب تن کیا اور سینے پر داہنی طرف صلیب کا نشان چسپاں کیا اور دونوں فاتح اور مفتوح اسلامی لشکر کے معائنے کو نکل کھڑے ہوئے۔

سلطان اپنے مشکی رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا اور قیصر اپنے ابلق گھوڑے پر۔ ان کے پیچھے سلاتگین، گوہر آئین، صنداق ترک اور دوسرے سردار تھے۔

شہزادہ ملک شاہ سلطان کے ہمراہ تھا اور سلطان شہزادے کو بڑی اہمیت دے رہا تھا۔

قیصر اس کم سن شہزادے کو بار بار غور سے دیکھ رہا تھا۔ سلطان نے قیصر کے تجسس پر اس کو شہزادے کے بارے میں بتایا۔ "اگر میں یہ جنگ ہار جاتا اور اس میں بذاتِ خود قتل کردیا جاتا تو میرا شہزادہ ملک شاہ میرا جانشین قرار پاتا۔ اور یہ تجھ سے میری شکست کا بدلہ لیتا۔"

قیصر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کم سن شہزادہ اتنے عظیم الشان سلطان کا صحیح جانشین ثابت ہوتا اور یہ کہ یہ ناتجربے کار شہزادہ ناکام سلطان کا عیسائیوں سے انتقام بھی لیتا۔

فوج میں اعلان کردیا گیا کہ سلطان اپنے ناکام اور شکست خوردہ حریف قسطنطنیہ کے قیصر کے ساتھ فوج کا معائنہ کرے گا اور اس لئے فوجی مستعد اور چاق و چوبند رہیں۔

اس اعلان نے فوج میں زندگی کی روح پھونک دی اور وہ اپنی اپنی جگہ مستعد اور چوکس موجود رہے۔ سلطان نے سب سے پہلے وہ ساز و سامان دکھایا جس کی تیاری میں ہنرمند آشوری نے شب و روز ایک کردیے تھے۔

منجنیقیں اور دبابے۔ قیصر کو بڑی حیرت تھی۔ اس نے حیرت سے پوچھا "یہ ساری چیزیں بیٹھے اور مخبوط الحواس جوان نے تیار کی ہیں جس کو میں نے پاگل اور فاترالعقل سمجھ کر اپنے دربار سے نکلوا دیا تھا؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں، ان میں کی کچھ تو اس نے بنائی ہیں اور کچھ اپنی نگرانی میں تیار کرائی ہیں۔ وہ بلاشبہ ایک استاد اور ماہر و مشاق ہنرمند ہے۔"

قیصر نے متاسفانہ لہجے میں کہا "افسوس کہ میں اس کو نہیں پہچان سکا۔"

سلطان نے جواب دیا "ایک اس کو کیا تو کسی کو بھی نہیں پہچان سکا۔"

مسلمان سپاہی قیصر کو پرشوق نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ قیصر کو سلطان اور مسلمانوں کی سادگی پر حیرت تھی۔ سلطان کے ہاں وہ تکلفات

نہیں تھے جو قیصر کے نزدیک رعب اور دبدبے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

اتنے میں ایک سپاہی آگے بڑھا اور قیصر پر حملہ آور ہوگیا لیکن گوہر آئین نے اسے راستے میں پکڑ لیا اور اپنے خدمت گاروں کے حوالے کردیا۔

قیصر سہم گیا اور سلطان غضب ناک ہوگیا۔ اس نے گوہر آئین کو حکم دیا "اس سے پوچھا جائے کہ اس نے یہ ناشائستہ حرکت کیوں کی؟"

گوہر آئین گرفتار سپاہی کے پاس چلا گیا۔

ایک فوجی سردار نے قیصر کو ملامت کی۔ "اسلام اور مسلمانوں کے دشمن، آج تو اس عزت اور سلوک کا مستحق نہیں تھا۔"

سلطان نے فوجی سردار کو منع کیا کہ وہ اس قسم کی باتیں نہ کرے۔

ایک خیمہ دوز قیصر کو دیکھ کر رونے لگا۔ سلطان نے اس کے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے سلطان کو بتایا "میں خلاط کا رہنے والا ہوں۔ اس کی فوج نے میرے پورے خاندان کو ہلاک کر ڈالا۔"

سلطان نے جواب دیا "خلاط والوں سے فرنگیوں کے بادشاہ نے بد عہدی کی اس کا خلاط سے کوئی تعلق نہیں۔"

گوہر آئین واپس آیا اور اس نے بتایا کہ اس سپاہی کا پورا خاندان خلاط میں قتل کردیا گیا یہ مغلوب الغضب سپاہی اس کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

سلطان نے قیصر سے کہا "تیرے ساتھیوں نے مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے ہیں ان کے باقیات تجھ سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔"

قیصر کو اپنی جان کا خوف تھا۔ اس نے سلطان سے درخواست کی "آپ مجھے یہیں سے واپس لے چلیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اچانک کہیں قتل نہ کردیا جاؤں۔"

سلطان نے ہمت بندھائی "ایسا نہیں ہوگا، میں تیرے ساتھ ہوں۔ تیرے ساتھ دھوکا نہیں کیا جائے گا۔"

سلطان نے اسے اپنی فوج میں بڑی تیزی سے گھمایا پھرایا اور اس کے بعد اپنے ہنرمندوں میں لے گیا حدادوں اور خیمہ دوزوں میں۔ ان میں معمار بھی، تانبے اور پیتل کے برتن بنانے والے بھی۔ یہ بڑے بڑے ماہر اور چابک دست لوگ تھے۔

یہیں قیصر کی ملاقات آشوری سے بھی ہوئی۔ آشوری چوبی چیزیں تیار کر رہا تھا۔ وہ خود اس وقت آری سے ایک موٹا تا

سالانہ خریدار بننے کے فائدے

اگر آپ کو سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ یا ماہنامہ پاکیزہ بروقت نہیں ملتا یا غیر ممالک میں بہت مہنگا ملتا ہے تو آپ سالانہ خریدار کیوں نہیں بن جاتے، سالانہ خریدار بننا بہت آسان ہے۔ آپ مطلوبہ رقم کا بینک ڈرافٹ پاکستانی روپے یا امریکی ڈالر میں ہمیں ارسال کردیں۔ پرچے آپ کو گھر بیٹھے بذریعہ رجسٹری ائر میل ملتے رہیں گے۔ زرِ سالانہ یہ ہے:

۱۔ برائے پاکستان۔ ۲۶۰/- روپے

۲۔ ایران، عراق، اُردن، عمان، قطر، یمن، سعودی عرب، کویت، ترکی، سری لنکا، انڈیا، بنگلہ دیش، متحدہ عرب امارات۔ ۵۰۰/- روپے

۳۔ برطانیہ و تمام یورپی ممالک اور تمام افریقی ممالک، ہانگ کانگ، جاپان، سنگاپور، چین، تھائی لینڈ اور فار ایسٹ۔ ۵۵۰/- روپے

۴۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، امریکا، کینیڈا اور جنوبی امریکا کے تمام ممالک اور جزائر۔ ۶۰۰/- روپے

جولائی ۱۹۹۰ء سے عام شماروں کی قیمت میں اضافے کے باوجود سالانہ چندے میں کوئی اضافہ نہیں کیا جارہا ہے اس لیے سالانہ خریدار بننے میں آپ کو مالی بچت بھی ہوگی اور سہولت بھی۔ تینوں رسائل کے لیے ڈرافٹ درج ذیل نام پر بنوائیں

JASOOSI DIGEST KARACHI

اس کے علاوہ اگر آپ کسی اور ملک کے بارے معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں خط لکھیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

پوسٹ بکس ۲۲۹، ۲۱ رمضان چیمبر آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ۷۴۲۰۰

کاٹ رہا تھا۔ سلطان نے اس سے پوچھا "اے آشوری ہنرمند! یہ تو کیا کر رہا ہے؟ یہ ادنا کام تو کسی ادنا مزدور سے بھی لے سکتا تھا۔"

آشوری نے جواب دیا "بے شک، میں یہ معمولی کام کسی مزدور سے بھی لے سکتا تھا لیکن میں نے اپنی سستی اور تکبر پر قابو پانے کے لیے یہ کام کیا ہے۔"

سلطان نے کہا "کوئی ایسا کام جو دوسرے بھی کر سکیں، تجھے نہیں کرنا چاہیے تو وہ کام کر جو تیرے علاوہ کوئی اور نہ کر سکے۔"

قیصر نے آشوری سے شکایت کی "تو نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ تو اتنے بہت سے کام کر سکتا ہے؟"

آشوری نے جواب دیا "میں آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتا تھا مگر آپ نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔"

سلطان نے آشوری سے پوچھا کہ اگر اب تجھ کو قیصر کے حوالے کر دیا جائے تو کیا تو جانا پسند کرے گا"

آشوری نے بے جھجک جواب دیا "لیکن اب میں یہاں سے کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"

قیصر ابھی تک پر امید نہیں تھا کہ اسے رہا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سلطان سے درخواست کی کہ آپ ایسے سوالات اور پیش کش نہ کریں کہ میرا دل دکھے۔ میں آپ کا قیدی ہوں اور جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھ کو قطعی قتل کر دیا جائے گا پھر ایسے سوالات کر کے کیوں میرا دل دکھایا جائے؟"

سلطان اس کا جواب ٹال گیا کیونکہ وہ اس قسم کا کوئی پیشگی وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہاں شاعر اسماعیل بھی موجود تھا۔ قیصر اس کو غور سے دیکھتا رہا "میں تجھ سے بھی کہیں مل چکا ہوں۔"

شاعر اسماعیل مسکرانے لگا "میں کچھ دن آپ کی فوج میں رہ چکا ہوں۔"

قیصر نے سلطان سے شکایتاً پوچھا "یہ شخص بھی میری فوج میں رہ چکا ہے، کہیں یہ لوگ وہاں جاسوسی کرنے کو تو نہیں گئے تھے؟"

سلطان نے جواب دیا "مجھ کو جاسوسی کی نہیں، جواں مردوں کی ضرورت تھی اور الحمد اللہ، یہ لوگ میری فوج میں موجود تھے۔"

سلطان نے شہزادہ ملک شاہ کو اپنے قریب بلایا اور قیصر سے کہا "یہ میرا بیٹا شہزادہ ملک شاہ ہے اور یہ میرا ولی عہد بھی ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں لیکن یہ جنگ میں میرے ایک عام سپاہی کی طرح پیش پیش رہتا ہے۔"

قیصر اس [illegible]ل اور ان باتوں سے خاصا متاثر ہوا اور اس نے اعتراف کیا "ہم میں یہ خصوصیات نہیں ہیں۔"

اس طرح گھومتے پھرتے ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ سلطان نے اپنے آدمیوں کی امامت کی اور نماز کے بعد اس نے اپنے امراء اور سرداروں کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس دربار میں قیصر بھی موجود تھا، آشوری ہنرمند اور شاعر اسماعیل بھی۔

قیصر کو دربار کے انداز سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔

اس نے گوہر آئین سے درخواست کی "آپ سلطان سے یہ معلوم کریں کہ یہاں کیا ہونے والا ہے؟"

گوہر آئین نے جواب دیا "آج یہاں آپ پر مقدمہ چلے گا۔ سلطان آپ پر مقدمہ چلائے گا۔"

قیصر نے کہا "لیکن سلطان تو مجھ پر مہربان ہے، اس نے تو اس کا کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔"

گوہر آئین نے جواب دیا "سلطان آپ کو کب تک مہمان بنا کے رکھے گا؟"

سلطان نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے گوہر آئین کو منع کیا کہ وہ قیصر سے باتیں نہ کرے اور کچھ دیر بعد قیصر کو اپنے قریب بلایا۔

سلطان نے اس موقع پر اپنے وزیر خواجہ حسن کو یاد کیا۔ "افسوس، خواجہ حسن بزرگ یہاں موجود ہوتے تو میرا کام آسان ہو جاتا۔"

قیصر نے دریافت کیا "کیا یہ درست ہے کہ آج مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا؟"

سلطان نے جواب دیا "ہاں، آج تجھ پر مقدمہ چلے گا۔ میں تیری صحت یابی کا انتظار کر رہا تھا اور اب تو صحت یاب ہو چکا ہے۔"

قیصر کو کچھ اور ہی اندیشے تھے۔ پوچھا "کیا خلاط کی بربادی کا الزام بھی میرے ہی سر ہے؟"

سلطان نے جواب دیا "نہیں، میں خلاط کے معاملے میں فرنگیوں کے بادشاہ پر مقدمہ چلاؤں گا۔"

دربار کا سماں ہی عجیب اور پریشان کن تھا۔ لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ سلطان نے فقیہہ ابو نصر پیش امام کو اپنے داہنی طرف بٹھا لیا۔ شہزادہ ملک شاہ سلطان کے متصل بیٹھ گیا۔

سلطان نے برہمی کا اظہار کیا اور بہ آواز بلند پوچھا "حماد کاتب کہاں رہ گیا؟ اس کو جلد حاضر کیا جائے۔"

لیکن حماد کاتب کو بلوانا نہیں پڑا، وہ اسی وقت دربار میں حاضر ہوا اور سلطان اور حاضرین کو سلام کرتا ہوا سلطان کے قریب پہنچ گیا۔

سلطان نے چیں بہ جبیں تیوروں سے حماد کاتب کو مخاطب کیا "یہ تو کہاں رہ گیا تھا؟"

حماد کاتب نے صفائی پیش کی "جہادیوں کا ایک وفد سلطان سے

ملاقات کرنا چاہتا ہے اور آشوری ہنرمند بذات خود بہ نفس نفیس انہیں سلطان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔"

سلطان نے پوچھا "آشوری ہنرمند کہاں ہے اور یہ جہادی کون ہیں؟"

حماد کاتب نے جواب دیا "آشوری بارگاہ سلطانی میں حاضر ہے اور یہ جہادی وہ لوگ ہیں جو منبج میں قیصر اور اس کی افواج کے داخلے کے بعد آس پاس سے آ آ کر عیسائیوں پر حملے کرتے تھے اور انہیں نقصان پہنچا رہے تھے۔"

سلطان نے اپنے ذہن پر زور دیا "ہاں، مجھے یاد آیا۔ یہ حلب اور اس کے نواح کے پرجوش لوگ جو بعد میں جہادی کہلائے، حملہ آور عیسائیوں سے خوب جنگ کر رہے تھے۔"

حماد کاتب نے عرض کیا "یہ وہی لوگ ہیں جو واقعی عیسائیوں سے نبرد آزما تھے، یہ بہت بہادر لوگ ہیں اور سلطان کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔"

سلطان نے حکم دیا "آشوری ہنرمند دربار میں آ سکتا ہے لیکن جہادیوں کو فی الحال باہر رکھا جائے۔ انہیں قیصر کے مقدمے کے بعد بلایا جائے گا۔"

ایک خدمت گار باہر گیا اور آشوری ہنرمند کو اپنے ساتھ دربار میں لے آیا۔ سلطان نے اس کو گوہر آئین کے برابر جگہ دی۔

سلطان نے اپنی داڑھی میں اس روز دو گرہیں لگا رکھی تھیں۔ اس نے حاضرین دربار کو سرسری نظروں سے دیکھ کر قیصر کی طرف دیکھا اور پیش امام کو حکم دیا کہ وہ بہ آواز بلند سب کو یہ بتا دے کہ اس وقت دربار میں کس قسم کی کارروائی ہونے والی ہے۔

پیش امام نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر مختصر سی تقریر کی "حاضرین دربار اور اراکین حکومت! جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ [illegible] دنیا کے حکمراں مسیحی جن میں روس، فرینک، بالڈیا اور دوسرے کئی ملکوں کے بادشاہ اور شہزادے اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ باز [illegible] فرمانروا قیصر کی سرداری اور زیر فرمان رہ کر اپنے لاکھوں سپاہیوں کے ساتھ ہم پر یعنی مسلمانوں اور اسلام پر حملہ آور ہوئے تھے، ان کی پوری کوشش اور جملہ تدابیر کا ماحصل یہ تھا کہ ہمیں برباد کر دیا جائے، اسلام کو خاک میں ملا دیا جائے اور پھر آخر میں ہمیں بھی تباہ و برباد کر دیا جائے۔"

قیصر نے پیش امام سے پوچھا "یہ ساری باتیں آپ کو کس نے بتائیں اور یہ آپ ہم پر بے سروپا اور بے بنیاد الزام کیوں لگا رہے ہیں؟"

سلطان نے قیصر کو منع کیا کہ پیش امام جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کو کہنے دیا جائے۔ قیصر کو بولنے اور صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا

جائے گا، اس لیے پریشان نہ ہو اور ہمیں بھی پریشان نہ کرے۔

قیصر چپ ہو گیا اور پیش امام نے اپنی تقریر جاری رکھی "پھر عیسائیوں نے مسلمانوں کو بے گناہ قتل کیا، ان کی نسلوں کو برباد کیا۔"

سلطان نے پیش امام کو اشارہ کیا کہ وہ سلطان کے منہ کے پاس اپنا کان لائے۔

پیش امام، سلطان کے روبرو جھک گیا اور اپنا داہنا کان سلطان کے منہ کے سامنے کر دیا۔

سلطان نے کہا "جو کچھ ہوا، ہو چکا، اس کو بیان کرنے میں طول نہ دیں۔ آپ صرف اعلان کر دیں کہ آج قیصر سے چند فیصلہ کن باتیں کی جائیں گی۔"

پیش امام نے کھڑے ہو کر حسب منشائے سلطان اعلان کر دیا۔ "آج جو جس نے کیا ہے اس کا حساب کتاب ہو جائے گا۔ مفتوحین کے ساتھ شایان شان اور ان کے اعمال اور افکار کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔"

سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے پیش امام کو بٹھا دیا اور قیصر کو بالکل پاس بٹھا لیا۔

سلطان نے قیصر سے کہا "اب میں رے واپس جانا چاہتا ہوں، تو نے جو کچھ کیا اور جو تیرے عزائم تھے، ان سے ہم دونوں واقف ہیں۔ اب ہم دونوں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تو کیا چاہتا تھا اور میں کیا چاہتا ہوں۔"

قیصر بو[illegible] "آپ مجھ سے پوچھیں، میں جواب دوں گا۔"

سلطان نے پوچھا "بتا، میں تیرے ساتھ کیا [illegible] کروں گا؟"

قیصر نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا ہے، آپ اس کے مواخذے میں مجھے قتل کرا دیں گے، اگر ایسا نہیں کریں گے تو مجھے ذلیل و خوار کرنے کے لیے بلادِ اسلامیہ میں گھمائیں پھرائیں گے اور میری زیادہ سے زیادہ تشہیر کریں گے اور آپ کے سابقہ چند روزہ سلوک کے پیشِ نظر اس بات کا بھی امکان ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔"

سلطان نے شہزادہ ملک شاہ کی طرف دیکھا جو یہ ساری باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

سلطان کے چہرے سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کرنے والا ہے۔

سلطان نے اچانک قیصر سے سوال کر دیا "اور اگر تو فاتح ہوتا اور میں مفتوح اور میں تیرے سامنے قیدی بنا کے پیش کیا جاتا تو تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتا؟"

قیصر نے سلطان کو تیز اور عمیق نظروں سے دیکھا "آپ مجھ سے یہی توقع کریں گے کہ میں وہی جواب دوں گا جو میرے دل میں تھا۔"

"بے شک" قیصر نے جواب دیا "میں وہی جاننا چاہتا ہوں جو جنگ کے پہلے تیرے دل میں تھا۔"

قیصر نے جواب دیا "اگر میں فاتح ہوتا اور آپ مفتوح میرے قیدی تو میں آپ کو ذلیل اور اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کوڑوں سے پٹواتا' آپ کی خوب مرمت کراتا۔"

قیصر کا جواب جس نے بھی سنا خوفزدہ اور پریشان ہو گیا۔ قیصر خود بھی پریشان نظر آرہا تھا۔

سلطان نے اپنے غصے اور جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی مگر پھر بھی اشتعال اس کے جواب میں موجود تھا۔

"تیری نیت کا فساد تیرے جواب میں موجود ہے۔"

قیصر نے جواب دیا "آپ کا اسرار تھا یوں میں سچ بول رہا ہوں اور سچ ہی بولتا رہوں گا۔ رہ گئی بات فسادِ نیت کی تو میں نے جو فصل بوئی تھی کاٹ رہا ہوں۔"

سلطان نے حماد کاتب کو اور قریب آنے کا حکم دیا' اور قیصر سے کہا "میں جو کچھ لکھوا رہا ہوں اس کو غور سے سنتا رہ' کیونکہ بعد میں فریق ثانی کی حیثیت سے تجھے اس پر دستخط کرنا ہوں گے۔"

قیصر نے جواب دیا "آپ لکھوائیں میں سن رہا ہوں' جہاں اختلاف ہوگا میں اس سے مطلع کردوں گا۔"

سلطان نے حماد کاتب سے کہا "لکھ' یہ معاہدہ پچاس سال کے لیے لکھا جا رہا ہے اور اس معاہدے کا فریق غالب اور فریق اول' میں کہ سلطان الپ ارسلان بیٹا داؤد جغری بیگ ہوں اور اس کا دوسرا فریق شکست خوردہ دیو جینس رومانس قیصر قسطنطنیہ اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ معاہدہ پچاس سال تک نافذ العمل ہوگا۔

۱۔ میں فریق دوم قیصر قسطنطنیہ جنگ کے تاوان کے طور پر پندرہ لاکھ دینار زر فدیہ ادا کروں گا۔

۲۔ تین لاکھ ساٹھ ہزار دینار سالانہ بطور خراج ادا کرتا رہوں گا۔

۳۔ فریق غالب یعنی فریق اول سلطان الپ ارسلان کو جب بھی فوجی امداد درکار ہوگی میں کہ فریق دوم اور قیصر قسطنطنیہ سلطان کو مزکورہ فوجی مدد فراہم کروں گا۔

۴۔ تمام مسلمان قیدی جو میری قید میں ہیں' یہاں کہیں قسطنطنیہ یا کسی دوسرے بلادِ محروسہ میں۔ میں انہیں رہا کر دوں گا۔

۵۔ کسی ایک رومی شہزادی سے سلطان کے بیٹے اور ولی عہد کی شادی کردوں گا۔

میں کہ فریق شکست خوردہ اور قیصر قسطنطنیہ دیو جینس رومانس شرط مندرجہ بالا کا پابند ہوں اور ان پر مخلصانہ عمل کروں گا۔"

قیصر نے کسی شرط پر بھی اعتراض نہیں کیا اور اس پر دستخط کر دیئے۔

حاضرین نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیا اور دونوں کو مبارکباد دی۔

سلطان نے کہا "یہ سوچ کے جنگ کرنا کہ کوئی کسی کو نیست و نابود کر دے گا اور کسی کے دین کو دنیا سے ناپید کر دیا جائے' خام خیالی ہے اور یہ احمقانہ سوچ ہے۔"

قیصر نے جواب دیا "میں خود بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

سلطان نے معاہدے کے بعد فرنگیوں کے بادشاہ اور بطریقوں کو بھی اپنے خیمے میں بلوا لیا۔

آشوری نے سلطان کو مطلع کیا کہ چند جہادی بھی باہر اذنِ باریابی کے انتظار میں ہیں۔

سلطان نے جواب دیا "انہیں بھی حاضر کیا جائے۔"

آشوری خود باہر چلا گیا اور وہاں یحییٰ سردار کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا "یحییٰ سردار! یہ آپ ہیں؟"

یحییٰ سردار نے پوچھا "کیوں' کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟"

آشوری نے کہا "میں نے منج میں آپ کو بے حد تلاش کیا اور اس اندیشے کا شکار ہو گیا کہ کہیں آپ کو ناقابلِ تلافی گزند تو نہیں پہنچا دیا گیا۔"

یحییٰ سردار نے جواب دیا "جب میں نے وہاں کی فضا میں فساد اور ہلاکت کی بو محسوس کی تو تجھ سے ملے بغیر ہی فرار ہو گیا۔ میں جہادیوں میں شامل ہو کر عیسائیوں سے جنگیں لڑتا رہا اور اب میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تو حسب وعدہ میری مدد کر اور سلطان کے دربار میں کوئی جگہ دلوا دے۔"

آشوری نے یحییٰ سردار کے دوسرے بارہ ساتھیوں کے بارے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟"

یحییٰ سردار نے جواب دیا "میرے ساتھی' میرے جہادی ساتھی۔ یہ جوش اور جذبے کے لوگ ہیں۔ ان کا ماضی میرے ماضی جیسا نہیں' یہ شریف اور پاک صاف لوگ ہیں۔"

آشوری نے اپنی مجبوری بیان کی "اندر فاتح اور مفتوح میں ایک معاہدہ طے پا رہا ہے اس لیے اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکوں گا کہ اندر آپ لوگوں کو جہادیوں کی حیثیت سے سلطان سے ملوا دیا جائے۔ باقی سفارش بعد میں کروں گا۔"

یحییٰ سردار نے جواب دیا "ٹھیک ہے میں بھی یہی چاہتا ہوں' مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔"

سلطان آشوری اور جہادیوں کا انتظار کر رہا تھا۔

جب یہ لوگ تاخیر سے اندر داخل ہوئے تو سلطان نے پوچھا "کیا بات ہے تجھے باہر دیر کیوں لگ گئی؟"

آشوری نے جواب دیا "جناب والا! میں انہیں اپنے ساتھ لایا

Faisal Ahmed

ضرور تھا تھوڑی دیر پہلے لیکن اندر آنے کے بعد میری نیت میں کسی قدر فتور آگیا تھا۔"

سلطان نے کہا "میں اس وقت بہت مصروف ہوں' بات مختصر مگر صاف صاف کر۔"

آشوری نے جواب دیا "میں انہیں اپنے ساتھ لایا تھا اور اندر تنہا آنے کے بعد میں یہ سوچ رہا تھا کہ انہیں سلطان سے نہ ملوایا جائے اور یوں ہی چلتا کردیا جائے۔ اس کشمکش اور تردد میں جب میں آپ کے حکم پر باہر انہیں لینے گیا تو ان سے اس طرح پیش آیا کہ جیسے ان سے اچانک یہاں پہلی بار ملا ہوں۔ دربار کے محافظ اور خدمت گار بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں حالت اضطرار میں غیر معمولی حرکتیں کررہا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں چاہتا' میں یہ فیصلہ بھی نہیں کرپا رہا تھا۔ یحییٰ سردار" اس نے اس کی طرف اشارہ کیا "شاید اس نے بھی میری اضطراری حالت کا اندازہ کرلیا تھا۔ میں اس سے جس طرح پیش آیا اور جس قسم کی باتیں کیں' یحییٰ سردار نے نہ تو اس پر اعتراض کیا اور نہ حیرت کا اظہار کیا۔ یحییٰ سردار بہرحال یہاں دربار تک آنا چاہتے تھے سو آگئے۔"

سلطان نے حیرت سے پوچھا "تو اس جہادی کو بار بار یحییٰ سردار کہہ رہا ہے' یہ کون ہے؟"

آشوری کا حلق خشک ہورہا تھا "یہ شخص جہادی کے علاوہ بھی کچھ ہے اور فی الحال ان باتوں کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھا جائے۔"

سلطان نے کہا "ٹھیک ہے۔ اس وقت تیرے یہ بارہ آدمی جو خود کو جہادی کہتے ہیں اور تو بھی انہیں یہی کہتا ہے' مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

آشوری نے کہا "یہ جو کچھ بھی ہیں میں بعد میں ان کا تعارف کرادوں گا' فی الحال یہ لوگ حضور والا کا دیدار کرنا چاہتے تھے سو کرلیا' اب انہیں جانے دیا جائے اور ان کے قیام اور طعام کا انتظام بھی کردیا جائے۔"

سلطان مسکرانے لگا "تو انہیں اپنے ساتھ لے جا اور انہیں اپنے ساتھ ہی رکھ' میں ان سے بعد میں ملوں گا۔"

آشوری ان سب کو اپنے ساتھ لے کر باہر آگیا۔

یحییٰ سردار بار بار اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ وہ آشوری سے ناراض تھا۔ باہر آتے ہی پوچھا "یہ اندر تو کیا بکواس کررہا تھا؟"

آشوری نے جواب دیا "یحییٰ سردار! سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں میں طاقتور ہوں اس لیے آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ مجھ سے نیچی آواز میں بات کریں۔"

یحییٰ سردار نے کہا "آشوری جوان! تو خوب جانتا ہے کہ میں زیادہ مصلحت اندیش نہیں ہوں اس لیے مجھ سے ڈر۔ میں کہیں بھی کچھ کرسکتا ہوں۔"

آشوری نے جواب دیا "ڈرتا تو میں بہت نہیں ہوں لیکن میں سچ بولتا ہوں۔ میری نیت میں اور میرے دل میں آپ کے بارے میں جو فساد پیدا ہوا تھا اور جو خرابی آئی تھی اس کا میں نے برملا اظہار بھی کردیا لیکن اب میں آپ کے معاملے میں بالکل مخلص ہوں اس لیے آپ مجھ سے پریشان نہ ہوں۔"

یحییٰ سردار نے اپنے ساتھیوں کے لیے تین خیموں کا انتظام کرایا۔ ایک میں خود تنہا رہا دو میں اپنے بارہ ساتھیوں کو ٹھہرادیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو دونوں خیموں میں ٹھہرا کر آشوری کے پاس چلا گیا۔

اس وقت آشوری اس نئی صورتحال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ یحییٰ سردار سے واقعی خوف زدہ تھا اور یحییٰ سردار نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر آشوری اس کے کام نہ آیا تو وہ اس کو قتل کرکے کہیں چلا جائے گا۔

..... ☆ .....

دربار میں سلطان نے فرینکوں کے بادشاہ اور بطریقوں کو بھی معاف کردیا۔

اس نے فرینکوں کے بادشاہ سے کہا "خلاط میں جو کچھ تو نے کیا وہ تجھے معاف نہ کرنے کی سفارش کرتا ہے لیکن میں نے تجھے اس لیے معاف کردیا کہ تو میرے اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھے گا اور پھر کبھی اس طرح یہاں نہیں آئے گا۔"

قیصر نے بھی اسے اس موقع پر یاد رکھا اور پوچھا "آپ کے فراخ دلانہ سلوک کے پیش نظر ہمیں جب روسی بادشاہ یاد آتا ہے تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا؟"

سلطان نے جواب دیا "اس نے اپنی پندرہ بیس ہزار فوج سے میرے مختصر ترین ہراول پر حملہ کیا تھا اور جب شکست کھا کر گرفتار ہوا تو تلخ اور نازیبا باتیں کیں اور اس نے ہمیں یہاں تک برہم کیا کہ ہم کثیر التعداد مسیحی عساکر کے خوف سے اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔ اس وقت ہمیں اس کو وہ سزا دینا پڑی۔"

سلطان نے ان سب کی ایک شاندار دعوت کی اور قیصر کے ساتھ دوسرے سرداروں' بطریقوں اور بادشاہ فرینک کو خلعتوں سے نواز دیا۔ وہ سب سلطان کے زیر بار احسان ہورہے تھے۔ انہوں نے سلطان کی شان میں مکالماتی قصیدے ادا کیے۔

قیصر نے بغداد کی طرف منہ کیا اور تعظیماً جھک گیا۔ وہ خلیفۃ المسلمین قائم بامراللہ خلیفہ عباسیہ کو تعظیم دے رہا تھا۔

باہر ان کے گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ سلطان نے ان سے کہا "تم لوگ آزاد ہو' جب چاہو چلے جاؤ۔"

قیصر اور اس کے ساتھیوں نے اجازت پاتے ہی مصافحہ کیا اور معانقہ شروع کردیا۔ قیصر اسے بغلگیر ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں' گلا رندھ گیا اس نے کہا "ہم آپ کا یہ حسن سلوک کبھی بھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔"

سلطان نے جواب دیا "معاہدے کی رو سے بوقت ضرورت تو ہماری فوجی مدد کرے گا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تو جب چاہے ہمیں اپنی مدد کے لیے آواز دے سکتا ہے۔"

سلطان کے امراء اور شہزادہ ملک شاہ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار شکست خوردہ قیصر اور اس کے ساتھیوں کو الوداع کہنے مشایعت کے طور پر ایک فرسخ ان کے ساتھ گئے۔ مسیحی سرحد سامنے تھی یہاں سے سلطان واپس آگیا۔

عیسائیوں سے مسلمانوں نے جو مال غنیمت حاصل کیا تھا اس کو ایک میدان میں جمع کردیا گیا۔ یہاں ہتھیاروں' خود اور زرہوں کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں بھی تھیں۔ مسلمانوں کو حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ یاد آیا جو ایران کی فتح کے بعد مال غنیمت کے مسجد نبوی کے صحن میں جمع ہونے سے متعلق مشہور ہے۔ خود سلطان کو بھی تاریخ اسلام کا وہ دور اور وہ واقعہ یاد آیا۔

سلطان نے یہ چیزیں اپنی فوج میں تقسیم کردیں اور مسلمانوں نے یہ وافر سامان بازار میں فروخت کرنا شروع کردیا۔ خریداروں نے ایک دینار میں تین زرہیں حاصل کرلیں اور دینار کے چھٹے حصے میں بارہ خود فروخت ہوگئے۔

اس تقسیم میں آشوری اور شاعر اسمٰعیل کو بھی یاد رکھا گیا۔ یحییٰ سردار اور اس کے بارہ ساتھی بھی فیضیاب ہوئے۔ ان کو تقسیم میں شامل کرنے کا جواز یہ تھا کہ وہ بھی کہیں نہ کہیں جہاد میں حصہ لے چکے تھے۔

یحییٰ سردار کا دل آشوری کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ تو نے سلطان کے دربانوں کے سامنے جس تجاہل عارفانہ اور حیران کن روش سے ہمیں پہچانا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔

آشوری نے یحییٰ سردار سے پوچھا "آپ کے بارہ ساتھی بھی آپ کے ماضی واقف ہیں یا نہیں؟"

یحییٰ سردار نے جواب دیا "نہیں۔ میں اپنی اس حیثیت کو ان پر ظاہر کرکے خود کو نادم اور پشیمان پشیمان تو نہیں رکھ سکتا۔"

آشوری نے مشورہ دیا "یحییٰ سردار! آپ یہ تو سوچیں اور دل سے اس کا اعتراف کریں کہ میں آپ کو اب بھی یحییٰ سردار کہتا ہوں۔ حتیٰ کہ سلطان کے سامنے بھی آپ کو یحییٰ سردار کہہ کر مخاطب کیا۔ حالانکہ یہاں آپ کی دھونس اور رعب بھی نہیں ہے۔ آپ اس وقت سے ڈریں جب اس کشمکش اور تنازعہ میں آپ کے بارہ ساتھی بھی آپ کے ماضی سے واقف ہوجائیں گے۔"

یحییٰ سردار کو کچھ کچھ اپنی غلطی اور بے جا ضد کا احساس ہوا' پوچھا "پھر تو نے ابھی تک سلطان سے کوئی منصب یا عہدہ کیوں نہیں دلایا؟ حالانکہ تو نے اس کا وعدہ کیا تھا۔"

آشوری نے جواب دیا "سلطان کے سامنے آپ کو پیش کیا جاچکا ہے جب وہاں سے آپ کو دوبارہ طلب کیا جائے گا میں آپ کا کام کرادوں گا۔ آپ وقت کا انتظار کریں۔ میں سلطان کو آپ سے ملاقات کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔"

یحییٰ سردار نے تحمل سے جواب دیا "میں خاموش رہوں گا اور وقت کا انتظار کروں گا۔"

آشوری نے محسوس کیا کہ جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو اس کا ذہن کہیں اور تھا' وہ سوچ کچھ اور رہا تھا۔

سلطان نے واپسی کا اعلان کردیا اور واپسی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

اس دوران سلطان نے آشوری اور یحییٰ کے ۱۲ ساتھیوں کو نہایت خاموشی سے اپنے خیمے میں طلب کرلیا۔ اس میں یحییٰ کو نظرانداز کردیا گیا تھا۔ یحییٰ اپنے خیمے میں موجود نہیں تھا۔ سلطان نے بارہ جہادیوں کو بڑی عزت دی اور آشوری سے یحییٰ کے بارے میں پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟

آشوری کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یحییٰ کہاں ہے۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

سلطان نے آشوری سے پوچھا "تو اسے یحییٰ سردار کیوں کہتا ہے' کیا اس لیے کہ وہ ڈاکوؤں کو سردار رہا ہے؟"

آشوری کو سلطان کی معلومات پر حیرت تھی۔ پوچھا "کیا آپ اس سے واقف ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا "مجھے اس شخص کی تلاش تھی۔ بغداد اور دمشق سے اس کی شکایتیں آچکی ہیں۔"

بارہ جہادی دم بخود سلطان کی طرف دیکھنے کی کوشش کررہے تھے لیکن رعب سلطانی مانع تھا۔

سلطان نے کہا "وہ اچھا آدمی نہیں ہے اسے یہاں میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔"

آشوری نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنادی اور عرض کیا "اس نے مجھ پر احسانات کیے ہیں اور میں نے... اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ یہاں دربار میں کوئی منصب یا عہدہ

دلوادوں گا تاکہ وہ بقیہ زندگی باعزت گزار سکے۔"

سلطان نے خشک اور بے مروتانہ لہجے میں کہا "اس نے جس ماحول اور معاشرے میں آنکھ کھولی تھی وہ اس میں پختہ تر ہوچکا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ اسے گرفتار نہ کروں۔ اسے یہاں سے چلا جانا چاہئے' ورنہ اسے ماردیا جائے گا۔ ہمارے معاشرے کا ہر شخص جو اس کے ہاتھوں ستایا یا لوٹا گیا ہے۔ یحیٰی کو قتل کرسکتا ہے۔ وہ شریفانہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسے جب بھی موقع ملے گا' اس کی وہ عادت اور فطرت عود کرے گی اور وہ وہی کرگزرے گا جو زندگی بھر کرتا رہا ہے۔"

بارہ جہادی یحیٰی کے بارے میں جو کچھ سن رہے تھے اس پر وہ حیرت زدہ تھے۔ ایک نے عرض کیا "جناب والا! مجھے مال غنیمت میں سے جو کچھ ملا تھا' یحیٰی نے اس میں سے ایک چوتھائی یہ کہہ کر لے لیا کہ یہاں یعنی سلطان کے دربار میں وہ لایا تھا۔ اگر وہ نہ لاتا تو مجھے کچھ بھی نہ ملتا۔"

دوسروں نے بھی یہی شکایت کی کہ ان کے مال میں یحیٰی حصے دار بن چکا ہے۔

سلطان نے آشوری سے کہا "میں تیری عزت کرتا ہوں' اس لئے یحیٰی کو بخیریت یہاں سے نکل جانے دوں گا۔"

آشوری نے تاسف آمیز لہجے میں کہا "میں نے یحیٰی سے جو وعدہ کیا تھا' اسے پورا نہ کرسکوں گا۔ اس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا اور اب میں اس کا سامنا بھی نہیں کرسکوں گا۔"

سلطان نے بارہ جہادیوں کو فوج میں لے لیا اور یحیٰی کے بارے میں حکم دیا کہ اسے بتادیا جائے کہ وہ فوج میں نہیں رہ سکتا' کہیں اور چلا جائے۔

آشوری نے باہر نکل کر دربار سلطانی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اپنے خیمے میں گیا اور شاعر اسماعیل کو بتایا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔

شاعر اسماعیل نے ہنس کر پوچھا "تو یہاں نہیں رہے گا تو یہاں رہے گا کون؟"

آشوری سامان سمیٹ رہا تھا اور اسماعیل کو بتاتا جارہا تھا "سلطان نے میری درخواست رد کردی' میں نے یحیٰی سردار سے وعدہ کرلیا تھا' اب میں یحیٰی سردار کو اپنا منہ بھی نہیں دکھا سکتا۔"

شاعر اسماعیل نے اپنے بارے میں پوچھا "اور میرے لیے کیا حکم ہے؟"

آشوری نے جواب دیا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تو یہاں رہنا چاہے تو شوق سے رہ' ورنہ میرے ساتھ چل۔"

شاعر اسماعیل نے پوچھا "لیکن کہاں؟ یہ بھی تو معلوم ہو"

آشوری نے جھنجلا کر جواب دیا "ابھی تو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھ کو سلطان اور مسلمانوں کو چھوڑ دینا ہے۔ ابھی میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ یہاں سے مجھے جانا کہاں ہے۔"

شاعر اسماعیل نے بھی اپنا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔

ان دونوں کے فیصلوں کا ذکر وہاں عام ہوگیا۔ لشکر میں' عام مسلمانوں میں اور پھر یہ خبر سلطان کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔

آشوری نے اپنا بیشتر سامان فروخت کردینا چاہا کیونکہ اسے لے کر دور دراز ملکوں کا سفر نہیں کرسکتا تھا۔ لشکری مسلمانوں نے اس کے اونے پونے مال میں بڑی دلچسپی لی اور خرید لیا۔ آشوری کے دل پر ایک چوٹ اور لگی۔ اس کا خیال تھا کہ عام لشکری بھی اس کا سامان نہیں خریدے گا اور اسے روکنے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

شاعر اسماعیل کا سامان بھی فروخت ہوگیا۔ اب ان دونوں کے پاس سامان کی جگہ دینار تھے۔

اچانک ان کے خیمے میں گوہر آئین داخل ہوا اور خالی خولی خیمہ دیکھ کر پوچھا "یہاں کا سامان کون لے گیا؟"

آشوری نے اس سوال کا جواب بھی نہیں دیا۔ شاعر اسماعیل نے کہا "ہم نے اپنا سامان فروخت کردیا ہے اور اب ہم آپ لوگوں سے جدا ہوجائیں گے۔"

گوہر آئین نے حیرت سے پوچھا "مگر کیوں؟ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی' وہ وجہ بھی تو معلوم ہو؟"

شاعر اسماعیل نے گوہر آئین کو اس کی وجہ بھی بتادی۔

گوہر آئین سناٹے میں آگیا اور آشوری سے پوچھا "تو نے اپنے اس فیصلے کی خبر سلطان کو بھی دے دی ہے یا نہیں؟"

آشوری نے جواب دیا "میرے ذمے سلطان یا مسلمانوں کا کچھ بھی نہیں' پھر کسی کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے؟"

گوہر آئین نے اسے سمجھایا "دیکھ آشوری! تو یہ جو کچھ کررہا ہے' اچھا نہیں کررہا۔ سلطان کو اپنے اس فیصلے سے ضرور مطلع کردے۔"

شاعر اسماعیل نے گوہر آئین سے اتفاق کیا اور گوہر آئین سے کہا "یہ کام میں کروں گا' آپ مجھے دربار تک لے چلیں۔"

آشوری نے شاعر اسماعیل کو ایسا کرنے سے منع کیا اور اسے خبردار کیا "دیکھ' تو یہ نہ کر' جب تو واپس آئے گا تو میں یہاں سے جاچکا ہوں گا۔"

گوہر آئین نے سخت لہجہ اختیار کیا "تو اپنی مرضی سے نہیں جاسکتا۔ یہاں کا بھی ایک آئین ہے۔ یہاں سلطان کا حکم اور سکہ چلتا ہے۔"

اس نے باہر نکل کر دو سپاہیوں کو خیمے کے در پر بٹھادیا اور حکم دیا کہ آشوری کو یہاں سے نکلنے نہ دیا جائے۔ وہ شاعر اسماعیل کے

ساتھ سلطان کے خیمے تک گیا مگر وہاں بدقسمتی سے سلطان موجود نہ تھا اور دربانوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ گیا کہاں ہے۔

آشوری نے باہر نکل کر اپنے خیمے تک جانا چاہا مگر گوہر آئین کے متعینہ پہرے داروں نے آشوری کو حکم دیا کہ وہ اندر خیمے میں چلا جائے۔

آشوری نے پوچھا "مگر تم دونوں ہو کون؟"

ایک نے جواب دیا "گوہر آئین نے ہمیں یہاں بٹھایا ہے اور ہم یہاں سے ٹل بھی نہیں سکتے۔"

آشوری نے کہا "میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں اس لیے میرا راستہ چھوڑدو۔"

دونوں دربانوں نے آشوری کو دھکے دے کر اندر کردیا اور حکم دیا "اب تو باہر نہیں نکلے گا۔"

وہاں اچانک سلطان آگیا۔ اس نے دونوں پہرے داروں سے پوچھا "کیا آشوری ہنرمند اتنا مال دار ہوگیا ہے کہ دو دو دربان اپنے خیمے کے در پر بٹھادیے؟"

ایک دربان نے زمین بوس ہوکر جواب دیا "حضور والا! ہم آشوری کے نہیں' سعد اللہ گوہر آئین کے دربان ہیں' ہمیں یہاں گوہر آئین نے بٹھایا ہے۔"

سلطان نے دونوں کو حکم دیا "تم دونوں یہیں رہو اور کسی کو اندر مت آنے دینا۔"

اور سلطان خیمے کے اندر داخل ہوگیا۔

آشوری نے سلطان کو اچانک اپنے خیمے میں دیکھا تو گھبرا گیا۔ وہ اس گھبراہٹ میں سلطان کو وہ احترام بھی نہیں دے سکا جس کا وہ مستحق تھا۔

سلطان نے خالی خیمہ دیکھ کر پوچھا "تو تو سفر کے لئے تیار ہے حالانکہ لشکری ابھی تیاری میں مشغول ہیں؟"

آشوری سلطان کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اسے اور مسلمانوں کو چھوڑ کر جارہا ہے مگر تکلف میں بتا نہیں سکا۔

سلطان نے پوچھا "یحیٰی ابھی تک اپنے خیمے میں نہیں ہے' وہ کہاں چلا گیا؟"

آشوری نے سرد مہری سے جواب دیا "پتا نہیں' میں بھی اس سے ابھی تک نہیں ملا۔"

سلطان نے پوچھا "آشوری ہنرمند! کیا یہ درست ہے کہ تو ہم سے جدا ہونا چاہتا ہے؟"

آشوری اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر بھی جواب دیا "جی بندہ پرور!"

سلطان نے دریافت کیا "کیوں' کوئی وجہ.... اس کی کوئی خاص وجہ؟"

آشوری نے جواب دیا "اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ جیسا کہ حضور والا خود بھی جانتے ہیں کہ ہم سیاح مزاج لوگ' کسی ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔"

سلطان نے درشت لہجہ اختیار کیا "نہیں' یہ بات نہیں ہے' تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو یحیٰی کو کوئی منصب دلوانا چاہتا تھا' میں نے نہیں دیا اور تو ناراض ہوگیا۔"

آشوری نے جواب دیا "حضور والا! میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ میں اس کو اپنی شکل تک نہیں دکھا سکتا۔"

سلطان نے کہا "تو نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ میں پوچھتا ہوں تو نے اس سے وعدہ کیوں کیا تھا؟ ایک چور ایک ڈاکو میرے دربار میں منصب کس طرح حاصل کرسکتا ہے۔ وہ بغداد اور دمشق کا معتوب ہے۔ میں تیری یا کسی اور کی خاطر اس کو اپنے دربار میں جگہ نہیں دے سکتا۔"

آشوری نے آہستہ سے کہا "سلطانِ محترم! میں آپ سے اس کی شکایت تو نہیں کررہا۔"

سلطان نے سخت لہجے میں کہا "تو اس کی شکایت کررہا ہے' اپنی زبان سے نہیں' اپنے عمل سے' اپنے رویوں سے' اپنے کردار سے اور اپنے فیصلے سے۔"

آشوری لاجواب ہوگیا۔

سلطان کہتا رہا "میں نے تجھے اس وقت پناہ دی تھی جب تو

اپنے دینی بھائیوں سی بچتا پھر رہا تھا۔ تو جعلی سکے بنانے کا مجرم تھا' میں نے تجھے اپنے ملازمین میں جگہ دی۔ تو مجھ سے وہ کیوں مانگ رہا ہے جو میں دے نہیں سکتا۔ تجھے کچھ مانگنے سے پہلے یہ تو سوچنا چاہئے کہ تو کیا ہے اور میں کیا ہوں۔"

آشوری نے سلطان کی باتوں میں رعونت اور تکبر کی بو محسوس کی۔ سلطان اس کو ڈانٹتا رہا "اس وقت میں دنیا کا طاقت ور ترین سلطان ہوں۔ میں نے دو ڈھائی لاکھ عیسائیوں کی قوت کو اپنے پندرہ ہزار سپاہیوں سے کچل کر رکھ دیا۔ آج پوری دنیا میں میرا کوئی ثانی نہیں۔"

آشوری نے عاجزی سے درخواست کی "حضور والا! میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ مجھے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

سلطان نے جواب دیا "ہمیں اعتراف ہے کہ تو نے ہمارے لیے اہم کام سرانجام دیئے لیکن تجھے بھی یہ اقرار کرنا چاہئے کہ میں اور اسلام اقبال مند ہیں۔ مشیت ایزدی ہماری حمایت کر رہی ہے۔ تو جانا چاہتا ہے تو چلا جا لیکن یہ سمجھ لے کہ تو اقبال مندی کو خیرباد کہہ رہا ہے' خوش بختی سے منہ موڑ رہا ہے۔"

آشوری نے عرض کیا "میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے غصے کے عالم میں حکم دیا "تو جاسکتا ہے' تجھے کوئی نہیں روکے گا۔ تو ابھی اسی وقت جاسکتا ہے" سلطان نے جاتے جاتے اسے حکم دیا "نصف ساعت ٹھہر' صرف نصف ساعت۔"

سلطان چلا گیا اور نصف ساعت کے اندر گوہر آئین اس کے پاس سلطان کی طرف سے دو ہزار دینار لے کر آیا۔ اس نے کہا "یہ سلطان کی طرف سے تیرا سفر خرچ ہے۔ اب تو جاسکتا ہے' دونوں دربان ہٹائے جاچکے ہیں۔"

آشوری کے دل پر چوٹ سی لگی اور اس کا دل چاہا کہ وہ رک جائے اور اعلان کردے کہ وہ نہیں جارہا لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ شاعر اسماعیل بھی آگیا اور اس نے اعلان کیا کہ میں [illegible] رہوں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

آشوری نے اپنے دیناروں کی تھیلی زین کے نیچے رکھی اور چشم پرنم گھوڑے پر بیٹھ گیا۔

شاعر اسماعیل نے اس کے بائیں طرف پاؤں کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کیا "تیرا یہ فیصلہ غلط ہے' تو اس پر پچھتائے گا۔"

آشوری نے جواب دیا "ہو سکتا ہے' میرا یہ فیصلہ غلط ہو لیکن میں نے سلطان کے مزاج اور باتوں میں رعونت اور تکبر کی جھلک دیکھی ہے جو اچھی علامت نہیں ہے۔"

آشوری نے خاموشی سے سلطان اور مسلمانوں کو چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کو آشوری کے فیصلے کا علم تک نہ ہوسکا۔

وہ رومی سرحد کی طرف روانہ ہوگیا جو وہاں سے چند فرسخ دور تھی۔ آشوری کا تیز ذہن اپنی منزل کا انتخاب کرچکا تھا۔ اس کی منزل تھی قسطنطنیہ۔ وہ قیصر کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ قیصر دیوجینس رومانوس کے پاس کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب وہ قیصر کی نظر میں خبطی یا مخبوالحواس جوان نہیں ہے۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ اب اس کی شایان شان عزت ہوگی' اس کا احترام کیا جائے گا۔

☆☆

سلطان کو آشوری کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوا۔

گوہر آئین' شہزادہ ملک شاہ' ساوتگین اور صنداق ترک بھی اس خبر سے افسردہ تھے۔ شہزادہ ملک شاہ آشوری کے خلاف بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا "وہ ایک ہنرمند تھا' اچھا ہنرمند لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ حکومت کے معاملات میں دخل دینے لگے۔ اسے یہ حق نہیں دیا جاسکتا تھا۔"

ساوتگین نے خواجہ بزرگ کو یاد کیا "آج اگر خواجہ بزرگ یہاں ہوتے تو آشوری ہرگز نہ جاتا۔ خواجہ بزرگ کو دلوں پر حکومت کرنے کا ہنر آتا ہے۔"

گوہر آئین نے اتفاق کیا لیکن ذرا سے اختلاف کے ساتھ۔ "بیشک' خواجہ بزرگ یہ جانتے ہیں کہ کس سے کس وقت کس طرح اور کن لفظوں بات کی جائے کہ وہ ان کی بات مان لے لیکن آشوری کو شاید خواجہ بزرگ بھی نہیں روک سکتے تھے۔"

سلطان ان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

صنداق ترک نے پوچھا "وہ کیوں؟ کس طرح؟"

گوہر آئین نے جواب دیا "مجھے آشوری کے اس فیصلے کے پیچھے کچھ اور نظر آرہا ہے۔"

ساوتگین نے پوچھا "یعنی' وہ کیا؟"

گوہر آئین نے سلطان کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

سلطان نے بھی وہی سوال کیا "آشوری کے فیصلہ جدائی کے پیچھے تجھے کیا نظر آیا؟"

گوہر آئین نے کہا "میرا خیال ہے' قیصر اور آشوری میں کچھ باتیں ہوگئی ہیں۔ قیصر نے اس ہنرمند کو قسطنطنیہ بلایا ہوگا اور آشوری نے یہ سوچا ہوگا کہ اس کا ہنر اس کے دینی بھائیوں کے کام کیوں نہ آئے۔"

گوہر آئین کی دلیل سب کو بھاگئی۔ سب کی سمجھ میں آگئی۔ سلطان نے آہستہ سے کہا "ممکن ہے' تیرا خیال قرین قیاس ہے۔"

شہزادہ ملک شاہ بھی اس رائے سے متاثر ہوا اور کہا "آپ نے خوبصورت اور ناقابل رد دلیل دی ہے۔"

صنداق ترک نے کہا "اس سے کون اختلاف کرے گا۔"

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۶۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۸۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت ۶۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت ۶۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول۔ ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو پاکیزگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

کالی کہانیاں
جرائم' جادو' شیطان ازم' ارواح' طنز و مزاح' اسرار و خوف' سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۱۲۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چُراتا ہے۔
قیمت جلد اول ۲۵ جلد دوم ۲۵
ڈاک خرچ فی جلد ۱۰ روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۲۳ سعید منشن بلیمویا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

سلطان نے فوراً فیصلہ دیا "چند سواروں کو آشوری کے پیچھے روانہ کردیا جائے' یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کہاں جارہا ہے اور اگر وہ واقعی باز نطینی حکومت کی طرف جارہا ہے تو اسے روک دیا جائے۔ اسے قسطنطنیہ نہیں جانا چاہیے۔"

صنداق ترک نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور کہا "اس کا پیچھا میں کروں گا۔ اسے قسطنطنیہ جانے سے میں روکوں گا۔"

سلطان نے کہا "وہ اگر قسطنطنیہ جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دیا جائے۔ ہمارے لئے یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ یہاں سے کہاں گیا ہے۔"

صنداق ترک نے تیس سپاہیوں کو ساتھ لیا اور رومی سرحد کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆

آشوری کو سلطان اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑنے کا دکھ تھا۔

اسے اپنی خدمات پر ناز تھا اور یقین تھا کہ سلطان اس کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔ وہ یحیٰی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ نہ میں سلطان کے دربار میں رہوں گا اور نہ مجھے شرمندگی ہوگی۔

اب وہ بڑے منصوبے بنا رہا تھا۔ مغربی ملکوں کے کئی بادشاہ اس کی لیاقت اور حیثیت سے اچھی طرح واقف تھے اور خاص کر قیصر اسے اچھی طرح جان اور سمجھ چکا تھا۔

وہ اپنے گھوڑے کو قیصر اور اس کے ساتھیوں کے نقوش پر دوڑا رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں واضح تھیں۔ خاردار جھاڑیوں اور ناہموار راستے پر گھوڑے کو مسلسل بھگانا خطرناک بھی ہوسکتا تھا کیونکہ یہ راستہ اس کا سمجھا ہوا نہیں تھا۔ آگے یہ راستہ پتھریلا تھا اور پتھروں پر گھوڑے کی ٹاپیں مسلسل واضح نہیں تھیں۔ پتھروں پر گھوڑوں کی نعلوں کے نشان ایک جیسے واضح نہیں تھے۔ کہیں ٹوٹے پھوٹے بے ربط تھے۔ کہیں پتھروں کی بے ربط شکستگی تھی اور کہیں نعل اور پتھر کی اور پتھر کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آگ نے پتھر کو سیاہ کردیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پانی کے جوہڑوں پر جب گھوڑوں نے چھلانگ لگا کر انہیں عبور کرنے کی کوشش کی تو ان کے پانی میں گر جانے سے پانی کی چھینٹیں دور دور تک پھیلی تھیں اور اس کی نمی جوہڑوں کے آس پاس اب تک موجود تھی۔ آشوری نہایت ہوش مندی سے آگے بڑھا چلا جارہا تھا۔

ابھی رومی سرحد نصف فرسخ دور رہی ہوگی کہ اس کے داہنی جانب دو گھڑسوار نمودار ہوئے۔ وہ آشوری کی طرف گھوڑے دوڑاتے چلے آرہے تھے۔ آشوری گھوڑوں کی ٹاپوں سے چونکا اور پریشان ہوگیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو گھنی

Faisal Ahmed

جھاڑیوں کے پیچھے لے جانا چاہا لیکن دونوں گھڑ سواروں نے آشوری کو چھپ جانے کا موقع ہی نہ دیا۔

ایک سوار نے اسے دور سے آواز دی "آشوری ہنرمند خبردار! جو بھاگنے یا چھپنے کی کوشش کی۔"

آشوری کو آواز جانی پہچانی لگی اور آواز کے تیور سے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رومی سرحد کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔

دونوں گھڑ سواروں نے بھی اپنے اپنے گھوڑوں کی رفتار تیز کردی اور دھمکی دی "آشوری! میں کہتا ہوں رک جا' بھاگنے کی کوشش نہ کر ورنہ میں تیروں کی بوچھاڑ سے تجھے ہلاک کردوں گا۔"

آشوری نے خطرے کی بو محسوس کرلی تھی اور اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر دی۔

اب وہ اس آواز کو پہچان چکا تھا۔ یہ یحییٰ سردار کی آواز تھی لیکن اس آواز میں غصہ تھا' منفی جوش تھا۔

یحییٰ سردار نے بھاگتے بھاگتے کمان سے تیر چھوڑا جو خطا کرگیا۔

یحییٰ نے اپنے ساتھی سے کہا "اس پر تیروں کی بارش کردے۔"

اور پھر دونوں نے تعاقب کے ساتھ ساتھ تیروں سے حملہ بھی شروع کردیا۔ آشوری کو اپنی موت بہت قریب نظر آرہی تھی۔ آشوری نے چیخ کر پوچھا "تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو"

یحییٰ نے جواب دیا "تو مجھ سے بھاگے گا تو میں تجھے ماردوں گا خیریت اسی میں ہے کہ تو رک جا میں تجھ سے چند باتیں کروں گا اور یہ پوچھوں گا کہ تو کہاں جارہا ہے؟"

آشوری نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کردی اور جواب دیا۔ "جب سلطان نے میری سفارش پر آپ کو قبول نہیں کیا تو میں نے سلطان اور مسلمانوں کا ساتھ ہی چھوڑ دیا۔ اب میں قسطنطنیہ کے قیصر کے پاس جارہا ہوں اور اس کے دربار سے وابستہ ہوجاؤں گا۔ آپ اگر پسند کریں تو میں قیصر کے دربار میں کوئی جگہ دلوادوں۔"

یحییٰ نے کہا "میں ہر دربار کو اپنے لئے مناسب سمجھتا ہوں میں قیصر کے دربار سے وابستہ ہوکر سلطان سے انتقام لوں گا۔"

آشوری نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور یحییٰ سے کہا "اب میں رکا جارہا ہوں اس لئے تیر اندازی کا سلسلہ بند کردیں"

یحییٰ اور اس کے ساتھی دونوں نے تیر اندازی بند کردی اور چشم زدن میں آشوری کے سر پر پہنچ گئے اور دونوں تیزی سے نیچے اترے اور آشوری سے کہا "اب تو بھی نیچے آجا۔"

ان کے پاس ہی ایک برگد کا درخت تھا اور اس کے سائے میں ایک سنگی چبوترہ' شاید اس چبوترے پر لوگ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔

آشوری نے اپنا گھوڑا تنے کے پاس لے جاکر دیناروں کی تھیلی درخت کے نیچے کی جھاڑیوں میں چھپادی اور گھوڑے کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں پکڑیں اور اسی طرح آشوری کے پاس پہنچ گئے۔

آشوری نے سنگی چبوترے پر ہاتھ مارا "آپ دونوں اس پر بیٹھ جائیں۔"

یحییٰ اپنے ساتھی کے ہمراہ آگے بڑھ کر سنگی چبوترے پر آشوری کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا اور یہ تو مجھ سے بھاگ کیوں رہا تھا؟"

آشوری نے کھسیائے لہجے میں جواب دیا "دراصل میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔"

یحییٰ کی نظریں آشوری کے پورے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں "میں نے تجھے آواز دی تھی۔ کیا تو نے میری آواز بھی نہیں پہچانی تھی؟"

آشوری نے جواب دیا "پہلی بار خوف کی وجہ سے میں آپ کی آواز بھی نہیں پہچان سکا تھا۔"

یحییٰ نے پوچھا "اور دوسری بار' دوسری بار بھی آواز نہیں پہچانی؟"

آشوری نے جواب دیا "دوسری بار آواز سے آپ کو پہچان لیا اور رک کر یہاں آپ کا انتظار کرنے لگا۔"

یحییٰ نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکاری بھری "ہوں۔ پھر وہی بات کہ تو ہم سے بھاگ رہا تھا۔"

آشوری نے اس سے انکار کیا "نہیں' ایسی بات نہیں تھی میں اپنے آس پاس سے خبردار قسطنطنیہ جانے کی فکر میں تھا کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں نے مجھے خوف زدہ کردیا اور میں بے اختیار بھاگنے لگا۔" پھر اس کے دوسرے ساتھی کے بارے میں پوچھا "یحییٰ سردار! یہ کون ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا "میرا ساتھی' میرا ہم پیشہ۔"

آشوری کا ماتھا ٹھنکا۔ پوچھا "میں قیصر کے پاس پہنچنے کی کوشش کررہا ہوں' آپ دونوں بھی میرے ساتھ چلیں' اور جو کام میں سلطان سے نہ کراسکا قیصر سے کرادوں گا۔"

یحییٰ نے درشت لہجے میں کہا "اب میں کہیں نہیں جاؤں گا میں نے تیری باتوں کے سحر میں اپنا بہترین پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے شریفانہ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن قدرت

اس کے خلاف ہے۔ سلطان مجھے گرفتار کرکے بغداد یا دمشق بھیج دینا چاہتا تھا۔"

آشوری نے کہا "وہ باتیں تو ختم ہوگئیں اور اب ہم دونوں سلطان سے دور ہیں۔ آپ دونوں میرے ساتھ قیصر کے پاس چلیں۔"

یحییٰ نے جھڑک دیا "بند کر یہ بکواس" آشوری حیرت زدہ نظروں سے یحییٰ کو دیکھنے لگا۔

یحییٰ نے پوچھا "تو وہاں سے کتنے دینار لے کر چلا تھا؟"

آشوری نے کہا "خالی ہاتھ' میں نے وہاں سے کچھ بھی نہیں لایا!"

یحییٰ نے گرج کر کہا "جھوٹ' بالکل جھوٹ؟ سرتاپا جھوٹ۔" اور اپنے ساتھی سے کہا "جا اس کے گھوڑے کی کاٹھی دیکھ' کہیں اس کی کاٹھی سے کچھ بندھا ہوا تو نہیں ہے۔"

یحییٰ کا ساتھی گھوڑے کی طرف چلا گیا۔

یحییٰ نے اس کے جاتے ہی آشوری کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کردیا "میں پوچھتا ہوں وہ دینار کہاں ہیں جو تو سلطان کے پاس سے لے کر چلا ہے؟"

آشوری نے انکار کیا "میں وہاں سے خالی ہاتھ چلا ہوں' میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

یحییٰ نے کہا "ناممکن ایسا نہیں ہوسکتا۔ شرافت سے بتا دے ورنہ میں تجھے برگد سے الٹا لٹکا دوں گا۔"

آشوری' یحییٰ سردار کے اس لہجے اور رویئے پر حیران تھا۔ جواب دیا "آپ جو چاہیں کریں۔ جب میرے پاس کچھ ہے نہیں تو میں بتاؤں کیا؟"

یحییٰ نے اس پر طمانچوں کی بارش کردی۔ آشوری کا چہرہ گھوم گھوم گیا اور وہ مظلومیت سے یحییٰ سردار کو دیکھنے لگا اور پوچھا "یحییٰ سردار یہ آپ کیا کررہے ہیں؟"

یحییٰ نے جواب دیا "دیناروں کا اتا پتا پوچھ رہا ہوں اور کیا کررہا ہوں۔"

آشوری نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا "وہ میرے پاس نہیں۔ میں نے ایک بار کہہ جو دیا۔"

یحییٰ نے اپنے ساتھی کو آواز دی "علی! ملا کچھ؟"

علی نے جواب دیا "یہاں کچھ بھی نہیں۔"

یحییٰ نے کہا "یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص سلطان کے پاس سے خالی آئے۔"

آشوری نے جواب دیا "یہ ممکن ہے اور میں اس کی بہترین مثال ہوں۔"

یحییٰ نے اپنے ساتھی کو حکم دیا "علی! یہ یوں نہیں مانے گا۔ اسے برگد کے درخت سے الٹا لٹکا دو۔"

علی آشوری کی طرف بڑھا اور اسے دبوچ لینے کی کوشش کی لیکن آشوری بچ کے نکل گیا۔ وہ برگد کے پیچھے چلا گیا۔ یحییٰ نے دھمکی دی "دیکھ آشوری! سیدھی طرح مان جا' ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

آشوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اچانک بہت سے سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے میدان کو ہلا کر رکھ دیا۔ میدان میں پتھریلی زمین زیادہ شور کررہی تھی۔ آشوری بھاگ کر سواروں کے سامنے کھڑا ہوکر چلانے لگا "مجھے موذیوں سے بچاؤ۔ مجھے لٹیروں سے بچاؤ۔"

یہ صنداق ترک اور اس کے تیس ساتھی تھے۔ صنداق ترک سب سے آگے تھا۔ اس نے آشوری کو پہچان لیا اور گھوڑا اس کے قریب روک دیا۔ اس کے ساتھی بھی یکے بعد دیگرے وہیں آکے رک گئے۔ یحییٰ اور اس کے ساتھی نے فوراً گھوڑوں پر بیٹھ کر راہ فرار اختیار کی۔

آشوری نے صنداق ترک کو پہچان لیا' اس نے درخواست کی "ترک سردار! ان دونوں کو مت جانے دو۔"

صنداق ترک نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا "ان کا پیچھا کرو اور تیر اندازی کرکے اسے مار گراؤ۔"

تیس کے تیس گھڑ سوار ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ صنداق ترک نے آشوری سے پوچھا "تو یہاں کیا کررہا ہے؟"

آشوری نے جواب دیا "میں قیصر کے پاس جارہا تھا کیونکہ ایک دربار سے نکل کر کسی دوسرے دربار میں تو پہنچنا ہی تھا۔"

صنداق ترک نے دونوں کے بارے میں پوچھا "وہ دونوں کون ہیں؟"

آشوری نے جواب دیا "یحییٰ اور اس کا کوئی ساتھی' میں اس سے واقف نہیں ہوں۔"

صنداق نے اپنے حافظے پر زور دیا "وہی یحییٰ جو اپنے بارہ جہادیوں کے ساتھ آیا تھا ؟"

آشوری نے جواب دیا "ہاں وہی یحییٰ۔ وہ بنیادی طور پر رہزن رہ چکا ہے اور چاہتا تھا کہ سلطان سے کوئی منصب حاصل کرکے شریفانہ زندگی بسر کرے لیکن سلطان نے کوئی منصب دینے سے انکار کردیا تھا۔"

صنداق کو بڑی جستجو تھی پوچھا "وہ یہاں تیرے پاس کیا لینے آیا تھا؟"

آشوری نے جواب دیا "وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں سلطان کے پاس سے کتنے دینار لے کر چلا ہوں' وہ دینار اس کے حوالے کردوں۔"

صنداق نے قرآنی آیات کا حوالہ دیا "ہر شے اپنی اصلیت کی طرف بھاگتی ہے۔ وہ اپنے پرانے پیشے میں واپس گیا۔"

آشوری نے کہا "میں نے یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یحییٰ اتنا برا آدمی ہے۔"

صنداق ترک خاموش ہوگیا۔ آشوری جھاڑیوں میں چھپی ہوئی دیناروں کی تھیلی صنداق ترک کے سامنے اٹھانے نہیں گیا' کیونکہ وہ صنداق پر بھی اعتبار نہیں کرسکتا تھا۔

صنداق نے کہا "اب تو قیصر کے پاس جائے گا اور اس کے لئے وہی چیزیں بنائے گا جو سلطان اور مسلمانوں کو بنا کر دے چکا ہے، کیا تو یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس سے سلطان خوش ہوگا؟"

آشوری نے کہا "میں قیصر کے پاس جا تو رہا ہوں مگر اس کے لئے وہ کام نہیں کروں گا جو سلطان اور مسلمانوں کے لئے کرچکا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

صنداق ترک نے کہا "کیا یہ مناسب نہیں کہ تو سلطان کے پاس واپس چلے کیونکہ تو نے میری اطلاع کے مطابق جس یحییٰ کی خاطر سلطان کو چھوڑا تھا اس نے تیرے ساتھ زیادتی کی اور ذرا سی بھی مروت سے کام نہیں لیا۔ اب تو سلطان کے پاس چل۔"

آشوری کسمسایا اور عرض کیا "ترک سردار! اب اگر میں واپس جاؤں گا تو اس میں مزہ نہیں آئے گا اس لئے مجھے چلا ہی جانے دیں۔"

صنداق ترک کے تیس گھڑسوار یحییٰ اور اس کے ساتھی کو پکڑ لائے۔ اس کوشش میں ایک آدمی مارا بھی گیا تھا۔ ترک سردار اس خبر سے پاگل سا ہوگیا اور پوچھا "اسے کس نے مارا؟"

سپاہیوں نے یحییٰ کی طرف اشارہ کیا "ہمارے ساتھی کو اس نے مارا ہے۔"

صنداق ترک نے کہا "میں ان دونوں کو سلطان کے پاس لے جاؤں گا اور سزا دلواؤں گا۔"

یحییٰ اور اس کا ساتھی دونوں باندھ کر صنداق ترک کے سامنے ڈال دیئے گئے۔ دونوں زخمی بھی تھے۔ یحییٰ کا چہرہ زخمی تھا اور ساتھی کا دایاں شانہ۔ آشوری نے کہا "یحییٰ سردار! میں نے آپ کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی پھر آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟"

صنداق ترک نے یحییٰ کی پشت پر پاؤں رکھ دیا "او ذلیل انسان! تو نے میرے ایک آدمی کو قتل کردیا۔ یہ کیا کیا؟ تو سلطان کے غیظ و غضب سے واقف نہیں ہے ابھی۔"

یحییٰ نے جواب دیا "ترک سردار! اس وقت میں تیرے اختیار میں ہوں اور بندھا ہوا ہوں اس لئے تیرا ہر اہانت آمیز سلوک برداشت کروں گا۔ آج میں اس پر نادم اور شرمسار ہوں کہ میں نے اس ذلیل آشوری ہنرمند کے کہنے پر اپنا قدیم پیشہ کیوں ترک کردیا تھا یہ اس غداری کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

آشوری نے کہا "میں سلطان کی روشن ضمیری کا قائل ہوگیا ہوں' سلطان نے تجھے صحیح سمجھا تھا جبکہ میں بالکل نہیں سمجھا تھا۔"

صنداق ترک نے آشوری سے پوچھا "ہاں تو اب تو بتا' ہمارے ساتھ واپس چل رہا ہے یا نہیں؟"

آشوری نے جواب دیا "نہیں' اب میں نہیں جاؤں گا۔ شاید میری قسمت میں سلطان کی ملازمت اور مصاحبت اتنی ہی لکھی تھی۔"

صنداق ترک نے اپنے ساتھیوں سے بھاری اور غم زدہ آواز میں کہا "چلو' واپس چلیں" اور آشوری سے کہا "تو اپنے فیصلے پر بہت نادم اور شرمسار رہے گا" اور وہ دونوں قیدیوں اور اپنے انتیس ساتھیوں کو لے کر سلطان کے پاس روانہ ہوگیا۔

آشوری کچھ دیر تو ان کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد جھاڑی سے دیناروں کی تھیلی نکالی اور گھوڑے پر بیٹھ کر رومی سرحد کی طرف روانہ ہوگیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شاید نصف فرسخ کے فاصلے پر تھی۔

کہانی کے تاریخی پس منظر کے ماخذ

سلاجقہ	نظام الملک طوسی	معجم البلدان	تاریخ اسلام	تاریخ طبری
مولانا مودودی	مولانا عبدالرزاق کانپوری	یاقوت حموی	ابن خلدون	امام طبری

Faisal Ahmed

شکل وصورت سے پیشہ ور مجرم نظر آنے والے ایک پی ایچ ڈی کے شب و روز۔ حوالات اس کا مقدر بن گئی تھی۔ ایک لڑکی نے اسے آزاد کرا دیا مگر وہ ایک دوسری قید میں چلا گیا۔

مزاج کے سیلانی پن نے اس کی زندگی دشوار کردی تھی

جہاں گرد

مہتاب جلیل

ڈاکٹر ویگن لٹ نے ادبیات میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اسی لیے اس کے نام کے ساتھ 'لٹ' لگا ہوا تھا جو لٹریچر کا مخفف تھا۔ اس کی معلومات خاصی وسیع تھیں اور ان معلومات کے مطابق ادبیات کے کسی اور ڈاکٹر کو اس تواتر سے جیل نہیں جانا پڑتا تھا۔ جس تواتر سے وہ جیل جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھ جیل میں کھلی تھی۔ وہ علی الصباح ہی بیدار ہوگیا تھا اس لیے اس نے قیدیوں والا مخصوص ٹین کا ڈونگا سلاخوں پر مار مار کر گارڈ کو بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مبادا دوسرے قیدیوں کی نیند میں خلل پڑے۔

ڈاکٹر ویگن لٹ کوئی جرم پیشہ یا بدطینت شخص نہیں تھا۔ وہ تو ایک نہایت شریف' نرم خو اور دردمند انسان تھا۔ اس امر سے اس کے احساسات بے حد مجروح ہوتے تھے کہ اسے

آئے دن اٹھا کر جیل میں پھینک دیا جاتا تھا۔ خصوصاً اس وجہ سے تو اسے اب زیادہ ہی چڑ ہونے لگی تھی کہ اس کے خلاف باقاعدہ طور پر کوئی الزام نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر اسے صرف اندیشۂ نقضِ امن کے تحت ہی پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اللہ نے اس کی شکل ہی ایسی بنائی تھی کہ اسے دیکھتے ہی اندیشۂ نقضِ امن محسوس ہونے لگتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس میں اب اس کا اپنا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

وہ سیلانی آدمی تھا۔ تعطیلات کے دوران عام طور پر دوسرے شہروں میں گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اور جیل جانے کا ناخوشگوار اتفاق عام طور پر اسے اجنبی شہروں میں ہی ہوتا تھا۔

اب اگر وہ کسی اجنبی شہر کی گلیوں میں آوارہ گردی کر رہا ہوتا یا کتابوں کی دکان کے فٹ پاتھ والے حصے پر کسی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی کر رہا ہوتا تھا تو اسے توقع رہتی تھی کہ ابھی کوئی پولیس والا اس کا کندھا تھپتھپائے گا اور محض کسی بے عنوان شبہے کے تحت اسے پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہے گا۔

پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد جب ضابطے کی کارروائی کے تحت ڈیسک سارجنٹ اس کی تلاشی لیتا تھا تو اس کی حیثیت کچھ اور مشکوک سی ہو جاتی تھی۔ اس کی جیب سے عام طور پر ڈیڑھ دو ہزار ڈالر کی رقم برآمد ہوتی تھی۔ بیشتر شہری اتنی نقد رقم جیب میں لے کر نہیں گھومتے تھے اور وہ بھی اس بے پروائی سے کہ مڑے تڑے نوٹوں کا بس ایک گولا سا بنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک برتھ سرٹیفکیٹ برآمد ہوتا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران فرانس میں پیدا ہوا تھا۔

پولیس کو شک میں مبتلا کرنے کے لیے تو اس کا ظاہری حلیہ ہی کافی تھا۔ اس کا قد چھ فٹ پانچ انچ تھا چہرہ کچھ تو قدرتی طور پر ٹیڑھا میڑھا سا تھا اور کچھ کشتی کے دوران چوٹیں لگ لگ کر مزید بگڑ گیا تھا۔ اس پر بھی گوبھی کے پھول کی طرح پھیلے ہوئے بڑے بڑے کان گویا سونے پر سہاگہ تھے۔ وزن ایک مدت سے دو سو پچاس پونڈ سے کم نہیں ہوا تھا۔

اس کے اپنے شہر میں پروموٹر اب مشکل سے ہی کوئی ایسا ریسلر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوتے تھے جو اس سے لڑنے پر آمادہ ہو سکے۔ جن دنوں وہ ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور باقاعدگی سے کلاسز اٹینڈ کرتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ پارٹ ٹائم کے طور پر کشتیاں لڑ کر مہینے میں اتنا کما لیتا تھا کہ نہ صرف تعلیم کے اخراجات پورے ہو جاتے تھے بلکہ گزر بسر بھی شاہانہ انداز میں ہوتی تھی۔

اس کا ریسلر ہونا اس اعتبار سے تو حیرت کا باعث نہیں تھا کہ اس کا باپ باقاعدہ ایک پیشہ ور ریسلر تھا۔ گو کہ وہ بھی ایک شریف اور نرم خو انسان تھا لیکن کتابوں سے دلچسپی اسے بہرحال کبھی نہیں رہی تھی۔ وہ تو کیا شاید ماہرینِ نفسیات بھی اس سوال کا جواب نہ دے پائے کہ گھر کے انتہائی غیر ادبی اور غیر علمی ماحول میں لڑکے کو فلسفے اور ادبیات کی موٹی موٹی کتابوں سے دلچسپی کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔

باپ کو کبھی کبھی اس کے مطالعے کا شوق دیکھ کر غصہ بھی آتا تھا اور وہ اس پر گھونسا بھی تان لیتا تھا لیکن گھونسا رسید کرنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ دراصل چودہ سال کی عمر میں بھی ویگن کا قد کاٹھ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ گھونسے کا جواب گھونسے سے دے سکتا ہے۔ اور یہ کہنا ذرا مشکل تھا کہ باپ بیٹے میں سے کس کا گھونسا زیادہ زوردار ہو گا۔

اس کے باپ کی طاقت اور پھرتی پر زوال پینسٹھ سال کی عمر میں آیا۔ ایک روز چھبیس سال کے ایک ریسلر نے اس کے سینے پر ڈراپ کک ماری اور وہ ایسا گرا کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور حرکتِ قلب رک گئی تھی۔ تاہم کشتی کا فیصلہ پھر بھی چھبیس سالہ ریسلر کے حق میں نہ ہو سکا کیونکہ مرتے وقت ویگن کے باپ کا ہاتھ رنگ کے رسّے پر تھا۔

یہ حادثہ ڈبلن میں پیش آیا اور اس کے کچھ عرصے بعد ویگن امریکا آ گیا۔ اس نے ہارورڈ اور کئی دوسری یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کر لیا۔

. . . لیکن اس وقت وہ کولول نامی ایک چھوٹے سے شہر کی جیل میں تھا۔

اس نے تو اس خیال سے ٹین کے ڈونگے سے دروازے کی آہنی سلاخوں کو نہیں کھٹکھٹایا تھا کہ دوسرے قیدیوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ مگر چند لمحے بعد ہی کسی نے ہارمونیم ٹائپ ایک پر ہنگم ساز اور دف کی دھن پر زور و شور سے ایک دعائیہ نغمہ گانا شروع کر دیا۔ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ویگن لٹ نے اس شخصیت کو بھی دیکھ لیا جو ساز اور آواز کا یہ امتزاج پیش کر رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت اور نوجوان لڑکی تھی جو کوٹھریوں کی قطاروں کے درمیان راہداری میں چلی آ رہی تھی۔ وہ سالویشن آرمی کے یونیفارم میں تھی۔

ویگن لٹ کے دل میں سالویشن آرمی کے لیے ہمیشہ نیک جذبات رہے تھے کیونکہ وہ ایک ایسی عالمگیر تنظیم تھی جو دنیا بھر میں فلاحی کاموں میں مصروف تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ سالویشن آرمی کی کسی عورت کی طرف دیکھ کر اگر ویگن لٹ اخلاقاً مسکراتا تھا تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ سالویشن آرمی کی عورتوں سے جب بھی ویگن لٹ کا سامنا ہوتا تھا، وہ عموماً

جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی ہوتا تھا۔ اس لیے وہ عورتیں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی تھیں۔

لڑکی نے دعائیہ نغمے کا آخری بول پُرجوش انداز میں گا کر نغمہ ختم کیا اور ویگن لٹ کی کوٹھری کے سامنے رک گئی۔ اس کے ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ تھی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"ڈاکٹر ویگن لٹ۔"

وہ اس نام پر حیران ضرور نظر آئی تاہم اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور وہ جلدی سے بولی۔ "تم پر مجرمانہ حملے کا الزام ہے یا کسی اور پُرتشدد کارروائی کا؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ اس بار میں کس سلسلے میں گرفتار ہوا ہوں۔" ویگن سادگی سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے تم پہلے بھی جیل جا چکے ہو؟"

"کئی مرتبہ۔"

"لیکن کیوں؟"

"اللہ نے میری شکل ہی ایسی بنائی ہے۔ جو بھی دیکھتا ہے یہی سمجھتا ہے کہ میں ابھی ابھی اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر آ رہا ہوں۔ یا کسی اور کو موت کے گھاٹ اتار کر آ رہا ہوں۔" ویگن ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"جب تم جیل میں نہیں ہوتے تو کیا کرتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا پھر گویا وضاحت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "میں یہ معلومات اپنے سماجی کاموں کے سلسلے میں جمع کر رہی ہوں۔"

"میں کتابیں خریدتا ہوں۔"

لڑکی اس جواب پر بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ "کتابوں کے لیے رقم کہاں سے آتی ہے تمھارے پاس؟"

"ریسلنگ سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کا بیشتر حصہ میں کتابوں پر خرچ کرتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" لڑکی نے گہری سانس لی۔ "ریسلنگ کی وجہ سے تمھارا چہرہ بگڑا ہوا ہے۔"

"خطرناک لگتا ہے نا میرا چہرہ؟" ویگن نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں۔" لڑکی نے اعتراف کیا۔ "لیکن جب تم مسکراتے ہو اس وقت نہیں لگتا۔"

"افسوس کہ میں اس وقت ایسی جگہ پر ہوں جہاں نہ تو تمھیں بیٹھنے کے لیے کہہ سکتا ہوں اور نہ خود تمھاری کوئی تواضع ہی کر سکتا ہوں۔ لیکن کیا میں تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام روتھ ہے۔ اور میں سالویشن آرمی میں لیفٹیننٹ کے عہدے پر ہوں۔" پھر اسے جیسے کچھ خیال آیا اور وہ نرمی سے لہجے میں بولی۔ "ویسے میں ڈیسک سارجنٹ سے بھی معلوم کر سکتی ہوں کہ تمھیں کس الزام میں جیل میں ڈالا گیا ہے۔"

"ضرور معلوم کرو۔" ویگن بے پروائی سے بولا۔ "لیکن تم چاہو تو میری بات پر یقین کر کے اس زحمت سے بچ سکتی ہو۔ مجھے محض تحفظِ امنِ عامّہ اور شک کے تحت حراست میں لیا گیا ہے۔ جونہی یہ لوگ میرے فنگر پرنٹس وغیرہ کی مدد سے تصدیق کر لیں گے کہ میں ایف بی آئی وغیرہ کو تو مطلوب نہیں ہوں، اسی وقت مجھے چھوڑ دیں گے۔ اور ایف بی آئی والوں سے یہ تصدیق اتنی مرتبہ کی جا چکی ہے کہ اب تو وہ چیک کرنے کی زحمت کیے بغیر ہی جواب دے دیتے ہیں کہ میں دیوزاد ضرور ہوں لیکن بالکل بے ضرر ہوں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "جب تم واپس جاؤ گی تو براہِ کرم دو چھوٹے چھوٹے کام کرتی جانا۔ ڈیسک سارجنٹ سے کہنا کہ میری رقم میں سے میری طرف سے تمھیں سالویشن آرمی کے تازہ ترین فلاحی منصوبے کے لیے دو سو ڈالر چندہ دے دے۔"

لڑکی کی آنکھیں قدرے حیرت سے پھیل گئیں۔ "تم۔۔۔ میرا مطلب ہے تمھارے پاس اتنی رقم کا چندہ دینے کی گنجائش ہے؟"

"گنجائش تو میرے پاس اس سے بھی زیادہ کی ہے۔ لیکن احتیاطاً فی الحال صرف اتنا ہی دے رہا ہوں۔" ویگن بولا۔ "دوسرا چھوٹا سا کام میں تمھیں خالصتاً ذاتی نوعیت کا بتانے لگا ہوں۔ ڈیسک سارجنٹ سے میری ہی رقم میں سے پچیس سینٹ مزید لینا اور مجھے ایک اخبار لا دینا۔ بس یہی کام ہے۔"

لیفٹیننٹ روتھ فوراً راہداری میں واپس دوڑتی چلی گئی۔ چند منٹ بعد ہی وہ اخبار سمیت واپس آ گئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ویگن اخبار میں سب سے پہلے اسپورٹس کے صفحات دیکھتا تھا پھر دلچسپ خبروں کی تلاش میں نظر دوڑاتا تھا۔ روتھ نے اخبار اسے دیتے وقت ایک رنگین ضمیمہ خود اُچک لیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر نہایت انہماک سے دیکھنے لگی۔ اگر اس وقت وہ نہایت سنجیدہ سماجی مشن پر نہ ہوتی تو اس پر کسی ایسی نوعمر لڑکی کا گمان گزرتا جو اپنے گھر میں آتشدان کے سامنے بیٹھ کے کُل لیٹی مطالعے سے محظوظ ہو رہی ہو۔

اپنے دیوار گیر بستر پر بیٹھ کر اخبار کا اسپورٹس کا صفحہ دیکھنے پر ویگن کو اندازہ ہوا کہ کولول شہر کے لوگ ریسلنگ کے دیوانے تھے اور مقامی اخبار میں سب سے زیادہ اہمیت ہی ریسلنگ کو دی گئی تھی۔ چوکور حاشیے میں چھپی ہوئی ایک نہایت نمایاں تصویر اور اعلان پر تو اس کی نظر جم کر ہی رہ گئی۔

وہ ریسلنگ کے مقامی چیمپین کی تصویر تھی جس کا تذکرہ صرف دی چیمپین کے نام سے کیا گیا تھا۔ تصویر میں وہ دیو قامت

گنجاد ونوں بازو فاتحانہ انداز میں بلند کیے کھڑا تھا اور نیچے اعلان چھپا ہوا تھا کہ پرانی روایت کے مطابق اس اتوار کی رات بھی چیمپئن کی طرف سے عام چیلنج کیا جارہا ہے کہ کوئی بھی آکر اس سے کشتی لڑ سکتا ہے اور دو ہزار ڈالر کا وہ انعام جیت سکتا ہے جو ہر اتوار کی رات رکھا جاتا ہے۔ مگر ایک مدت سے جسے کوئی بھی جیت کر نہیں لے جاسکا۔ اعلان کی سرخی تھی۔

چیمپئن کو اُٹھا کر رنگ سے باہر پھینکیں اور دو ہزار ڈالر انعام حاصل کریں۔

ڈاکٹر ویگن نے اٹھ کر سلاخوں کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔" سالویشن آرمی کو اگر دو ہزار ڈالر کا چندہ مل جائے تو کیسی رہے؟"

"اتنی خطیر رقم کون دے گا چندے میں؟" روتھ نے بے یقینی سے پوچھا۔

ویگن نے اخبار کا وہ ورق سلاخوں کے درمیان سے اس کی طرف بڑھا دیا جس پر مقامی پہلوان کا چیلنج چھپا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی مایوسی سے بولی۔" اوہ۔۔۔ یہ اعلان تو بالکل اسی طرح پورے دو سال سے چھپ رہا ہے۔ چیمپئن سے مقابلہ کرنے کا خیال بھی دل میں مت لانا۔ وہ ریسلر نہیں، درندہ ہے۔ جس روز ریسلنگ ہوتی ہے اس روز میں رنگ کے قریب کھڑے ہوکر دف بجا بجا کر تماشائیوں سے چندہ جمع کرنے کی کوشش کرتی ہوں اس لیے مجھے معلوم ہے کہ چیمپئن کا چیلنج قبول کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ عام طور پر انھیں اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا جاتا ہے۔ چیمپئن اپنے منہ میں بیئر کی بوتلوں کے ڈھکن چھپا کر لاتا ہے اور انھیں دانتوں تلے رکھ کر اپنے حریفوں کو کاٹ لیتا ہے۔ اس حرکت کا موقع اسے آسانی سے میسر آتا رہتا ہے کیونکہ ریفری کشتی تو کم دیکھتا ہے، کیمرے کی طرف زیادہ دیکھتا ہے۔"

چیمپئن کا وزن کتنا ہے؟" ویگن نے پوچھا۔

" دو سو بہتر پونڈ۔" روتھ نے جواب دیا پھر وہ فیصلہ کن سے لہجے میں بولی۔" تم اس سے مقابلہ نہیں کرو گے۔ وہ تمھیں جان سے مار دے گا۔" اس کے لہجے میں ویگن کے لیے ہمدردی تو تھی لیکن ساتھ ہی شاید ہلکا سا احساسِ تفاخر بھی تھا کہ اس کے شہر کا چیمپئن ناقابلِ شکست تھا۔

" قسمت آزمائی میں کیا حرج ہے؟" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

" لیکن تم جیل سے نکلو گے کیسے؟" روتھ حیرت سے بولی۔

" شاید پولیس چیف اتوار کی رات کے لیے مجھے پیرول پر رہا کر دے۔"

" پیرول پر رہائی کے لیے تمھاری ضمانت کون دے گا؟"

" تم۔" ویگن نے اطمینان سے جواب دیا۔

" میں؟" روتھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔" میں بھلا ایسا کیوں کرنے لگی؟ سالویشن آرمی والے مجھے نکال باہر کریں گے۔ تمام مراعات چھن جائیں گی اور مجھے فٹ پاتھ پر ڈیرا لگانا پڑے گا۔"

" مقابلہ ختم ہوتے ہی تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے واپس جیل پہنچا دینا۔" ویگن نے خلوص سے کہا۔

" میں اس چکر میں ہرگز نہیں پڑ سکتی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور تیزی سے قدم اٹھاتی وہاں سے چل دی۔ ڈاکٹر ویگن لٹ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس گفتگو کا بیشتر حصہ سارجنٹ بلینک بھی سن چکا تھا۔

سارجنٹ بلینک فوراً ہی مشورہ کرنے پولیس چیف ڈولبرگ کے پاس پہنچا۔ ڈولبرگ نے گزشتہ رات جب ویگن کو جیل کی کوٹھری میں دھکیلا تو اسے یہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی چٹان کو دھکیل رہا ہے۔ حالانکہ ویگن قطعاً مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ اسی وقت ڈولبرگ کو شبہ ہوا تھا کہ ویگن بھی کسی نہ کسی علاقے کا چیمپئن ضرور ہے۔ یا کبھی رہا ہے۔

اب یہ تجویز سامنے آئی تو اس کا دل چاہا کہ اس پر عمل کر کے دیکھ ہی لیا جائے۔ کسی بھی مقابلے میں مقامی چیمپئن کے ہارنے کے امکان صرف دس فی صد ہوتے تھے۔ اور ہارنے والے کو تو چونکہ کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا اس لیے کسی کو یہ معلوم ہونے کا امکان بہت ہی کم تھا کہ اسے ایک شام کے لیے جیل سے رہا کیا گیا تھا۔

چنانچہ ہوا یہ کہ اتوار کی شام اندھیرا پھیلنے کے بعد ویگن، ریسلنگ کے پروموٹر کے سامنے موجود تھا اور اسے اپنا پیشہ ورانہ ریسلر کا لائسنس دکھا رہا تھا۔

پروموٹر نے ایک نگاہِ غلط انداز میں ہی محسوس کر لیا کہ اجنبی ایک لمبا چوڑا مگر احمق انسان تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ چیمپئن کو اس کا قیمہ بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ چار منٹ درکار ہوں گے۔ لیکن اس کا ارادہ تھا کہ وہ چیمپئن سے اس مقابلے کو کچھ طول دینے کی درخواست کرے گا تاکہ ٹی وی نے اس کے لیے جو وقت مخصوص کیا ہوا تھا، وہ پورا ہوسکے اور تماشائی بھی ذرا اچھی طرح محظوظ ہوسکیں۔ انھیں محسوس ہو کہ ٹکٹ کی رقم وصول ہوگئی ہے۔ وہ لوگ ہر ہفتے کسی نہ کسی جانے پہچانے چہرے کو ہی

چیمپئن کے ہاتھوں پٹتے دیکھ دیکھ کر بور ہوچکے تھے۔

مقابلہ شروع ہونے کا وقت قریب آیا تو ویگن رنگ میں پہنچ گیا۔ وہ اپنی حیثیت کی مناسبت سے چیمپئن کے بعد رنگ میں پہنچا تھا۔ ڈاکٹر ویگن لٹ نے اسی طرح پُرتجسس نظروں سے اس کا جائزہ لیا جس طرح وہ دکان پر سجی ہوئی کسی نئی کتاب کو دیکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو کشتی بھی اسے کوئی اُلجھا ہوا ادبی مسئلہ لگتی تھی جسے وہ نہایت یکسوئی، انہماک اور سکون سے سلجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ تماشائی رنگ میں اس کا یہ انداز دیکھ کر خاصے حیران ہوتے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ریسلر ہے اور رنگ میں لڑ رہا ہے۔ چاہے وہ اپنے حریف کو اٹھا کر پٹخ رہا ہوتا یا اس کے ہاتھوں اپنی درگت بنوا رہا ہوتا، محسوس یہی ہوتا تھا کہ وہ کسی گہرے ادبی اور تخلیقی کام میں مصروف ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چیمپئن جیسا قد کاٹھ، خدوخال میں اس جیسی کرختگی اور چہرے پر اس جیسی وحشت رکھنے والے حریفوں سے ویگن کا واسطہ کم ہی پڑا تھا۔ وہ جنگل سے بھاگا ہوا درندہ معلوم ہوتا تھا۔ گردن تو اس کی تھی ہی نہیں۔ بس کھوپڑی اور کندھوں کے درمیان ایک معمولی حلقہ سا تھا۔

اس کی شکل دیکھ کر ہی ویگن کے لیے اس کی فطرت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ ان ریسلرز میں سے ایک تھا جن کے کوئی اخلاقی اصول نہیں ہوتے۔ انھیں ہر حال میں مقابلہ جیتنا ہوتا ہے۔ اور اگر حریف ان سے مار کھا رہا ہو تو وہ مقابلے کو زیادہ سے زیادہ طول دیتے ہیں۔

رنگ اناؤنسر کا نام ٹم بریڈی تھا جو پارٹ ٹائم وہاں اناؤنسمنٹ کا کام کرتا تھا ورنہ ویسے وہ حجام تھا اور اس کی دکان خوب چلتی تھی۔ وہ پستہ قد تھا اور پنجوں کے بل کھڑے ہوکر مائکروفون پر چیخ رہا تھا۔" خواتین و حضرات! بلیک کارنر میں ہمارا محبوب اور ہردلعزیز چیمپئن۔۔۔۔ کولول کا ہیرو ہے۔۔۔ وزن دو سو بہتر پونڈ ہے۔۔۔ وھائٹ کارنر میں چیلنجر ہے جس نے دو ہزار ڈالر اور ٹائیٹل جیتنے کے لیے چیمپئن کو چیلنج کیا ہے۔ وزن دو سو پچاس پونڈ۔۔۔ شہر نامعلوم۔۔۔۔ نام ہے ڈاکٹر ویگن لٹ۔۔۔۔!"

ایک ریسلر کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ سن کر حاضرین میں قہقہہ بلند ہوا۔ ویگن لٹ ان کی طرف دیکھتے ہوئے تحمّل سے مسکرا تا رہا جس طرح وہ لیکچر دیتے وقت اپنی کلاس میں مسکراتا تھا۔ وہ گھنٹی بجنے کا منتظر تھا لیکن چیمپئن نے گھنٹی بجنے کا انتظار نہیں کیا۔ بلکہ اس نے تو اپنا لبادہ بھی نہیں اتارا اور اچھل کر ویگن کے منہ پر گھونسا رسید کر دیا۔ ریفری نے گویا اس کی یہ حرکت دیکھی ہی نہیں۔ لیکن جب ویگن لٹ گھونسا تان کر چیمپئن پر جھپٹا تو ریفری مستعدی سے اچھل کر درمیان میں آگیا اور چیخ چیخ کر اسے بتانے لگا کہ اس قسم کی حرکت کے باعث وہ میچ شروع ہونے سے پہلے ہی ڈس کوالیفائی ہوسکتا ہے۔ حاضرین بھی ریفری کے اس منصفانہ طرزِ عمل پر تالیاں اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔

روتھ عین اس وقت ہی ایرینا میں پہنچی تھی اور اس نے ویگن کو گھونسا پڑتے دیکھ لیا۔ وہ اس کھلی ناانصافی پر دہشت زدہ سی رہ گئی۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ رنگ سے دُور رہی تھی اور کشتی کا نظارہ نہیں کرتی تھی کیونکہ تنظیم کے اخلاقی اصولوں کے مطابق یہ خواہ مخواہ کا تشدد تھا اور اسے کوئی پسندیدہ عمل قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

ویگن کو جب جوابی کارروائی سے روک دیا گیا تو روتھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس شہر میں ایک اجنبی کے ساتھ ہونے والی دھاندلی میں وہ بھی برابر کی شریک ہے۔ وہ دف بجانا بھول گئی اور رنگ کے قریب پہنچ کر اس نے دونوں بازو زور و شور سے لہرا لہرا کر اس زیادتی پر احتجاج کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن ہجوم کے شور وغل میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

میچ شروع ہوا اور دونوں دیوقامت انسانوں کو خونخوار انداز میں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر گویا اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی اور وہ رنگ کے قریب ایک خالی کرسی پاکر اس پر ڈھیر ہوگئی۔ تھکے تھکے انداز میں اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

حاضرین کی طرف گھومتے ہوئے کیمروں کو حسین چہروں کی تلاش رہتی ہے۔ کیمرا روتھ کے حسین اور خوابیدہ سے چہرے پر آیا تو گویا وہیں جم کر رہ گیا۔

روتھ نے دوبارہ آنکھ کھولی تو منظر بدل چکا تھا۔ مقامی چیمپئن اور ہیرو رنگ میں حیرت انگیز رفتار سے اُلٹے قدموں بھاگ رہا تھا اور ویگن لٹ اس کے تعاقب میں تھا۔ بالآخر عین روتھ کے سامنے والے کارنر میں ہی اس نے چیمپئن کو آلیا اور اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ چیمپئن بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا لیکن بہرحال ابھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ دفعتاً ویگن نے اچھل کر اسے زوردار فلائنگ کک رسید کی اور چیمپئن بے جان سے انداز میں کینوس پر ڈھیر ہوگیا۔

ویگن نے اس کے کندھے فرش پر لگانے کی زحمت نہیں کی کیونکہ وہ ویسے ہی فرش سے لگے ہوئے تھے۔ ریفری نے تین تک گنتی گننے میں پورے بیس سیکنڈ لگائے۔

اس دوران سالویشن آرمی کے ہیڈکوارٹر میں کمشنر ایٹکن کو گشت کرتے کرتے رکنا پڑا۔ کمشنر ایٹکن، سالویشن آرمی کا سربراہ تھا اور عمارت کے مرکزی ہال سے گزرتے وقت اس کی نظر

دراصل ٹی وی پر پڑ گئی تھی۔ اسکرین پر اس وقت جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ اسے دم بخود کر دینے کے لیے کافی تھا۔

سالویشن آرمی کی سب سے خوش شکل لیفٹیننٹ اپنی تمام تر سنجیدگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نہایت جوش و خروش سے اچھل رہی تھی، دف بجا رہی تھی اور نہ جانے کیا نعرے لگا رہی تھی اور کمشنر لیٹکن کے لیے نہایت ہی تشویش کا مقام تھا کہ یہ سب کچھ وہ اس وقت کر رہی تھی جبکہ سالویشن آرمی کی یونیفارم اس کے جسم پر تھی۔

پھر کمشنر نے ویگن لٹ کو رسّوں پر جھک کر رو تھ سے بات کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ ویگن لٹ کو چونکہ ٹی وی والوں کے ٹائم شیڈول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اسے چیمپئن سے کوئی خاص عناد یا دلچسپی تھی اس لیے اس نے چیمپئن کو جلد ہی لمبا لٹا کر سب کی توقعات سے بہت پہلے مقابلہ ختم کر دیا تھا اور چونکہ بہت بھوک لگ رہی تھی اس لیے وہ رسّوں پر جھک کر دراصل رو تھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اس کے ساتھ جیل واپس جاتے وقت راستے میں کھانا کھانا پسند کرے گی؟

اسی وقت چیمپئن غرّاتا ہوا اٹھا اور ویگن پر جھپٹا۔ اپنی دانست میں اس نے بے خبری میں ویگن کو دبوچنے کی کوشش کی تھی مگر ویگن نے بر وقت پلٹ کر گھٹنا آگے کر دیا۔ چیمپئن جتنے زور و شور سے آ رہا تھا اتنی ہی اذیت کے عالم میں پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو کر گرا اور پھر تڑپتا ہوا رسّے کے نیچے سے گزر کر رنگ سے باہر جا گرا۔ مگر جلد ہی سنبھل کر وہ دوبارہ رنگ میں آ گیا۔

ختم شدہ مقابلہ اس نے گویا دوبارہ شروع کر دیا۔ بالآخر ویگن نے وہی داؤ آزمانے کا فیصلہ کر لیا جو بڑے بڑے ٹیڑھے مقابلوں کو انجام تک پہنچا دیتا تھا۔ یعنی سوپلیکس۔ وہ اس داؤ کے موجد کا ہمیشہ ممنون رہا تھا اور اس میں اس نے کچھ اپنی اختراعات بھی شامل کی ہوئی تھیں۔

چند لمحے بعد ہی چیمپئن مُردہ چھپکلی کی طرح کینوس پر پڑا ہوا تھا تاہم ویگن کو معلوم تھا کہ اسے کوئی شدید چوٹ نہیں آئی ہو گی اور نہ ہی کوئی عضو ناکارہ ہوا ہو گا۔ وہ انسان تو کیا کسی مکھی کو بھی غیر ضروری گزند پہنچانا پسند نہیں کرتا تھا۔

اناؤنسر مائک پر چیخ رہا تھا۔ "خواتین و حضرات! چیمپئن ڈھیر ہو چکا ہے ... اور ... اور ... وہ دوبارہ اٹھتا دکھائی نہیں دے رہا ...... اس کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

بالآخر ویگن کا ہاتھ اٹھا کر اس کے فاتح ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ چیمپئن اٹھ کھڑا ہوا اور بن مانس کی طرح اچھلنے کودنے لگا۔ پھر اس نے وحشیانہ انداز میں اپنے سر پر گھونسے مارے اور چیخ چیخ کر حاضرین کو بتانے لگا کہ اس کے ساتھ کم از کم بیس فاؤل کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ساری کشتی کے دوران فاؤل اسی نے کیے تھے۔ تاہم اب کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

ویگن لٹ کا خیال تھا کہ پڈ موڑ ادائیگی اپنے آفس میں کرے گا مگر اناؤنسر نے اسے رنگ میں ہی بلا لیا۔ وہ کپڑوں کا بیوپاری بھی تھا اور شہر کے معززین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔

وہ نہایت نفاست اور نزاکت سے اپنا لباس سنبھالتا رنگ میں داخل ہوا۔ اس کی پتلون کی کریز تلوار کی دھار سے بھی تیز دکھائی دے رہی تھی۔ کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک ادائے خاص سے چیک بک نکالی پھر ویگن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "چیک کس کے نام سے کاٹا جائے؟"

"براہِ کرم سالویشن آرمی کے نام کاٹ دیجیے۔" ویگن نے نہایت شائستگی سے کہا۔ مائکروفون کے ذریعے اس کی آواز ٹی وی پر بھی صاف سنائی دی اور تمام تماشائیوں تک بھی پہنچ گئی۔ تالیاں گونجنے لگیں۔

اناؤنسر اگلی قطاروں کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولا۔ "سالویشن آرمی کی نمائندہ خاتون ابھی یہیں موجود تھیں ... براہِ کرم وہ جلدی سے رنگ میں آ جائیں۔"

پندرہ بیس نوجوانوں نے نہایت اشتیاق سے رو تھ کو رنگ تک پہنچا دیا۔ اتنے ہجوم کے درمیان کیمرے کے سامنے شرم سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ پڈ موڑ نے چیک کاٹ کر رو تھ کی طرف بڑھایا۔ اس نے اپنا دف کشکول کی طرح پھیلا دیا۔ پڈ موڑ نے چیک اس میں ڈال دیا۔

چیمپئن ایک عرصے سے ہر اتوار کو ہونے والی اس کشتی کا اسٹار ہوا کرتا تھا۔ آج وہ ٹوٹا تارہ بن گیا تھا۔ اس سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ہجوم کو چیر کر آگے آنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اس کی کہنی رو تھ کو لگ گئی۔ دھان پان اور نرم و نازک سی رو تھ رنگ کے رسّے سے جا ٹکرائی اور وہاں سے گڑیا کی طرح اچھل کر عین ممکن تھا کہ چاروں خانے چت گر جاتی مگر ویگن لٹ نے بازو بڑھا کر بر وقت اسے سنبھال لیا۔

چیمپئن ... یا یوں کہنا چاہیے کہ سابق چیمپئن کو یہ حرکت خاصی مہنگی پڑی۔ ویگن نے اسے بازو سے پکڑ کر غلیل کی طرح چاروں طرف گھمایا اور اچانک چھوڑ دیا۔ وہ غلیل سے نکلے ہوئے پتھر کی طرح ٹرن بکل سے ٹکرایا اور بیس منٹ کے عرصے میں تیسری مرتبہ رنگ سے باہر جا گرا۔ اس بار وہ جس طرح پھڑک کر ساکت ہوا اس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اسے بُری طرح چوٹ آئی تھی۔

رو تھ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے جا کر پہلے چیمپئن کو

ہلا جلا کر دیکھا۔ ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے یہ اس کا فریضہ تھا۔ پھر وہ ٹی وی کیمروں کی پروا کیے بغیر ویگن کے گلے کا ہار ہو گئی۔ یہ اس کے جذبات کا اظہار تھا۔

سالویشن آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں کمشنر لیٹکن نے یہ نظارہ دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سالویشن آرمی کی کوئی ممتاز کارکن کبھی اسے یہ سب کچھ کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔ اور وہ بھی ٹی وی کی اسکرین پر!

اُدھر بالآخر ویگن لٹ، رو تھ کے ساتھ جیل کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔ وہ راستے میں کھانا کھانے کے لیے نہیں رک سکے۔ کیونکہ چند منٹ کے اندر اندر پورا شہر انھیں پہچاننے لگا تھا اور انھیں اندیشہ تھا کہ وہ کھانا کھانے بیٹھے تو ان کے گرد ہجوم جمع ہو جائے گا۔

اپنے قیدی کو واپس "وصول" پا کر پولیس چیف ڈولبرگ کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کشتی کے بارے میں شرط لگا کر وہ ڈیڑھ سو ڈالر جیت چکا تھا لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ افواہیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ویگن لٹ ایک حوالاتی تھا اور لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا اسے صرف مقامی ہیرو کی پٹائی کرنے اور اسے ذلیل کرنے کے لیے رہا کیا گیا تھا؟

وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے ویگن لٹ سے مخاطب ہوا۔ "میں نے تصدیق کر لی ہے۔ تم ایف بی آئی کو مطلوب نہیں ہو۔ شیرف کو بھی تم مطلوب نہیں ہو۔ اور یہ بات تو بالکل یقینی ہے کہ مجھے بھی تم مطلوب نہیں ہو۔"

"یعنی مجھے رہا کر دیا گیا ہے؟ میں جانے کے لیے آزاد ہوں؟" ویگن نے تصدیق چاہی۔

"میں تمھیں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ آؤں گا۔" ڈولبرگ نے فوراً کہا۔

"کافی رات ہو چکی ہے ...!" ویگن قدرے تشویش سے بولا۔ "اگر تم مجھے یہ رات جیل میں ہی گزار لینے دیتے تو بہتر تھا۔ تمھاری جیل کی کوٹھری خاصی آرام دہ ہے۔ اس سے پہلے مجھے اتنی اچھی کوٹھری میں قیام کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"اب تو کوئی کوٹھری خالی نہیں رہی۔" چیف نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کچھ ہی دیر پہلے دو شرابیوں اور ایک آوارہ گرد کو حراست میں لیا گیا ہے۔"

یوں ویگن کو با دلِ ناخواستہ چیف کی کار میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن آنا پڑا جہاں وہ اسے فوراً خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

کولن چھوٹا شہر تھا مگر اس کا ریلوے اسٹیشن کافی بڑا تھا اور اس وقت سنسان پڑا تھا۔ انتظار گاہ کی نشستیں کم از کم ویگن لٹ کے لیے بہت چھوٹی اور غیر آرام دہ تھیں اس لیے وہ اسٹیشن پر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اس دوران دو ٹرینیں آ کر گزر بھی گئیں۔ ویگن لٹ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کون سی ٹرین پکڑنی چاہیے اور کہاں جانا چاہیے؟

ویران پلیٹ فارم پر وہ اس وقت بھی اسی الجھن میں ٹہل رہا تھا جب اس نے ایک لڑکی کو آتے دیکھا۔ لڑکی متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی پلیٹ فارم کی طرف آ رہی تھی۔ ویگن پہلے تو اسے پہچان نہیں سکا کیونکہ اس نے اسے صرف یونیفارم میں دیکھا تھا۔ اور عام لباس میں وہ کہیں زیادہ دلکش، پہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

ویگن لٹ کو دیکھ کر وہ دوڑتی ہوئی اس کی طرف آئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ "خدا کا شکر ہے تم ابھی یہیں ہو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چل رہی ہوں۔" اور تب حیران و پریشان ویگن لٹ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں سفری بیگ بھی موجود تھا۔

"خیریت ...؟" وہ تھوک نگل کر بولا۔ "کیا سالویشن آرمی والوں نے تمھیں نکال دیا؟"

"شاید نکال ہی دیتے۔ لیکن وہ میری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ خصوصاً آج میں نے جو دو ہزار ڈالر کا چیک انھیں دیا، وہ تو ایک ریکارڈ تھا۔ کسی بھی شخص نے انفرادی طور پر آج تک اتنی بڑی رقم چندے میں نہیں دی۔ کارپوریشنز اور کمپنیاں تو دیتی رہتی ہیں۔ مگر وہ دوسری بات ہے۔ میں نے چیک کمشنر کے حوالے کر کے استعفا دے دیا۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ میری منزل سالویشن آرمی نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے تمھاری منزل؟" ویگن نے سرسراتی سی آواز میں پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ منزل جو کچھ بھی ہے، جہاں بھی ہے، وہاں تک میں تمھارے ساتھ ہی پہنچوں گی۔" اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔

چند لمحے بعد وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بکنگ کلرک کی کھڑکی کے سامنے پہنچے اور ویگن لٹ نے ایک بڑا نوٹ کلرک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دو ٹکٹ دے دیجیے۔ کہیں کے بھی۔ ہم وہ مسافر ہیں جنھیں اپنی منزل معلوم نہیں۔"

کلرک کی حیرانی دیکھ کر وہ دونوں بیک وقت ہنس دیے۔

THE CHIVALROUS CHALLENGER
Malcolm Stuart Boylan.

Faisal Ahmed

میرے والد ایک رشوت خور افسر تھے۔ ان کی موت کے بعد میری سوتیلی ماں نے مجھے میری ماں سمیت گھر سے نکال دیا۔ ماں اس صدمے سے انتقال کر گئی اور میں کراچی چلا آیا جہاں منشیات فروش تنظیم شی کا آلۂ کار بن گیا۔ اس دوران میں غزالہ میرے دل کی دھڑکن بن گئی۔ اس نے میرے ضمیر کو جھنجوڑا اور ہم اپنے دیگر دوستوں جہانگیر اور سلطان شاہ کے ساتھ ان موت کے سوداگروں کے پیچھے پڑ گئے۔ تنظیم کا مقامی سربراہ ہماری بیخ کنی کے لیے خود سامنے آیا مگر مارا گیا۔ میری ملاقات ویرا لائیڈ سے ہوئی۔ تنظیم کا سربراہ جمی لائیڈ اپنی اس بیٹی کو ایک حادثہ سمجھ کر بھول چکا تھا۔ ویرا مجھ سے اس شرط پر تعاون کرنے پر تیار تھی کہ میں اس کے باپ کی تلاش میں اس کا ساتھ دوں۔ ہم نے لائیڈ کاٹیج کو تباہ کر دیا۔ کاٹیج کے خفیہ کمرے میں ویرا نے اپنے باپ کا پورٹریٹ دیکھ کر اسے اٹلی کے بدنام زمانہ غنڈے کی حیثیت سے پہچان لیا۔ موت کے سوداگروں سے نبرد آزمائی کے دوران میں غزالہ مجھ سے بچھڑ کر لندن پہنچ گئی۔ میں بھی اس کی تلاش میں لندن پہنچا۔ وہاں ہمیں سنگین حالات پیش آئے۔ ہم گرفتار بھی ہوئے مگر دوستوں نے چھڑا لیا۔ ہم فرانس پہنچے۔ ہمارے اور شی کے درمیان آنکھ مچولی بدستور جاری تھی۔ غزالہ کا بھی اب تک کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ اٹلی پہنچنے پر ہمارے ہاتھ سلور آئی بھی لگی جو ہمارے بہت کام آئی۔ وہاں خاصا ہنگامہ برپا کرنے کے بعد ہم پاکستان روانہ ہونے کے لئے ائرپورٹ پہنچے جہاں ہماری ملاقات مافیا کے ایجنٹ فرانکو لومبارڈی سے ہوئی۔ اس نے مجھے مافیا کے لیے کام کرنے کی پیش کش کی۔ میں نے جان چھڑانے کے لئے پاکستان سے واپسی تک کی مہلت طلب کی اور کراچی پہنچ گیا۔ جہانگیر کے گھر پہنچنے پر اس کی بیوی سلمٰی نے مجھے غزالہ کی بے وفائی کی روح فرسا خبر سنائی۔ میں غزالہ سے مل کر فوراً حقیقت جاننا چاہتا تھا۔ بہ صد تلاش بسیار سلطان شاہ یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوا کہ اب غزالہ مسز دلدار آغا بن چکی ہے۔ دلدار آغا جاز فارماسیوٹیکل کمپنی کا مالک اور کراچی میں شی کی سرگرمیوں کا ذمے دار تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں غزالہ سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلدار نے غزالہ کے گرد اپنی عظمت و شرافت کا حصار قائم کر رکھا تھا جسے توڑنے کے لیے ٹھوس ثبوت درکار تھے۔ میں نے اسی دوران میں مافیا کے کراچی بیورو چیف سے ملاقات کا وقت لیا اور معاملہ طے ہو جانے کے بعد مافیا کا کارندہ بن گیا۔ ادھر سلطان شاہ جاز فارماسیوٹیکل کمپنی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں سے خفیہ طریقے سے ہیروئن اسمگل کی جاتی ہے۔ دلدار نے میرے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے جہانگیر کو اغواء کر لیا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی کارروائی کرتا' اس نے جہانگیر کو میری نشاندہی کی تاکید کے ساتھ چھوڑ دیا۔

میں نے دلدار پر حملہ کیا مگر وہ بچ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دلدار کی اصلیت جان لینے کے بعد غزالہ وہاں سے فرار ہو گئی تھی۔ دلدار نے جھنجلا کر شہر میں دہشت گردی شروع کرا دی۔ لالوکھیت میں اپنی گاڑی سے اندھادھند فائرنگ کرتے گزرتے ہوئے وہ ایک ہجوم میں گھر گیا۔ مجھے اس کے زندہ بچنے کی امید نہ تھی۔ مافیا کے زیرِ انتظام کلب کے معائنہ کے دوران میں کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک مرحلے پر دلدار آغا سے پھر سامنا ہوا جو معجزانہ طور پر زندہ رہ گیا تھا۔ چوکنڈی کے قبرستان میں اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگایا۔ اگلے ہی روز ویرا کراچی آدھمکی۔ اسی نے یہ حیران کن بات بتائی کہ ڈی ڈی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس نے سیٹلائٹ کے ذریعے جمی لائیڈ کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دلدار کے بعد اب وہ پاکستان میں شی کی کرتا دھرتا تھی اور مجھے راہِ راست پر لانا چاہتی تھی۔ میرے بار بار کے انکار پر بھنا کر اس نے جہانگیر کے گھر پر چڑھائی کر دی جہاں میں موجود تھا۔ میں نے مافیا کی کمک طلب کی اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ مافیا کے مقامی چیف کے زیرِ زمین چلے جانے کے بعد شی اور مافیا میں تصادم کرا کے میں ان دونوں تنظیموں کو کمزور کرنے کے لیے آزاد تھا۔ میں نے سب سے پہلے ماچے کا اڈا تباہ کر دیا۔ ویرا مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لئے غزالہ کی طرف متوجہ تھی اور اس بات سے آگاہ ہو چکی تھی کہ وہ میرے ساتھ نہیں۔ اس نے غزالہ کے بھائی کامران سے اس کا ٹھکانا پوچھ کر کامران کو مار ڈالا۔ غزالہ کے ٹھکانے پر ہم دونوں بیک وقت پہنچے مگر غزالہ نہ ملی۔ بوڑھی ماسی کے روپ میں اس کا سلطان شاہ سے سامنا ہوا۔ سلطان تو اسے نہ پہچان سکا مگر غزالہ نے بھی شناسائی کا اظہار نہ کیا۔ میں اس کی طرف سے بددلی کا شکار ہونے لگا چنانچہ جب ویرا نے رابطہ قائم کر کے ہوٹل میں ملنے کی پیش کش کی تو میں تیار ہو گیا۔ گفتگو کے دوران میں اس کی نگاہ گلدان میں پوشیدہ مائکروفون پر پڑی۔ جس طرح اس نے وہ آلہ تباہ کیا اس سے میں سمجھ گیا کہ یہ اس کے باپ کی کارستانی ہے۔ میں نے اسے جمی کے خلاف مزید ورغلایا۔ ملاقات کے اختتام تک وہ میرے بارے میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے ایک پولیس افسر کو غزالہ کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ معلوم ہوا' وہ گرفتار ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی پاداش میں اسے مروا دیا اور ایک بدعنوان سابق افسر کو غزالہ کی رہائی کا بندوبست کرنے کو کہا۔ ویرا' غزالہ کے معاملے میں رضاکارانہ طور پر میری مدد کر رہی تھی۔ اسی نے اطلاع دی کہ کچھ نامعلوم لوگوں نے اس تھانے پر دھاوا بول دیا ہے جہاں غزالہ قید تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ریاض ٹیڈی کے آدمی تھے جو جانو ماچھی کو رہا کرانے آئے تھے اور جاتے جاتے مالِ غنیمت کے طور پر غزالہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ فرمان خان نے غزالہ تک پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔ میں نے اپنے تمام تر ذرائع بروئے کار لاتے ہوئے غزالہ کی بازیابی کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ جانو ماچھی بدنامِ زمانہ رنگین مزاج ڈاکو تھا۔ ادھر ویرا نے ایک اجنبی کے ہاتھوں پریشان ہو کر مجھ سے مدد چاہی۔ وہ اجنبی دشمن ملک کا ایجنٹ تھا اور ویرا سے بھاری مقدار میں اسلحے کی خریداری کا خواہش مند۔ وہ پڑوسی ملک کے ایک سفارتی عہدے دار کا شناسا تھا جو ملک میں دہشت گردی کا ذمے دار تھا۔ میں نے تمام واقعات سلطان شاہ کو سنائے۔ وہ اس سفارتی عہدے دار کو اغواء کرنے کی نیت سے فوراً اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میں نے فون کر کے جہانگیر کو بلا لیا۔ ابھی ہمیں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر آنے والی ہستی کو دیکھ کر جہانگیر کی آنکھیں پھیل گئیں اور ہاتھ میں موجود گلاس چھوٹ کر گر گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ کیجیے

اُسے دیکھ کر جہانگیر پر ایسی سراسیمگی طاری ہوئی کہ وہ قطعی غیرارادی بلکہ مشینی طور پر اپنی کرسی سے اٹھتا چلا گیا۔ اُس کے انداز میں خوف کے ساتھ ہی عزت و تکریم کا پہلو بھی نمایاں تھا۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی۔" میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ "نقب زنی کرنے کے بجائے تم ڈور بیل بھی بجا سکتی تھیں۔"

"میں نے سوچا کہ کہیں گھنٹی کی آواز تمھاری نیند میں مخل نہ ہو۔" اُس نے مڑی ہوئی ناکارہ بال پن ڈسٹ بِن میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "جب تک تم یہ ناکارہ قفل نہیں بدلواؤ گے میں اسی طرح آتی رہوں گی۔"

میں نے اُس کا نام نہیں لیا تھا اور نہ ہی جہانگیر نے کبھی ویرا کو دیکھا تھا اور نہ ہی اُس کی کوئی تصویر دیکھی تھی پھر بھی اُس نے ویرا کو محض اندازے سے شناخت کر لیا تھا۔

اُس کی اس وقت کی کیفیت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ویرا سے غائبانہ طور پر ہی بہت خائف تھا۔ ویرا کے اچانک سامنے آجانے سے اُس کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اُس کے لیے ویرا جمی لائیڈ کی بیٹی اور اُس شی کی سربرآوردہ شخصیت تھی

جس کو پروان چڑھانے کے لیے جہانگیر نے دن یارات کی پروا کیے بغیر اپنے خون پسینے کی قربانی دی تھی۔ اُس زمانے میں شی والوں میں ویرا بلیک کوئین کے نام سے جانی جاتی تھی اور مدتوں میں شاید دو بار ہم لوگوں کے سامنے آئی تھی۔ بلیک کوئین کے روپ میں وہ سر سے پیر تک سیاہ اور چست لباس میں ملبوس ہوتی تھی۔ کوئی اس کی صورت سے واقف نہیں تھا لیکن اس کی بربریت اور سفاکی سے ہر ایک ہی لرزہ براندام رہتا تھا۔ ایک اجلاس میں تو ویرا نے کسی بات پر ناراض ہو کر کھڑے کھڑے اپنے ہی ایک اہم کارکن کو گولی مار کر موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اُس نے اجلاس میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا لیکن بلیک کوئین کی ہیبت کی وجہ سے اُس کے دن رات کے ساتھی بھی اُس کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس لاش کو چھیڑے بغیر وہ اجلاس اس طرح جاری رہا تھا جیسے ویرا نے اپنے سر پر بھنبھنانے والی کسی مکھی کو مارا ہو۔ اجلاس کے اختتام پر وہ لاش پر نگاہ ڈالے یا اُس کے بارے میں کسی کو کوئی ہدایت دیے بغیر سرد مہری کے ساتھ وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

ویرا کے صرف اس بھیانک روپ سے واقف ہونے کی وجہ سے جہانگیر کی دہشت اپنی جگہ حق بجانب تھی۔ ویرا کے بارے میں سنائی ہوئی سلطان شاہ کی کہانیاں اور سلمٰی کی تلخ کلامیاں بھی جہانگیر کے دل سے اُس کا خوف کم نہیں کر سکی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ شی پر بُرا وقت آنے کے ساتھ ساتھ اُس کا شیرازہ اس طرح بکھرا تھا کہ بعد میں آنے والوں میں سے کسی نے جہانگیر سے کام لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی ورنہ وہ اُس وقت بھی شی کا ایک وفادار کارندہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شی میں ایک مرتبہ شمولیت اختیار کر لینے کے بعد ہر شخص زندگی بھر شی کا غلام رہتا ہے یا اپنی قیادت کے فیصلوں سے انحراف کرنے پر مار دیا جاتا ہے۔ شی کو چھوڑ کر یا اس سے باغی ہو کر کوئی زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی وجہ سے زیرِ زمین دنیا میں شی کے کسی سابقہ کارکن کا کوئی وجود نہیں ملتا تھا۔ یہ اعزاز صرف میرے ہی نصیب میں آیا تھا یا پھر میرے ستارے یاور تھے کہ میں اُن لوگوں سے بغاوت کر کے بھی اُن کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے زندہ تھا۔

شی والا رابطہ ٹوٹ جانے کے بعد جہانگیر نے چند روز قبل ویرا کے وہ بھیانک تیور بھی دیکھے تھے جب وہ مسلح آدمیوں کے جتھے لے کر مجھے ہلاک کرنے کے ارادے سے جہانگیر کے مکان پر چڑھ دوڑی تھی۔ اُس رات ویرا نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جہانگیر کے گھر پر اس قدر شدید حملہ کیا تھا کہ گھر میں محصور ہو جانے والے ہر فرد کو وہ کائنات کی آخری طویل رات محسوس ہونے لگی تھی جسے ٹالنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

جہانگیر کے ذہن سے ویرا کی وہ دہشت دُور کرنے کے لیے مجھے اپنی جانب سے پیش رفت ضروری محسوس ہو رہی تھی ورنہ وہ ویرا کے قریب کے خوف سے ہی سہم کر اپنا خاصا وزن کھو بیٹھتا۔ ویرا بھی پکّی بدمعاش تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ میں خواب گاہ میں اکیلا نہیں تھا اور شاید وہ یہ قیاس بھی کر چکی تھی کہ وہ میرا جگری دوست، جہانگیر تھا لیکن اُس نے ابتدا سے ہی اُسے بُری طرح نظرانداز کیا ہوا تھا۔ ایک بار بھی اُس سے مخاطب نہ ہوئی تھی اور نہ اُس پر نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

"یہ میرا دوست جہانگیر ہے اور یہ میری دوست ماریانا گبرائیل۔" میں نے اُن دونوں کا رسمی تعارف کراتے ہوئے اُن سے باری باری مخاطب ہو کر اُن کے نام دُہرائے۔ جہانگیر کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس مرتبہ ویرا ایک فرضی نام سے پاکستان میں وارد ہوئی تھی مگر ویرا کو بھی یہ جتانا مقصود تھا کہ میں نے اپنے قریب ترین دوست کو بھی اُس کے راز میں شریک نہیں کیا تھا کیونکہ وہ خود اس بارے میں رازداری کی خواہاں تھی۔

تعارف ہوتے ہی ویرا نے باچھیں پھیلا کر بلاتردد اپنا داہنا ہاتھ جہانگیر کی طرف بڑھا دیا۔ جہانگیر نہ کچھ بول سکا اور نہ ہی اُس سے نظریں چار کرنے کی ہمت کر سکا۔ میں نے دیکھا کہ ویرا سے مصافحہ کرتے ہوئے اُس کا داہنا ہاتھ یوں کانپ رہا تھا جیسے اُس پر رعشہ طاری ہو گیا ہو۔

خواب گاہ میں دو کرسیاں موجود تھیں۔ تیسرا میرا بستر تھا۔ لیکن وہ کمرا تین افراد کی نشست کے لیے ناکافی تھا۔ اس لیے میں اپنا گلاس لے کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ "بوتل وغیرہ بھی ڈرائنگ روم میں لے آؤ۔ ماریانا بھی ہمارا ساتھ دے گی۔" میں نے چلتے چلتے جہانگیر سے کہا تھا۔

"مادام کے لیے اسکاچ ہی چلے گی یا شیری کا بندوبست کروں؟" جہانگیر نے ہم دونوں کی تقلید کرتے ہوئے کسی جدّی پشتی غلام کی طرح مجھ سے سوال کیا تھا۔

میں اُس کی بزدلی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ویرا کی سفید چمڑی اور شی میں اُس کی بالادستی کے باوجود اس کے تعارف کی رسم اردو زبان میں ادا کی گئی تھی جو جہانگیر کو اس

لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کر خاصی مار کھا لینے کے باوجود اُس کی آنکھوں میں حوصلے کی چمک برقرار تھی۔

مَیں نے لاپروایانہ انداز میں سب مشین گن پر اپنی گرفت تبدیل کر کے اُس کی سرد آہنی نال اپنے ہاتھ میں لے لی اور پھر اچانک ہی گھما کر اُس کا آہنی دستہ کرنل مہیش پال کے چہرے پر بائیں طرف رسید کر دیا۔

کئی ہڈیاں چٹخنے کی لرزہ خیز آواز کے ساتھ ہی وہ بُری طرح جنگھاڑتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا اور اُسی لمحے جہانگیر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

مہیش پال فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر خون تھوک رہا تھا۔ خون کے سُرخ لوتھڑوں میں ٹوٹے ہوئے سفید دانت اور اُن کی کرچیں بھی دُور ہی سے دیکھی جا تی تھیں۔

اس ضرب سے اُس کے دہانے میں اتنی شدید شکست و ریخت ہوئی تھی کہ وہ مُنہ بھر کر خون تھوکنے سے فارغ نہ ہوتا تھا کہ تازہ خون دوبارہ اُس کے دہانے میں بھرنے لگتا تھا۔

"اُس کی کھال کافی جگہوں سے پھٹ چکی ہے۔ ان کھلے ہوئے زخموں پر اسپرٹ لگاؤ تاکہ اس کے ہوش ٹھکانے آسکیں۔ مَیں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔" مَیں نے سرد لہجے میں جہانگیر کو ہدایات دیں اور خود اُس کمرے سے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

"نہیں! میری ہدایت پر مہیش پال کے حلق سے خرخراتی ہوئی کرب ناک آواز برآمد ہوئی تھی۔" میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔ مَیں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔۔۔"

"بکواس بند کر اُلّو کے پٹھے!" جہانگیر نے بھی اس کی پشت پر ایک ٹھوکر رسید کر دی۔" یہاں صرف باس کا حکم چلتا ہے۔ زبان نہیں کھولے گا تو تیرے مرنے کا انتظار کیے بغیر تیرے زندہ بدن پر اسپرٹ چھڑک کر آگ لگا دی جائے گی اور تو شعلوں کا ناچ ناچنا شروع کر دے گا۔"

"اوہ بھگوان!" وہ بہت دردبھری آواز میں کراہا تھا۔" یہ کیا کلجگ آن لگا ہے۔ پتا نہیں یہ میرے کس پاپ کی سزا ہے جو مجھے موت بھی نہیں آ رہی۔۔۔"

مَیں نے اُس کی مزید فریاد سنے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

دروازے کے باہر ایک مختصر سی راہداری تھی جس میں دو کُرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسی راہداری کے ایک گوشے سے زینے اوپر جا رہے تھے۔

مَیں نے اپنی سر سے گردن تک چڑھا ہوا چُست نقاب اُتارا اور وہیں ایک کرسی پر دراز ہو کر اپنے لیے سگریٹ سُلگالی۔ کرنل مہیش پال سے اس مقابلے میں مجھے کوئی شدید محنت نہیں کرنا پڑی تھی لیکن اس کی ذہانت اور قوتِ برداشت نے اعصابی طور پر مجھے تھکا ڈالا تھا۔

مجھے نظر آ رہا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھوں سسک سسک کر دَم توڑ دے گا لیکن نہ کوئی اعتراف کرے گا اور نہ ہی کوئی اور کام کی بات اُگل کر دے گا۔

چند ثانیوں بعد میرے کان اندر سے آنے والی چیخوں پر مرکوز ہو گئے۔ جہانگیر نے مقفّل کیبنٹ سے اسپرٹ نکال کر اس کے زخموں کی دھلائی شروع کر دی تھی یا پھر اس پر تشدّد کا کوئی دوسرا دَور شروع کر دیا تھا۔ وہ کمرا خاصی حد تک ساؤنڈ پروف تھا لیکن کرنل مہیش پال کی، ذبح ہوتے ہوئے سانڈ جیسی چیخوں کو اندر ہی مقید رکھنا ان دیوار و بام کے بس سے باہر تھا بلکہ میرا تو خیال تھا کہ وہ آوازیں اوپر موجود ملازمین تک بھی پہنچ رہی ہوں گی جن کی کُل تعداد صرف دو تک محدود رکھی گئی تھی۔

مَیں نے نہ کوئی آہٹ محسوس کی اور نہ کوئی سایہ دیکھا، مَیں بس چھٹی حس کے تحت اچانک ہی پیچھے مُڑا تھا اور پھر بھونچکا ہو کر بے اختیار اپنی کُرسی سے اُٹھتا چلا گیا۔

زینوں والے نیم روشن خلا سے ویرا اس حالت میں بے آواز قدموں سے فرش پر اُتر رہی تھی کہ اس کے ایک ہاتھ میں پستول موجود تھا اور وہ برہنہ پا تھی۔

اُس نے اضطراری طور پر پستول کی نال میری طرف گھمائی تھی اور تقریباً ہذیانی سرگوشی کے عالم میں بولی تھی۔" اندر کون ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ تمھاری گردن سے یہ سیاہ نقاب کیوں جھول رہا ہے؟"

"جہاں ہو، وہیں سے واپس لَوٹ جاؤ ویرا!" مَیں نے اپنی سب مشین گن پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔" یہ میرا کھیل ہے۔ مَیں تمھیں اس میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتا۔" میرا لہجہ سرد اور تحکمانہ تھا۔

"دوستی ہو جانے کے بعد اب کوئی بھی کھیل صرف تمھارا اپنا نہیں رہا ہے ڈیئی!" آگے بڑھتے ہوئے وہ دھیمے اور مکّارانہ لہجے میں بولی۔" تم تو اندرونِ سندھ جانے والے تھے پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟ مَیں تمھارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے جہانگیر سے ملنے آئی تھی لیکن اوپر کی تو فضا ہی عجیب ہے۔۔"

"رُک جاؤ ویرا!" مَیں غصّے سے اپنا ایک پاؤں زمین پر مار کر غرّایا۔" مزید آگے بڑھو گی تو مَیں فائر کر دُوں گا۔"

وہ جہاں تھی وہیں منجمد ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی قہر بار نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اندر سے اُبھرنے والی کرنل مہیش پال کی چیخوں میں اِس وقت بَلا کی شدّت پیدا ہو چکی تھی۔

انسانیت کے دشمنوں کی اس داستانِ عبرت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے

مغرب سے درآمد ایک پُراسرار اور بے قرار ماجرا

وہ دونوں میاں بیوی ایک مکان کے مالک بنے مگر اُس مکان کا ایک اور حق دار نکل آیا جس نے اُن دونوں کی زندگیوں میں ہلچل پیدا کر دی۔

دعویدار

فضہ ہاشمی
Faisal Ahmed

کچھ اُس وقت شروع ہُوا، جب [illegible] آرتھر کے نام آسٹریلیا سے خط موصول ہوا۔ مَیں ڈاک چھانٹ رہی تھی کہ میری نظر اُس خط پر پڑی۔

"ارے دیکھو۔" مَیں نے کہا۔" میرا خیال ہے آسٹریلیا میں تو ہمارا کوئی جاننے والا نہیں رہتا!"

"بالکل نہیں رہتا۔" آرتھر نے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔" چلو۔۔۔ اب کھولو بھی، یہ تمھیں کاٹے گا تو نہیں۔" مجھے اپنے الفاظ اب بھی یاد ہیں۔

اُن دنوں صُبحیں بہت چمکیلی ہوتی تھیں۔ مکان ایسٹ اوین تھا۔ مَیں صُبح سویرے کھڑکیاں کھول دیتی تھی تاکہ پینٹ کی بُو تازہ ہوا اُڑا کر لے جائے۔ ہم جس دن وہاں منتقل ہوئے تھے اسی روز کاریگروں نے بھی اپنا کام مکمل کیا تھا اسی لیے ہر چیز بے حد تازہ تازہ اور اچھی اچھی لگ رہی تھی۔

مکان اگرچہ کافی قدیم تھا مگر ہمیں بالکل نیا محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں ہنستے۔ ہماری شادی کو ۳۵ سال ہو چکے ہیں مگر ایک دوسرے کے لیے ہمارے جذبات اب بھی ازدواجی زندگی کے شروع کے دنوں جیسے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری محبت اور بڑھ گئی تھی۔

جب ہم پُرانا گھر چھوڑ رہے تھے تو ہمارے ملنے والے سمجھتے تھے کہ ہم حماقت کر رہے ہیں۔" تم یہاں سے جانے کے بعد کیا کرو گے؟" وہ پوچھتے۔ کیونکہ آرتھر کے پاس باغبانی کے سوا کوئی معروفیت نہیں تھی۔" وقت کیسے گزارو گے؟"

جب آرتھر سے میری ملاقات ہوئی تھی تو وہ مغربی علاقے میں رہنے کے خواب دیکھتا تھا۔ ہم نے اپنا ہنی مُون بھی مغرب میں گزارا تھا اور ہر سال چھٹیاں بھی وہیں گزارا کرتے تھے اور اب وہ

دن آپہنچا تھا کہ آرتھر نے اپنا چلتا ہوا کامیاب بزنس معقول داموں فروخت کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین میں اپنے لیے مکان خرید لیا تھا۔ ہمیں زیادہ پریشانی بھی نہیں ہوئی کیونکہ ہمارا کنبہ دو افراد پر مشتمل تھا، میں اور آرتھر۔

میں نے زندگی میں کبھی کسی انسان کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا جتنا آرتھر تھا۔ اس نے اپنا کاروبار اپنی محنت سے چمکایا تھا اور اب وہ اسے فروخت کر کے باقی زندگی اس علاقے میں گزارنا چاہتا تھا جس کے اس نے ساری عمر خواب دیکھے تھے، یہ اس کا حق تھا اور میں اس کی خوشی میں خوش تھی۔

نئے مکان میں منتقل ہوئے ہمیں تین ہفتے ہوئے ہوں گے کہ وہ خط آگیا۔ موسم خوشگوار تھا۔ کبھی تیز دھوپ نکل آتی اور کبھی بادل چھا جاتے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں وقت کتنی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا، یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ ہمارا گھر گاؤں سے کچھ دُور دریا کے کنارے پر تھا۔ لوگوں کا اس طرف آنا جانا کم ہی ہوتا تھا۔ رات کو باہر اندھیرے اور سمندر کی موجوں کے ساحل پر سر پٹخنے کی آوازوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

اُسی روز ڈاک میں میری کا خط بھی تھا۔ اس خط کو پا کر میں تھوڑی دیر کے لیے آسٹریلیا کو بھول گئی۔ میری نے اپنے خط میں اس خوشخبری کا ذکر بھی کیا تھا جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔ میں خط پڑھنے میں مگن تھی کہ آرتھر کی پھنکار نے مجھے چونکا دیا اور جب آرتھر نے مجھے بات بتائی تو میں حیران رہ گئی۔ اس نے بتایا کہ آسٹریلیا سے موصول ہونے والے اس خط میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ مکان فریسندہ کا ہے، اور اس کے سلسلے میں کسی بھی طرح کا معاملہ کرنے کا حق صرف اور صرف اُس کا ہے۔ یہ مکان اُس کا خاندانی ورثہ ہے اور کسی کو اس پر قبضہ جمانے کا کوئی حق نہیں۔ آنجہانی جے ہوبرٹ اُس کے انکل تھے اور وہ ان کا اکلوتا وارث ہے اور یہ کہ وہ اِس گھر کی ایک اینٹ بھی کسی کو دینے کا روادار نہیں۔

آرتھر نے وہ مکان تمام قانونی کارروائیاں پوری کرنے کے بعد خریدا تھا۔ اس خریداری میں کہیں کوئی سقم نہیں تھا۔

یہ درست ہے کہ مسٹر جے ہوبرٹ اس مکان کے مالک تھے۔ ان سے پہلے ان کے آباؤ اجداد اس گھر میں رہتے چلے آئے تھے لیکن مسٹر ہوبرٹ نے مرتے وقت کوئی وصیت نہیں چھوڑی تھی۔ آرتھر نے جس وکیل کے توسط سے یہ مکان خریدا، وہ اس کی غفلت سے پوری طرح مطمئن تھا۔ وہ آنجہانی جے ہوبرٹ کا بھی قانونی مشیر تھا۔ مسٹر ہوبرٹ نے اسی سے اپنی وصیت لکھوائی تھی۔ پھر ایک دن مسٹر ہوبرٹ اس کے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ وصیت نامے کو ان کی نگاہوں کے سامنے پھاڑ دیا جائے۔ وکیل نے اُن سے پوچھا بھی کہ کیا وہ نئی وصیت لکھوانا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد انھیں قضا نے آلیا۔ وکیل جانتا تھا کہ اُن کے پاس اس مکان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے قرض کے سوا کچھ نہیں چھوڑا ہے پھر اُن کے قرض خواہوں نے مطالبات شروع کر دیے۔ قرض کی ادائی کی واحد صورت یہ تھی کہ مکان فروخت کر دیا جائے۔

بات بالکل سیدھی سی تھی۔ مسٹر ہوبرٹ اپنی نسل کے آخری فرد تھے۔ اُس وقت کسی بھتیجے کا تذکرہ ہی نہیں ہوا تھا مگر اب وہ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ "اس دعوے دار کا نام کیا ہے؟" میں نے آرتھر سے پوچھا۔

"پیٹر ہوبرٹ۔"

"آرتھر! کہیں وکیلوں سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، وکیلوں سے غلطی نہیں ہوئی، یہ شخص پیٹر جھوٹا لگتا ہے۔ میرے خیال میں کھڑے ہونے کے لیے اس کے پاس ٹانگیں ہی نہیں ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے، وہ محض کوشش کر رہا ہے... یا کوئی فراڈ ہے؟ ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے خیال آرائی کی۔

"وہ جو کوئی بھی ہے..." آرتھر نے میری طرف خط بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس مکان سے... اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔"

اور یہ سچ تھا، وہ عجیب خط تھا۔ توہین کا احساس بھی دلاتا تھا۔ اس میں ہمیں ڈاکو اور لٹیرا کہا گیا تھا۔ وہ شاید ہمارے جذبات سے کھیلنا چاہتا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس مکان میں اس کا لڑکپن گزرا ہے، اس کی زندگی گزری ہے۔ اُس نے لکھا تھا کہ اس اذیت ناک زندگی میں ایک... صرف ایک اُمید اُس کا سہارا رہی ہے اور وہ یہ کہ ایک نہ ایک دن وہ لوٹ کر آئے گا۔ "یہ میری قسمت ہے، مجھے عشق ہے اس مکان سے اور وہ میرا ورثہ ہے۔" اُس نے خط میں لکھا تھا۔ "اور وہ مکان میرا ہے... صرف میرا، اسے کوئی شخص مجھ سے نہیں چھین سکتا۔" پھر اُس نے مکان کا نقشہ کھینچا تھا۔

"خدا کی پناہ... کہیں یہ سچ مچ..." میں نے خط پڑھ کر کہا۔

آرتھر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ویسے اُس کے انکل کو اُسے بے خبر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔" میں نے مزید کہا۔

"ہو سکتا ہے، وہ اسے کچھ دینا ہی نہیں چاہتے ہوں۔" آرتھر نے تبصرہ کیا۔ "تم نہیں جانتیں۔ قدیم خاندانوں میں اس طرح کی بڑی پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔"

"آرتھر... مناسب یہی ہے کہ تم یہ خط وکیل کو بھجوا دو۔ وہی صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس سے کہو کہ وہ بھتیجے صاحب کو سمجھائے کہ وہ ہمارے ساتھ ایسے کھیل نہ کھیلے۔"

"اس کی بات میں ذرا معقولیت نہیں۔" آرتھر نے بے دھیانی سے کہا۔

"دیکھو ڈیئر... یہ کوئی پرابلم نہیں، تم یہ سب کچھ ذہن سے جھٹک دو اور پُرسکون ہو جاؤ۔"

لیکن آرتھر پر میرے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا، وہ بڑبڑا رہا تھا۔ اِکا دُکا لفظ میرے پلّے بھی پڑ جاتا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ اُسے پیٹر ہوبرٹ پر ترس بھی آرہا ہے۔ دیر تک وہ بڑبڑاتا رہا۔

بالآخر میری قوّتِ برداشت جواب دے گئی۔ "آرتھر پلیز، پلیز! اب بس بھی کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"اُسے خود بھی کچھ زیادہ اُمید نہیں ہے۔" آرتھر بولا۔ پھر وہ لان کی طرف چلا گیا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر پودوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد دریا کے کنارے درختوں کی طرف چلا گیا۔ ایسا وہ اُس وقت کرتا تھا جب پریشان ہوتا تھا۔

آدمی کو پوری طرح جاننے اور سمجھنے کا دعویٰ کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن جاننا اور سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

آرتھر پریشان رہنے لگا۔ وہ اب زیادہ تر ہوبرٹ فیملی کے وارث کے متعلق گفتگو کرتا تھا۔ دوسری طرف آرتھر کو خود اس گھر سے بہت محبت ہو گئی تھی، اس محبت کے ڈانڈے اُس کی ماضی کی محرومی سے ملتے تھے۔ آرتھر کے ماضی میں گھر سے محرومی رچی تھی۔ اتنی عمر گزارنے کے بعد اب وہ پہلی بار آباد ہوا تھا۔ پہلی بار اُس نے گھر بسایا تھا، اُسے سجایا سنوارا تھا۔ اُسے اس گھر سے محبت تھی کہ وہ اس کی ماضی کی محرومی کی تلافی تھا۔ کسی انسان کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے بعد بھی اسے پوری طرح سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ آرتھر کی محرومی کے اثرات اتنی گہرائی میں اب بھی موجود ہیں۔ اب اُسے گھر ملا تھا تو ایک دعوے دار کی مصیبت بھی نازل ہو گئی تھی۔ مجھے تو اس کی کوئی پروا نہیں تھی مگر آرتھر اندر ہی اندر خوفزدہ ہو گیا تھا۔

ویسے وہ مکان تھا بھی بہت اچھا۔ میں نے اُسے دیکھ کر کہا تھا "مجھے خوشی ہے کہ دریا کے کنارے پر کیچڑ بدبودار نہیں ہے۔" اور مجھے آرتھر کے چہرے کا تاثر دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گھر ہمارا گھر ہے۔ مستقل گھر...!

میرے کہنے پر آرتھر نے وہ خط وکیل کو بھیج تو دیا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کو اپنے طور پر بھی نمٹانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ شاید اس لیے کہ گھر سے محرومی اس کا بھی مسئلہ تھی، وہ پیٹر ہوبرٹ سے ہمدردی کرنے پر مجبور تھا۔ اُس کے دُکھ اور محرومی کو محسوس کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے پیٹر کو آسٹریلیا خط پوسٹ کر دیا۔ یہ کام وکیل کے توسط سے بھی کیا جا سکتا تھا مگر آرتھر، پیٹر ہوبرٹ کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ تو پیٹر کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس کا آبائی مکان غلط ہاتھوں میں نہیں ہے لیکن آرتھر اپنے جذبات اور محسوسات کاغذ پر منتقل کرنے کے معاملے میں بے حد کورا تھا، وہ اس خط میں اپنا مافی الضمیر پوری طرح بیان نہیں کر سکا تھا۔

اس خط کے جواب میں آسٹریلیا سے فوراً ہی ایک اور خط موصول ہو گیا۔ اس خط میں غصّے، ناراضی اور نفرت کا اظہار پہلے سے کہیں شدید تھا۔ اگر وہ خط میں نے ہی وصول نہ کیا ہوتا تو آرتھر مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگنے دیتا۔ بہرحال آرتھر نے خط کی خاص خاص باتیں مجھے بتا دیں۔

"تو کیا وہ ہمیں قتل کرنے آرہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

پیٹر ہوبرٹ نے لکھا تھا کہ اس خط کے فوراً بعد والی فلائٹ سے وہ آرہا ہے اور ہماری اچھی طرح خبر لے گا۔

ہم وکیل کے پاس بھاگے لیکن وکیل نے توقع کے خلاف ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ صورتِ حال جاننے کے بعد وہ خاموش بیٹھا نظریں چُراتا رہا۔

گاؤں کے لوگوں کا رویّہ بھی ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ پھر یہ تھا کہ ہم بھی ان میں زیادہ گھلے ملے نہیں تھے۔ وہ لوگ ہوبرٹ کے مقابلے میں بجا طور پر ہمیں اجنبی سمجھتے تھے۔ بہرحال عجیب بات یہ تھی کہ انھیں ہوبرٹ فیملی کے وارث کی آمد کا علم نہ جانے کیسے ہو گیا تھا۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انھوں نے پہلے ہمیں اس وارث کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

بہرحال، اب ہم اکیلے تھے اور سر پر پیٹر ہوبرٹ کی تلوار لٹک رہی تھی۔ ایک طرح سے جنگ شروع ہو چکی تھی۔ قانونی اعتبار سے آرتھر کا پلّہ بھاری تھا۔

"اگر اس شخص کا یہی رویّہ رہا تو میں اس کی ایک نہیں سنوں گا۔" آرتھر نے مجھ سے کہا۔ "میں اس مکان سے بے دخل ہونا پسند نہیں کروں گا نہ میں اسے کسی کے ہاتھ فروخت کروں گا، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

اور میں جانتی تھی کہ آرتھر آخری فیصلے کے بعد اپنی جگہ اٹل ہو جاتا ہے۔

ایک دن... ایک رات اور گزر گئی۔

آرتھر نے صبح معمول کے مطابق ناشتے کی میز پر اخبار پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ چند لمحے بعد لرزتے ہاتھ سے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔ میں نے اُس کی پُشت پر جا کر اخبار کا جائزہ لیا۔ جلی حروف میں ایک فضائی حادثے کی خبر چھپی تھی۔ وہ آسٹریلیا سے آنے والا جہاز تھا جس کے مسافروں اور عملے میں سے کوئی ایک بھی نہیں بچ سکا تھا اور وہ وہی جہاز تھا جس سے پیٹر ہوبرٹ نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔

آرتھر نے دوسری تمام تفاصیل نظرانداز کرکے جلدی جلدی مسافروں کی فہرست کا جائزہ لیا۔ اُس میں پیٹر ہوبرٹ کا نام درج تھا۔ ہمارے مُنہ سے اطمینان کی سانس نکلی جس پر بعد میں ہم دونوں ہی شرمندہ ہوئے پھر آرتھر اُٹھ کر لان میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وکیل نے یہ خبر سُنانے کی کوشش کی مگر میں نے یہ کہہ کر اُس کی بات کاٹ دی کہ ہم اخبار پڑھ چکے ہیں۔

اس شام ہمارے لان میں تباہی مچ گئی۔ تمام چھوٹے پودے جڑ سے اکھاڑ دیے گئے۔ کمرے میں دیوار پر آویزاں گھڑیال خود بخود زمیں بوس ہو گیا۔ الماریوں سے کپڑے نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ اسٹڈی میں موجود تمام کتابیں پھڑپھڑانے لگیں... تمام کاغذات اُڑنے لگے۔ پورا گھر ایک ایسی جگہ کا نمونہ بن گیا جہاں چوہے پاگلوں کی طرح کوئی خاص چیز تلاش کر رہے ہوں۔

پھر یہ ہر روز کا معمول بن گیا...!

آرتھر نے اس کی آواز سُنی، میں نے بھی سُنی مگر اس کی جھلک نظر نہیں آئی اکثر ایسا ہوتا کہ ہم کسی کمرے میں جاتے تو ہر چیز قرینے سے رکھی ہوتی اور کبھی وہی کمرا اس حال میں نظر آتا کہ دل بھر آتا... رونے کو جی چاہنے لگتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ آسٹریلیا کے بن بلائے مہمان کی کارستانی تھی۔

”اگر ہم کسی طرح اس کی مدد کرسکیں تو ممکن ہے، وہ یہ تخریبی کارروائیاں چھوڑ دے۔“ ایک دن میں نے آرتھر سے کہا۔

آرتھر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں اُٹھی اور ایک ایسی جگہ آکھڑی ہوئی جہاں سے پورے گھر کو دیکھ سکتی تھی، ہر طرف نظر رکھ سکتی تھی۔ میری کوشش تھی کہ اس گھر کے وارث کو دیکھ لوں یا ممکن ہے، میری خواہش یہ ہو کہ اس کا وجود ثابت ہی نہ ہو۔ ”یہ تو کوئی اچھی بات نہیں کہ تم ہمیں اس طرح پریشان کرتے رہو۔“ میں نے اتنے زور سے چیخ کر کہا کہ میری آواز گھر کے ہر حصّے میں سُنی گئی ہوگی، میں چاہتی بھی یہی تھی۔

لیکن کچھ بھی نہ ہُوا۔ ہوبرٹ مرنے کے باوجود ہماری جان چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

مجھے ایک خیال سُوجھا۔ آرتھر نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔ ہم نے سُنا تھا کہ پادریوں کا ایک حلقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو روحوں سے بات کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم نے مقامی پادری سے اس سلسلے میں مدد چاہی مگر اس کی بیوی نے دروازے ہی سے یہ کہہ کر ہمیں واپس کردیا کہ پادری کسی کام سے گیا ہوا ہے۔

شروع شروع میں ہم نے اپنے گھر کے دروازے کھُلے رکھے کہ ممکن ہے کبھی پیٹر ہوبرٹ سے سامنا ہو جائے اور اس سے گفتگو کا موقع مل جائے لیکن سامنا کبھی نہیں ہوا۔ البتہ وہ اور طرح سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا۔ کبھی اچانک درختوں کے گرد دھواں سا پھیل جاتا۔ کبھی اندھیرے میں اچانک روشنی کا جھما کا سا ہو جاتا۔

میری ذہنی حالت ابتر ہوتی دیکھ کر آرتھر نے بوٹنگ پکنک کا پروگرام بنایا۔ میں نے کچھ سینڈوچز بنا لیے۔ ہم دریا پار گئے، وہاں ہم درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، آرتھر نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ مجھ پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں ہی اونگھنے لگے۔ ہماری آنکھ پوری طرح نہیں لگی تھی کہ کسی پرندے کی چیخ نے ہمیں جگا دیا۔ حشرات الارض نے اپنا راگ چھیڑ دیا۔

مَیں نے دیکھا، آرتھر بہت اُداس اور فکر مند ہو رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ اصول پرست آدمی ہے۔ اسے علم تھا کہ مکان پر اس کا دعویٰ ہر اعتبار سے درست ہے اور پھر وہ غیر معقول بھی نہیں تھا۔ وہ مدلل گفتگو چاہتا تھا لیکن گفتگو کس سے کرتا۔ یہاں تو دوسرا فریق اُس کی سُننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ آرتھر اپنے گھر میں آزادی سے رہنا چاہتا تھا۔

اس روز پہلی بار میں نے پیٹر ہوبرٹ کو دیکھا۔ وہ کافی فاصلے پر تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب بھی ہو گیا پھر ایک شام درختوں کے ایک جُھنڈ سے نکلتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا۔ وہ مکان کے داخلی دروازے پر مالک مکان کی طرح کھڑا تھا۔ اُس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ وہ دراز قامت تھا۔ اُس کا سر بالوں سے محروم تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی لیکن جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچی، وہ اچانک ہی غائب ہو گیا۔

کئی دن تک وہ اسی طرح ہمارے ساتھ حاضر غائب کا کھیل کھیلتا رہا پھر ایک دن اُس نے ہمیں اپنی طویل جھلک دکھائی۔ کھڑکی کھُلی ہوئی تھی۔ ہوا میں کافی خنکی تھی۔ کھڑکی سے باہر دریا کی سمت دور تک دھُند ہی دھند تھی۔ میں نے اُسے کھڑکی کے شیشے میں دیکھا وہ میری پُشت کی طرف تھا۔ شیشے میں مجھے اُس کے دانت اور آنکھیں نمایاں طور پر نظر آئیں، وہ بتیسی کی نمائش کر رہا تھا۔

”آرتھر!“ میں پوری قوت سے چلائی ”جلدی سے سارے دروازے بند کر لو۔“

”اوہ... تم مجھے بند کر دو گی۔“ اُس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا اور ہنسنے لگا۔

مجھے اُس کی ہنسی سے بُری طرح خوف آیا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی لیکن اس کے انداز سے یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ اُس کا ہدف آرتھر ہے، میں نہیں ہوں۔ اُس کی جنگ آرتھر سے تھی۔ ویسے سچّی بات یہ ہے کہ مجھے اُس سے ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ دوسری طرف آرتھر اب کسی بھی طرح مفاہمت کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ مکان اب اس کے لیے محرومی کا مداوا نہیں رہا تھا بلکہ ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ اکثر کہتا۔ ”جو چیز پیٹر کے لیے اہمیت رکھتی ہے اب میرے لیے بھی اُس کی اہمیت کچھ کم نہیں اور وہ تو مر چکا ہے۔ اب اُسے اس مکان کی ضرورت نہیں، وہ بلاوجہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔“

ایک رات پیٹر ہوبرٹ نے مجھے بُری طرح ڈرا دیا۔ آرتھر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جا کر چند روز میری کے ساتھ گزار آؤں۔

”تمھیں اس طرح چھوڑ کر؟ نہیں... مَیں تمھارے ساتھ رہوں گی۔ اپنا مقام اور فرض خوب پہچانتی ہوں میں۔“ مَیں نے جواب دیا۔

پیٹر نے اب اپنی تمام تر توجہ ہم پر مرکوز کر دی تھی۔ اس سے بچ کر جانا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ دونوں فریقین اپنی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ مکان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا تو ہم بھی تیار نہیں تھے۔ آرتھر اُس سے معقولیت کے ساتھ گفتگو کرنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ پیٹر کو بالآخر قائل کرے گا کہ وہ غلطی پر ہے یا پھر پیٹر دلائل کے ذریعے اسے قائل کرے۔

دوسری طرف پیٹر ہوبرٹ کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود کو اس گھر کا مالک سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک ہم زبردستی کے قابضین ہیں۔ وہ گھر میں مالکوں کی سی شان سے گھومتا۔ جب چاہتا، دندناتا ہُوا ہمارے کمرے میں بھی چلا آتا۔ اس گھر سے اور گرد و پیش سے وہ اس طرح واقف تھا کہ اندھیرے میں بھی کبھی ٹھوکر نہ کھاتا۔ وہ اس کا اپنا گھر تھا... اور طویل عرصے کی دُوری کے بعد وہ اپنے گھر واپس آیا تھا...!

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اپنے گھر میں کسی ناخواندہ مہمان کو بھی برداشت کرسکتی تھی بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔

آرتھر کی ضد اور تھی، وہ کہتا تھا۔ ”وہ ہمیں مالک تسلیم کرلے تو مجھے اُس کے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں مگر معقولیت سے بات تو کرے۔ اگر وہ زندہ آدمی ہوتا تو میں اُس پر ثابت کر دیتا کہ میں حق پر ہوں۔ اب ایک مُردہ شخص سے میں کیسے... کس زبان میں بات کروں“!

آرتھر کے خیال میں یہ کمینگی تھی کہ پیٹر اپنے مُردہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔

”تم پیٹر کو پورا الزام مت دو، اصل قصور تو جہاز کے حادثے کا ہے۔“ مَیں اکثر آرتھر کو سمجھاتی۔

آرتھر کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ جب تک اس معاملے کو نمٹا نہ لیتا، سکون کا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ اپنے گھر سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا، جو اُس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ وہ اپنے گھر میں مکمل مالکانہ حقوق کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور اس کا یہ مطالبہ ناجائز بھی نہیں تھا۔

”وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتا۔“ ایک دن آرتھر نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ ”کیا مجھے یہ معاملہ دوسری دُنیا میں جا کر نمٹانا ہوگا؟“

ایک دن آرتھر بڑے فیصلہ کُن انداز میں داخلی دروازے پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی نظریں کھڑکی کے پٹ پر جما دیں۔ وہ اسی طرح ایک گھنٹا ساکت و صامت کھڑا رہا لیکن پیٹر ہوبرٹ نظر نہیں آیا، تنگ آکر آرتھر واپس آگیا۔

”تم دل چھوٹا نہ کرو، ایک نہ ایک دن اُسے بات کرنا ہی پڑے گی۔“ میں نے آرتھر کو دلاسا دیا۔

لیکن پیٹر ہوبرٹ نے بھی تہیّہ کر لیا تھا کہ آرتھر کو معقولیت کے ساتھ تبادلۂ خیال کا کوئی موقع نہیں دے گا۔ اب تو ہر وقت اس کی موجودگی کا احساس ہوتا جبکہ وہ دکھائی بھی نہ دیتا۔ اچھا خاصا گھر آسیب زدہ لگنے لگا۔ وہ ہمیں گھر سے نکالنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی روح کو اسی طرح قرار آسکتا تھا۔

ایک بات عجیب تھی۔ اس پورے قضیے کے دوران ہم نے ہمیشہ اسے پیٹر ہوبرٹ کہا۔ لفظ بھوت ایک بار بھی ہماری زبان پر نہیں آیا۔ بس آرتھر بہت اصول پرست تھا۔ وہ ایسی صورت میں سکون سے بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اسے خرابی کا احساس ہو جبکہ میں ناگزیر خرابیوں کو قبول کر کے... سمجھوتا کر کے زندگی کو آسان بنا لینے کی قائل تھی۔

لیکن آرتھر فیصلہ چاہتا تھا سو وہ بھی ہو ہی گیا۔

*

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ مختصراً بتاؤں گی کہ انجام کیسے ہُوا۔

اُس روز صُبح ہی سے آسمان پر گھرے سیاہ بادل چھائے

زندگی بنانے اور سنوارنے والی تحریروں سے آراستہ

ماہنامہ

اکتوبر ... کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

تازہ شمارے کی جھلکیاں

- تیسری لہر ــــ ایلون ٹوفلر کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ زاہدہ حنا کے قلم سے۔
- ذہنی دباؤ ــــ ذہنی دباؤ کے اسباب، اس کی شدت اور اس کا تدارک۔
- بچّے کی معاشی تربیت ــــ اپنے بچّوں کو خوش حال دیکھنے کے خواہش مند والدین کے لیے
- رنگوں سے علاج ــــ ایک قدیم طریقۂ علاج نئی جہتوں کے ساتھ۔
- قوتِ ارادی کا تجزیہ ــــ اپنی قوتِ ارادی کی بے پناہ صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھائیے۔
- غصے پر قابو پائیے ــــ اس مضمون کو پڑھیے اور غصہ تھوک دیجیے۔
- ذاتی سحر ــــ یہ کمال تھوڑی سی کوشش سے آپ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔
- عادت بد ــــ عادت بد کے شکار نوجوانوں کے لیے ایک زندگی افروز تحریر۔
- منشیات کی لعنت ــــ ایک سنگین قومی مسئلے پر ایک بصیرت افروز مضمون۔
- ہپناٹزم سیکھیے ــــ ہپناٹزم کے بارے میں ایک ماہرِ فن کی تحریر۔
- بھرپور زندگی ــــ وہ پانچ اصول جو آپ کو عمر بھر یاد رہنے چاہئیں۔
- کامیاب ازدواجی تعلقات ــــ کامیاب ازدواجی تعلقات کو برقرار رکھنے کے لیے چند سنہرے اصول
- زندگی کی کہانیاں ــــ آپ کی کہانی آپ کی زبانی۔ جیتے جاگتے دنوں کی تصویریں۔
- علم نجوم کی روشنی میں ــــ زندگی کے پیچیدہ راستوں پر رہنمائی کے لیے ایک مفید ذریعہ۔
- کھانے لیجیے ــــ آپ کے ذاتی حالات و واقعات کی روشنی میں نفسیاتی مشورے ماہنامہ نفسیات کے تعاون سے

... مضامین جنھوں نے ماہنامہ نفسیات کو قارئین میں بے حد مقبول کر رکھا ہے۔

ماہنامہ نفسیات کا مطالعہ کیجیے اور زندگی کی نئی جہتوں سے شناسائی حاصل کیجیے

قیمت ۱۵ روپیہ ــــ سالانہ چندہ بذریعہ رجسٹری ... روپیہ

مکتبۂ نفسیات ○ پوسٹ بکس ۹۳۳ کراچی ــــ ۷۴۲۰۰

ہوئے تھے۔ بجلی کڑکتی رہی۔ وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی۔ صبح کے وقت بھی گھُپ اندھیرا ایسا تھا جیسے آدھی رات کا وقت ہو۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ مجھے ناشتا تیار کرنا ہے یا رات کا کھانا۔ آرتھر کو بہت بھوک لگی تھی۔ وہ ناشتے کے انتظار میں اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ باورچی خانے سے آرتھر مجھے صاف نظر آ رہا تھا پھر اچانک آرتھر کے پیچھے مجھے پیٹر ہوبرٹ کی ایک جھلک دکھائی دی۔

اس کے بعد کے کئی گھنٹے مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا۔ میں ذرا سی نیند لینے کے لیے لیٹی تھی اور کئی گھنٹے بعد جاگی۔ جاگی کیا طوفان کے شور نے مجھے جگا دیا تھا۔ آنکھ کھُلتے ہی میری نظر پیٹر ہوبرٹ پر پڑی جو بیڈ کی پائنتی پر بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے وہ اتنا نزدیک کبھی نہیں آیا تھا۔

وہ اور قریب آ گیا۔ اُس کی آنکھیں بے حد سفید لگ رہی تھیں۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں واضح طور پر بدمعاشی نظر آئی۔ میں نے زور سے چیخ ماری لیکن آرتھر پہلے ہی دروازے میں موجود تھا۔ اُس کا بھی پس منظر تھا۔ چند روز پہلے آرتھر نے اپنے لیے نئی حکمتِ عملی ترتیب دی تھی۔ پہلے ہوبرٹ ہمارے پیچھے پڑا تھا مگر پھر آرتھر نے جارح بننے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چپکے سے کسی بھی کمرے میں گھُستا اور کھڑکی کے ذریعے پیٹر ہوبرٹ کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا۔ وہ اسے کسی جگہ گھیر کر اُس سے دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ گھنٹوں نگرانی کرتا رہتا مگر لاحاصل۔ پیٹر اسے بڑی آسانی سے جُل دے جاتا تھا۔ وہ آرتھر کا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ جہاں آرتھر ہوتا، وہاں پیٹر نہ ہوتا اور پیٹر وہاں ہوتا، جہاں آرتھر موجود نہ ہوتا۔

تو اس وقت جب پیٹر میرے بیڈ پر بیٹھا تھا، آرتھر دروازہ گھیرے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ باہر طوفانی بارش دریا پر شور مچا رہی تھی۔

پیٹر نے زوردار قہقہہ لگایا اور پیچھے ہٹا۔

”جانے کی ضرورت نہیں۔“ آرتھر نے اُس سے کہا۔ ”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ہاتھ پھیلائے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ پیٹر کو گھیر رہا تھا۔

پیٹر آگے بڑھا اور آرتھر کے وجود میں سے گزر گیا۔ آرتھر نے اُسے دبوچنے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ٹکرایا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی اُبھری پھر اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور مجھ سے ایک لفظ کہے بغیر پیٹر ہوبرٹ کے پیچھے چل دیا۔

میں ازل کی ڈرپوک ٹھہری۔ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھی۔ باہر بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ پیٹر باہر دروازے کی طرف رُخ کیے کھڑا تھا جیسے آرتھر کا منتظر ہو۔ پھر آرتھر گھر سے نکلا۔ اب پہلی بار وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کے ہونٹ ہلتے نظر آ رہے تھے مگر میرے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑا۔

پھر پیٹر آرتھر کو جھٹک کر دریا کی طرف بڑھ گیا۔ آرتھر اُس کے پیچھے لپکا اور لان کے سرے پر اُسے جا لیا۔ اُس نے پیٹر کے گھونسا مارا جو پیٹر کے جسم کے آرپار نکل گیا۔ میں پلٹی اور باہر کی طرف بھاگی۔ میرا ہر خوف مٹ گیا تھا۔

پیٹر جیٹی کی طرف جا رہا تھا۔ آرتھر اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ”میری بات سنو۔ میں معقولیت کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ آرتھر کہہ رہا تھا۔ میں بہت تیز بھاگ رہی تھی اور ان کے بے حد نزدیک پہنچ گئی تھی۔ پیٹر آرتھر کی بات سُننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

پیٹر ہوبرٹ چند لمحے جیٹی پر رُکا۔ اُس نے پلٹ کر آرتھر کو دیکھا جو اب بھی التجائیں کیے جا رہا تھا۔ پیٹر نے نفی میں سر ہلایا اور پانی پر اُتر گیا۔ میں نے اُسے پانی پر یوں چلتے دیکھا جیسے اُس کے پیروں کے نیچے پانی نہیں سخت زمین ہو۔

”اس بار میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔“ آرتھر نے چیخ کر کہا۔ ”میں تمھیں قائل کر کے رہوں گا خواہ اس کے لیے مجھے دوسری دُنیا تک جانا پڑے۔“ یہ کہہ کر آرتھر بھی پانی پر... نہیں... پانی میں اُتر گیا۔ ظاہر ہے، وہ پانی پر نہیں چل سکتا تھا چنانچہ پانی نے اُسے نگل لیا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی رہی۔

چند لمحے بعد میں نے اُن دونوں کو ساتھ ساتھ پانی پر چلتے دیکھا۔ وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ جانے کتنی دیر وہ بحث جاری رہی پھر پیٹر نے آرتھر کو گلے لگا لیا۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واپس آئے اور میری طرف دیکھے بغیر گھر کی طرف چل دیے۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے تھی۔

*

اگلے روز پانی سے آرتھر کی لاش نکالی گئی۔ اُس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ اُسے جو کہنا تھا، کہہ چُکا تھا۔ مرتے وقت اُس کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ شاید وہ اپنا کیس لڑ کر جیت بھی چُکا تھا۔

کسی نے مَیری کو تار دے دیا تھا۔ وہ آئی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ مکان اب بھی میرا ہے اور میں اُسے بیچنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ مجھے رقم کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اب اُن دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ساتھ ساتھ گھومتے ہیں لیکن مجھے یہ اب بھی معلوم نہیں کہ اُن دونوں میں سے مکان کا مالک کون ہے۔ میں تو صرف دنیاوی قانون کے تحت اس کی مالک ہوں۔ اصل مالک یا تو پیٹر ہے یا آرتھر...!

CLAIMANT
Elizabeth Bowen.

ڈیئر معصوم...!

سلامِ خلوص۔ میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کی تو بہت پہلے سے قائل تھی کیونکہ آپ کے سابق مدیر کے جانے کے بعد آپ کے دورِ ادارت میں رسالے نے مزید ترقی کی ہے اور اس میں کافی نکھار آیا ہے لیکن جب سے آپ نے میری کہانی ”آخری داؤ“ شائع کی ہے تب سے تو میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کی مزید قائل ہو گئی ہوں گو کہ کہانی کا عنوان ”آخری داؤ“ تھا لیکن درحقیقت وہ میری پہلی کاوش تھی۔ اس کہانی کا مرکزی خیال بہت ہی نازک تھا اور اس میں جو باریک سا نکتہ پنہاں تھا میرا خیال تھا کہ کسی مدیر کی نظر اس تک نہیں پہنچ سکے گی لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ آپ کی نکتہ رس اور نکتہ شناس نظریں اس نکتے تک پہنچ ہی گئیں اور آپ نے میری کہانی کو شرفِ اشاعت

ایک انتہائی دلچسپ، بے ساختہ اور قرینِ قیاس ماحول کی رُوداد

محمود احمد مودی بلا کے ذہین اور فطین ادیب ہیں۔ تراجم میں وہ ایک چابک دست مترجم نظر آتے ہیں اور ماخوذ کہانیوں میں ذہنی اختراع اُن کی طبیعت کا خاصّہ ہے۔ پڑھنے والوں نے فرضی کرداروں پر مشتمل حقیقی کہانیاں تو بہت سی پڑھی ہوں گی مگر یہ فرضی کہانی ہے جس کے تمام کردار حقیقی ہیں سوائے اُس مصنفہ کے جسے بہرحال کہانی میں مرکزیت حاصل ہے۔

محمود احمد مودی

Faisal Ahmed

بخش دیا۔

مَیں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں اور نگاہِ انتخاب کو ایک بار پھر خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں لیکن آپ کو بھی یہ اعتراف یقیناً ہوگا کہ اگر آپ اس کہانی کو ناقابلِ اشاعت قرار دیتے تو آپ کے لاکھوں قارئین ایک عظیم فن پارے اور ایک ناقابلِ فراموش تخلیق کے مطالعے سے محروم رہ جاتے۔ اگر آپ خودستائی نہ سمجھیں تو مَیں کہوں گی کہ اس قسم کی کہانیاں کبھی کبھار ہی لکھی جاتی ہیں۔

کہانی نویسی کے میدان میں اپنی کوششیں جاری رکھنے کا تو میرا پہلے ہی ارادہ مستحکم تھا لیکن آپ کی ہمت افزائی نے میرے قلم میں نئی رُوح پھونک دی ہے۔ تخلیق کے میدان میں مَیں نے اپنا سفر نئے عزم، نئے حوصلے اور نئے ولولے سے شروع کر دیا ہے۔

یہ مت سمجھیے گا کہ مَیں نے خاطر خواہ مطالعے کے بغیر ہی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مَیں آپ کے تینوں پرچے ایک طویل عرصے سے بڑی باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں اردو اور انگریزی کے بیشتر نامور مصنّفین کو مَیں نے بڑی گہری اور تنقیدی نظر سے پڑھا ہے۔ کلاسیکی اردو اور انگریزی ادب کے علاوہ جدید دَور کے فکشن رائٹرز کی طبع زاد تخلیقات اور ترجمے بھی میرے مطالعے میں شامل رہے ہیں اور مَیں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے تاہم مجھے اُمید ہے کہ اگر ان مصنّفین میں بھی مجھ جیسا انکسار اور فن کی لگن و جستجو ہوتی تو یہ بھی مجھ سے بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔

یہاں مَیں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکوں گی کہ معاملہ خواہ قدیم ادب کا ہو یا جدید فکشن کا... مَیں نے مطالعے میں زیادہ تر مصنّفاؤں ہی کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مَیں کوئی دقیانوسی خیالات کی مالک لڑکی ہوں اور میری سوچ گھوم پھر کر خواتین کے حلقوں تک ہی محدود رہتی ہے۔ جی نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا تعلق ایک روشن خیال، آسودہ حال اور جدت پسند گھرانے سے ہے۔

مَیں محض دقیانوسیت کی وجہ سے خواتین رائٹرز کو ترجیح نہیں دیتی بلکہ میں بڑی ٹھوس بنیادوں پر ان کی زیادہ حامی ہوں۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ قلمکاری کے میدان میں مشرق و مغرب، دونوں جگہ خواتین زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ معاوضے کے لالچ سے قطعِ نظر وہ اپنا کام زیادہ محنت، زیادہ لگن، زیادہ جوش و خروش، زیادہ خلوص سے کر رہی ہیں، اسی لیے ان کے کام میں زیادہ خوب صورتی، اثر انگیزی اور گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے۔ مغرب میں جوائس ہیرنگٹن، فلس وٹنی، میری ہگنس کلارک، روتھ رینڈل، جوائس پورٹر، فلس بنٹلے، جین ڈارلنگ اور ڈیشیل اسٹیل وغیرہ جیسی خواتین رائٹرز کی زبردست کامیابیاں میرے دعوے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

اردو ادب میں بھی جو بات ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، عصمت چغتائی، بانو قدسیہ وغیرہ کی تحریروں میں ہے وہ مرد مصنفوں کی تخلیقات میں نہیں ۔۔۔ تخلیق درحقیقت عورت ہی کا وَرثہ ہے۔ آپ کے ڈائجسٹوں میں بھی میری توجہ زیادہ تر مصنفات پر ہی رہتی ہے۔ عائشہ جمال، خالدہ شاد، پاکیزہ خان، صبا احمد وغیرہ اور بجنل لکھتی ہیں تب بھی اُن کا اپنا ہی ایک انداز ہوتا ہے اور ترجمہ کرتی ہیں تب بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ یہ مردوں کی نسبت زیادہ محنت کرتی ہیں۔ چند ابھرتی ہوئی مصنفائیں بھی خوب محنت کر رہی ہیں۔ ناہید سلطانہ اختر تو اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں نجمہ مودی بھی ٹھیک ٹھاک ہی لکھتی ہیں۔

یہی حال میرا ہے۔ مَیں کم لکھتی ہوں لیکن ڈوب کر لکھتی ہوں۔ لکھنا میرا جنون ہے۔ اس شوق نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ دل چاہتا ہے ہر وقت بس لکھتی ہی رہوں اور ہر رسالے میں میری تحریر چھپی ہوئی نظر آئے، لیکن کیا کروں زندگی کی دوسری مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ لکھنے کے لیے برائے نام وقت ملتا ہے لیکن سسپنس سے تو چونکہ خصوصی اور دلی وابستگی ہے اور پھر آپ نے میری پہلی کہانی چھاپ کر صرف میری حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ میرے کندھوں پر ایک بھاری ذمّے داری بھی عائد کر دی ہے کہ مَیں آپ کے قارئین کو اپنی تخلیقات سے محروم نہ رکھوں اور وقتاً فوقتاً اپنی تحریریں ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے پیش کرتی رہوں۔

اسی احساسِ ذمّے داری سے مجبور ہو کر اپنی تازہ کہانی 'موت اور مصنّفہ' آپ کی خدمت میں ارسال کر رہی ہوں۔ اس کہانی کے حصول کے لیے کئی اور ڈائجسٹوں کے مدیروں نے بھی مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ نہ جانے انھیں کہاں سے بھنک پڑ گئی تھی کہ میری تازہ کہانی تکمیل کے قریب ہے۔ بس فوراً فون پر فون آنے شروع ہو گئے لیکن مَیں نے ان سب سے یہی کہا کہ میری کہانی پر سب سے پہلے میرے پسندیدہ ترین رسالے ہی کا حق بنتا ہے۔ سچ پوچھیں تو اس میں آپ کی نگاہِ جوہر شناس کا بڑا دخل ہے۔ میری کہانیوں کو جتنا بہتر آپ اور آپ کے ذہین قارئین سمجھ سکتے ہیں، اتنا کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔

اس کہانی کا بیشتر حصّہ تو مَیں نے گھر پہ ہی لکھا ہے لیکن آخری صفحہ جہاز کے سفر کے دوران لکھا ہے اس لیے شاید رائٹنگ کچھ خراب محسوس ہو۔ دراصل وقت ہی نہیں مل سکا ورنہ آخری صفحہ دوبارہ لکھتی۔ مَیں انجمنِ نسواں کی سرگرم رکن ہوں پچھلے دنوں اسی کے اجلاس کے سلسلے میں کراچی سے لاہور جانا پڑا۔ ذہن تو چونکہ میرا ہر وقت تخلیق میں ہی اُلجھا رہتا ہے، سفر کے دوران جہاز میں بھی مَیں اپنی کہانی ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اچانک ہی بہت اچھا انجام ذہن میں آ گیا اور مَیں نے فوراً مسوّدہ بیگ سے نکال کر اُسے مکمل کر ڈالا۔

اُمید ہے کہانی آپ کو پسند آئے گی اور آپ اوّلین فرصت میں... بلکہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر جلد از جلد جواب سے نوازیں گے۔

آپ کی مخلص،

مس حنا افتخار۔

محترمہ مس حنا افتخار صاحبہ!

السلام علیکم۔

آپ کی کہانی 'موت اور مصنّفہ' موصول ہوئی۔ آپ کے قلمی تعاون اور نیک جذبات کے لیے شکرگزار ہوں کہانی کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنے سے پہلے میں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کرتا چلوں تو مناسب ہوگا۔ مجھے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاص شناسائی کے بغیر کوئی خاتون مجھے 'ڈیئر معراج' کے القاب سے خط لکھے۔ مجھے معلوم ہے کہ انگریزی زبان کے قواعد اور استعمال کے لحاظ سے لفظ ڈیئر بیک وقت دو معانی رکھتا ہے۔ یہ پیار اور بے تکلفی کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور تکلّف و احترام کے لیے بھی ۔۔۔ لیکن دونوں موقعوں پر استعمال کا طریقہ مختلف ہے۔ اگر تکلّف اور احترام مقصود ہوتا تو آپ 'ڈیئر مسٹر معراج رسول' لکھتیں۔ اُمید ہے آیندہ خیال رکھیں گی۔

کہانی کے بارے میں عرض یہ ہے کہ اسٹاف نے اپنے اپنے ریمارکس کے ساتھ وہ میرے پاس بھیج دی تھی اور مَیں نے بھی انتہائی توجہ سے اُسے پڑھا۔ نہایت معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ کہانی ہمارے پرچے کی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتی جس کی وجہ سے ہم اسے شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کہانی ناقابلِ اشاعت ہے۔ شاید دوسرے کئی رسائل اسے بہ خوشی شائع کرنا پسند کریں۔ ہمیں صرف اپنی پالیسی کی وجہ سے مجبور سمجھیے اور معذرت قبول فرمائیے۔

معراج رسول۔

آسکر ایوارڈ

دنیا کا سب سے بڑا فلمی اعزاز ہے اور اسے حاصل کرنا فلمی صنعت سے وابستہ ہر شخص کی سب سے بڑی تمنّا سمجھی جاتی ہے۔ فلمی دنیا میں ایسے متعدد افراد گزرے ہیں جنھیں یہ اعزاز حاصل کرنے کا موقع ایک سے زیادہ مرتبہ حاصل ہوا۔ ان میں سرفہرست نام والٹ ڈزنی کا ہے جنھوں نے یہ اعزاز ۲۰ مرتبہ حاصل کیا۔ ہالی ووڈ کی اداکارہ کیتھرین ہیپرن نے یہ اعزاز چار مرتبہ (۱۹۳۲ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۶۸ء اور ۱۹۸۱ء) وصول کیا۔ وہ اس اعزاز کے لیے بارہ مرتبہ نامزد ہوئیں۔ جبکہ فریڈرک مارک، اسپنسر ٹریسی، گیری کوپر اور مارلن برانڈو نے یہ اعزاز دو دو مرتبہ حاصل کیا۔

افشاں نقوی کی ڈاک

محترم معراج رسول صاحب!

السلام علیکم۔

معذرت خواہ ہوں کہ پچھلے خط میں اندازِ تخاطب میں کچھ بے احتیاطی ہو گئی اور آپ کو اس کی نشاندہی کرنا پڑی۔ مَیں نے آپ کی ہدایت کا بُرا نہیں منایا۔ مجھے ابھی آپ جیسے لوگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ مَیں آپ کے خط کا جواب بہت تاخیر سے دے رہی ہوں۔ دراصل پچھلے دنوں میرا گھر ایک طرح سے انجمنِ نسواں کا ہیڈ کوارٹر بنا رہا ہے۔ تمام اجلاس اور سیمینار میرے گھر پہ ہی منعقد ہوتے رہے۔ ایک ہنگامہ بپا رہا۔ شکر کیجیے کہ مَیں پھر بھی آپ کو جلدی خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں ورنہ ذہن تو صحیح معنوں میں ابھی ٹھکانے نہیں آیا ہے۔

آپ نے میری کہانی واپس کر دی تھی۔ مَیں نے اس کا بھی بُرا نہیں منایا۔ اس سے میری ہمّت شکنی بھی نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے آپ کو رسالے کی پالیسی پر تو کاربند رہنا ہی ہے مَیں چاہتی تو اس کہانی کو فوری طور پر کسی دوسرے پرچے کو روانہ کر دیتی اور یہ بلاتردد چھپ جاتی لیکن سسپنس میں چھپنے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس لیے مَیں نے اس کہانی پر دوبارہ محنت کی اور اسے نئے سرے سے لکھا۔ آپ نے گو کہ اپنے خط میں وضاحت نہیں کی تھی کہ آپ کو کن نکات سے اختلاف ہے یا کون سے پہلو آپ کی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لیکن مَیں نے اپنے طور پر اندازہ لگا لیا تھا کہ کہانی کے کون سے حصّے آپ کی پالیسی میں فٹ نہیں بیٹھے ہوں گے۔ مَیں نے وہ حصّے تبدیل کر دیے ہیں۔ اُمید ہے اب یہ کہانی آپ کے

لیے قابلِ قبول ہوگی۔ ویسے بھی دوبارہ محنت کے بعد یہ کہانی پہلے سے زیادہ خوب صورت اور سنسنی خیز ہوگئی ہے۔ اسے چھاپنے کے بعد جب آپ قارئین کی پسندیدگی و تحسین کا سیلاب اُمڈتا دیکھیں گے تو اپنے فیصلے پر فخر کریں گے۔

ایک چیز مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ کہ آپ کے پرچے میں مرد رائٹرز کا غلبہ نظر آتا ہے۔ شاید آپ یہ عذر پیش کریں کہ خواتین لکھتی ہی کم ہیں لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے۔ خواتین ہر کام مردوں سے زیادہ کرتی ہیں اور بہت محنت سے کرتی ہیں۔ وہ کہانیاں بھی زیادہ لکھتی ہوں گی لیکن آپ اور مرد رائٹرز یقیناً ان کے خلاف سازشیں کرتے ہوں گے جن کی وجہ سے ان کا بیشتر کام ضائع ہوجاتا ہوگا یا وہ بددل ہوکر لکھنا کم کردیتی ہوں گی۔ مَردوں کا تو کام یہی ہے، وہ ہر شعبے میں عورتوں کی راہیں مسدود کرتے ہیں ان کے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں تاکہ وہ کسی میدان میں اپنی برتری ثابت نہ کرپائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ بحیثیت ایڈیٹر تمام مرد اور خواتین رائٹرز کو مساوی مواقع دیں اور ان کی مساوی ہمت افزائی کریں تو جلد ہی سسپنس میں صرف اور صرف خواتین رائٹرز نظر آئیں کیونکہ وہ ہر لحاظ سے مردوں سے زیادہ اچھا لکھتی ہیں۔

آپ کو چونکہ خود بھی اس حقیقت کا احساس ہے اور آپ بھی بہرحال ایک مرد ہونے کے ناتے متعصب ذہنیت رکھتے ہیں اس لیے آپ نے بیشتر خواتین رائٹرز کو 'پاکیزہ' تک محدود کر رکھا ہے اور اُن بے چاریوں کو خالص زنانہ پرچے کے خول سے نکلنے نہیں دیتے اور وہ بھی اسی پر اکتفا کیے رہتی ہیں حالانکہ آئیڈیاز خواتین کے پاس زیادہ ہیں۔ اُن کے اندازِ تحریر میں ندرت ہوتی ہے اور وہ قارئین میں زیادہ مقبول ہونے کے باوجود زیادہ شو نہیں مارتیں، نخرے نہیں دکھاتیں جبکہ مَرد چار کہانیاں کیا لکھ لیتے ہیں، خود کو احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، اشفاق احمد یا ایڈگر ایلن پو سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ تاثر بھی دراصل مَردوں نے ہی عام کر رکھا ہے کہ بعض خواتین رائٹرز کے پیچھے مَردوں کا ہاتھ ہے یعنی لکھتے دراصل مرد ہیں لیکن وہ اُن کی بیویوں، بیٹیوں یا پھر فرضی خواتین کے نام سے چھپتا ہے۔ اس قسم کی افواہیں مَرد خود ہی پھیلاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ کریڈٹ سمیٹ سکیں، دوسروں کی کارکردگی پر بھی خود داد و تحسین حاصل کرسکیں اور یوں رفتہ رفتہ ہر خاتون رائٹر کا نام مشکوک قرار پاجائے۔

حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مجھے تو بعض مَرد رائٹرز کے بارے میں شبہ ہے کہ انھیں خواتین لکھ کر دیتی ہیں۔ آپ گھر کے بھیدی ہیں آپ حقیقتِ حال بہتر جانتے ہوں گے لیکن آپ بھلا تسلیم کیوں کرنے لگے! آپ مَرد ہیں، ظاہر ہے مَردوں ہی کا ساتھ دیں گے۔ ویسے بھی انھوں نے اس چالاکی کے ساتھ آپ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے کہ آپ اُن کی خوشنودی حاصل کیے رکھنے پر مجبور ہیں لیکن ہوسکے تو کبھی غور ضرور کیجیے گا کہ آخر خواتین کا یہ استحصال کب تک جاری رہے گا؟ اور وہ کب تک اسے برداشت کریں گی؟ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی سرپھری اس کے خلاف علمِ بغاوت ضرور بلند کرے گی . . . بلکہ کیا بعید ہے کہ کوئی . . . . خیر چھوڑیے۔ آپ بھی سوچیں گے کہ یہ تو جذباتی ہی ہوگئی لیکن ایک فنکار . . . اور خصوصاً ایک رائٹر کے پاس جذبات کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے؟

خط شاید کچھ طویل ہو رہا ہے۔ مَیں ایک بار پھر اپنی کہانی کی طرف آتی ہوں۔ اُمید ہے اب آپ اسے زیادہ توجہ اور زیادہ کشادہ دلی سے پڑھیں گے اور محض اس لیے اس میں نقائص تلاش نہیں کریں گے کہ اسے ایک لڑکی نے لکھا ہے۔ اُمید ہے اب یہ آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

چلتے چلتے ایک اور خبر آپ کو سناتی چلوں۔ آپ کے لیے تو شاید یہ کوئی اہم بات نہ ہو لیکن میری زندگی کا یہ ایک نہایت اہم موڑ ہے۔ خواتین کے ایک ماہنامے 'گلدر[illegible]' نے مجھے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر ملازمت کی پیش کش کی ہے اور مَیں نے قبول کرلی ہے۔ یہ ایک غیر معروف ما[illegible] ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس کی اشاعت آپ کے [illegible] کی اشاعت کا عشرِ عشیر بھی نہیں لیکن اس کی انفرادیت [illegible] ہے کہ یہ خواتین کے حقوق کا علمبردار ہے، اس مقصد کے لیے جدوجہد کررہا ہے اور اسے مکمل طور پر صرف اور صرف [illegible] ہی حل کرنکال رہی ہیں۔ اس کا ہر شعبہ خواتین نے سن[illegible] رکھا ہے۔

میگزین چھوٹا اور غیر معروف سہی لیکن ان خوات[illegible] نظر یقیناً جوہر شناس ہے جو اسے نکال رہی ہیں۔ تبھی انھوں نے میری خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی لگن اور صلاحیتوں کی مدد سے [illegible] میگزین کو کہیں سے کہیں لے جاؤں گی۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

مس حنا افتخار۔

محترمہ مس حنا افتخار صاحبہ!

آپ کا خط پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ آپ نے مجھ پر وہ الزام عائد کردیا جو میرے یا ہمارے ادارے کے کسی رکن کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا۔ آپ نے صنف کی بنیاد پر ہمیں تعصب اور تنگ نظری کا مجرم ٹھہرایا ہے جبکہ ہم نے کبھی کسی بھی قسم کے تعصب سے کام لینے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ محترمہ! ہم لکھنے پڑھنے والے لوگ ہیں، انسانی قدروں کا پرچار کرتے ہیں۔ ہم نے کسی بھی نوعیت کے تعصبات کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ ہمارے ادارے میں کہانیاں اپنے پلاٹ، جدت، اندازِ بیاں، کردار نگاری اور اخلاقی حدود و قیود کی بنیاد پر منتخب کی جاتی ہیں، صنف کی بنیاد پر نہیں —— بلکہ خواتین رائٹرز کی ہم نے نسبتاً زیادہ ہمت افزائی کی ہے اور جن میں صلاحیت محسوس کی ہے، اُن کی مقدور بھر رہنمائی بھی کی ہے۔ آپ چاہیں تو اُن سے ہمارے بارے میں رائے بھی لے سکتی ہیں۔ اُن کی رائے یقیناً ہمارے حق میں ہوگی۔ ہماری زیادہ کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ کہانی منتخب کرتے وقت صرف کہانی کو ہی مدِنظر رکھیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ اسے کس نے لکھا ہے۔

میری پوری کوشش تھی کہ آپ کی ہمت شکنی نہ ہو لیکن افسوس کے ساتھ اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کی کہانی اب بھی ہمارے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ میری مصروفیات اجازت نہیں دیتیں کہ کہانی مسترد کرنے کی تمام وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالوں۔ اُمید ہے آپ خود ہی ہماری مجبوری کو سمجھ لیں گی اور معذرت قبول فرمائیں گی۔

دُعاگو،

معراج رسول۔

محترم معراج رسول!

سلام مسنون

آپ کا خط پڑھ کر مجھے قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اسی قسم کے جواب کی توقع تھی۔ مَیں نے آپ کا خط اپنے نئے دفتر کی ایک ساتھی کارکن کو بھی پڑھوایا۔ میری طرح وہ بھی زہریلے انداز میں ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اسی قسم کے کھوکھلے الفاظ کا سہارا لیں گے۔ وہی تاویلیں پیش کریں گے جو عورتوں کا استحصال کرتے وقت مَرد ہمیشہ پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ مَردوں کا یہی تو کمال ہے کہ میٹھے لفظوں کی آڑ میں وہ اس طرح عورتوں کے حقوق کا قتلِ عام کرتے ہیں کہ وہ حرفِ شکایت بھی زبان پہ نہ لاسکیں۔ مَرد بھلا کب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عورتوں کا استحصال کررہے ہیں؟ ظاہر ہے وہ تو اس بات کو جھٹلائیں گے۔ جس طرح آپ نے جھٹلایا ہے۔

کہانی آپ نے محض اس لیے واپس کی ہے کہ کہیں ایک اور خاتون نامی گرامی رائٹر نہ بن جائے۔ نامی گرامی خاتون رائٹر کل کلاں کو آپ کی مجبوری بھی بن سکتی ہے اور یہ آپ ہرگز برداشت نہیں کرسکتے کہ کوئی عورت آپ کی مجبوری بنے۔ مَیں ایک رائٹر ہوں اور مَیں نے مَردوں کی فطرت کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔

بہرحال مَیں ایک عورت ہوں اور عورت فراخدل ہوتی ہے۔ اس لیے مَیں نے آپ کو معاف کردیا ہے . . . .

مجھے معلوم ہے آپ کو مرد رائٹرز کے ہاتھوں میں ہی کھلونا بنے رہنے کی عادت پڑگئی ہے۔ وہ آپ کو زیادہ نخرے دکھاتے ہیں اور مَیں نے سُنا ہے کہ ایک ایک کہانی بڑی مشکلوں سے لکھ کر دیتے ہیں لیکن آپ انھی سے خوش رہتے ہیں۔ رائٹرز کی ناز برداریوں کے سلسلے میں مَیں نے اِدھر اُدھر سے بڑے افسانے سُنے ہیں۔ اب کون جانے کہ وہ افسانے ہی ہیں یا حقیقت — میرا اندازہ ہے کہ وہ حقیقت ہی ہوں گے۔ جو لوگ خود اپنی کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں ان کی بھلا آپ کے ہاں کیونکر قدر ہوسکتی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ آپ کے ہاں چھپنے کی حسرت لیے اس دنیا سے کوچ کرگئے ہوں گے اور اُن میں اکثریت خواتین کی ہوگی۔ کبھی کبھی تو مَیں سوچتی ہوں کہ مجھے کوئی مردانہ نام رکھ کر آپ کے ہاں لکھنے کی کوششوں کا آغاز کرنا چاہیے تھا۔

بعض دوسرے رسائل کے مدیروں کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی تھی لیکن اب مَیں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہوگئی ہوں۔ مَیں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تمام مرد ایڈیٹر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب یہی چاہتے ہیں کہ خواتین اِن کے آگے پیچھے دُم ہلاتی پھریں اور اپنا کوئی مقام بنانے میں کبھی کامیاب نہ ہوسکیں۔

ارے ہاں . . . مَیں اپنے پرانے شکوؤں میں اُلجھ کر اِس ماہ کی سب سے اہم خبر پر اظہارِ رائے کرنا تو بھول ہی گئی۔ پچھلے دنوں اخبار کے کسی کونے کھدرے میں تین چار سطروں کی چھوٹی سی خبر پڑھی کہ آپ کے ادارے کے ایک خاصے پرانے رائٹر محمود احمد مودی پُراسرار حالات میں انتقال کرگئے۔ سُنا ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں کسی تقریب میں شامل تھے۔ کسی نے شاید اُن کے کھانے کی پلیٹ میں زہر ڈال دیا تھا۔ پھر آپ کے پرچے میں اس سلسلے میں تعزیتی نوٹ بھی پڑھا۔

ایک قلمکار کی موت پر دوسرے قلمکار کو افسوس تو ہونا چاہیے، مجھے بھی ہوا۔ مَیں نے اُن کی اہلیہ کے نام ایک خصوصی

تعزیتی پیغام بھی ارسال کردیا ہے اور اگر مصروفیات نے اجازت دی تو اظہارِ افسوس کے لیے بہ نفسِ نفیس بھی اُن کے گھر جاؤں گی۔

سُنا ہے موصوف کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی میرے خیال میں وہ اتنا لکھ چکے تھے کہ انھیں کئی سال پہلے رضاکارانہ طور پر خود ہی ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا تاکہ اُن کی جگہ کسی نئے رائٹر کو اپنا راستہ بنانے میں آسانی رہتی۔

اُمید ہے آپ زیادہ دل برداشتہ نہیں ہوں گے۔ ڈائجسٹوں کے میدان میں اتنے بہت سے مرد رائٹرز کا ہجوم ہے، ایک کے کم ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

جناب مدیرِ اعلیٰ! اصل بات یہ ہے کہ ابھی ہم خواتین نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے صحیح معنوں میں جدوجہد شروع ہی نہیں کی لیکن یقین رکھیے . . . حقوق کی یہ جنگ ایک نہ ایک روز ضرور شروع ہوگی ضرور شروع ہوگی۔ خدا حافظ۔

مخلص،

حنا افتخار۔

محترمہ حنا افتخار صاحبہ!

السلام علیکم۔

آپ کے کئی خطوط عام ڈاک سے کئی ارجنٹ میل سے اور کئی خطوط غالباً آپ کے ملازم کے ہاتھ بھجوائے ہوئے بھی ملے۔ اُن میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی لیکن نہایت شدت سے اصرار تھا کہ میں جواب ضرور دوں۔ بی بی! میری مصروفیات اجازت نہیں دیتیں کہ کسی سے خط و کتابت جاری رکھ سکوں۔ بعض اوقات تو نہایت ضروری امور کے سلسلے میں بھی خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ آج کل تو ویسے بھی ہمیں پے در پے صدموں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ابھی ہم اپنے جوان سال رائٹر محمود احمد مودی کے ناگہانی قتل کے صدمے سے سنبھل نہ پائے تھے کہ ہمارے ایک اور ممتاز رائٹر احمد اقبال کے قتل کی خبر آگئی۔ اس صدمے نے تو میرے اعصاب بالکل ہی شل کر دیے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون ایسا شقی القلب ہو سکتا ہے جو ایسے شریف انسانوں اور عمدہ تخلیق کاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دے۔

پولیس ابھی تک قتل کی دونوں وارداتوں کے سلسلے میں کوئی سُراغ نہیں لگا سکی۔ احمد اقبال کو کسی نامعلوم شخص نے کہیں دھوکے سے بُلا کر اُن پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ پولیس جب جائے واردات پر پہنچی تو اُن میں کچھ سانسیں باقی تھیں لیکن وہ قاتل کے بارے میں کوئی اشارہ نہ دے سکے۔ اُکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان انھوں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ کسی کے بُلاوے پر شام ڈھلے ایک ہوٹل میں پہنچے تھے۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ اُترے ہی تھے کہ اندھیرے میں عقب سے کسی نے کوئی تیز دھار چیز اُن کی کمر میں گھونپ دی۔ وہ نامعلوم قاتل کی جھلک تک نہیں دیکھ سکے۔ پولیس نے آلۂ قتل کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ کوئی ننھا سا چاقو تھا مگر زہر میں بُجھا ہونے کی وجہ سے مہلک ثابت ہوا۔

مَیں نے اپنے پرانے اور کہنہ مشق قلم کار جناب اثر نعمانی سے درخواست کی تھی کہ وہ قتل کی اس گتھی کو سلجھانے میں پولیس کی مدد کریں کیونکہ پولیس سے مجھے کوئی خاص اُمید نہیں ہے کہ وہ اس معمّے کو حل کر سکے گی۔ اثر نعمانی صاحب نے جُرم و سزا کے موضوع پر بے شمار کہانیاں لکھی ہیں اور سراغرسانی کے معاملات میں اُن کا ذہن بے حد دُوررَس ہو چکا ہے لیکن افسوس کہ اس وقت وہ قتل کی ایک اور واردات پر تندہی سے کام کر رہے ہیں اس لیے انھوں نے ”احمد اقبال مرڈر کیس“ پر توجہ دینے سے معذرت کر لی۔

اب آپ ہی بتایئے کہ ان حالات میں مَیں کس طرح کسی سے خط و کتابت جاری رکھ سکتا ہوں؟ اُمید ہے معذرت قبول فرمائیں گی اور آیندہ جواب کے لیے اصرار نہیں کریں گی۔

مخلص،

معراج رسول۔

محترم معراج صاحب!

سلام۔

یہ بات طے ہے کہ آپ کبھی اپنے بارے میں حقیقت کا اعتراف نہیں کریں گے۔ یہی حقیقت کہ آپ بہرحال صنف کے معاملے میں متعصّب ہیں۔ اپنے مرد رائٹرز کی موت کا صدمہ آپ کو اتنا ستا رہا ہے کہ ابھی تک آپ کے پاس کسی کے خط کا جواب دینے کی فرصت نہیں ــــ لیکن اُن بے شمار خواتین کے لیے آپ کے دل میں کبھی تاسف کی ذرا سی لہر بھی نہیں اُبھری ہوگی جنھیں آپ ذہنی طور پر قتل کر چکے ہیں۔ جی ہاں . . . وہی اَن گنت خواتین جو اپنے خونِ دل سے کہانیاں لکھ لکھ کر اپنی زندگی کے نہایت قیمتی لمحے صَرف کر کے آپ کو ارسال کرتی ہیں لیکن آپ ان پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی ڈالنے کی زحمت نہیں کرتے اور انھیں محض ردّی کے پلندے سمجھ کر ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ یہ محض اُن کے وقت اور صلاحیتوں کا زیاں نہیں ہوتا بلکہ یوں سمجھیے آپ انھیں ذہنی طور پر قتل کر دیتے ہیں۔

بہرحال . . . صاحب! مردوں کا یہ ظلم و ستم زیادہ عرصے جاری نہیں رہ سکتا۔ ہر ظلم کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ عورتیں ایک نہ ایک روز مساوی حقوق حاصل کر کے رہیں گی۔ اسی مقصد کے لیے میں انجمنِ نسواں کی ممبر بنی تھی اور آپ کو یہ سُن کر شاید بالکل خوشی نہ ہو کہ آج کل مَیں اس کی جنرل سیکریٹری ہوں۔

مَیں آپ کو ایک بار پھر احساس دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ کے میگزین کو میری کہانی کی اشد ضرورت ہے۔ اگر آپ اسے تعصّب کی عینک اُتار کر پڑھیں گے تو آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کہانی آپ کے رسالے کی شہرت کو چار چاند لگا سکتی ہے۔ یہ تو صرف آپ کے رسالے سے میری جذباتی وابستگی ہے جس کی وجہ سے مَیں اسے آپ کے ہاں چھپوانے پر اصرار کیے جا رہی ہوں۔

اگر آپ کے خیال میں مجھ میں اچھا لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو آپ نے میری پہلی کہانی چھاپ کر مجھے یہ چاٹ ہی کیوں لگائی؟ کیوں میری ہمت افزائی کی؟ مجھے یاد ہے آپ اپنے ایک خط میں میرے اس سوال کا جواب خاصی بے رخی سے دے چکے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ کبھی کبھی کسی انسان سے کوئی کہانی ’سرزد‘ ہو جاتی ہے جو اُس کی پہلی اور آخری اچھی کہانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد زندگی بھر وہ کوئی ڈھنگ کی کہانی لکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا ـــ اور یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ رائٹر نہیں ہے۔ بس کسی رَو میں ایک کہانی لکھنے میں کامیاب ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

آپ بہت تجربہ کار ایڈیٹر اور پبلشر ہیں۔ آپ کی رائے کو علمی و ادبی حلقوں میں شاید اہمیت دی جاتی ہو لیکن مَیں اس رائے سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں اگر رائٹر نہ ہوتی یا مجھ میں لکھنے لکھانے کے جراثیم نہ ہوتے تو مَیں ایک کے بعد دوسری کہانی لکھنے کی کوشش ہی نہ کرتی لیکن مَیں نے نہ صرف جوش و خروش سے دوسری کہانی لکھی بلکہ آپ کے اعتراضات کے بعد اسے ری رائٹ بھی کیا۔ اور یہ تو آپ کے علم میں ہی نہیں ہے کہ میں نے اس کے بعد بھی مزید تین کہانیاں لکھ کر بھیجی ہوئی ہیں۔ لیکن آپ نے تو میری دوسری کہانی کی اشاعت کو ہی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ باقی کہانیوں کی نوبت بھلا کیونکر آسکتی ہے!

میری کہانی کا منتخب ہونا یا نہ ہونا دراصل اب میرا ذاتی مسئلہ نہیں رہا بلکہ یہ مسئلہ ایک طرح سے اُن بے شمار عورتوں کا مسئلہ ہے جن کے حقوق مرد صدیوں سے غصب کرتے چلے آرہے ہیں۔ میرے اس مسئلے کے سلسلے میں آپ جو رویہ اختیار کر رہے ہیں اس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ عورتوں کو اُن کے حقوق دینے کے لیے آپ ذہنی طور پر کس حد تک تیار ہیں۔

بہرحال میں اُن عورتوں میں سے نہیں ہوں جو آسانی سے ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ میری اور مجھ جیسی اَن گنت عورتوں کی جدّوجہد جاری رہے گی اور کوئی بھی ہمارا راستہ نہیں روک سکے گا۔

مَیں ایک بار پھر آپ کو مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں کہ میری کہانی کے بارے میں تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر ازسرِنو غور کیجیے اور جلد از جلد اسے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیجیے تاکہ میری باقی کہانیوں کی بھی باری آسکے۔

نیک خواہشات کے ساتھ،

مس حنا افتخار۔

محترمہ حنا افتخار صاحبہ!

سلام۔

آپ کے خطوں کا جواب دینے کے سلسلے میں میری قوّتِ برداشت جواب دیتی جا رہی ہے۔ ایک تو اب تک مَیں نے جتنی بھی باتیں لکھی ہیں۔ ان سب کا آپ نے اُلٹا مطلب اخذ کیا ہے۔ اس کے باوجود میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آج کل مَیں کتنے ذہنی دباؤ کا شکار ہوں اور میری

دفتری ضابطے داریاں کتنی سنگین صورت اختیار کرچکی ہیں۔

گزشتہ چند مہینوں میں ہمارے تمام مایہ ناز رائٹرز یکے بعد دیگرے پُراسرار حالات میں قتل کیے جاچکے ہیں۔ سب کے سب مرد تھے اور بظاہر سب کو یکساں حالات میں ہی قتل کیا گیا ہے۔ سوائے ایک مودی صاحب کے جنھیں زہر دے کر سب سے پہلے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو تمام رائٹرز کی کمر میں دل کے قریب کوئی چھوٹا سا تیز دھار آلہ گھونپ کر انھیں ہلاک کیا گیا۔ میڈیکل رپورٹ میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ آلہ زہر آلود تھا۔ طریقۂ واردات بھی تمام کیسوں میں تقریباً یکساں ہی رہا۔ تمام رائٹرز کو نہ جانے کس نے کسی بہانے سے ایسی جگہوں پر بلایا تھا جہاں تقریباً ویرانی ہوتی تھی۔ ان مقامات پر بے خبری میں رائٹرز کو عقب سے حملہ کرکے ہلاک کیا گیا۔

میں اور میرا تمام اسٹاف ابھی تک ان صدمات سے سنبھل نہیں پایا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ محی الدین نواب، الیاس سیتاپوری، عبدالقیوم شاد، احمد اقبال، علیم الحق حقی، محمود احمد مودی، اقلیم علیم ہم سے بچھڑ چکے ہیں۔ آہ . . . ! سوچتا ہوں تو کلیجا منہ کو آتا ہے۔ معلوم نہیں ان سب کے بغیر ہمارے پرچوں کا کیا بنے گا۔ یہ میرے وہ قابلِ فخر قلمکار تھے جن کے متبادل شاید مجھے کبھی میسر نہ آسکیں۔ فی الحال چند متبادل رائٹرز سے ان کے حصّے کی کہانیاں لکھوانی شروع کی تھیں لیکن قارئین کے زبردست شکایتی خطوط آنے شروع ہوگئے ہیں کہ پرچے میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ نئے رائٹرز میری اور قارئین کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکے۔

مزید صدمے کا مقام یہ ہے کہ پولیس ابھی تک ہمارے رائٹرز کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی حالانکہ میں نے اس سلسلے میں ذاتی طور پر بھی کافی اثر و رسوخ استعمال کیا ہے۔

آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ ان حالات کی وجہ سے میں کس قدر پریشان ہوں۔ کم از کم اس وقت تک آپ براہِ کرم مجھے خط نہ لکھیں اور نہ ہی جواب کے لیے اصرار کریں جب تک ہم اپنے مسائل پر قابو نہ پالیں۔ آپ نے اپنی جس کہانی کے سلسلے میں میرا ناک میں دم کر رکھا ہے، میں نے سوچا کہ اسے شائع کر ہی دیا جائے۔ جہاں کئی کمزور کہانیاں شائع ہو رہی ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی۔ اگر ہمارے اتنے رائٹرز کے قتل کے باعث اتنا بڑا اخلا پیدا نہ ہوتا تو شاید میں اس فیصلے پر مجبور نہ ہوتا۔ بہرحال آپ کو تو کہانی کی اشاعت ہی سے مطلب ہے خواہ وہ بادلِ ناخواستہ ہی شائع کی جائے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی کہانی چونکہ ناقابلِ اشاعت قرار دے دی گئی تھی اس لیے اس کا مسوّدہ ضائع کیا جاچکا ہے۔ اب آپ ایسا کریں کہ اس کی نقل یا فوٹو اسٹیٹ لے کر کسی روز براہِ کرم خود دفتر تشریف لے آئیں لیکن آنے سے پہلے فون پر میرے سیکریٹری سے اپوائنٹمنٹ ضرور لے لیں۔ اپوائنٹمنٹ کے بغیر مجھ سے ملاقات شاید ممکن نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کہانی کے بارے میں آپ سے روبرو تبادلۂ خیال ہوجائے اور بعض کمزور پہلوؤں پر اگر تھوڑی بہت نظرِ ثانی کی ضرورت ہو تو وہ اُسی وقت ہوجائے۔

آپ سے اب تک رابطہ صرف ڈاک کے ذریعے ہی رہا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ہمارے پاس آپ کا ایڈریس یا فون نمبر بھی موجود نہیں، صرف پوسٹ بکس نمبر ہے۔ جبکہ اس کہانی کا معاملہ ذاتی طور پر مل کر ہی بہتر طور پر نمٹایا جاسکتا ہے۔

خیر اندیش،

معراج رسول۔

محترم معراج صاحب!

آداب۔

آپ کا خط پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ آخرکار آپ نے میری کہانی کی اشاعت کا فیصلہ کر ہی لیا۔ یہ حقوق کی جنگ کے سلسلے میں عورتوں کی ایک اہم فتح ہے۔ ایک نہ ایک دن عورتیں تمام محاذوں پر جیت جائیں گی۔ کوئی بعید نہیں کہ ایک دن ایسا بھی آئے جب آپ سسپنس کی پیشانی پر جلی لفظوں میں یہ لکھنے پر مجبور ہوجائیں: "خواتین کا پسندیدہ ماہنامہ"! اُس وقت اس کے تمام قلمکار بھی خواتین ہوں گی اور یوں مردوں کو معلوم ہوجائے گا کہ اس ملک کی نصف آبادی اپنے جائز حقوق حاصل کرچکی ہے، اپنے بقا کی جنگ جیت چکی ہے۔

یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ بہت سے اچھے مرد رائٹرز سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ میری نظر میں تو خیر وہ کچھ ایسے غیر معمولی لکھنے والے نہیں تھے لیکن بہرحال کسی کے انتقال کے بعد اس کے بارے میں اچھی ہی رائے کا اظہار کرنا چاہیے۔ پولیس اس سلسلے میں کس نتیجے پر پہنچی ہے؟ کوئی سراغ ملا یا نہیں۔

میں اپنی کہانی کی نقل یا فوٹو اسٹیٹ لے کر آنے کے بجائے اپنے ہاتھ سے اُس کا مسوّدہ تیار کر رہی ہوں اور دو تین دن بعد آپ کی ہدایت کے مطابق اپوائنٹمنٹ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گی۔ اُمید ہے کہ آپ اسی ماہ کے شمارے میں کہانی کو شاملِ اشاعت کرلیں گے خواہ اس کے لیے آپ

کو اپنے کسی رائٹر کی کہانی نکالنی پڑے۔ اخلاقاً آپ کو میری کہانی کا معاوضہ بھی اپنے رائٹرز کی نسبت کہیں زیادہ دینا چاہیے کیونکہ ایک طویل عرصے تک آپ ویسے ہی خواتین کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ اب کچھ تلافی تو ہونی چاہیے۔ اور ہاں . . . اب کہانی شائع کرنے کا وعدہ کرکے مُکر مت جائیے گا۔ ورنہ . . .

حنا افتخار۔

قارئین کے لیے ایک اہم اعلان

عزیز قارئین! آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ ہمارے معزز رائٹرز محی الدین نواب، الیاس سیتاپوری، عبدالقیوم شاد، احمد اقبال، علیم الحق حقی، محمود احمد مودی اور اقلیم علیم وغیرہ کے بارے میں جو خبریں گرم تھیں وہ مکمل طور پر درست نہیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یکے بعد دیگرے انھیں دھوکے سے قتل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ان قاتلانہ حملوں میں صرف معمولی زخمی ہوئے تاہم کچھ عرصے کے لیے وہ اس قابل نہ رہے کہ اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے۔ اسی لیے کچھ عرصہ آپ کو ان کی قسطیں اور کہانیاں پڑھنے کو نہ مل سکیں جس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔

ہم نے خود ہی مصلحتاً اُن کے اس دارِ فانی سے کوچ کر جانے کی خبریں مشہور کردی تھیں تاکہ مجرم کو خوش فہمی میں رکھ کر گھیرا جاسکے۔ ہماری تدبیر کارگر رہی اور ہم مجرم کو مسلسل خوش فہمی میں رکھ کر بالآخر قانون کے شکنجے تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مجرم ایک عورت تھی۔ حقیقت واقعی افسانے سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ ہم نے لاتعداد کہانیاں شائع کی ہیں لیکن جیسا یہ واقعہ ہمارے ساتھ پیش آیا ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اس خاتون نے رائٹرز کو قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچ گئے۔ بزعمِ خود یہ خاتون بھی رائٹر تھی اور ہم اس کی ایک کہانی چھاپنے کی غلطی کر بیٹھے تھے جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا تھا کہ وہ چوری کی تھی۔

بہرحال مجھے اس خاتون کے خطوط سے شبہ ہوا کہ ہمارے رائٹرز پر حملے کے پیچھے اِسی کا ہاتھ ہے۔ میں نے اپنے رائٹرز سے بصد محبت و شفقت یہ بات معلوم کرلی تھی کہ ان سب کو فون کرکے ہر ایک کو الگ الگ کوئی مصیبت بھری داستان سُنا کر ملاقات کے لیے آمادہ کرنے والی کوئی خاتون ہی تھی لیکن ہر رائٹر جب مقررہ جگہ پر ملاقات کے لیے پہنچا تو وہاں اس کے استقبال کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔ پھر وہیں بے خبری میں عقب سے اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

پہلے پہل میں نے جب اس پہلو پر سوچنا شروع کیا تو مجھے یقین نہ آیا کہ ان تمام وارداتوں کی ذمے دار کوئی خاتون ہوسکتی ہے لیکن بالآخر مس حنا افتخار کے خطوط سے کچھ کڑیاں ملتی گئیں اور میرا شبہ قوی تر ہوتا گیا۔

بالآخر میں نے مس حنا افتخار کو یہ جھوٹی خوش خبری دے کر اپنے دفتر طلب کرلیا کہ اُن کی دوسری کہانی اشاعت کے لیے منتخب کرلی گئی ہے۔ وہ جب وقت طے کرکے مجھ سے ملنے آئیں تو میرے دفتر میں پولیس ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ ان کی دیدہ دلیری دیکھیے کہ محترمہ میرے دفتر میں بھی اپنے ہتھیاروں سے لیس ہوکر آئی تھیں۔ یعنی اُن کے پرس میں لپ اسٹک کے ایک خول میں چھپی ہوئی زہر کی چھوٹی سی شیشی اور وہ نیل کٹر موجود تھا جس میں ایک ننھا سا چاقو بھی لگا ہوتا ہے۔ مس حنا افتخار اسی چاقو پر زہر لگا کر اپنے شکار پر حملہ کرتی تھیں۔

تفتیش کے بعد پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ بیکی عمر کی یہ لڑکی دماغی خلل میں مبتلا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ زیادہ سے زیادہ معروف رائٹرز کو راستے سے ہٹادے تو اس کے لیے راستہ بن جائے گا۔ حیرت کا مقام ہے کہ شہرت کا جنون بعض لوگوں کو کیا کچھ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے۔

بہرحال اب یہ معاملہ اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ مس حنا افتخار کو شاید دماغی اسپتال بھیج دیا جائے۔ ہمارے تمام رائٹرز صحت یاب ہوچکے ہیں اور اُن کی تخلیقات آپ اسی شمارے سے دیکھنا شروع کردیں گے۔ سب کے سب اپنا کام سرگرمی سے شروع کرچکے ہیں۔ رسالے کے معیار کے بارے میں آپ کو فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد میں آیندہ بھی اسی طرح مصروف رہیں گے۔

پرانے رائٹرز تو بہرحال اپنی جگہ ہیں لیکن اس ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے ہم نے ہمت نہیں ہاری اور نئے رائٹرز کو خوش آمدید کہنے کا سلسلہ ترک نہیں کیا۔ نئے رائٹرز اپنی تخلیقات ارسال کرتے رہیں۔ ان میں سے جو بھی ہمارے معیار پر پوری اُتری اسے ہم ضرور شائع کریں گے لیکن نئے رائٹرز کی خدمت میں گزارش یہی ہے کہ وہ حنا افتخار بننے کی کوشش نہ کریں۔

والسلام،

معراج رسول۔

(ماخوذ)

Faisal Ahmed

دریائے وقت کے تند و تیز دھارے میں انسان کا وجود جب اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہو تو سوائے جان بچانے کے اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ نہ آدابِ حیات نہ اور کوئی قاعدہ۔ وہ تو بس اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور دیگر تمام باتوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی خود غرض اور مطلبی ماں کے گرد گھومتی ہے جسے اپنے مفادات کے سامنے اپنے لختِ جگر کا مستقبل بھی نظر نہ آیا۔ اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے کم سن بچے کو بادِ زمانہ کے سرد و گرم کے سپرد کر دیا۔ وہ کم سن بچہ جس کے پیروں تلے سفاک زمین اور سر پر بے رحم آسمان تھا، حالات سے نبرد آزما رہا۔ کئی مواقع ایسے آئے کہ وہ ہمت ہار جاتا اور حالات سے سمجھوتا کر لیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور یہی اس کی سرخروئی کا راز بنا۔ حسبِ معمول ایک سنگین اور رجاں گسل واقعہ جسے یادداشت اور تحریر کا نادر نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

راوی: مرزا امجد بیگ

تحریر: عبدالقیوم شاد

بعض لوگوں کو دیکھ کر بسا اوقات کوئی عجیب سا خیال ذہن میں آ جاتا ہے لیکن اس میں انسان کا شعوری طور پر کوئی قصور نہیں ہوتا کیونکہ بعض خیالات خاصے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔

اتوار کی شام جو شخص میرے دفتر میں داخل ہوا، اسے دیکھ کر میرے ذہن میں سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ "رام رام جپنا پرایا مال اپنا"۔ وہ درمیانے قد کا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کے ہونٹوں کے خم اور آنکھوں کی چمک میں بخیلی سی پائی جاتی تھی۔ وہ بظاہر عاجزانہ انداز میں اندر داخل ہوا تھا قدرے خم ہو کر فرشی سلام کرتے ہوئے۔

اس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی جس کی عمر پینتیس اور چالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ساری باندھ رکھی تھی اور وضع قطع سے متوسط طبقے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہوا لیکن یہ یاد نہ آ سکا کہ میں نے اس کو کہاں دیکھا تھا۔ وہ کچھ سوگوار سی لگ رہی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد مرد کا نام محمد حنیف اور خاتون کا نام افروزہ معلوم ہوا۔ دونوں بہن بھائی تھے۔

محمد حنیف نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ "وکیل صاحب! میری اس بہن کا ایک بیٹا گیارہ سال پہلے گم ہو گیا تھا — اس کا نام عامر ہے۔ چند روز پہلے ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ لانڈھی جیل میں بند ہے۔ اس پر چوری کا الزام ہے۔ ہم اس کا کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اسے کتنی سزا ہوئی تھی؟"

"ابھی تک مقدمہ ہی نہیں چلا۔" حنیف نے جواب دیا۔ "دوسرے لفظوں میں یہ قانون اور انصاف کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔"

"حنیف صاحب، ہم لوگ ان طمانچوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم لوگ سے مراد ہمارا پورا معاشرہ ہے۔ بے حسی ہماری فطرت کا اٹوٹ انگ بن چکی ہے۔ ہمارے ارد گرد لوٹ مار ہو رہی ہے، قتل و خون ہو رہا ہے، بم پھٹ رہے ہیں، گولیاں چل رہی ہیں لیکن ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ناشتے کی میز پر یہ ہولناک خبریں پڑھتے ہیں اور لنچ تک انھیں بھول جاتے ہیں۔ ہمیں احساس اس وقت ہوتا ہے جب بم ہماری ناشتے کی میز کے اوپر آ کر پھٹتا ہے پھر ہم دوسروں کی بے حسی کا راگ الاپنے لگتے ہیں۔ خیر، یہ ایک افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کے بھانجے کا کیس کس تھانے میں درج ہوا تھا؟"

"غالباً ضلع شرقی کے کسی تھانے کا کیس ہے۔ جیل حکام کسی قسم کا تعاون نہیں کر رہے۔ انھوں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ عامر کو ریمانڈ پر جیل بھیجا گیا تھا۔ بعد میں اسے دو تین مرتبہ عدالت میں بھی پیش کیا گیا لیکن پھر پولیس اور گواہوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے کیس ٹھپ ہو گیا۔ عامر کو صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ اسے کب جیل میں داخل کرایا گیا تھا۔ تاہم اس کا خیال ہے کہ اسے وہاں پانچ چھ سال ہو چکے ہیں۔ اگر اسے سزا ہوتی تو زیادہ سے زیادہ سال یا چھ مہینے کی ہوتی لیکن وہ چھ سال سے جیل میں بند ہے۔ بتایئے اس ظلم کا کون ذمے دار ہے؟ پولیس یا وہ عدالت جس میں کیس پینڈنگ پڑا ہے؟"

"سب ہی ذمے دار ہیں۔ میں اور آپ بھی ذمے دار ہیں۔ عام طور پر قانون اور انصاف کو روبہ عمل لانے کے لیے زور لگانا پڑتا ہے۔"

افروزہ بیگم نے پہلی دفعہ لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی ملزم اپنے اوپر عائد شدہ الزام کی سزا فیصلے سے پہلے ہی بھگت لیتا ہے تو اسے خود بخود رہائی مل جانی چاہیے۔ اگر عدالت فیصلہ کرنے میں دیر لگاتی ہے تو اس میں ملزم کا کیا قصور ہے؟"

"ہم لوگ وقتاً فوقتاً اس قسم کی تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "قانون بنانا حکومت کا کام ہے۔ ہمارا اور عدالتوں کا کام رائج الوقت قانون پر عمل درآمد کرانا ہے۔ آپ نے جو صورتِ حال بتائی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا بچہ عامر گم تاریخ والا قیدی ہے۔ ہمارے ملک کی جیلوں میں اس قسم کے ہزاروں قیدی بند ہیں۔ جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا انھیں عموماً فراموش کر دیا جاتا ہے۔ گم تاریخوں والے بعض قیدی پندرہ پندرہ بیس بیس سال سے جیلوں میں بند ہیں۔ اس اعتبار سے آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو جلد اپنے بچے کا سراغ مل گیا۔ ویسے آپ کا بچہ گم کیسے ہوا تھا؟"

دونوں نے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر افروزہ بیگم نے کہا۔ "یہ خاصی لمبی کہانی ہے بس اتنا سمجھ لیں کہ عامر ہماری غلطیوں کی وجہ سے گھر سے چلا گیا تھا۔"

"عامر کے باپ کا کیا نام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"عارف حسین مرحوم۔"

"اوہ.... ان کا انتقال کب ہوا؟"

"تقریباً سات آٹھ ماہ قبل۔" افروزہ بیگم نے جواب دیا۔ "عارف حسین ایک بحری جہاز میں سیکنڈ انجینئر تھے۔ ان کے جہاز کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس میں عارف سمیت عملے کے پانچ آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔"

محمد حنیف نے کہا۔ "اخبار میں خاصی تفصیلی خبر شائع ہوئی تھی۔"
میں نے فیس طے کی، وکالت نامہ سائن کرایا اور کہا۔ "آپ کل سہ پہر کے وقت آجائیں۔ میں آپ کے ہمراہ لانڈھی جیل میں عامر سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، ہم حاضر ہوجائیں گے۔" حنیف نے کہا، پھر قدرے تامل کرتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! کیا ہم ہرجانے کا کیس نہیں کرسکتے؟"
"کس پر؟" میں نے پوچھا۔
"کسی پر بھی... میرا مطلب ہے کہ پولیس پر، حکومت پر، عدالت پر یا گواہوں پر...؟"
"کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔"
"جیل کا ایک افسر بتا رہا تھا کہ عامر چوری کی نیت سے کسی کے گھر میں گھسا تھا، اور گھر کے مالک نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ کیا ہم اس شخص کے خلاف ہرجانے کا دعویٰ نہیں کرسکتے؟"
"اس کا انحصار کیس کی نوعیت پر ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے عامر کی عمر کتنی ہے؟"
"اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال کے قریب ہوگی۔" افروزہ بیگم نے جواب دیا۔ "گیارہ سال پہلے جب وہ گھر سے غائب ہوا تھا تو صرف سات سال کا تھا۔"
یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ سات سال کا بچہ گھر سے ناراض ہوکر چلا گیا اور ماں باپ کو گیارہ سال تک اس کا خیال تک نہ آیا!

اگلے روز میں لانڈھی جیل میں عامر سے ملا۔ وہ ایک دُبلا پتلا اور خوش شکل لڑکا تھا تاہم اس کے چہرے پر سختی اور ہوشیاری کا تاثر پایا جاتا تھا۔ ایک خاص بات میں نے یہ نوٹ کی کہ وہ اپنے چہرے کو حرکت دیے بغیر آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے کا عادی تھا جیسے کوئی داؤ لگانے کی فکر میں ہو۔ دوسری بات میں نے یہ نوٹ کی کہ وہ اپنی ماں اور ماموں کی طرف سے سخت بے اعتنائی برت رہا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کہیں انھوں نے لڑکے کو پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی تھی۔
میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ "عامر، تمھاری امی نے مجھے تمھارا وکیل مقرر کیا ہے۔ انشاءاللہ تم جلد رہا ہوجاؤ گے۔ تمھیں یہاں کتنا عرصہ ہوا ہے؟"
"پتا نہیں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "شاید پانچ سال... چھ سال... یا سات سال۔"
"تمھیں کس جرم میں گرفتار کیا گیا تھا؟"
"چوری کے جرم میں۔"
"کیا تم نے واقعی چوری کی تھی؟"
"جس وقت پکڑا گیا اس وقت چوری نہیں کی تھی۔"
"کیا اس سے پہلے کوئی چوری کی تھی؟"
اس نے آنکھیں گھما کر دائیں بائیں دیکھا، پھر بولا۔ "اپنا گزارا ہی چوریوں پر تھا۔"
"تم نے یہ بات پولیس کو تو نہیں بتائی تھی؟"
"انھوں نے کوشش تو بہت کی تھی لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ ویسے تھانیدار اچھا آدمی تھا۔ اس نے سپاہیوں سے کہہ دیا تھا کہ کوئی مجھ پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہت شریف لڑکا ہوں۔"
"تو پھر اُس نے تمھیں چھوڑ کیوں نہیں دیا؟"
"دراصل میں جس شخص کے گھر میں گھسا تھا وہ ایک بددماغ سرکاری افسر تھا۔ اس نے تھانیدار سے کہا تھا کہ مجھے سزا ضرور ملنی چاہیے۔"
"تم اس کے گھر میں کیوں گھسے تھے؟"
اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "امی کو تلاش کرنے گیا تھا۔"
"کیا تم نے اس افسر کو یہ بات نہیں بتائی؟"
"وہ سرکاری افسر تھا اور سننے کا عادی نہیں تھا۔ صرف اپنی بات سناتا تھا۔ اس نے مجھے پانچ تھپڑ مارے، سات گالیاں دیں اور تین لاتیں ماریں۔ جواب میں میں نے صرف دو گالیاں دیں اور شیشے کی ایش ٹرے اٹھا کر اس کے مُنہ پر دے ماری۔" وہ ذرا سا ہنسا۔ "ٹرے زیادہ بھاری نہیں تھی۔ اسے چوٹ کم لگی مگر سگریٹوں کے ٹوٹے اور راکھ اس کے مُنہ پر پڑ گئی۔ اس کے دو چار طبق تو ضرور روشن ہوگئے ہوں گے۔"
"پھر کیا ہوا؟"
"ایش ٹرے مار کر میں باہر بھاگا اور اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا مگر وہ... کم بخت بھنگی نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ ویسے اچھا ہی ہوا۔"
"کیوں، اچھا کیوں ہوا؟"
اس نے ایک بار پھر آنکھیں گھمائیں۔ "باہر ہوتا تو اب تک ہسٹری شیٹر بن چکا ہوتا۔"
"جس افسر نے تمھیں پولیس کے حوالے کیا۔ اس کا نام پتا جانتے ہو؟"
"اسے پتا اچھی طرح معلوم نہیں تھا، نام معلوم تھا۔ اس کا نام شوکت حسین فرض کرلیتے ہیں۔"
اس کے ماموں نے کہا۔ "فکر نہیں کرو، ہم اس افسر پر ہرجانے کا دعویٰ ضرور کریں گے۔"

عامر نے استہزائیہ نظروں سے ماموں کی طرف دیکھا، پھر پوچھا۔ "آپ گیارہ سال پہلے کہاں تھے؟"
"کیسی بات کررہے ہو بیٹے!" ماموں نے کہا۔ "تمھیں کیا پتا کہ تمھاری جدائی میں ہمارا کیا حال تھا۔"
عامر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "ماموں! اس وقت آپ کہاں تھے جب آپ کی بہن نے صرف چھ سات سال کی عمر میں مجھے گھر سے نکال دیا تھا؟"
میں یہ بات سن کر دنگ رہ گیا۔
"ایسی بات مت کہو بیٹے۔" افروزہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ "کوئی ماں اپنے بیٹے کو گھر سے نہیں نکال سکتی۔"
"ماں، ایسے ڈائیلاگ آج کل صرف فلموں میں ہی چل سکتے ہیں۔ یہ پوری جیل ماؤں کے دھتکارے ہوئے بچّوں سے بھری ہوئی ہے۔ کراچی کے بیسیوں یتیم خانے ماؤں کے بچّوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے شمار بچے آوارہ پھرتے ہیں۔ کچھ کو بردہ فروش پکڑ کر لے جاتے ہیں اور کچھ کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ مجھے کوئی بات نہ سمجھائیں۔ میں نے گیارہ سال کی آوارہ گردی میں بہت کچھ سیکھا ہے۔"
افروزہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔" حنیف، بہن کو تسلّی دیتے ہوئے بولا۔ "سب ٹھیک ہوجائے گا، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ عامر بیٹے نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اسے گھر کا آرام ملے گا تو اس کی ساری شکایتیں دور ہوجائیں گی۔"
صورتِ حال پیچیدہ معلوم ہوتی تھی۔ عامر کی طنزیہ گفتگو نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا لیکن اس وقت میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

اگلے چند روز کے اندر میں نے متعلقہ تھانے سے چالان کی نقل نکلوائی، عدالت میں درخواست دے کر کیس کی تاریخ لگوائی اور متعلقہ افراد کے نام سمن جاری کروا دیے۔ ایک سمن شوکت حسین کے نام بھی جاری کروایا اور محمد حنیف سے کہا کہ وہ خود بیلف کے ساتھ جاکر سمن کی تعمیل کرائے۔ نیز شوکت حسین کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرے۔
میری توقع کے مطابق شوکت حسین پہلی دو پیشیوں میں عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ تیسری پیشی کے لیے میں نے اس کے قابلِ ضمانت وارنٹ جاری کروا دیے۔ وہ مدعی ہونے کی وجہ سے پابند گواہ تھا اور عدالت میں اس کی حاضری ضروری تھی۔
اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تقریباً ایک سال قبل ایک اہم عہدے سے ریٹائر ہوا تھا اور ہنوز خاصا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔
تیسری پیشی پر وہ اپنے وکیل کے ہمراہ عدالت میں حاضر ہوا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے کچھ زیادہ اور صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ سرخ و سفید رنگت والا ایک بارعب شخص تھا اور دوسروں کو متاثر کرنے کی قدرتی صلاحیت اپنے اندر رکھتا تھا۔
اس وقت تک ہمارے کیس کی آواز نہیں پڑی تھی۔ میں برآمدے میں اپنے موکل عامر اور اُس کے ماموں سے باتیں کررہا تھا۔
"یہ شوکت حسین ہے۔" حنیف نے ہولے سے کہا۔ "بہت بدمزاج شخص ہے۔"
برآمدے میں لوگوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ شوکت حسین ہماری طرف دیکھے بغیر عدالت کے کمرے میں چلا گیا اور پیش کار سے کچھ بات کرنے لگا۔ غالباً اس نے عامر کو پہچانا نہیں تھا۔
مجھے خیال آیا کہ کیس کی کارروائی کا آغاز شناختی پریڈ سے ہونا چاہیے۔ یہاں پر کیس کے بارے میں چند ضروری باتیں بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ملزم پر دفعہ ۳۷۹ اور ۴۴۸ عائد کی گئی تھی یعنی چوری از خانہ آباد اور مداخلت بے جا۔ پہلی دفعہ کے تحت سات سال تک قید اور جرمانہ کی سزا اور دوسری کے تحت تین ماہ قید اور جرمانہ عائد کیا جاسکتا تھا۔
گواہوں میں شوکت حسین کے علاوہ دو نام اور بھی تھے۔ یہ دونوں شوکت حسین کے ملازم تھے اور کام چھوڑ کر جا چکے تھے۔ واضح طور پر شوکت حسین کا کیس چلانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ عامر کو اس کی بدتمیزی کی سزا دلوانا چاہتا تھا اور اس مقصد میں کامیاب رہا تھا۔
میں نے سپاہی کو حنیف سے کچھ پیسے دلوائے اور کہا کہ کیس کی آواز پڑنے پر وہ اندر نہ آئے اور جب تک میں نہ کہوں باہر ہی کھڑا رہے۔
"جناب، کہیں میری پھٹو پریڈ نہ ہوجائے۔" اس نے کہا۔
"فکر نہیں کرو۔" میں نے اسے تسلّی دی۔ "میری موجودگی میں کچھ نہیں ہوگا۔ میں، دراصل ملزم کی شناخت پریڈ کروانا چاہتا ہوں۔ تم ایک کام اور کرو۔ اس سے ملتے جلتے دو تین لڑکے اور دیکھو۔ ہم ان کو بھی چائے کے پیسے دے دیں گے۔"
"اچھا جی، کوشش کرتا ہوں۔"
"تم فکر نہیں کرو۔" حنیف نے کہا۔ "میں پانچ منٹ میں لڑکوں کی لائن لگا دیتا ہوں۔ لیکن ایک مسئلہ ہے۔ عامر کو ہتھکڑی لگی ہوئی ہے۔"
"ہتھکڑی کھلوانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔"

حنیف، شناختی پریڈ کے لیے موزوں قسم کے لڑکے تلاش کرنے لگا۔

میں نے سپاہی سے کہا۔ "تم اسے لے کر ایک طرف ہو جاؤ، گواہ کی اس پر نظر نہیں پڑنی چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد میں عدالت کے کمرے میں داخل ہوا تو پیش کار نے میری طرف دیکھتے ہوئے شوکت حسین کے وکیل سے کہا۔ "لو جی، وہ بیگ صاحب بھی آ گئے۔"

مذکورہ وکیل سے میری تھوڑی سی شناسائی تھی۔ اس کا نام بی اے لاکھانی تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور رسمی کلمات کے بعد بولا۔ "بیگ صاحب، یہ کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "چوری اور مداخلت بیجا کا کیس ہے۔"

اس نے شوکت حسین کا مکمل تعارف کرایا، پھر کہا۔ "میں نے ان سے بات کر لی ہے۔ یہ اس لڑکے کو معاف کرنے پر تیار ہیں، ویسے بھی اسے کافی سزا مل چکی ہے۔"

میں نے سادگی سے کہا۔ "لیکن وہ لڑکا معاف کرنے پر تیار نہیں ہے۔"

یہ غیر متوقع جواب سن کر شوکت حسین کے چہرے پر غصہ نمودار ہو گیا۔ "وحاٹ دا ہیل . . ." اس نے کہنا شروع کیا۔ لیکن لاکھانی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اور دوستانہ لہجے میں بولا۔ "کیا بات ہے، بیگ صاحب! کیا آج کل کیس کم مل رہے ہیں؟"

"مجھے اپنے ففٹی پرسنٹ موکلوں کو مایوس کرنا پڑتا ہے۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ ایک آوارہ لڑکے کے لیے آپ اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہیں؟"

"غالباً آپ میرے موکل کے خاندانی پس منظر سے واقف نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ ہرجانے کا دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ہرجانہ! مائی فٹ۔" شوکت حسین نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے موکل کی بہتری منظور نہیں ہے۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑا تھا۔ اگر ضد کی بات ہے تو اسے مزید سات سال تک جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔"

"شوکت صاحب! فیصلہ عدالت کو کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے موکل کو ہمیشہ انصاف دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر وہ مجرم ثابت ہوا تو یقیناً سزا کا مستوجب ہوگا اور یہی انصاف ہے۔"

"اور یہی ہوگا بھی۔" شوکت حسین نے کہا اور اپنے وکیل کے ہمراہ ایک طرف ہو گیا۔ میں نے سنا، وہ وکیل کو تاریخ لینے کا مشورہ دے رہا تھا۔

دس بارہ منٹ کے بعد ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی۔

لاکھانی نے مجسٹریٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جناب عالی! یہ تقریباً چھ سال پرانا کیس ہے۔ ہمیں اس کے حقائق و شواہد اکٹھے کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ کم از کم ایک مہینے کی تاریخ دے دی جائے۔"

"جناب والا! فاضل وکیل متضاد بات کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حقائق و شواہد اکٹھے کرنے کے لیے چھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے۔ میرے موکل پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں وہ انتقام اور بدنیتی پر مبنی ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کیس میں ایک دن کی تاخیر بھی مناسب نہیں ہوگی۔"

مجسٹریٹ نے کٹہرے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "ملزم کہاں ہے؟"

"ملزم باہر موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ کیس کی سماعت شروع کرنے سے قبل گواہ شوکت حسین سے ملزم کی شناخت کروائی جائے۔"

"جناب عالی! اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔" لاکھانی نے کہا۔ "جیسا کہ ایف آئی آر میں لکھا ہے، گواہ نے ملزم کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا اور وہ اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ شناختی پریڈ کا انتظام کرنے میں وقت لگے گا، اور عدالت کا قیمتی وقت ضائع ہوگا۔"

"شناختی پریڈ کا انتظام کیا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں عدالت سے صرف ایک درخواست کروں گا کہ ملزم کی ہتھکڑی کھولنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ اسے دوسرے افراد کے درمیان شناخت کے لیے پیش کیا جا سکے۔"

شوکت حسین کا وکیل اعتراض کرتا رہا، مگر مجسٹریٹ نے میری درخواست منظور کر لی۔

میں عدالت کے ایک کارندے کے ہمراہ باہر گیا۔ عامر کی ہتھکڑی کھلوائی اور اسے ان تین لڑکوں کے ہمراہ عدالت میں پیش کیا جن کا حنیف نے انتظام کیا تھا۔

شوکت حسین کنفیوز ہو گیا۔ چھ سال پہلے جب اس نے عامر کو پکڑا تھا اس وقت وہ بارہ سال کا بچہ تھا۔ اب اس نے اچھا خاصا قد نکال لیا تھا۔

دو تین منٹ کے جائزے کے بعد شوکت علی نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ لڑکا ہے۔ چھ سال پہلے اسی نے میرے گھر میں چوری کی تھی۔"

وہ سیدھا سادہ لڑکا گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا۔ "میں چور نہیں ہوں جی۔ میں تو ادھر کنٹین میں کام کرتا ہوں۔ میری ٹرے باہر پڑی ہے۔ ایک صاحب نے مجھے دس روپے دے کر لائن میں کھڑا کر دیا تھا۔ کہہ رہے تھے صرف پانچ منٹ لگیں گے۔"

عدالت میں موجود لوگ ہنسنے لگے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شوکت حسین نے عامر کی طرف اشارہ کیا۔ "سوری یور آنر، میں کنفیوز ہو گیا تھا... اصل چور یہ ہے۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب والا!" میں نے کہا۔ "گواہ نے فقط قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ یہ ملزم کو پہچاننے میں ناکام رہا ہے۔"

لاکھانی نے کہا۔ "جناب عالی! عدالت اس بات کو بھی مدِنظر رکھے کہ شوکت صاحب نے پورے چھ سال کے بعد ملزم کو دیکھا ہے۔ اتنے طویل عرصے میں انسان بعض اوقات اپنے دوستوں کو پہچاننے میں بھی غلطی کر جاتا ہے۔"

عدالت نے میرا اعتراض تو مسترد نہیں کیا، مگر لاکھانی کی بات بھی مان لی۔

اس کارروائی کے بعد تین لڑکوں کو فارغ کر کے عامر کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس اثنا میں لاکھانی نے شوکت حسین کی درخواستِ ضمانت پیش کی اور ایک بار پھر ایک مہینے کی تاریخ مانگی۔

"جناب والا! اس کیس میں تاریخ دینا انصاف کے تقاضے کے سخت خلاف ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ایف آئی آر میں صرف تین گواہوں کے نام درج ہیں۔ ایک گواہ مسٹر شوکت حسین عدالت میں موجود ہیں۔ دوسرے دو گواہ جو ان کے گھریلو ملازم تھے، کام چھوڑ کر جا چکے ہیں اور ان کا موجودہ ٹھکانا پولیس کو معلوم نہیں ہے۔ اصل انکوائری آفیسر بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ نیا انکوائری آفیسر صرف ایف آئی آر کی بنیاد پر ہی بات کر سکتا ہے۔ اس لیے تاریخ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میں انکوائری آفیسر اور گواہ شوکت پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ یہ دونوں افراد اس وقت عدالت میں موجود ہیں۔ اس لیے عدالت کی کارروائی جاری رکھنے کے لیے کوئی بات مانع نہیں ہے۔"

عدالت نے میری درخواست منظور کر لی۔ میں نے پہلے انکوائری آفیسر کو جرح کے لیے طلب کیا اور عدالت کی اجازت سے شوکت کو عدالت کے کمرے سے باہر بھیج دیا۔

انکوائری آفیسر ایک نوجوان اے ایس آئی تھا اور اس کا نام غلام سرور تھا۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ ملزم عامر چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "ایف آئی آر میں یہی لکھا ہوا ہے۔"

"کیا آپ مالِ مسروقہ کی تشریح کریں گے؟"

"جو چیز کوئی چور، چوری کر کے لے جاتا ہے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دیتا ہے اسے مالِ مسروقہ کہا جاتا ہے۔"

میں نے اس بات کی مزید وضاحت کے لیے کہا۔ "مثلاً ایک گھر میں چور داخل ہوتا ہے۔ کمرے میں رکھا ہوا بریف کیس اٹھا کر صحن میں لے جاتا ہے، اس میں سے قیمتی اشیا نکال لیتا ہے اور بریف کیس کو صحن میں ہی چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیا یہ بریف کیس بھی مالِ مسروقہ سمجھا جائے گا؟"

"جی ہاں، اس کو بھی مالِ مسروقہ ہی کہا جائے گا۔ تاہم بعض صورتوں میں اس کی تشریح مختلف بھی ہو سکتی ہے۔"

"اگر چور گھر کے اندر ہی پکڑ لیا جائے تو اس کے قبضے سے گھر کی جو چیز برآمد ہوگی اسے کیا کہا جائے گا؟"

"اسے بھی مالِ مسروقہ کہا جائے گا۔"

"کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گے کہ پولیس مالِ مسروقہ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے؟"

"پولیس مالِ مسروقہ اپنے قبضے میں لے لیتی ہے اور بوقتِ ضرورت اسے ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایف آئی آر کے مطابق ملزم رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لیکن اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ ملزم کے قبضے سے کیا چیز برآمد ہوئی تھی۔ کیا آپ اس معاملے پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایف آئی آر میں یہ تو درج ہے کہ ملزم چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تھا لیکن اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ اس نے کیا چیز چوری کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ چوری کی نیت سے گھر میں داخل ہوا تھا مگر صاحبِ خانہ کی بروقت مداخلت سے چوری کرنے سے قبل ہی پکڑا گیا۔"

"یہ محض آپ کا قیاس ہے اور قیاس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گے کہ ملزم پر پی پی سی کی دفعہ ۷، ۳ کیوں عائد کی گئی تھی؟"

"یہ کیس خاصا پرانا ہے، اس لیے میں اس سلسلے میں کوئی یقینی بات عرض نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ موقع پر تفتیش کرنے والے افسر کو مسروقہ مال قبضے میں لینے کا خیال نہ رہا ہو۔ یا مال اتنا قیمتی ہو کہ مالک نے اسے پولیس کے حوالے کرنے سے

انکار کر دیا ہو۔"

"گویا آپ صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ کوئی ٹھوس ثبوت آپ کے پاس نہیں ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے اسے فارغ کر دیا اور شوکت حسین کو اندر بُلا لیا۔

اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد کہا کہ چھ سال قبل ایک شام وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے ملزم کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس وقت شام کے تقریباً چھ بجے تھے اور گھر کے افراد ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے وی سی آر پر فلم دیکھ رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں ملزم کے پیچھے گیا اور اسے قیمتی چیزیں سمیٹتے دیکھا۔ گواہ نے مزید کہا کہ ملزم نے اسے دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر اس نے ملازموں کی مدد سے اسے پکڑ لیا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔ "شوکت صاحب کیا آپ ان قیمتی چیزوں کی تفصیل بتانا پسند کریں گے جن کو بقول آپ کے ملزم نے سمیٹا تھا۔"

"بات بہت پرانی ہو چکی ہے اور تفصیل مجھے یاد نہیں رہی۔ اس قسم کے آوارہ لڑکے عموماً ریڈیو، گھڑیاں اور دیگر قیمتی اشیا سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور انھیں چور بازار میں اونے پونے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔"

"شوکت صاحب! یہ آپ سنی سنائی بات کر رہے ہیں یا ایسے واقعات اکثر آپ کے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں؟ اور اگر یہ مشاہدے کی بات ہے تو کیا آپ کسی ایک مشاہدے کا احوال اس عدالت میں پیش کریں گے؟"

"وکیل صاحب، معلوم ہوتا ہے کہ آپ اخبار نہیں پڑھتے ایسی خبریں روزانہ اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔"

"میں آپ کو ایک منٹ کے اندر آج کا اخبار فراہم کر سکتا ہوں۔ کیا آپ اس میں سے ایسی خبر نکال کر پیش کر سکتے ہیں؟"

"آج کا اخبار ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔"

"ابھی آپ نے کہا کہ اس قسم کے آوارہ لڑکے، کیا آپ اس جملے کی وضاحت کریں گے اور کیا یہ ثابت کریں گے کہ میرا موکل بھی اس قسم کے آوارہ لڑکوں میں سے ہے؟"

"کمال ہے، آپ اتنی معمولی بات نہیں سمجھ رہے جو آوارہ لڑکا چوری کی نیت سے کسی کے گھر میں گھسے اور رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اسے آپ کس قسم کے لڑکوں میں شمار کریں گے۔"

"میں آپ کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا موکل ایک میرین انجینئر کا بیٹا اور ایک معزز خاندان کا فرد ہے۔ آپ اس کے لیے بار بار آوارہ کا لفظ استعمال نہ کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چوری کا الزام ثابت ہونے سے قبل ملزم قانون کی نظر میں بے گناہ متصور ہوتا ہے۔ میرے موکل کا موقف یہ ہے کہ اس پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں، وہ بدظنی، بدنیتی اور انتقامی جذبے پر مبنی ہیں۔"

"مسٹر وکیل صاحب، میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہا ہوں۔ کیا میں ایک دو ٹکے کے چھوکرے کے خلاف انتقامی کارروائی کروں گا۔"

"ہم اسی بات کا فیصلہ کرنے کے لیے اس عدالت میں جمع ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کہا کہ ملزم آپ کے ڈرائنگ روم سے چند قیمتی چیزیں سمیٹ رہا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال حال ہی میں آپ کے ذہن میں آیا ہے۔ اگر یہ الزام حقیقت پر مبنی ہوتا تو ایف آئی آر میں اس کا ضرور ذکر ہوتا۔"

"یہ پولیس کی نااہلی ہے کہ اس نے اس بات کا ایف آئی آر میں ذکر نہیں کیا۔"

"ایف آئی آر پر آپ کے دستخط بھی موجود ہیں۔ آپ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہے ہیں اور اہم کاغذات پہ دستخط بھی کرتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے ایف آئی آر پر دستخط کرنے سے قبل اسے مکرر بلکہ بار بار پڑھا ہوگا۔ کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گے کہ جن قیمتی چیزوں کو ملزم نے، آپ کے بیان کے مطابق سمیٹا تھا، انھیں برآمد شدہ مالِ مسروقہ کی حیثیت سے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا گیا؟"

"چہ خوب، میں اپنا قیمتی مال پولیس کے حوالے کر دیتا اور اس کے بعد اس کی واپسی کے لیے عدالتوں میں دھکے کھاتا پھرتا۔"

میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جنابِ والا! گواہ کے یہ الفاظ توہینِ عدالت کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان کا نوٹس لیا جائے۔"

مجسٹریٹ نے کہا۔ "مسٹر شوکت حسین، آپ جواب دینے میں احتیاط سے کام لیں۔"

میں نے جرح جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شوکت صاحب، آپ کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کا مقصد فقط ملزم کو پولیس کے حوالے کرنا تھا۔ آپ اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اب آپ قیاس آرائی کر رہے ہیں۔"

"یہ قیاس آرائی نہیں حقیقت ہے۔ کیس چھ سال قبل درج کروایا گیا تھا۔ ملزم کو عدالت میں پیش کیا گیا اور آپ کو گواہی کے لیے

سمن بھیجے گئے، مگر آپ نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ آج پہلی مرتبہ آپ وارنٹ گرفتاری کی وجہ سے عدالت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کے دو سمن آپ نے نظر انداز کر دیے تھے۔"

"میں ایک مصروف آدمی ہوں بعض مجبوریوں کی وجہ سے عدالت میں حاضر نہیں ہو سکا۔"

میں نے کہا۔ "چھ سال قبل میرا موکل ایک بارہ سالہ نادان بچّہ تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کسی کے گھر میں گھسنا قانوناً جرم ہے لیکن آپ کو یہ بات یقیناً معلوم تھی کہ کسی بچے پر تشدّد نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" شوکت حسین نے میری بات کاٹی۔ "ملزم بُری نیّت سے میرے گھر میں داخل ہوا تھا۔ میں اسے سرزنش کر سکتا تھا۔ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"بُری نیّت کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"اگر ملزم کی بُری نیّت نہ ہوتی تو وہ میرے گھر میں داخل کیوں ہوتا۔"

میں نے مجسٹریٹ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جنابِ والا! اس کیس کا سب سے اہم سوال یہی ہے کہ ملزم، گواہ کے گھر میں کیوں داخل ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سوال کا جواب ملزم خود اپنی زبان سے دے۔"

مجسٹریٹ نے ملزم کو جواب دینے کی اجازت دے دی۔

عامر نے میرے استفسار پر کہا۔ "سر! میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا تھا اور کافی عرصے سے اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اس روز میں ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک عورت کو ٹیکسی سے اُتر کر ایک بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا اس عورت کی شکل ہوبہو میری ماں سے ملتی جلتی تھی۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور بنگلے میں داخل ہو گیا۔ پہلا کمرا جو ڈرائنگ روم تھا، خالی تھا۔ میں نے اپنی ماں کو آواز دی اور دوسرے کمرے میں نظر ڈالی۔ تب ہی ان صاحب نے پیچھے سے میری گردن دبوچ لی اور کہا، 'کیوں بے، کُتّے کی دُم کس کی اجازت سے اندر گھسا ہے۔' میں نے ان کو بہت کہا کہ میں نے اپنی ماں کو اس بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور ان کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔ مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی۔ بعد میں تھانیدار صاحب نے مجھ سے کہا کہ شوکت صاحب بہت بڑے افسر ہیں اور ان کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا اور یہ کہ مجھے ان کے سامنے چپ رہنا چاہیے لیکن مجھے یہ بات پہلے معلوم نہیں تھی۔ اس لیے میں اپنی بات سنانے کی کوشش کرتا رہا۔ انھوں نے مجھے پانچ تھپّڑ مارے، سات گالیاں دیں اور تین لاتیں ماریں۔ میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے دو گالیاں دیں اور شیشے کی ایش ٹرے اٹھا کر ان کی طرف پھینکی۔ اس سے ان کا دھیان دوسری طرف ہو گیا اور مجھے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ لیکن جیسے ہی میں نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی پیچھے سے بھنگی نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ اس کے بعد شوکت صاحب نے مجھے بہت ساری گالیاں دیں اور بہت سارے تھپّڑ مارے۔ یہ کام انھوں نے بہت تیز تیز کیا اس لیے میں گنتی نہ کر سکا۔ پھر انھوں نے پولیس کو بُلایا اور تھانیدار سے کہا، 'اس شیطان نے میرے گھر میں گھس کر مجھے گالیاں دی ہیں اور مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اسے جیل میں بند کر دو۔' تھانیدار نے پوچھا، 'اس پر دفعہ کون سی لگانی ہے؟' انھوں نے جواب دیا، 'کوئی بھی دفعہ لگا دو۔ چوری، ڈکیتی، قاتلانہ حملہ یا کوئی بھی سخت قسم کی دفعہ۔ اسے دو چار سال تک جیل سے باہر نہیں آنا چاہیے۔' تھانیدار صاحب شریف آدمی تھے انھوں نے مجھے دو چار ہلکے ہلکے ہاتھ مارے اور لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ وہ مجھے چھوڑ دینا چاہتے تھے مگر شوکت صاحب نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اگلی صبح یہ خود تھانے آئے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ایف آئی آر کٹوائی اور پولیس کے ایک بڑے افسر سے تھانیدار کو فون بھی کروا دیا۔"

عامر کا بیان ختم ہوا تو مجسٹریٹ نے شوکت حسین سے پوچھا۔ "ملزم کے بیان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"یہ سب جھوٹ ہے۔"

میں نے مجسٹریٹ کی اجازت سے جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آپ نے اپنے وکیل کی وساطت سے مقدمہ ختم کرنے کی پیشکش کی تھی؟"

"آپ میرے انسانی ہمدردی کے جذبے کو غلط رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اگر آپ یہ پیشکش چھ سال پہلے کرتے تو اسے انسانی ہمدردی کا جذبہ ہی سمجھا جاتا لیکن اب اس پیشکش کا مطلب یہ ہے کہ آپ بقولِ خود عدالتوں میں دھکّے کھانے سے بچنا چاہتے ہیں۔ نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ملزم ایک معزز خاندان کا فرد ہے اور آپ پر ہرجانے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

"ہونہہ... معزز خاندان!" اس نے زیرِ لب کہا۔

"شکریہ" میں نے کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"
شوکت حسین کٹہرے سے نکل کر کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے پر خاصی جھنجلاہٹ پائی جاتی تھی۔
میں نے عدالت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جناب والا! انکوائری افیسر اور گواہ پر جرح سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملزم پر محض انتقامی کارروائی کے طور پر جھوٹا مقدمہ بنایا گیا تھا۔ ایف آئی آر میں کسی مالِ مسروقہ کا ذکر نہیں ہے۔ نہ ہی استغاثہ یہ بتا سکا ہے کہ ملزم نے کیا چیز چوری کی تھی۔ جرح کے دوران آپ یہ بات بھی سن چکے ہیں کہ گواہ شوکت حسین انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت مقدمہ ختم کرنے پر راضی ہیں لہٰذا میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ملزم کو ہرجانے کے اختیار کے ساتھ باعزت طور پر بری کیا جائے۔"
مجسٹریٹ نے وکیلِ استغاثہ سے کہا۔ "آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"
"جناب عالی! چونکہ ملزم چھ سال کا عرصہ جیل میں گزار چکا ہے، اس لیے انسانی ہمدردی کے نقطۂ نظر سے مقدمہ ختم کیا جا سکتا ہے لیکن میں ہرجانے والی بات سے متفق نہیں ہوں۔"
"جناب والا! مقدمے کا یہ پہلو خاص طور پر آپ کی توجہ کا مستحق ہے کہ ایک بارہ سالہ بچے کو مقدمہ چلائے بغیر چھ سال کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان چھ سالوں میں اس نے جیل کی اذیتیں بھی برداشت کیں اور تعلیم سے بھی محروم رہا۔ اگر ہم ان بچوں کو بہ حیثیتِ مجموعی قوم کا سرمایہ نہیں سمجھیں گے تو ہم ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اگر شوکت صاحب کا اپنا بچہ ایسی غلطی کا مرتکب ہوتا تو وہ اس کے لیے ہرگز ایسی خوف ناک سزا تجویز نہ کرتے۔ اس عمر کے بچے تو اکثر دوسروں کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ گلی میں کھیلتے ہوئے کسی بچے کی بال گھر میں چلی جاتی ہے یا کوئی اور ضرورت پیش آسکتی ہے۔ کیا ہم گھر میں گھسنے والے ہر بچے کو مارنا شروع کر دیں گے یا اس پر چوری کا الزام لگا کر اسے جیل میں بند کر دیں گے؟ جناب والا! اس رجحان کی سختی سے حوصلہ شکنی ہونا چاہیے تاکہ کوئی شخص اپنے اثر و رسوخ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کی اس دولت کو ضائع نہ کرے۔"
وکیلِ استغاثہ کچھ نہیں بولا۔
شوکت حسین نے متوقع نظروں سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا، پھر اسے چپ پا کر بولا۔ "یور آنر، میں یہ بات مانتا ہوں کہ میری غفلت اور پولیس کی نااہلی کے سبب چوری والا معاملہ صحیح انداز میں درج نہیں کیا گیا لیکن مداخلتِ بے جا کا معاملہ تو بہرحال ثابت شدہ ہے۔ ملزم نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے۔"
مجسٹریٹ نے قدرے تلخی سے پوچھا۔ "مسٹر شوکت حسین، کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے ملزم کو مارا تھا؟"
شوکت حسین نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔ "غصے میں دو تین تھپڑ مار دیے ہوں گے۔"
"آپ ایک بارہ سال کے بچے کے لیے مداخلتِ بے جا کی اس سے زیادہ اور کیا سزا تجویز کرتے ہیں؟"
"سزا قانون کے مطابق ہی ہونی چاہیے۔"
"قانون صرف تین مہینے کی سزا تجویز کرتا ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "کیا آپ کے وکیل نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی؟"
شوکت حسین خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔
مجسٹریٹ پندرہ بیس منٹ کے لیے چیمبر میں گیا اور پھر واپس آکر فیصلہ سنا دیا۔ اس نے عامر کو ہرجانے و خرچے کے حق کے ساتھ باعزت بری کر دیا۔
شوکت حسین فیصلہ سنتے ہی عدالت سے نکل گیا۔

دوپہر کے بعد محمد حنیف اپنے بھانجے عامر کے ہمراہ میرے دفتر میں داخل ہوا اور رسمی کلمات کے بعد بولا۔ "بیگ صاحب، ہم آپ کا شکریہ بھی ادا کرنے آئے ہیں اور ایک دوسرا کیس بھی سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ شوکت حسین کو بھاگنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ جب آپ اس پر جرح کر رہے تھے تو مجھے بڑا ہی مزہ آرہا تھا۔"
"سر! آپ نے واقعی بڑی عمدہ وکالت کی ہے۔" عامر نے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی وکیل بن جاؤں لیکن میں صرف بچوں کا وکیل بنوں گا۔"
"جذبہ تو بہت اچھا ہے، مگر تمھاری عمر بہت ہو چکی ہے۔"
چونکہ وہ سات سال کی عمر میں بے گھر ہوا تھا۔ اس لیے میرا اندازہ تھا کہ وہ دو تین جماعتوں سے زیادہ نہیں پڑھ سکا ہوگا لیکن اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ اس سال اس نے جیل میں نویں کا امتحان دیا تھا۔
"پھر تو تم یقیناً وکیل بن سکتے ہو۔" میں نے کہا۔
"بیگ صاحب، ہم اس کو بہت کچھ بنائیں گے۔" اس کے ماموں نے کہا۔ "فی الحال آپ شوکت حسین کے نام ہرجانے کا ایک نوٹس بھجوا دیں اور ہمارا خیال ہے کہ یہ نوٹس دس لاکھ روپے کا ہونا چاہیے۔ کیوں عامر بیٹے، ٹھیک ہے نا؟"
"ماموں، نوٹس جتنے کا مرضی بھیج دیں۔" عامر نے کہا۔ "لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کی فیس بھی ڈوب جائے گی۔"
میں نے محسوس کیا کہ لڑکا ذہین تھا۔ زمانے کی ٹھوکروں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔
"میاں صاحبزادے، تم پالیٹکس نہیں جانتے۔ شوکت حسین ریٹائر ہو چکا ہے اور سہل پسند آدمی بھی ہے۔ اس کے پاس پہلے جیسا اثر و رسوخ بھی نہیں رہا۔ ہم اس کی عدالت کے برآمدوں میں خوب دوڑ لگوائیں گے اور جب وہ تھک کر ہانپنے لگے گا تو ہم اس سے پوچھیں گے، بتا تیری رضا کیا ہے؟"
عامر نے پُرخیال نظروں سے ماموں کو گھورا۔ "یعنی بلیک میل۔"
"یہ بعد میں سوچنے کی باتیں ہیں۔" حنیف نے کہا۔ "بیگ صاحب، آپ عامر سے دستخط وغیرہ کروا لیں اور یہ...... تھوڑی سی رقم بطورِ ایڈوانس رکھ لیں۔" اس نے نوٹوں کی گڈی نکال کر میز پر رکھی۔ "ابھی ہم ایک کیس اور آپ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ فیس ذرا مناسب ہی رکھیں۔"
میں نے نوٹ گن کر دراز میں رکھ دیے اور پوچھا۔ "آپ لوگ صرف نوٹس دینا چاہتے ہیں یا باقاعدہ کیس چلائیں گے؟"
"باقاعدہ کیس چلائیں گے صاحب، آپ پوری طرح تیار رہیں۔ عدالت نے ہمیں ہرجانہ وصول کرنے کا جو موقع دیا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ یہ رقم صاحبزادے کا مستقبل سنوارنے کے لیے ہوگی۔"
"کیس تیار کرنے سے پہلے میں سارے واقعات سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً عامر کی گمشدگی کی وجوہات، گھر سے جانے کے بعد یہ کہاں رہا اور کس حال میں رہا اور آپ لوگوں نے، یعنی آپ اور اس کے والدین نے اس کی بازیابی کے لیے کیا کچھ کیا؟"
یہ واقعات میں اس لیے بھی جاننا چاہتا تھا کہ عامر کی باتوں سے میرے دل میں تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ جیل میں ملاقات کے دوران اس نے اپنی ماں سے جو باتیں کی تھیں ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بچپن میں ماں باپ کی ناچاقی کے باعث گھر سے نکلنا پڑا تھا۔
"سارے واقعات میں آپ کو بتا دوں گا۔" حنیف نے کہا۔ "آپ بھی ضرور بتائیں لیکن جو واقعات عامر کے ساتھ پیش آئے ہیں، وہ آپ نہیں بتا سکیں گے۔"
"میری کہانی سننے کے لیے آپ کو بہت وقت دینا پڑے گا۔" عامر نے کہا۔ "اور میں کسی کے سامنے اپنی کہانی نہیں سناؤں گا۔"
میں اپنے ڈیسک کیلنڈر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم پرسوں تین بجے میرے پاس آجاؤ۔ میں پورے اطمینان سے تمھاری کہانی سنوں گا۔"
محمد حنیف اس بات پر خوش نظر نہیں آتا تھا کہ میں علیحدگی میں اس کے بھانجے کی کہانی سنوں۔

شوکت حسین کو نوٹس بھجوانے سے قبل میں نے عامر، اس کی ماں اور اس کے ماموں سے الگ الگ ملاقات کر کے سارے واقعات سنے۔ ان کے بیانات میں اچھا خاصا تضاد تھا۔ اس تضاد کو سمجھنے کے لیے مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملنا پڑا۔ ان میں افروزہ بیگم کے بعض پرانے پڑوسی اور عامر کے باپ کے دوست بھی شامل تھے۔ اگر میں یہ ساری تفصیل بیان کروں گا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی لہٰذا میں غیر ضروری تفصیلات اور متضاد باتوں کو چھوڑ کر اصل واقعات کو مختصر کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔
عارف حسین ایک میرین انجینئر تھا اور ایک یونانی جہاز راں کمپنی میں ملازم تھا۔ اسے اپنی ملازمت کے سلسلے میں بعض اوقات دو دو سال تک باہر رہنا پڑتا تھا۔
افروزہ بیگم شادی سے پہلے ایک فیشن ماڈل تھی جبھی مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس سا لگا تھا۔
عارف حسین نے شادی کے وقت یہ شرط رکھی تھی کہ افروزہ بیگم شادی کے بعد ماڈلنگ نہیں کرے گی۔ افروزہ بیگم نے یہ شرط منظور کر لی اور شادی ہو گئی۔ ابتدائی چند سال خیریت سے گزر گئے۔ بعد میں عارف کو معلوم ہوا کہ افروزہ اس کی عدم موجودگی میں ماڈلنگ کرتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ افروزہ بیگم کا جواز یہ تھا کہ عارف تو دیس دیس کی سیر کرتا پھرتا ہے اور وہ گھر میں پڑی بور ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر وہ فقط تفریح کے لیے تھوڑی سی ماڈلنگ کر لیتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔
عارف اس عذرِ لنگ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی طرح ہزاروں لاکھوں افراد جہازوں پر کام کرتے ہیں اور اس کی طرح گھروں سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ لیکن ان کی بیویاں گھروں میں بور نہیں ہوتیں، نہ ہی ماڈلنگ کو تفریح کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ افروزہ کو فرصت کا وقت اپنے بچے عامر کی تعلیم و تربیت پر صرف کرنا چاہیے۔
لیکن دونوں میں سمجھوتا نہ ہو سکا اور بالآخر علیحدگی ہو گئی۔ اس وقت عامر کی عمر تقریباً پانچ سال تھی۔ طے یہ پایا کہ عامر ماں کے پاس رہے گا اور اس کا خرچہ عارف ادا کرے گا۔

یہ انتظام دو سال تک ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ عارف کا جہاز جب کراچی پورٹ پر لنگر انداز ہوتا تو وہ عامر کو اپنے پاس بلا لیتا۔ کراچی میں اس کا اپنا گھر تھا جس کے نچلے حصّے میں کرائے دار رہتے تھے اوپر کا حصّہ اس کی غیر حاضری میں بند پڑا رہتا تھا اس لیے اسے کراچی میں قیام کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی ہوتی تھی۔

اصل مسئلہ ۱۹۷۷ء کے اوائل میں پیدا ہوا۔

ان دنوں افروزہ بیگم کی محبوب علی نامی شخص سے شناسائی ہوگئی۔ محبوب علی ایک غیر ملکی ہوائی کمپنی میں اسٹیورڈ تھا اور اچھا کھاتا پیتا شخص تھا۔ گو اس کی تنخواہ بڑی معقول تھی۔ مگر دولت کی جو ریل پیل تھی وہ تنخواہ کے حساب سے بہت زیادہ تھی۔ کچھ عرصہ تک دونوں کی ملاقاتیں یونہی چلتی رہیں پھر ایک روز افروزہ نے شادی کی بات چھیڑ دی۔

"شادی کے معاملے میں مَیں بہت خود غرض ہوں۔" محبوب نے کہا۔ "تم میری شرط پوری نہیں کر سکو گی۔"

"آزما کر تو دیکھو۔" افروزہ بیگم نے کہا۔ ان دنوں وہ قدرے موٹی ہوگئی تھی۔ اور اسے ماڈلنگ کا کام ملنا تقریباً بند ہوگیا تھا اس کے علاوہ اسے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کی پریشانی بھی لاحق ہوگئی تھی۔

"شرط بہت سخت ہے۔" محبوب علی نے کہا۔ "ایسا نہ ہوکہ دوستی بھی جاتی رہے۔"

"اب تو تمھیں بتانا ہی پڑے گا۔" افروزہ نے کہا۔ "ورنہ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہیں گے۔"

محبوب علی نے تامّل کرتے ہوئے کہا۔ "مسئلہ تمھارے بچے کا ہے۔ مَیں ایک ایسے بچے کی سرپرستی قبول نہیں کر سکتا، جس کا باپ زندہ ہو۔"

افروزہ یہ سن کر چپ سی ہوگئی۔ ایک طویل توقف کے بعد اس نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گی۔

چند ماہ بعد عارف حسین کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو وہ حسبِ سابق عامر کو لینے گھر لے گیا۔

اس دوران افروزہ نے محبوب علی کی شرط منظور کر لی اور اس سے کہا کہ اس نے عامر کو ہمیشہ کے لیے اس کے باپ کے سپرد کر دیا ہے۔

"ایسا نہ ہوکہ عارف اسے دوبارہ ہمارے دروازے پر چھوڑ کر چلا جائے۔" محبوب علی نے خدشہ ظاہر کیا۔ "اس لیے کام پکا ہونا چاہیے۔"

"کیا تم اسٹیمپ پیپر لکھوانا چاہتے ہو؟"

"وہ تو بہر حال لکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک دوسری بات ہے۔ مَیں نے کلفٹن کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا ہے۔ کل مَیں خاموشی سے تمھارا سامان اس اپارٹمنٹ میں منتقل کروا دیتا ہوں۔ پرسوں ہم کورٹ میں جا کر شادی کر لیں گے۔ یہاں سے رخصت ہوتے وقت تم کسی کو اپنا نیا پتا نہ بتانا۔ جس کمپلیکس میں مَیں نے اپارٹمنٹ کرائے پر لیا ہے وہاں سیکیورٹی کا انتظام بہت سخت ہے۔ کوئی اجنبی بغیر اجازت کے وہاں داخل نہیں ہو سکتا۔"

افروزہ جس مکان میں رہتی تھی وہ ناظم آباد میں تھا۔ عارف کا مکان اس سے بھی آگے نارتھ ناظم آباد میں تھا۔ جبکہ کلفٹن وہاں سے دس بارہ میل دور تھا۔ افروزہ نے محبوب علی کی تجویز منظور کر لی اور اگلے روز کلفٹن منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم اس نے عارف کو عامر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا جب عارف کو اس کی نقل مکانی کا پتا چلے گا تو وہ خود ہی عامر کا کوئی انتظام کرے گا۔ واضح طور پر اسے ہوسٹل میں داخل کرانے پر مجبور ہو جائے گا۔

لیکن اسی شام اس نے اطلاعی گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ عامر اپنا اسکول بیگ پشت پر ڈالے دروازے پر کھڑا تھا اور عارف کی ٹیکسی دروازہ کھلتے دیکھ کر حرکت میں آ رہی تھی۔

"اوہ، عامر بیٹے، تم اتنی جلدی واپس آ گئے؟" افروزہ نے قدرے پریشانی سے کہا۔ "کیا تمھارے ابو واپس شپ پر جا رہے ہیں؟"

"پتا نہیں. . ." عامر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"اس دفعہ انھوں نے تمھیں پندرہ دن بھی اپنے پاس نہیں رکھا ہے۔"

"میرا ان کے پاس دل نہیں لگتا۔" عامر نے کہا۔ "ان کو کھانا پکانا تو آتا نہیں۔ بس ہوٹل سے کھانا منگوا لیتے ہیں۔ جب دیکھو ہوٹل کا کھانا. . . جب دیکھو ہوٹل کا کھانا۔"

افروزہ کو خیال آیا کہ عامر کو اسی وقت واپس چھوڑ آئے لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ عامر پر بُرا اثر پڑے گا۔

اگلی صبح اس نے عامر سے کہا۔ "بیٹا، آج مَیں ایک ریکارڈنگ کے سلسلے میں ٹھٹھہ جا رہی ہوں۔ تم ایک دن اور ابو کے پاس گزار لو، میں کل صبح تمھیں واپس لے آؤں گی۔"

سات سالہ عامر ماں کے اس فیصلے پر کیا اعتراض کر سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے تیار ہو گیا۔

افروزہ نے رکشا کیا اور عامر کو ساتھ لے کر عارف کے

گھر پہنچ گئی۔ عامر کو اس کا رویہ خاصا عجیب لگا رہا تھا مگر وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ افروزہ نے مکان کے سامنے رکشا رکوایا اور یہ فرض کرتے ہوئے عارف حسین گھر میں ہی ہوگا۔ عامر کو سیڑھیوں کے سامنے اتار کر واپس چلی گئی، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ عارف گزشتہ رات ہی جہاز پر چلا گیا تھا، اور اس کے جہاز نے علی الصباح لنگر اٹھا دیا تھا۔

عامر سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا اور دیکھا کہ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر وہاں انتظار کرنے لگا کہ شاید اس کے ابو ناشتا کرنے کسی ہوٹل میں گئے ہوں لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ جب دوپہر ہو گئی تو اس نے نیچے پہنچ کر کرائے داروں کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے ابو کے بارے میں پوچھا۔

"تمھارے ابو تو شپ پر چلے گئے ہیں۔" خاتون خانہ نے جواب دیا۔ "تم کس کے ساتھ آئے ہو؟"

"مجھے امی یہاں چھوڑ گئی ہیں۔"

"اُدھر سے بس پکڑو اور فوراً واپس چلے جاؤ۔" خاتون نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

عامر گلی سے نکل کر مین روڈ پر پہنچا اور جو پہلی بس ناظم آباد کی طرف جاتی دکھائی دی اس میں بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماں گھر پر نہیں ہو گی اس لیے وہ گھبراہٹ میں ایک اسٹاپ آگے نکل گیا اور پھر پیدل چل کر واپس پہنچا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے محبوب علی سامان کے ٹرک کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

عامر دروازے کے پاس بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس کا بھوک سے بُرا حال تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

افروزہ کو اس علاقے میں رہتے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے اور اس نے آس پاس رہنے والوں سے زیادہ مراسم نہیں پیدا کیے تھے۔ یوں بھی کراچی میں پڑوسیوں سے میل جول بڑھانے کا رواج کم ہی ہے۔

چار بجے تک عامر کی حالت غیر ہو گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ساتھ والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک عورت نے حیرت سے عامر کی طرف دیکھا۔

"آئے ہائے..." اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "وہ کمبخت ماری اپنے بچے کو یہیں چھوڑ گئی۔ اری رضیہ بیٹی، ذرا اِدھر تو آ۔ یہ بچہ اسی پڑوسن کا ہے نا جو آج صبح ایک مرد کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

لمحہ بھر کے اندر مذکورہ عورت کی بیٹی رضیہ اور دو چھوٹے بچے گلی میں نکل آئے اور عامر کو گھورنے لگے۔ بچوں کے نام انور اور طاہر تھے۔ طاہر، عامر کا ہم عمر تھا اور گھر میں اسے سب گلو کہتے تھے۔ وہ عامر کا دوست تھا اور دونوں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔

"ارے عامر، تمھاری امی تو چلی گئیں، تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔"

عامر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اچانک اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "میں امی کے پاس جاؤں گا... میں امی کے پاس جاؤں گا۔ مجھے بھوک لگی ہے... میں امی کے پاس جاؤں گا۔"

رضیہ کو اس پر ترس آگیا۔ وہ اسے اندر لے گئی، اس کا منہ دھلایا اور اس کے لیے کھانا نکال لائی۔

عامر کو اس صورتِ حال پر بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا معصوم سا ذہن یہ حقیقت قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

جب شام ہو گئی تو رضیہ کی ماں قمر النسا نے کہا۔ "ارے بیٹی، تم خواہ مخواہ اس کو گھر لے آئیں کہیں یہ ہمارے پلّے ہی نہ پڑ جائے۔ پتا نہیں وہ... کیا نام ہے اس کا، افروزہ بیگم، اس کی ماں بھی تھی یا نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ... کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" رضیہ نے کہا۔ "ممکن ہے کہ آنٹی اسے لینے کے لیے واپس آئیں۔"

"واپس آنا ہوتا تو چھوڑ کر ہی کیوں جاتی۔" قمر النسا نے کہا۔ "سچ پوچھو تو یہ عورت ٹھیک نہیں تھی۔ ایک آوارہ سا مرد روزانہ کار میں اس کے گھر آتا تھا۔ وہی اس کا سامان ٹرک میں لدوا کر لے گیا تھا۔"

"عامر کے ابو کہیں اور رہتے ہیں۔" گلو نے کہا۔ "عامر کہہ رہا تھا کہ اس کے ابو سمندری جہاز میں کام کرتے ہیں۔ وہ بہت بڑے افسر ہیں۔"

"ہاں، میں نے بھی ان کو دیکھا تھا۔" رضیہ نے کہا۔ "ایک دن وہ عامر کو لینے آئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد جب رضیہ کا باپ ارشاد احمد گھر پہنچا تو اسے ساری بات بتائی گئی۔

"تم لوگوں نے عامر سے بھی کچھ پوچھا ہے یا خود ہی بیٹھے اندازے لگا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اس بے چارے کو کیا پتا ہوگا۔" قمر النسا نے کہا۔ "وہ تو دروازے کے سامنے بیٹھا ماں کا انتظار کر رہا تھا۔"

ارشاد احمد نے دوسرے کمرے سے عامر کو اپنے پاس

بُلایا اور پوچھا۔ "بیٹے! تمھاری امی کہاں گئی ہیں؟"

"انھوں نے کہا تھا کہ ٹھٹھہ جا رہی ہیں۔"

قمر النسا نے ہنس کر کہا۔ "وہ ٹھٹھہ نہیں گئیں، انھوں نے تمھارے ساتھ ٹھٹھا کیا ہے۔"

"بھئی آپ ذرا چپ رہیں۔" ارشاد احمد نے برہمی سے کہا۔ "بچے کی جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ کو ہنسی سوجھ رہی ہے۔ ہاں تو بیٹے، ابو کہاں ہیں تمھارے؟"

"ابو شپ پر چلے گئے ہیں۔" عامر نے جواب دیا۔

"چلو چھٹی ہوئی۔" قمر النسا نے کہا۔ "امی ٹھٹھہ چلی گئی اور ابو شپ پر۔ ارے بیٹا، امی تمھیں ساتھ لے کر کیوں نہیں گئیں؟ کیا وہ تمھاری سوتیلی امی تھی؟"

"امی مجھے ابو کے گھر چھوڑ کر واپس آگئیں۔ میں نے اوپر جا کر دیکھا تو تالا لگا ہوا تھا۔ نیچے والوں نے بتایا کہ ابو شپ پر چلے گئے ہیں۔ میں اِدھر واپس آیا تو یہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔"

"ہوں ں ں..." ارشاد احمد سوچتے ہوئے بولے۔ "یہ بچہ غلط فہمی میں مارا گیا ہے۔"

"ایسی بھی کیا غلط فہمی۔ اس کی ماں اس کو دھوکا دے کر بھاگ گئی ہے۔ اگر اس کو جانا ہی تھا تو اس کو باپ کے سپرد کر کے جاتی۔ یہ کیا کہ اس کو باپ کے دروازے پر چھوڑ کر خود ایک غیر مرد کے ساتھ چلتی بنی۔"

"تمھارے ابو شپ پر کیا کام کرتے ہیں؟" ارشاد احمد نے پوچھا۔

"جی، وہ انجینئر ہیں۔"

ارشاد احمد اپنی بیوی کو ایک طرف لے گیا اور سرگوشی سے بولا۔ "اس لڑکے سے ہمیں کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا باپ جہاز پر انجینئر ہے اور خاصی تنخواہ پاتا ہوگا۔ جب اسے اس کی گمشدگی کی اطلاع ملے گی تو وہ ضرور اس کی بازیابی کے لیے دس بیس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کرے گا۔ اسے گھر میں ہی رہنے دو۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔" قمر النسا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ "لیکن پتا نہیں اس کے باپ کا جہاز کہاں گیا ہے اور کب واپس آئے گا؟"

"باپ نہ سہی، ماں تو ہے۔ میرے خیال میں اس کے پاس بھی بہت مال ہوگا۔ اگر انھوں نے انعام کا اعلان نہ کیا تو ہم اس کے کھانے پینے اور دیکھ بھال کا خرچا طلب کر لیں گے۔"

"اچھی طرح سوچ لیں، گھر میں خرچ کی پہلے ہی تنگی ہے۔"

"اس پر ہم نے کیا خرچا کرنا ہے۔ بچی کھچی روٹی کھا لیا کرے گا اور بچوں کی اترن پہن لیا کرے گا اور ہاں، ہے تو ذرا چھوٹا، پر گھر کے چھوٹے موٹے کام تو کر ہی لے گا۔"

"اب آپ نے کام کی بات کی ہے۔" قمر النسا نے خوش ہو کر کہا۔ "کام تو واقعی بہت ہوتے ہیں۔ دن بھر کام کرتے کرتے میری تو کمر اکڑ جاتی ہے۔"

"اور سنیں، گمشدگی کے اشتہاروں پر بھی نظر رکھیں۔ زیادہ نہ سہی، دس ہزار ہی مل جائیں تو بہت ہوں گے۔ میں ایک عدد موٹر سائیکل خرید لوں گا۔"

عامر بظاہر گم صم بیٹھا تھا لیکن دونوں میاں بیوی کی ساری باتیں سن رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا ذہن ان باتوں پر حیران ہو رہا تھا۔

سات آٹھ مہینے گزر گئے۔ نہ تو گمشدگی کا کوئی انعامی اشتہار چھپا اور نہ عامر کی ماں کا کچھ پتا چلا۔

قمر النسا کو اس بات کی سخت جھنجلاہٹ تھی کہ انعام کے لالچ میں ایک پرایا بچہ گلے پڑ گیا تھا۔ اب وہ ہر قسم کا غصہ عامر پر نکالتی تھی۔ گھر کے بیشتر کام اس سے کرواتی تھی اور ذرا سی غلطی پر اسے دھنک کے رکھ دیتی تھی۔ پٹائی کے علاوہ طعنے بھی دیتی تھی اور اس کی ماں پر طرح طرح کے بہتان لگاتی رہتی تھی اور عامر فقیروں جیسے حلیے میں سارا دن گھر کے کاموں میں جتا رہتا تھا۔ اس گھر میں اس کی حیثیت لاوارث نوکر کی سی ہو گئی تھی، ہر شخص اس پر حکم چلاتا تھا اور اسے تفریح کی بالکل اجازت نہیں ملتی تھی۔

ان سختیوں کے باعث عامر اندر سے سخت ہو گیا۔ اب وہ پٹائی یا طعن و تشنیع کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا۔ وہ کسی سہارے کی تلاش میں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سہارا ملتے ہی وہاں سے بھاگ جائے گا

دوپہر کے کھانے کے بعد قمر النسا عموماً سو جاتی تھی اور عامر کو فرصت مل جاتی — اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ گلی میں نکل جاتا اور ہر آنے جانے والی عورت کو گھور گھور کر دیکھتا اس اُمید پر کہ شاید کسی دن اسے اپنی ماں نظر آجائے۔

ایسی ہی ایک دوپہر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ دو لڑکے گلی میں داخل ہوئے۔ ان کی عمریں دس اور بارہ سال کے درمیان تھیں اور لباس معمولی قسم کا تھا۔ دونوں دیوار کے سائے میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے اور ایک پوٹلی کھول کر سامنے رکھ لی۔ پوٹلی کے اندر کھانا تھا دونوں بڑے اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے عامر نے اندازہ لگایا کہ دونوں

کسی فیکٹری میں کام کرتے تھے جہاں ان کو دس دس روپے دہاڑی ملتی تھی۔

عامر ان کے قریب چلا گیا اور کہا "مجھے بھی اپنی فیکٹری میں کام دلوا دو۔"

ایک لڑکے نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا "کہاں رہتے ہو؟"

عامر نے سر کی جنبش سے مکان کی طرف اشارہ کیا "اس گھر میں۔"

دوسرے لڑکے نے کہا "تمہاری شکل تو اس گھر جیسی نہیں لگتی۔"

"میں اس گھر میں کام کرتا ہوں۔" عامر نے جواب دیا۔

دوسرے لڑکے نے تت تت... کرتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "بے چارہ یتیم لگتا ہے۔"

پہلے لڑکے نے پوچھا "ماں باپ نہیں ہیں تمہارے؟"

عامر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے سوچا، اگر اس نے ماں باپ کے بارے میں بتا دیا تو شاید وہ لڑکے اسے کام نہ دلوائیں۔

دونوں لڑکے اسے پلاسٹک کی چھوٹی سی فیکٹری میں لے گئے۔ اس فیکٹری میں پلاسٹک کے کھلونے بنتے تھے۔ جو لڑکے عامر کو ساتھ لے کر گئے تھے، پیکنگ کے شعبے میں کام کرتے تھے۔ اس شعبے میں بچے اور عورتیں کام کرتی تھیں۔

"صاحب، اس کو بھی کام پر رکھ لیں۔" ایک لڑکے نے شعبے کے سپروائزر کے پاس عامر کی سفارش کی "بے چارہ یتیم ہے۔"

"ابے، یہ تو بہت چھوٹا ہے۔" ادھیڑ عمر سپروائزر نے عامر کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا جائزہ لیا "گھر کدھر ہے تمہارا؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے جی۔" عامر نے جواب دیا۔

"کیوں بے، کہاں سے پکڑ لائے اس کو۔ اس کا تو گھر ہی نہیں ہے، یہ رہے گا کہاں؟"

"یہ ایک بنگلے پر کام کرتا ہے جی۔ وہ لوگ اس کو بہت مارتے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔ اس کا نام سلیم تھا "آپ اسے کام دیں، میں اپنی ماں سے بات کر کے اسے اپنی جھگی میں رکھ لوں گا۔"

سپروائزر نے ترس کھا کر عامر کو پانچ روپے روز پر ملازم رکھ لیا اور وعدہ کیا کہ جب وہ کام سیکھ جائے گا تو اسے دس روپے روز ملا کریں گے۔ حالانکہ کام سیکھنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ کھلونوں کو پلاسٹک کی تھیلیوں اور گتے کے ڈبوں میں بند کیا جاتا تھا جو کوئی بھی بچہ ایک دن میں سیکھ سکتا تھا۔

شام کے وقت سلیم نامی لڑکا عامر کو اپنی جھگی میں لے گیا اور اس کی ماں نے عامر پر ترس کھا کر اسے اپنی جھگی میں رکھ لیا۔ اس نے پہلے ہی عامر کو سمجھا دیا کہ وہ اپنی تنخواہ سنبھال کر گھر لایا کرے۔

فیکٹری میں ہر پندرہ روز کے بعد تنخواہ ملتی تھی۔ پانچ تاریخ اور بیس تاریخ کو، عامر کو جتنے پیسے ملتے وہ انھیں سنبھال کر گھر لاتا اور سلیم کی ماں خالہ آمنہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اسے پیسوں سے زیادہ شفقت کی ضرورت تھی۔ خالہ آمنہ اس کی تنخواہ ضرور سنبھال لیتی تھی، لیکن اسے شفقت اور محبت دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔

ظلم کے ماحول سے نکل کر آنے والے عامر کو اس جھگی میں بڑا سکون ملا۔ وہاں اسے پیٹ بھر کر کھانا ملتا تھا اور ہر طرح کی آزادی تھی۔ خالہ آمنہ بیوہ تھی اور بنگلوں میں کام کرتی تھی جہاں سے وہ روزانہ بچے کھچے مرغن کھانے گھر لے آتی تھی۔ ان کھانوں سے عامر کی صحت اچھی ہو گئی اور اس کے قد میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ ایک سال کے اندر اس نے خوب قد بھی نکالا اور مضبوط بھی ہو گیا۔ گلی یا فیکٹری میں اگر کسی لڑکے سے لڑائی ہو جاتی تو وہ اس لڑکے کی اچھی خاصی دھنائی کر دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گلی کے لڑکوں نے اس سے ڈرنا شروع کر دیا۔

ایک روز وہ فیکٹری سے چھٹی کر کے گھر آ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک آوارہ سے لڑکے پر پڑی جو اس سے چند قدم آگے جا رہا تھا۔ اس نے ٹخنوں سے اونچی جینز، فل بوٹ اور پیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، جس کے اوپر سپرمین کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے بال بڑے تھے اور سر کے عین اوپر ایک چھوٹی سی جالی دار ٹوپی رکھی تھی۔

عامر نے دیکھا کہ وہ لڑکا عجیب بے پروائی سے گلی میں چل رہا تھا۔ اس کے راستے میں کوئی پتھر یا خالی ڈبا آ جاتا تو اسے ٹھوکریں مارنے لگتا۔ کسی بنگلے میں لگے ہوئے پیڑ کی شاخیں نظر آتیں تو اچک کر ایک شاخ توڑ لیتا۔ کوئی بچہ نظر آ جاتا تو اس کی پشت پر ایک دھپ رسید کر دیتا۔ کتا نظر آ جاتا تو اس پر پتھراؤ شروع کر دیتا۔ سامان اٹھائے کوئی عورت نظر آتی تو کہتا "خالہ سلام۔ لاؤ یہ تھیلا میں اٹھا لیتا ہوں۔"

اتنے میں سامنے سے ایک طالب علم آتا دکھائی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اسکول بیگ اور دوسرے میں ٹفن کیریر تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔

آوارہ لڑکا، جو عمر میں اس سے ایک آدھ سال چھوٹا ہی

تھا۔ اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا "کیا حال ہے شہزادے، اس ڈبے میں کیا ہے؟"

طالب علم ایک طرف سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کچھ بھی ہو، تمھیں کیا۔"

آوارہ لڑکے نے بڑی تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ٹفن کیریئر چھین لیا اور اسے کھولنے لگا۔ عامر رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ طالب علم، جو دیکھنے میں مضبوط لگتا تھا، آوارہ لڑکے کی پٹائی لگا دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، طالب علم گھبراہٹ کے عالم میں اپنا ٹفن کیریئر چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ آوارہ لڑکے نے بڑی بے پروائی سے اسے پرے دھکیلا۔ ٹفن کھولا اور دیکھا کہ اوپر والے ڈبے میں تین روپے اور چند ٹافیاں رکھی تھیں۔ اس نے یہ چیزیں اپنی جیب میں ٹھونس لیں اور نچلے ڈبے میں جو بچا ہوا کھانا رکھا تھا اسے جلدی جلدی منہ میں ٹھونسنے لگا۔

"میرے پیسے اور ٹافیاں نکالو۔" طالب علم نے اس کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی "نہیں تو میں اپنے ابو کو بلا لوں گا۔"

آوارہ لڑکے نے خالی ٹفن طالب علم کے سر پر دے مارا اور اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے بولا "ابے چل چڑی مار کی اولاد، تیرے باپ سے کون ڈرتا ہے۔"

عامر کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنی کھانے کی پوٹلی زمین پر پھینکی اور آوارہ لڑکے کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "اس کی چیزیں واپس نکال..."

آوارہ لڑکے نے استہزائیہ نظروں سے عامر کا جائزہ لیا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اوے واہ رے پدی... کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔"

عامر نے نہایت پھرتی سے لڑکے کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا اور ایک دم نیچے بیٹھ کر اس کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ لڑکا چاروں شانے چت ہو گیا اور ہکا بکا ہو کر عامر کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ۔" طالب علم نے عامر سے کہا۔ "تم اس بدمعاش سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

لڑکا اطمینان سے اٹھا اور نہایت غصے کے عالم میں عامر کی طرف بڑھا۔ عامر اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ لڑکے نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ عامر ان تھپڑوں کا عادی تھا۔ اس نے مار کی پروا کیے بغیر ایک بار پھر اڑنگا لگا کر لڑکے کو نیچے گرا دیا۔ پھر اس نے طالب علم کے ہاتھ سے بیگ لیا، تیزی سے لڑکے کے عقب میں پہنچا اور بیگ کا پٹا اس کے گلے میں ڈال دیا اسے بل دینے لگا۔ لڑکا اٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ پٹے کو زور سے جھٹکا دے کر اسے نیچے گرا دیتا۔ چند منٹوں کے اندر لڑکا بے بس ہو گیا۔

"ابے چھوڑ دے، چھوڑ دے۔" وہ چلایا "میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

عامر اسے پیچھے سے ٹھوکریں مارتے ہوئے بولا "ایسے نہیں چھوڑوں گا۔ پہلے اس لڑکے کے پیسے واپس کر اور اس سے معافی مانگ۔"

لڑکے نے ٹافیاں اور پیسے نکال کر طالب علم کی طرف بڑھائے اور بولا "بابو، معاف کر دے۔"

عامر نے پٹا ڈھیلا کر دیا۔ عین اس وقت طالب علم کا باپ شور سن کر موقع پر پہنچ گیا۔ آوارہ لڑکا آزاد ہوتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔

طالب علم نے اپنے باپ کو ساری بات بتائی، جس نے عامر کی کمر تھپتھپائی اور جیب سے دس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"شکریہ صاحب۔" عامر نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ "میں نے پیسوں کے لیے یہ کام نہیں کیا۔ مجھے تو ایسے ہی اس

▲ کیا آپ کی عمر 19 یا 20 سال تک ہے اور آپ کا قد چھوٹا ہے؟
▲ کیا چھوٹے قد کی وجہ سے آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں؟
▲ کیا آپ کے بچے کی نشوونما عمر کے مطابق کم ہے اور اس کا قد چھوٹا ہے؟

ایڈریس لکھے جوابی لفافے کے ہمراہ عمر اور موجودہ قد لکھ کر تفصیلات منگوالیں

اپنے خط پر بھی اپنا مکمل ایڈریس ضرور تحریر کریں۔

پوسٹ بکس نمبر 18100 کراچی 33

لڑکے پر غصہ آگیا تھا۔“

طالب علم کا باپ اصرار کرتا رہا مگر عامر نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اپنے راستے پر ہولیا۔ جب وہ گلی کے کونے پر پہنچا تو مذکورہ آوارہ لڑکا ایک دیوار کی اوٹ سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔ عامر بے خوفی سے چلتا رہا۔

”اے پدی، ذرا بات تو سن۔“ لڑکے نے آواز لگائی۔

عامر رُک گیا، بولا۔ ”کیا بات ہے دوبارہ طاقت آزماؤ گے؟“

”ایک ہی دفعہ بہت ہے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”تُو نے تو میرے گلے پر خراشیں ڈال دی ہیں۔ کیا چیز ہے تُو؟“

”تم کیا چیز ہو؟“ عامر نے پوچھا اور ایک ہاتھ کولہے پر رکھ کر لڑکے کو گھورنے لگا۔

”میں چاکر علی ہوں۔“ لڑکے نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”میرے دوست مجھے چکری کہتے ہیں۔ تیرا کیا نام ہے؟“

”میرا نام عامر ہے۔“

”ابے یار ہاتھ تو ملا۔“ چکری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”آج سے میں تیرا دوست ہوں۔ کرتا کیا ہے؟“

”کھلونوں کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔“

”کتنی تنخواہ ملتی ہے؟“

”دس روپے دہاڑی۔“ عامر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”ابے چھوڑ یار، یہ بھی کوئی تنخواہ ہے۔ میرے ساتھ لگ جا، جتنے پیسے تو ایک مہینے میں کماتا ہے۔ اتنے میں ایک دن میں مار لیتا ہوں۔ تیرے ماں باپ تجھے پڑھاتے کیوں نہیں؟“

”میرے ماں باپ گم ہو چکے ہیں۔ میں ایک دوست کے ساتھ اس کی جھگی میں رہتا ہوں۔“

”جبھی تو نے اتنے چھیتھڑے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اپنی تنخواہ سے اپنے لیے کپڑے کیوں نہیں بنواتا؟“

”میں اپنی تنخواہ آمنہ خالہ کو دے دیتا ہوں۔“

”ابے لڑنے میں تو تو بہت تیز ہے، پر تنخواہ ساری آمنہ خالہ کو دے دیتا ہے تجھے کیا فائدہ ہوتا ہے؟“

”آمنہ [illegible] ہی اچھی ہے۔ میرا بڑا خیال رکھتی ہے۔“

”ابے وہ تیرا [illegible] تیرے پیسے کا خیال رکھتی ہے۔ اگر وہ [illegible] ہوتی تو تجھے اچھے کپڑے بنا کر دیتی ہے۔“

یہ سن کر عامر کو خیال آیا کہ چکری ٹھیک ہی کہتا ہے آمنہ خالہ نے اسے ایک مرتبہ بھی نئے کپڑے سلوا کر نہیں دیے تھے۔ وہ اسے بنگلوں سے خیرات میں ملے ہوئے کپڑے پہناتی تھی اور خیرات کا کھانا کھلاتی تھی۔ ان چیزوں پر اس کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی تنخواہ کے سارے پیسے وہ خود ہضم کر جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک روپیہ روز جیب خرچ دیتی تھی جبکہ وہ اپنے بیٹے سلیم کو دو تین دفعہ نئے کپڑے سلوا کر دے چکی تھی۔

”یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔

”پیارے، اس دنیا میں ہر ایک ٹھگ ہے ٹھگ۔“ چکری نے کہا اور داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو قینچی کی طرح چلایا۔ ”کوئی ہاتھ کی صفائی سے لوٹتا ہے، کوئی پیار سے لوٹتا ہے اور کوئی پستول سے لوٹتا ہے۔“

”یہ تو بہت بُری بات ہے۔“

”تو ابھی بچہ ہے، میرے ساتھ رہے گا تو سارے داؤ پیچ سیکھ جائے گا۔“

”تو کیا کام کرتا ہے؟“

چکری نے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو ایک بار پھر قینچی کی طرح چلایا۔ ”ہاتھ کی صفائی....“

”وہ کیسے؟“

”میرے ساتھ چل۔ اگر کام بن گیا تو تجھے بہترین تکے کباب کھلاؤں گا۔ تجھے ہاتھ کی صفائی کا مطلب بھی معلوم ہو جائے گا۔“

عامر قدرے تامّل کے بعد راضی ہو گیا۔ دونوں بس میں بیٹھ کر ایک نمبر چورنگی پر پہنچ گئے۔ وہاں ہر طرف دکانیں سجی ہوئی تھیں اور خریداروں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ چکری، عامر کو ساتھ لے کر پندرہ بیس منٹ تک اس ہجوم کے درمیان گھومتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے خریداری کے دوران دو تین مرتبہ اپنی ہپ پاکٹ سے خاصا پھولا ہوا بٹوا نکالا تھا۔ وہ شخص ہلکے رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور قدرے بے پروا لگتا تھا۔

چکری نے مذکورہ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کو اچھی طرح پہچان لے اور میرے ساتھ آ۔“ وہ عامر کو پچاس قدم آگے لے گیا اور کہا۔ ”تجھے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ تو اس جنگلے کے ساتھ کھڑا ہو جا اور اس طرف نگاہ رکھ۔ یہ آدمی خریداری کر کے اس طرف آئے گا۔ جب یہ اس ٹھیلے کے قریب پہنچے تو تجھے تیز تیز چلتے ہوئے اس کے بائیں پہلو سے رگڑ کھاتے ہوئے گزرنا ہے۔“

”بس؟“

”ہاں، بس اتنا ہی کام ہے۔ رُکنا نہیں۔ سیدھے نکل جانا اور اس ہوٹل کے پاس جا کر میرا انتظار کرنا۔“ باتوں کے دوران اس کا دھیان سفاری سوٹ والے کی طرف بھی تھا جو ایک دکان پر خریداری میں مصروف تھا۔ ”لے، میں جا رہا ہوں۔ وہ آدمی دکاندار کو پیسے دے رہا ہے۔“

عامر جنگلے کے قریب ٹھہر کر انتظار کرنے لگا۔ پانچ چھ منٹ کے بعد سفاری سوٹ والا شاپنگ بیگ پکڑے اس طرف آتا دکھائی دیا۔ عامر نے دیکھا کہ چکری اس کے پیچھے آرہا تھا۔ جب سفاری سوٹ والا ٹھیلے کے قریب پہنچا تو عامر، چکری کی ہدایت کے مطابق، لوگوں کے بیچ میں زِگ زیگ راستہ بناتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا اور سفاری سوٹ والے کے بائیں پہلو سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا۔

سفاری سوٹ والا لمحہ بھر کے لیے رُکا اور اپنا شاپنگ بیگ سنبھالتا ہوا غصّے سے عامر کو گھورنے لگا۔ اس کے رُکنے کی وجہ سے چکری اس کی پُشت سے ٹکرایا اور معاف کرنا بھائی صاحب کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

دو منٹ کے بعد وہ ہوٹل کے سامنے منتظر عامر کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر، لیاقت آباد جانے والی سڑک پر ہولیا۔ ”آجا پیارے، کام ہو گیا ہے۔“

ندی کے قریب پہنچ کر چکری اسے پُل کے نیچے لے گیا اور جیب سے ایک پھولا ہوا بٹوا نکال کر اسے جلدی جلدی چیک کرنے لگا۔

”یہ کیا؟“ عامر نے چونک کر پوچھا۔ ”ابے، یہ بٹوا کس کا ہے؟“

”پانچ سو سے زیادہ ہی لگتے ہیں۔“ چکری نے نوٹ جیب میں ٹھونسے اور بٹوا وہیں پر پھینک دیا۔ ”تیرا قدم بڑا برکت والا لگتا ہے۔ آجا...“

سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک رکشا روکا اور اسے پاپوش نگر چلنے کے لیے کہا۔

”ابے، یہ چکر کیا ہے؟“ عامر نے پوچھا۔

”پیارے، اسی کا نام ہاتھ کی صفائی ہے۔ اسی لیے میرے سنگی ساتھی مجھے چکری بولتے ہیں۔ یہ اسی بابو کا بٹوا تھا جس سے تو ٹکرایا تھا۔ یہ لے سو تو رکھ لے۔“ اس نے سو کا نوٹ عامر کی جیب میں ٹھونس دیا۔ ”تو بھی کیا یاد کرے گا۔ بول، کیسا کام ہے؟“

”یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔“

”ذرا بھی خطرناک نہیں ہے۔ میں بچپن سے یہ کام کر رہا ہوں۔ صرف دو دفعہ پکڑا گیا ہوں اُس وقت میں ذرا اناڑی تھا۔“

”تمھیں سزا نہیں ہوئی؟“

”اُستاد نے چھڑا لیا تھا۔ میں جو مال پار کرتا ہوں اس میں سے اُستاد کو حصّہ دیتا ہوں۔ اُستاد، پولیس کو بھتا دیتا ہے اور اس طرح سب کا کام چلتا رہتا ہے۔ میں تمھیں کسی روز اُستاد سے ملا دوں گا۔ وہ تمھیں سارے گُر سکھا دے گا۔“

عامر سر ہلا کر رہ گیا۔ دونوں چاندنی چوک پہنچے اور وہاں خوب ڈٹ کر تکّے کباب کھائے۔ چکری کا ٹھکانا وہاں سے قریب ہی تھا۔ وہ عامر کو اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ اور اس سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر رخصت کر دیا۔

عامر گھر پہنچا تو خالہ آمنہ نے قدرے پریشانی سے تاخیر کا سبب پوچھا۔

”میں ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔“ عامر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”کھانا وہیں سے کھا کر آیا ہوں۔“

”ارے، تیرا ایسا کون سا دوست ہے؟“

عامر نے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”خالہ میں جو پیسے کما کر لاتا ہوں وہ کہاں جاتے ہیں؟“

خالہ آمنہ نے تیوری چڑھائی اور بولی۔ ”پیسے گھر میں خرچ ہوتے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، آج یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے؟“

”خالہ، گھر میں تو کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ ہم لوگ بچا کھچا

اپنا جائزہ لیں!

ہوسکتا ہے کہ آپ ......

- چھوٹے قد میں اضافے (صرف ۲۰ سال تک)
- مٹاپا یا جسمانی کمزوری اور دبلاپن
- چہرے کے کیل چھائیوں اور داغ دھبوں
- گنجاپن، خشکی، سکری اور گرتے، سفید ہوتے بالوں
- ازدواجی مسائل اور ناآسودگیوں
- چہرے کے فاضل بالوں (صرف خواتین کے لیے)
- کمزور یادداشت اور ناقص حافظ
- نسوانی سراپا کی رعنائی میں اضافے اور نامکمل جسمانی نشوونما
- تمام نسوانی تکالیف اور شکایات

جیسے اہم مسائل کا شکار ہوں۔ اپنی مکمل کیفیت ایڈریس لکھے جوابی لفافے کے ساتھ بھیجیں۔ اپنے خط پر اپنا مکمل ایڈریس تحریر کریں۔ آپ گھر بیٹھے ان پریشانیوں سے نجات پالیں گے ہمیں ماہرین کا تعاون حاصل ہے۔ خواتین شعبۂ خواتین کی انچارج کے نام اپنے خط ارسال کریں۔

چیک اپ پوائنٹ

پوسٹ بکس 2297 کراچی 18

کھانا کھاتے ہیں۔ اور لوگوں کی اُترن پہنتے ہیں۔"

"واہ میرے لال واہ۔ آج تجھے کسی نے بہکا دیا ہے۔ جبھی تو پیسوں کا حساب پوچھ رہا ہے۔ یہ جو تو اُترن اور بچے کھچے کھانے کی بات کر رہا ہے نا، یہ بھی مفت میں نہیں ملتا۔ میں بنگلوں پر کام کرتی ہوں، محنت کرتی ہوں۔ اس لیے لوگ یہ چیزیں مجھے دیتے ہیں۔ تیرے پیسوں سے اتنے اچھے اچھے کھانے نہیں پک سکتے۔ اللہ کا شکر ادا کر، ناشکری کی باتیں نہ کر۔"

"خالہ میں نوکری نہیں کر سکتا۔"

"ہائے ہائے، نوکری نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا؟"

"میں... وہ کیا کہتے ہیں... بزنس کروں گا۔ یہ دیکھ آج میں نے بزنس میں سو روپے کمائے ہیں۔" اس نے نوٹ نکال کر خالہ کو دکھایا۔

خالہ نے فکرمندی سے کہا۔ "اے بیٹا، کسی بُرے دھندے میں نہ پھنس جانا۔"

"میرا دوست بتا رہا تھا کہ آج کل دولت ہی سب کچھ ہے۔ دولت سے آدمی بنگلا بھی خرید سکتا ہے اور کار بھی۔"

"اے بیٹا، اس عمر میں کار اور بنگلوں کے خواب دیکھنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"خالہ، اگر میں نے بنگلا خرید لیا تو تجھے بھی اپنے پاس رکھ لوں گا۔ بھلا جھگی میں رہنے کا بھی کوئی مزہ ہے۔"

خالہ افسردگی سے سر ہلانے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ عامر کو کوئی غلط قسم کا دوست مل گیا ہے۔

چند روز کے بعد عامر نے فیکٹری سے آخری تنخواہ وصول کی اور چکری کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں اُستاد کے علاوہ چند لفنگے قسم کے نوجوان بھی موجود تھے۔ کمرے میں چرس آلود سگریٹوں کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اُستاد نے عامر کو تھپکی دی اور اپنے پاس بٹھایا۔

"آج سے تو ہمارا خاص آدمی ہے۔" اُستاد نے کہا۔ "کوئی تیری طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ تھانے پولیس کی پروا نہ کرنا۔ پولیس اپنی جیب میں پڑی رہتی ہے۔ آج سے پورے شہر میں گھومو پھرو، کھاؤ پیو عیش کرو۔ کسی کا سر پھاڑ دو، ہاتھ پیر توڑ دو، پستول نکال کر ہاتھ پر رکھ دو اور جو جی میں آئے کرو، جب تک اُستاد فرمان علی زندہ ہے۔ اس وقت تک کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

عامر، اُستاد فرمان علی کی باتیں سن کر پھول گیا۔ اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت اور ہمت محسوس کی۔ لیکن اسے اس اڈے کا ماحول پسند نہیں آیا۔ اُستاد نے اسے ایک شاطر قسم کے شاگرد کے سپرد کر دیا جس نے اسے دو تین مہینے کے اندر جرائم کے اسرار و رموز سمجھا دیے۔ ان میں جیبیں کاٹنا، گھروں میں گھس کر قیمتی چیزیں پار کرنا، بوقت ضرورت مظلومیت کی اداکاری کرنا اور موقع ملتے ہی بھاگ جانا شامل تھا۔

عامر نے یہ سب کچھ سیکھ تو لیا، لیکن اس نے ذہنی طور پر اس کام کو قبول نہیں کیا۔ اس نے چکری کے ساتھ مل کر چند وارداتیں بھی کیں اور صاف بچ نکلا۔ اس کام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کا خوف جاتا رہا اور استاد کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے اس کے اندر جرأت اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ وہ ہر کس و ناکس کے ساتھ بلا جھجک بات کرتا اور بے دھڑک کھلے ہوئے دروازوں میں گھس جاتا تھا۔

ایک دفعہ ایک خاتون خانہ نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے اُستاد کے سکھائے ہوئے گُر کے مطابق رونا شروع کر دیا اور کہا۔ "میں دو دن سے بھوکا ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، میں یتیم اور بے سہارا ہوں، مجھے بچی کھچی روٹی دے دیں میں آپ کو دعائیں دوں گا۔"

مذکورہ خاتون جس کا نام مہرالنسا تھا، بیوہ اور تین بیٹیوں کی ماں تھی، اس کا بیٹا کوئی نہیں تھا۔ وہ متوسط طبقے کی ایک پریشان حال عورت تھی۔ اس کا گزارہ شوہر کی پینشن اور سیونگ سرٹیفکیٹس کے منافع پر تھا۔ اس نے عامر کو بیٹا بنا کر گھر میں رکھ لیا لیکن عامر کو گلی گلی گھومنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ چند ماہ مہرالنسا کے پاس رہا اور ایک بار پھر چکری کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ مہرالنسا نے اسے واقعی اپنی اولاد کی طرح رکھا تھا اور اسے پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا۔

ان دنوں عامر کو اپنی ماں بہت یاد آنے لگی تھی۔ گلی گلی گھومنے سے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اسے اپنی ماں کی تلاش تھی۔ اس آوارہ گردی کے دوران اسے کئی لوگوں نے اپنے گھر میں رکھا۔ کوئی بیٹا بنا کر رکھتا تھا اور کوئی نوکر بنا کر۔ شروع شروع میں وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے، پھر زیادتی کرنا شروع کر دیتے۔ زیادتی کرنے والوں کے گھروں سے وہ عموماً نقدی چرا کر لے جاتا۔ تاہم اتنی ہی رقم چرا تا جس سے اس کا ایک آدھ مہینہ نکل جاتا۔

بالآخر، ایک روز وہ شوکت حسین کے گھر میں گھسا اور وہاں سے جیل پہنچ گیا۔

ان تمام واقعات سے آگاہ ہونے کے بعد میں نے

شوکت حسین کو دس لاکھ روپے ہرجانے کا نوٹس بھجوا دیا۔

"اس اثنا میں مجھے افروزہ بیگم کے بارے میں کچھ حقائق معلوم ہوئے۔ تقریباً تین سال قبل اس کا دوسرا شوہر محبوب علی اسمگلنگ کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور اسے سزا ئے قید ہو گئی تھی۔ محبوب علی سے شادی کے بعد افروزہ بیگم کے ہاں دو بچے ہوئے تھے اور وہ دونوں لڑکیاں تھیں۔

محبوب علی کو سزا ہونے کے بعد افروزہ بیگم کو کلفٹن والا اپارٹمنٹ چھوڑنا پڑا۔ اور جب جمع پونجی ختم ہو گئی تو وہ بھائی کے در پر پہنچ گئی۔ مجھے بعض واقف کاروں کی زبانی معلوم ہوا کہ حنیف ایک موقع پرست آدمی تھا۔ اور بہن کا بوجھ برداشت کرنے پر تیار نہیں تھا لیکن اس اثنا میں اخبارات کے ذریعے اسے عامر کے باپ عارف حسین کی موت کی اطلاع ملی۔ یہ اطلاع ملتے ہی اسے عارف کی جائداد کی فکر لاحق ہو گئی اور عارف کی جائداد کا قبضہ حاصل کرنے کے لیے وارث جائداد کا ہونا ضروری تھا۔ سو دونوں بہن بھائی نے عامر کی تلاش شروع کر دی اور چند ماہ کے اندر اس کا کھوج لگا لیا۔

شوکت حسین کو نوٹس بھجوانے کے بعد افروزہ بیگم نے عامر کو باپ کی جائداد کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ جائداد کا واحد قانونی وارث تھا۔

عامر کے دل میں پہلے سے یہ رنجش موجود تھی کہ اس کی ماں بچپن میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن یہ رنجش اس وجہ سے کچھ کم ہو گئی تھی کہ ماں اور ماموں نے اسے تلاش کر کے جیل سے آزاد کرایا تھا۔

مگر جب اس کے سامنے باپ کی جائداد کا ذکر آیا تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا اس لیے فوراً سمجھ گیا کہ ماں نے اسے ممتا سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ جائداد کے حصول کے لیے تلاش کیا تھا۔

عارف حسین کی جائداد ایک دو منزلہ مکان، ساڑھے پانچ لاکھ بینک بیلنس، انشورنس کمپنی اور جہاز راں کمپنی کے واجبات پر مشتمل تھی۔

چند روز کے بعد عامر اپنی ماں اور ماموں کے ہمراہ میرے دفتر میں آیا اور بتایا کہ وہ حق وراثت حاصل کرنے کے لیے عدالت میں درخواست دینا چاہتا ہے۔

میں نے جائداد کی تفصیل پوچھنے کے بعد دیگر ورثا کے بارے میں استفسار کیا۔

"عامر اپنے باپ کی جائداد کا واحد وارث ہے۔" افروزہ نے جواب دیا۔ "اس کے سوا اس کے باپ کی اور کوئی اولاد نہیں ہے۔"

حنیف نے کہا۔ "افروزہ باجی، عارف کی جائداد پر آپ کا بھی حق ہے۔"

"مجھے جائداد کا شوق نہیں ہے۔" افروزہ بیگم نے کہا۔ "میرے بیٹے کو اس کا حق مل جانا چاہیے۔ میرے لیے یہی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

اس اثنا میں میرے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو میری سیکریٹری نے دھیمی آواز میں کہا۔ "سر، آپ کے پاس جو تین افراد بیٹھے ہیں ان میں عامر نامی ایک نوجوان بھی ہے۔ وہ میرے کمرے سے گزرتے وقت ایک کاغذ میری میز پر رکھ گیا تھا۔ اس میں لکھا ہے، 'پلیز، وکیل صاحب کو الگ بُلا کر کہہ دیں کہ میرے کیس میں میری امی یا ماموں کو اٹارنی وغیرہ نہ بنائیں۔ اگر وہ اس بات کا تقاضا کریں تو انھیں اپنی طرف سے کہہ دیں کہ انھیں ایسا کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔'"

"شکریہ مس صبیحہ۔" میں نے کہا اور انٹرکام بند کر دیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ عامر بیٹے نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔" حنیف نے کہا۔ "آپ اس کی جائداد کا معاملہ جلد از جلد نمٹا دیں تاکہ یہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکے۔"

عامر اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لے رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے تھوڑی دیر پہلے جائداد کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اور اسے صورت حال پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔

افروزہ بیگم نے کہا۔ "ایک کام یہ کریں کہ کرائے داروں کو اور بینک کو ایک ایک نوٹس بھجوا دیں۔ کرائے داروں سے کہہ دیں کہ آیندہ وہ بینک میں کرایہ جمع کرانے کے بجائے کیش دے دیا کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ عامر کی طرف سے اس کی امی کے نام ایک پاور آف اٹارنی بنا دیں۔" حنیف نے کہا۔

"میرے لیے یہ باہر کے دھندے سنبھالنے بہت مشکل ہیں۔" افروزہ بیگم نے اپنے بھائی سے کہا۔ "پاور آف اٹارنی آپ کے نام زیادہ مناسب رہے گی۔ کیوں عامر بیٹے!"

عامر نے بظاہر بڑی سادگی سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! کیا یہ پاور آف اٹارنی بہت ضروری ہے؟"

"تم جوان آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "اب تمھیں ان ذمے داریوں کا بوجھ خود اٹھانا چاہیے۔"

اس نے سر جھکا لیا اور ہولے سے بولا۔ "اگر ماموں کا تعاون شامل حال رہا تو یہ بوجھ بھی اٹھا ہی لوں گا۔"

ماموں نے چبھتی ہوئی نظروں سے عامر کی طرف دیکھا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔ ”بیٹے، اب تم اپنوں کے درمیان ہو۔ ہم پر بھروسا کرو گے تو ہم تمھیں مایوس نہیں کریں گے۔ قانونی معاملات میں ابھی تمھیں رہنمائی اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہو تو میرے نام پاور آف اٹارنی بنوالو۔ میں تو صرف تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”یہ کام تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔“ عامر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”فی الحال ہمیں عدالت میں درخواست داخل کر دینی چاہیے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”پاور آف اٹارنی کی عدالت میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

افروزہ بیگم نے الجھی ہوئی نظروں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو اس لڑکے کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔

”چلیں، یہ کام بعد میں ہو جائے گا۔“ حنیف نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال آپ قانونی کارروائی شروع کر دیں۔ باقی معاملات بھی سلجھ جائیں گے۔ میں تو کافی قرضے تلے دب گیا ہوں۔“

”ماموں، آپ بالکل فکر نہیں کریں۔“ عامر نے کہا۔ ”آپ کا قرضہ میرا قرضہ ہے۔ جائداد ملنے کے بعد آپ سب سے پہلے اپنے قرضے ادا کریں۔“

حنیف کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر کچھ تلخی سی آنے لگی تھی۔

میں نے تمام ضروری باتیں نوٹ کر لیں اور وعدہ کیا کہ دو تین روز کے اندر کاغذی کارروائی مکمل کر لوں گا۔

تیسرے روز میں شام کے وقت دفتر سے اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ عامر میرے پاس آیا اور اس نوٹس کے بارے میں پوچھا جو کرائے داروں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کے باپ نے اپنی موت سے دو سال قبل اپنے مکان کا اوپر والا پورشن بھی کرائے پر چڑھا دیا تھا تاہم صرف ایک کمرا اپنی ضرورت کے لیے رکھ لیا تھا۔

”نوٹس تیار ہیں۔“ میں نے عامر کو بتایا۔ ”کل صبح رجسٹری کر دیے جائیں گے۔“

”اب نوٹس کی ضرورت نہیں رہی۔“ عامر نے کہا۔ ”میں نے اوپر والا پورشن خالی کروا لیا ہے۔ اور نیچے والے کرائے دار سے ویسے ہی بات کر لی ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ آیندہ وہ مجھے کرایہ دے دیا کرے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم نے عدالتی اختیار ملے بغیر اوپر والا پورشن کیسے خالی کروا لیا؟“

”بیگ صاحب، اوپر والے پورشن میں ابّو نے ایک کمرا اپنے استعمال کے لیے بند رکھا ہوا تھا۔ نصیر صاحب کو جب ابّو کی وفات کی اطلاع ملی تو انھوں نے نہ صرف کمرا کھول کر اس کا سامان خورد برد کر لیا بلکہ ایک سال کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا۔ مجھے مجبوراً ان سے مکان خالی کرانا پڑا۔ ابھی ان کا کچھ سامان اندر موجود ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سات بجے سال بھر کا کرایہ ادا کر کے اپنا سامان لے جائیں گے۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ کسی معتبر شخص کی موجودگی میں کرایہ ادا کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

”تمھارے ماموں کہاں ہیں؟“

”میں فی الحال یہ بات ان سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”تم نے مکان کیسے خالی کروا لیا؟“

”میں اُستاد کے اڈے سے دو تین دوست اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا اور جلدی سے صفائی پیش کی۔ ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا بلکہ نصیر صاحب کا سامان نیچے اتارنے میں ان کی مدد بھی کی تھی۔ صرف ٹی وی، وی سی آر اور فریج وغیرہ روک لیا ہے۔“

مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا لیکن میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اگر نصیر صاحب نے واقعی اس کے والد کا کمرا کھول لیا تھا اور سال بھر کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا تو یہ اُن کی زیادتی تھی۔ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

میں عامر کے ساتھ نارتھ ناظم آباد پہنچ گیا۔ مکان کے اوپر والے پورشن میں ایک ادھیڑ عمر عورت اور تین لڑکیاں سامان سیٹ کر رہی تھیں۔

عامر نے عورت کا خالہ مہرالنسا کے نام سے تعارف کرایا اور بتایا کہ تینوں لڑکیاں اس کی بیٹیاں تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ عامر نے اپنے ایام آوارگی کی کہانی سناتے ہوئے اس عورت کا ذکر کیا تھا۔ لڑکیوں کی عمریں دس اور پندرہ سال کے درمیان تھیں۔ تینوں خوش شکل لڑکیاں تھیں۔

مہرالنسا رسمی بات چیت کے بعد اندر چلی گئی۔

میں نے عامر سے پوچھا۔ ”تمھاری ماں کہاں ہے؟“

”ماموں کے گھر میں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کیا تم ان کو اپنے ساتھ نہیں رکھو گے؟“

”بیگ صاحب، میری ماں جس شخص کی خاطر مجھے اس

گھر کی سیڑھیوں کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی، وہ چند ہفتوں کے اندر رہا ہونے والا ہے۔ میں اس شخص کو اور اس کی دو عدد بیٹیوں کو اس گھر میں نہیں رکھ سکتا۔“

”اُس وقت تمھاری ماں کی کچھ مجبوریاں تھیں۔“

”اِس وقت میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ماں نے مجھے اور اس گھر کو خود اپنے آپ سے الگ کیا تھا۔ یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔“

میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر اس معاملے پر وہ اندر سے بہت سخت تھا اور کوئی سمجھوتا کرنے پر تیار نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اَدھیڑ عمر شخص نے دروازے پر دستک دی اور اندر چلا آیا۔ اس کے چہرے پر خاصی برہمی پائی جاتی تھی۔ تعارف پر پتا چلا کہ وہ اس پورشن کا کرائے دار نصیر ہے۔

”وکیل صاحب، اس لڑکے نے جو بدمعاشی ہمارے ساتھ کی ہے اسے میں قیامت تک معاف نہیں کروں گا۔“ اس نے سخت شکایتی لہجے میں کہا۔ ”یہ ایک ٹرک اور چھ بدمعاش ساتھ لے کر آیا اور میرا سامان ٹرک میں رکھوانا شروع کر دیا۔ وہ ٹرک والا بھی ان کا ساتھی تھا۔ میں نے باہر نکلنا چاہا تو اس کے بدمعاش ساتھیوں نے مجھے دروازے پر روک دیا، کہنے لگے کہ میں سامان لوڈ ہونے سے پہلے باہر نہیں جا سکتا ہے۔ خود سوچیں کہ کراچی میں مکان ملنا کوئی سہل کام ہے؟“

میں نے کہا۔ ”عامر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اس کے باپ کے استعمال کا مقفل کمرا کھول لیا تھا اور ایک سال کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا تھا۔“

”ایک سال کا کرایہ تو میں ابھی اس کے مُنہ پہ مار دوں گا۔“ نصیر علی نے کہا۔ ”اور کمرے کی بات یہ ہے کہ عارف صاحب خود ہمیں کمرے کی چابی دے گئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہم وقتاً فوقتاً کمرا کھول کر صفائی کروا دیا کریں۔“

عامر خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ جب نصیر علی چُپ ہوا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”نصیر صاحب، اگر کرائے دار تین مہینے تک کرایہ ادا نہ کریں تو قانون کے مطابق مالک مکان اس سے مکان خالی کروا سکتا ہے۔ اگر میری بات پر یقین نہ آئے تو وکیل صاحب سے پوچھ لیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کرائے دار وقت پر کرایہ ادا نہ کر سکے تو اسے شرمندگی ہوتی ہے اور آپ پورے سال کا کرایہ مُنہ پہ مارنے کی بات کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں میں آپ کا سامان آپ کے مُنہ پہ مار دوں گا۔ میں آپ سے زیادہ شریف آدمی نہیں ہوں۔“

نصیر علی نے نوٹوں کی گڈّی جیب سے نکال کر عامر کے حوالے کی اور بولا۔ ”یہ اپنا کرایہ گن لو اور میرا سامان میرے حوالے کر دو۔“

عامر نے نوٹ گن کر جیب میں رکھے اور کونے میں رکھے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ رکھا ہے، آپ کا سامان اچھی طرح چیک کر لیں۔“

نصیر علی نے نیچے سے سوزوکی ڈرائیور اور مزدور کو بلایا اور اپنا سامان اٹھوا کر رخصت ہو گیا۔

نیچے والے پورشن میں جو کرائے دار رہتا تھا۔ اس کا نام افضال شاہ تھا۔ وہ ایک معمر شخص تھا اور عامر کو بچپن سے جانتا تھا۔ عامر نے مجھے بتایا کہ اس پر چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا تھا اور وہ بھی کرایہ ادا کرنے میں لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ لیکن جب اس نے اوپر والے کرائے دار کا حشر دیکھا تو چُپ چاپ چھ مہینے کا کرایہ ادا کر دیا۔

دو روز کے بعد عامر اکیلا میرے دفتر میں آیا اور بتایا کہ اس نے شوکت حسین سے راضی نامہ کر لیا ہے۔

اس لڑکے کی باتیں مجھے بہت حیران کر رہی تھیں۔ اس نے اپنے معاملات سنوارنے میں خاصی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”صرف راضی نامہ کیا ہے یا کچھ ہرجانہ بھی طے ہوا ہے؟“

”اَسّی ہزار پہ بات ہوئی ہے۔“

میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ شوکت حسین ایک ایسا شخص تھا جس کی جیب سے اَسّی ہزار روپے نکالنا بھی مشکل تھا۔ میں نے تفصیل پوچھی تو وہ ٹال گیا۔

تھوڑی دیر بعد شوکت حسین اپنے وکیل کے ہمراہ میرے دفتر پہنچا اور ٹائپ شدہ راضی نامہ مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ اس کے مطابق وہ عامر کو واقعی اَسّی ہزار روپے ہرجانہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے اس راضی نامے پر کچھ تعریفی کلمات کہے تو وہ پھٹ پڑا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ ایک ہفتے سے چند بدمعاش اسے مسلسل دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انھوں نے عامر کو ایک لاکھ روپے ہرجانہ ادا نہ کیا تو وہ اس کے نو سالہ نواسے کو اغوا کر کے اسے خرکاروں کے کیمپ میں پہنچا دیں گے۔

عامر نے میرے استفسار پہ کہا۔ ”میں اس دھمکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے کہ میرے دوستوں نے میری ہمدردی میں کوئی کارروائی کی ہو۔ لیکن اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔“

”اس کے دوست ڈاکو اور دہشت گرد ہیں۔“ شوکت نے کہا۔ ”وہ دو دفعہ مسلح حالت میں میرے گھر آچکے ہیں۔ آپ کو ایسے خطرناک لوگوں کے کیس نہیں لینے چاہئیں۔“

عامر نے بظاہر ادب سے کہا۔ ”شوکت صاحب، جب آپ نے مجھے تھپڑ اور لاتیں ماری تھیں تو میں ایک کمزور لڑکا تھا۔ آپ مجھے جیل نہ بھجواتے تو میں کمزور ہی رہتا۔ خطرناک لوگوں میں شامل نہ ہوتا۔“

شوکت حسین نے زیرِلب کچھ کہا اور رقم نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ”وکیل صاحب یہ رقم گن لیں اور اس راضی نامے پر دستخط کر دیں۔“

چند منٹ کے اندر ساری کارروائی مکمل ہوگئی اور شوکت اپنے وکیل کے ہمراہ رخصت ہوگیا۔

میں نے نوٹوں کی گڈی عامر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے دھمکی سے ہی کام نکالنا تھا تو کیس کرنے کی کیا ضرورت تھی....؟“

”پہلے یہ بتائیں کہ ماموں نے آپ کو آج تک کتنی فیس دی ہے؟ اس کے بعد میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں گا۔“

میں نے ڈائری چیک کر کے اسے بتایا کہ اس کے ماموں نے کل کتنی فیس ادا کی تھی۔ اس نے نوٹوں کی گڈی میں سے فیس کی کل رقم نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

”جو رقم ماموں نے آپ کو دی تھی وہ آپ انھیں اپنے ہاتھ سے واپس کر دیں۔ میں دوپہر کے بعد انھیں آپ کے پاس لے کر آؤں گا۔“

میں نے رقم دراز میں رکھی اور پوچھا۔ ”اور وہ راز کی بات کیا ہے؟“

”شوکت صاحب نے جن بدمعاشوں کا ذکر کیا تھا انھیں حنیف ماموں نے بھیجا تھا۔ ویسے وہ لوگ میرے ہی جاننے والے ہیں۔ ماموں سے ان کا تعارف بھی میں نے ہی کرایا تھا۔ ان لوگوں کی پولیس والوں سے بڑی اچھی سلام دعا ہے۔ شوکت صاحب اپنی پوری کوشش کرنے کے بعد ہرجانہ ادا کرنے پر راضی ہوئے تھے۔“

”کیا تمھارے ماموں کو اس راضی نامے کا پتا ہے؟“

”بیگ صاحب، بات یہ ہے کہ ماموں بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ وہ یہ سارا مال خود سمیٹنے کی فکر میں تھے لیکن ان کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ ان کا بھانجا ایک قدم آگے سوچنے کا عادی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ان کو یہ بات معلوم ہے کہ تم نے مکان کا اوپر والا پورشن خالی کرالیا ہے؟“

”ابھی نہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر پُرخیال مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ”آج انھیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔“

ہم یہ بات چیت ختم ہی کرنے والے تھے کہ عامر کی ماں اور ماموں افراتفری کے عالم میں اندر آئے۔

”تم یہاں بیٹھے ہو؟“ حنیف نے برہمی سے کہا۔ ”ہم گھر پر تمھارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ... شوکت صاحب تو یہاں نہیں آئے؟“

”آئے تھے۔“ عامر نے جواب دیا۔ ”ابھی ابھی گئے ہیں۔“

”تم نے ان کے ساتھ کوئی بات تو نہیں کی؟“

”میں نے ان کے ساتھ راضی نامہ کرلیا ہے۔“

”تم نے راضی نامہ کرلیا ہے۔ ہم سے پوچھے بغیر؟“

”میں نے اس شریف آدمی کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”او، خانہ برباد۔ میں نے ان سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔“

”میں نے اسّی ہزار میں معاملہ نمٹا دیا ہے۔“

افروزہ بیگم اور حنیف کے حیرت سے منہ کھل گئے۔

”رقم کہاں ہے؟“ افروزہ بیگم نے پوچھا۔

”رقم محفوظ ہے۔“ عامر میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”بیگ صاحب، ماموں نے جو فیس آپ کو ادا کی تھی وہ واپس کر دیں۔“

میں نے دراز سے رقم نکالی اور حنیف کی ادا شدہ رقم گن کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”یہ... یہ کیا مذاق ہے۔“ حنیف چلّایا۔

”باقی باتیں گھر پہ ہوں گی۔“ عامر نے کہا اور اٹھ کر دفتر سے نکل گیا۔

”دیکھ لیے اپنے لختِ جگر کے کرتوت؟“ حنیف نے اپنی بہن سے کہا۔ ”میں نے کہا بھی تھا کہ اِدھر اُدھر سے کوئی لڑکا پکڑ کر کام نکال لیتے ہیں۔ نہیں، مجھے اپنا لختِ جگر چاہیے!“

افروزہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ جیل میں رہ کر ایسا بدمعاش بن جائے گا۔“

* Faisal Ahmed

تاریک راہوں میں مارے جانے والے ایک سرفروش کی بپتا

راز ہست

علیم الحق حقی

وہ بڑے جان لیوا حالات میں اپنے ملک کے لیے ایک اہم خدمت پر مامور تھا۔ جب وہ خدمت سرانجام دے چکا تو اُس کی اپنی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ہر راستہ اُس کے لیے دیوار بن گیا اور ہر دروازہ اُس کے لیے بند ہوگیا۔

ابرک سانچے کو احساس ہوگیا کہ اُس سے بدترین غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہفت روزہ لبرٹی کی پریس مشینیں حرکت میں آجائیں گی اور اِل جیف کے بدترین دُشمنوں کے جلاوطن لیڈر جو آن والیجو کے دہکتے ہوئے الفاظ کاغذ پر اُتریں گے۔ گڑے مُردے اُکھاڑے جائیں گے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اُس نے ان پریس مشینوں کو حرکت سے روکنے کے لیے ہی یہ کوشش کی تھی، جو بدترین غلطی ثابت ہوئی۔ وہ بدترین غلطی یہ تھی کہ اُس نے اپنی

روح کو جوآن والیجو کے سامنے عریاں کر دیا تھا۔

وہ دولت اور طاقت کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ والیجو اُسے اپنے تازہ ترین اداریے کی شہ سرخی کے متعلق بتا رہا تھا۔ ”امریکا ہمارے پسماندہ ملک کو کروڑوں ڈالر کی امداد دیتا ہے۔ اور وہ امداد جاتی کہاں ہے؟ ال جیف، اُس کے رشتے داروں، دوستوں اور حمایتیوں کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے۔“

اس بات پر ارک سانچے کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ پھٹ پڑا۔ ”اسی لیے تو میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ ال جیف کے دوستوں اور حمایتیوں میں شامل ہو جاؤ۔“

والیجو مسکرا دیا۔ وہ سانچے کو یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اُس نے کوئی مزاحیہ بات کہہ دی ہو۔ مگر ایک لمحے بعد وہ مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ ٹائپ رائٹرز اور ٹیلی ٹائپ مشینوں کی ٹک ٹک بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ والیجو کے کمرے کے باہر ایک ہفت روزے کا مکمل دفتر تھا۔

”یہ انکشاف میرے لیے تکلیف دہ ہے کہ وہ شخص جسے میں اپنا دوست سمجھتا تھا، میرے دشمنوں کا دوست ہے۔ تمھیں اس سے انکار تو نہیں؟“

سانچے نے نفی میں سر ہلایا۔ اُس کے ہونٹ مضبوطی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اُس نے والیجو کو ابھی تک سچی بات نہیں بتائی تھی۔ لیکن اب لگتا تھا، چھپانا فضول ہی ہے۔ اتنی دیر کوشش کے باوجود وہ والیجو کو ذرا سا بھی رام نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اُس نے اب تک والیجو کو ال جیف کی پیشکش کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اُس نے اپنی نرم داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بڑی خاموشی سے... رازداری سے دس لاکھ ڈالر سوئٹزرلینڈ میں تمھارا اکاؤنٹ کھول کر جمع کر دیے جائیں گے۔ تمھیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ال جیف پر اپنے یہ حملے روک دو۔ بس اتنی سی بات ہے...“

”یعنی ال جیف کا دوست بن جاؤں؟“

”دوست نہ بنو۔ اتنا تو کر سکتے ہو کہ دشمن نہ رہو۔“

”شکریہ سانچے۔ میرا جواب تمھیں معلوم ہے۔“

والیجو کی مضبوطی، سچائی اور خلوص دیکھ کر سانچے کے لبوں پر تضحیک آمیز مسکراہٹ اُبھری... مضحکہ اڑانے، تاؤ دلانے والی مسکراہٹ۔

”ہاں سانچے۔“ والیجو نے گویا اُس مسکراہٹ کا جواب دیا۔ ”دس لاکھ ڈالر کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ سننا بھی خوشگوار لگتا ہے۔ اور مجھے یہ سن کر اس لیے بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس پیشکش کو سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔ یہ پیشکش ثابت کرتی ہے کہ تمھارا ڈکٹیٹر دوست پریشان ہے۔ اور اُس کی پریشانی برحق ہے۔ اُسے پریشان ہونا ہی چاہیے۔ حالات میں تبدیلی جو آ رہی ہے۔“

سانچے کی نگاہیں والیجو کے چہرے سے پھسلتی ہوئی اُس چھوٹے سے پتھر پر آ رکیں، جسے والیجو بطور پیپر ویٹ استعمال کرتا تھا۔ سانچے کو اِس پتھر کی کہانی معلوم تھی۔ اس پتھر کا تعلق وطن سے... وطن کی مٹی سے تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب والیجو وطن میں، دارالحکومت سے اپنا روزنامہ شائع کرتا تھا۔ ایک روز برسرِ اقتدار پارٹی کے کسی حامی نے والیجو کی سچائی کے خلاف اظہارِ نفرت کے طور پر یہ پتھر اچھالا تھا۔ پتھر کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے والیجو کی میز پر آ کر گرا تھا۔ والیجو نے اُسے پالش کرا کے بطور یادگار رکھ لیا... اور بے مصرف بھی نہیں رکھا۔ اُسے بطور پیپر ویٹ استعمال کرنا شروع کر دیا۔

بعد میں جب ملک پر ال جیف پوری طرح قابض ہو گیا تو والیجو سمجھوتا نہ کرنے کی پاداش میں جلاوطنی پر مجبور ہوا۔ امریکا آتے ہوئے وہ اس پتھر کو اپنے ساتھ لانا نہیں بھولا۔ والیجو کے لیے وہ پتھر وطن کی نشانی تھا۔ والیجو کو اپنے وطن کے اُس پتھر تک سے محبت تھی، جہاں سے اسے ایک ڈکٹیٹر نے طاقت کے زور پر بے دخل کر دیا تھا۔

سانچے نے پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جوآن والیجو، تم اس پتھر کی طرح ہو۔ ختم ہو جانے والی چیزوں کی یادگار۔ تمھارے نزدیک اس کی ایک جذباتی اہمیت ہے۔ تمھیں وطن سے جو لگاؤ ہے، اُس کی میں قدر کرتا ہوں۔ مگر تمھارا اس پتھر سے لگاؤ میرے نزدیک حماقت ہے۔ نری جذباتیت ہے۔ مجھے بتاؤ، اس سے فائدہ کیا ہے۔ یہ ایک بے حقیقت پتھر ہی تو ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی چاہیے ہوتی ہے، پتھر نہیں۔ یہی فرق ہے جذباتیت اور حقیقت پسندی میں۔“

”آزادی روح کے لیے روٹی ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔“

سانچے نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ ”آزادی محض ایک خوبصورت لفظ ہے۔ دوسری اجناس کی طرح آزادی بھی بکاؤ شے ہے۔ والیجو، تم کرتے کیا ہو؟ ایسے ہی خوبصورت الفاظ بیچتے ہو۔ تمھارے اس اخباری چیتھڑے میں اور کیا ہوتا ہے۔ یہی تو ہے آزادی۔“ سانچے نے ہفت روزہ لبرٹی کی ایک کاپی اُٹھائی اور اُسے ہاتھوں میں تولتے ہوئے بولا۔ ”دو ڈالر کی یہ آزادی ہے تمھاری۔“

والیجو کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ”اب اجازت ہو تو میں بھی یہی الفاظ استعمال کر لوں۔ تم ال جیف کے ہاتھوں بک چکے ہو۔ یہ درست ہے کہ یکتا ہر شخص ہے۔ کوئی محبت کے ہاتھوں، کوئی آئیڈیلز کے ہاتھوں اور کوئی کرنسی کے ہاتھوں۔ یہ آخری قسم انسانوں کی سب سے گھٹیا قسم ہے۔ اور تم اسی قسم سے تعلق رکھتے ہو۔ اب میں سمجھ گیا۔ تمھارا مشن شروع ہی سے مجھے جیتنا تھا... مجھے فتح کرنا... یا کم از کم میرا زہریلا ڈنک نکال لینا۔ اب واپس جاؤ اور اپنے ال جیف کو بتا دو کہ تم ناکام ہو گئے۔ یہی تمھاری بدترین سزا ہو گی، جو میں تمھیں دینا چاہتا ہوں۔ وطن سے غداری کی کم سے کم سزا۔ تم نے دوستی کے مقدس رشتے کو بھی پامال کیا۔ تم نے میری میزبانی کا بھی غلط فائدہ اُٹھایا۔ اب میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ یہاں سے ابھی... اور اسی وقت چلے جاؤ۔“

سانچے کو محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے وجود کے پرخچے اُڑ گئے ہیں۔ ”میں جا رہا ہوں۔“ اُس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”لیکن جانے سے پہلے تمھیں ایک بات ضرور بتاؤں گا۔ والیجو، میں تمھیں خبردار کر رہا ہوں کہ ال جیف کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اُس کی پہنچ بہت دُور تک ہے۔ اگر تم خوش قسمت ہو تو اس صورت میں وہ یہاں بھی تمھیں چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہے۔ اور اگر خوش قسمتی تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے لمبے ہاتھ تمھاری گردن پکڑ کر تمھیں کھینچتے ہوئے دوبارہ وطن لے جائیں گے، جہاں سے تم آزادی کے نام پر منہ موڑ کر بھاگ آئے تھے۔ تم دنیا کے کسی کونے میں پہنچ جاؤ، اس کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکو گے۔ پھر تم خود اپنی آنکھوں سے اُن ٹارچر سیلز کو دیکھو گے، جن کا تذکرہ اپنے اس چیتھڑے لبرٹی میں بغیر دیکھے کرتے ہو۔“

والیجو کا ہاتھ انٹرکام کی طرف بڑھا۔ ”میں خود بھی ایک ڈکٹیٹر ہوں سانچے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا اداریہ ڈکٹیٹ کراؤں، تم اس میں کچھ اور اضافہ کرانا پسند کرو گے؟ کوئی اور دھمکی؟ کوئی اور پیشکش؟ ویسے میں تمھارا شکر گزار ہوں۔ تم نے پہلے ہی مجھے بہت بارود دے دیا ہے۔ اب تو میں تہلکہ مچا دوں گا۔“

اُس لمحے سانچے کو اپنی بدترین غلطی کا پوری طرح احساس ہوا۔ وہ نہ صرف والیجو کو پٹانے کے سلسلے میں ال جیف کے حکم کی تعمیل میں ناکام ہوا تھا۔ بلکہ اُس نے والیجو کو واقعی بڑی مقدار میں آتش گیر مادّہ فراہم کر دیا تھا۔

اُس نے میز پر رکھا ہوا وہی والیجو کا محبوب پیپر ویٹ اُٹھا لیا...

والیجو آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ میز پر ڈھلکا ہوا تھا۔ میز پر رکھے تمام کاغذات، اداریہ اور لبرٹی کی کاپیاں خون میں بھیگی ہوئی تھیں۔

سانچے کے حواس ٹھکانے پر آئے تو اُس نے خود کو ایک سادہ کاغذ سے اپنے خون آلود ہاتھ صاف کرتے پایا۔ پیپر ویٹ سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹانے کے بجائے وہ یہ احمقانہ حرکت کر رہا تھا۔ لیکن اس سے بھی کیا ہوتا۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ جلد از جلد اس کمرے سے نکل لیا جائے۔ ہر حال میں وہ آخری آدمی ہوتا، جو والیجو سے ملا تھا۔

اُس کی آخری امید یہی تھی کہ وہ جلد از جلد اس ملک سے نکل جائے... پولیس کے ہوشیار ہونے سے پہلے۔ ایک بار وہ وطن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو اُس کی حیثیت ایک ہیرو کی سی ہو گی۔ بظاہر ال جیف والیجو کی موت پر اظہارِ افسوس کرے گا... اُس کی موت کو وطن اور ملکی صحافت کے لیے عظیم ترین نقصان قرار دے گا۔ مگر بہ باطن وہ والیجو کے قاتل کا پرتپاک خیر مقدم کرے گا۔ اُسے اعزازات سے نوازے گا۔

وہ ’لبرٹی‘ کے ایڈیٹر جوآن والیجو کے کمرے سے نکل آیا۔ اُس نے اپنی چال ہلکی رکھی تھی حالانکہ بھاگنے کی خواہش شدت سے سر اُبھار رہی تھی۔ باہر آفس میں کئی افراد نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن سانچے کے اندر کا چور لرز رہا تھا... چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا... کہیں انھوں نے ہماری گفتگو تو نہیں سن لی۔ ہم لوگ چیخ چیخ کر گفتگو کر رہے تھے۔ کہیں انھیں میرے کپڑوں پر یا ہاتھوں پر خون تو لگا ہوا نظر نہیں آ گیا؟ کہیں...

اُن کے چہروں کے نقوش اور تاثرات سانچے کے ذہن پر نقش ہو گئے۔ جیسے سانچے کا چہرہ اُن لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہو گا۔ وہ اکثر اُسے یہاں آتے جاتے دیکھتے رہتے تھے۔ انھیں اُس کا نام بھی معلوم تھا۔ جب وہ والیجو کی لاش دیکھیں گے... تب انھیں علم ہو گا کہ کیا ہو چکا ہے تو پولیس کو بتانے کے لیے اُن کے پاس بہت کچھ ہو گا۔

راہداری میں قدم رکھتے ہی اُس کی چال میں تیزی آ گئی۔

اُس نے لفٹ کا بٹن دبایا۔ لیکن فوراً ہی اُسے یاد آگیا کہ یہ فرسودہ لفٹ بے حد سُست ہے۔ چنانچہ وہ لفٹ کو نظر انداز کر کے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

فوراً ہی ثابت ہو گیا کہ یہ اُس کی عقلمندی تھی۔ لبرٹی کے دفتر کی طرف سے خوف میں ڈوبی ایک چیخ اُبھری اور روشنائی کے نقطے کی طرح پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے والیجو کی لاش دریافت کر لی تھی۔

باہر نکل کر اُس نے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ اُس کے دل کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ ٹیکسی اُس نے اپنے اپارٹمنٹ سے خاصی دُور رُکوالی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ادائیگی کر کے وہ پیدل ہی گھر کی طرف چل دیا۔ اُس کی سماعت میں پولیس سائرن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ۔ ۔ اور ہر سائرن جیسے اُس کے نام کی پُکار تھا۔

اگر چیک بُک اور پاسپورٹ کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کبھی اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔ لیکن پاسپورٹ لینے کے علاوہ وہ یہاں سے اپنا وہ سرمایہ بھی نکلوانا چاہتا تھا، جو ال جیف نے اُس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرایا تھا۔ مگر اُسے تنگیِ وقت کا احساس بھی تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ سرمایہ نکلوایا جا سکے۔

چند لمحوں بعد ثابت ہو گیا کہ اُس نے ٹیکسی گھر سے دور رُکوا کر دوسری عقلمندی کی تھی۔ اپنی گلی کے موڑ پر اُس نے سادہ لباس میں دو پولیس والوں کو اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔

پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔

سانچے جلدی سے دوسری گلی میں مڑ گیا۔ وہ عقبی راستے سے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ وہ آگ سے بچاؤ والے زینوں کے ذریعے اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ سکتا تھا۔ مگر خدشہ یہ تھا کہ پولیس پہلے ہی اپارٹمنٹ میں داخل نہ ہو چکی ہو۔ عقبی گلی میں پہنچ کر اُس نے اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی پر نظریں جما دیں۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ کھڑکی پر نظریں جمائے چوکس کھڑا رہا۔ بالآخر اُسے نقل و حرکت نظر آ ہی گئی۔ کسی نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکایا تھا۔ اُس کے بدن میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔

والیجو اُس کے اندازے سے زیادہ اہم شخصیت ثابت ہوا تھا۔ پولیس نے جتنی تیزی سے ایکشن لیا تھا، یہ اُس کی اہمیت کا ثبوت تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب تیزی سے شہر کی ناکابندی کر دی جائے گی۔ اس کا مطلب ہے، پہلی فرصت میں علاقہ چھوڑ دینا چاہیے۔ پاسپورٹ کے بغیر بھی نکلا جا سکتا تھا۔ اگر کسی طرح پیورٹو ریکو کا ٹکٹ مل جائے تو وہاں سے وہ بحری راستے سے وطن پہنچ سکتا تھا۔ بینک بیلنس کو تو وہ ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا لیکن کریڈٹ کارڈ بہرحال اُس کے پاس موجود تھے۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے رُکا۔ ۔ ۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔

کریڈٹ کارڈ بہت کام آتے تھے۔ لیکن کریڈٹ کارڈ پر نام ہوتا ہے۔ اور اگر اُس نام کی تشہیر ہو جائے۔ ۔ ۔ وہ بلیک لسٹ کر دیا جائے اور پولیس پورے شہر کی ناکابندی کر چکی ہو تو کریڈٹ کارڈ سے صرف ایک چیز خریدی جا سکتی ہے۔

گرفتاری!

یعنی وہ اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے نقد رقم کی ضرورت تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ نقد رقم کہاں سے ملے گی؟

وہ ایک بار پھر رُک گیا۔ اُس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ رقم کہاں سے مل سکتی ہے۔ اسے کہاں جانا چاہیے۔

رائیل نے دروازہ پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ وہ کنڈی چڑھائے رکھتی اور دروازہ ذرا سا ڈھیلا کر کے پہلے دیکھتی کہ کون آیا ہے۔ اس وقت دروازے کے پیچھے اُس کا خوبصورت چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سانچے کو دیکھ رہی تھیں۔

سانچے کو رائیل کی وہ نظریں اچھی نہیں لگیں۔ رائیل نے پہلے کبھی اُسے اس طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔

"تم نے یہاں آ کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے سانچے۔" بالآخر رائیل نے کہا۔ "میں ریڈیو پر تمہارا کارنامہ سن چکی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اُس نے سوچا، رائیل سے داڑھی صاف کرنے کے لیے کم از کم ایک ریزر ہی مانگ لے۔ داڑھی کی موجودگی میں تو پولیس اسے بآسانی شناخت کر سکتی تھی۔ داڑھی صاف کرنے میں بڑی بچت تھی۔ ویسے بھی رائیل اکثر کہتی تھی کہ اُس پر داڑھی اچھی نہیں لگتی۔ وہ یہاں آیا ہی اس لیے تھا کہ رائیل سے ریزر اور کچھ رقم لے سکے۔

"رائیل، مجھے اندر آنے دو۔ ریڈیو پر تم نے جو کچھ سنا ہے، اُس کے سلسلے میں میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔"

رائیل کے چہرے پر چھائی ہوئی درشتی کچھ کم ہوئی۔ لیکن اُس نے دروازے کی کنڈی پھر بھی نہیں ہٹائی۔ بس مستفسرانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"تم چاہتی ہو، میں یہیں کھڑا اُس وقت تک تمہارا دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہوں، جب تک گرفتار نہ کر لیا جاؤں؟"

"جوآن والیجو اچھا آدمی تھا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ سانچے۔ ورنہ میں پولیس کو بُلا لوں گی۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ رائیل نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ پھر بند دروازے کے پیچھے سے رائیل کے دُور ہوتے ہوئے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ پھر دوبارہ سناٹا چھا گیا۔

کہیں رائیل پولیس کو مطلع تو نہیں کر رہی ہے؟ سانچے نے سوچا۔

اگر رائیل کے گھر کا دروازہ اُس پر بند ہو گیا تھا تو کسی اور در پر دستک دینا فضول تھا۔ رقم ملنا تو اب خواب و خیال کی بات تھی۔ کریڈٹ کارڈ خطرناک سہی، مگر اب وہی اُس کی آخری امید تھے۔

اُس نے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو کینیڈی ایئرپورٹ چلنے کو کہا۔ ایئرپورٹ پر اُتر کر اُس نے ڈرائیور کو ادائیگی کرتے ہوئے جیب خالی کر دی۔ وہ ٹکٹ کاؤنٹر تک جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس اُس کے گھر پہنچ سکتی تھی تو یہ ناممکن تھا کہ اُنھوں نے ہوائی اڈوں کی ناکابندی نہ کی ہو۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں گُم ہو کر جہازوں کو لینڈ اور ٹیک آف کرتے دیکھتا رہا۔ وہ یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ مسافروں کی غیر معمولی تلاشی تو نہیں لی جا رہی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اس نے دو سادہ لباس والوں کو ایک مسافر کے کاغذات چیک کرتے دیکھا۔ وہ مسافر قد کاٹھ کے اعتبار سے سانچے جیسا ہی تھا۔ داڑھی بھی ویسی ہی تھی۔

اُسے ذہنی جھٹکا لگا۔ بائی ایئر فرار ناممکن تھا۔ بس اور ٹرین کے ذریعے نکلنا بھی مشکل تھا۔ پولیس پوری طرح چوکس تھی۔ وہ خود کو بُری طرح گھرا ہوا محسوس کرنے لگا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اُس کے ذہن کے اُفق پر کوندا۔ ابھی ایک جگہ ایسی تھی، جہاں اسے پناہ مل سکتی تھی۔ اور وہ پناہ گاہ مین ہٹن کے قلب میں واقع تھی۔ وہ کھل اُٹھا۔

وہ باہر نکل کر اس ہجوم میں شامل ہو گیا، جو ٹرمینل کے باہر فضائی کمپنی کی گاڑی کے انتظار میں تھے۔ اُس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ عام بس میں سفر کر سکتا۔ اُس نے مغربی اُفق پر نگاہ ڈالی۔ ہلکا ہلکا دھند لکا پھیلنے لگا تھا۔ مین ہٹن کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ پیدل سفر میں کافی وقت لگتا۔

اُس نے وقت ضائع کیے بغیر ہائی وے کے قریب رہ کر چلنا شروع کر دیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اُس کے پورے جسم کا بوجھ اُس کے پیروں پر آ پڑا ہے۔ چند میل چلنے کے بعد وہ کافی پینے کی غرض سے رُک گیا۔ بھوک اور تھکان سے اُس کا بُرا حال تھا۔

وہ کافی دیر کافی کے مگ پر جھکا رہا۔ مگ خالی ہو چکا تھا مگر اُسے اُٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بمشکل تمام وہ اُٹھا اور کیفے سے نکل آیا۔ باہر پارکنگ ایریا میں کاریں کھڑی دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ ایک ایک کر کے ہر گاڑی میں جھانکتا رہا۔ بالآخر اُسے ایک ایسی گاڑی نظر آ ہی گئی، جس کی چابی اگنیشن میں لگی تھی۔ اُس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی۔ اگلے ہی لمحے وہ مین ہٹن جانے والے ٹریفک میں شامل ہو گیا۔

کچھ دیر ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے کار کا جائزہ لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ گاڑی کے ساتھ تقدیر کی اور کتنی مہربانیاں شامل ہیں۔ گلوو کمپارٹمنٹ میں الیکٹرک شیور مل گیا۔ اُس نے فوری طور پر اُس سے استفادہ کیا اور اپنی داڑھی سے نجات حاصل کر لی۔

مین ہٹن کا پُل عبور کرتے ہی اُس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔ اُسے یقین تھا کہ اب تک پولیس کو اس گاڑی کے مالک نے گمشدگی کی اطلاع دے دی ہو گی اور پولیس اس گاڑی کو تلاش کر رہی ہو گی۔ آخری لمحوں میں اُس نے ایک بار پھر گاڑی کی تلاشی لی۔ اس بار رقم کا مسئلہ حل ہو گیا۔ مگر جزوی طور پر۔ تین ڈالر کی ریزگاری میسر آ گئی۔

اب ایک مسئلہ اور تھا۔ تمام دن اسے کسی ہتھیار کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا رہا تھا۔ اس نے کار کا جیک ہینڈل نکال کر جیکٹ کے نیچے پتلون میں ٹھونس لیا۔ اب وہ ہر طرح کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

قونصل خانے کی عمارت پوری طرح روشن تھی۔ کھڑکیوں

کے پیچھے متحرک سائے نظر آرہے تھے۔

وہ اُس کے وطن کا قونصل خانہ تھا۔ امریکی پولیس اس کی چوکھٹ بھی عبور نہیں کرسکتی تھی۔ خواہ عمارت کے اندر کچھ بھی ہوتا رہے۔

ساپچے جانتا تھا کہ جوآن دالیجو کی موت نے قونصل خانے کو بھی متاثر کیا ہوگا۔ افسرِ اطلاعات اِل جیف کو اُس کے بدترین دُشمن کی موت کی خبر بھیج چکا ہوگا۔ ٹیلی پرنٹر مشینیں کھڑکھڑا رہی ہوں گی۔ کمیونیکیشن آفیسر وطن اور واشنگٹن کے درمیان پیغامات کی ترسیل کررہا ہوگا۔

پہلی بار ساپچے پر کامیابی کا نشہ طاری ہونے لگا۔ یہ احساس کہ اُس نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا ہے، بے حد مسرت خیز تھا۔

نتائج کے اچھے یا بُرے ہونے سے قطع نظر، اس کا وہ فعل بہرحال ایک تاریخ ساز فعل تھا۔ اُس نے خود تک کو قائل کرنے کی کوشش کرڈالی کہ اُس نے جوآن دالیجو کو وقتی اور ذاتی اشتعال کے تحت نہیں، جذبۂ حبّ الوطنی کے تحت قتل کیا ہے۔

اُس نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور محتاط انداز میں قونصل خانے کی عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر ایک دروازے کے پیچھے سے آنے والی آوازوں نے اُس کے قدم روک دیے۔

”کیا خیال ہے۔ ایرک ساپچے یہاں آئے گا؟“

”نہیں۔ میرا خیال ہے، ہم اپنا وقت برباد کررہے ہیں۔ اگر ساپچے یہاں آیا تو اُس سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہوگا۔“

ساپچے کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اتنا غرور ہے انھیں۔ اُس نے سوچا۔ اگر پولیس یہ سمجھتی ہے کہ مجھے قونصل خانے سے پکڑ کرلے جائے گی تو ان سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔

وہ پلٹا اور شکار کی نیّت سے چل دیا۔ یہ ضروری تھا کہ قونصل خانے میں داخل ہونے سے پہلے وہ پکڑا نہ جائے۔ اُس کی اسے ایک ہی صورت سجھائی دی۔ اب اسے اپنے جیسے جُثّے کے کسی پولیس مین کی تلاش تھی۔

ایک سنسان سڑک پر اُسے اپنے مطلب کا ایک شکار نظر آ ہی گیا۔ ساپچے اُس کی طرف بڑھا اور اُس سے ایک پتا سمجھنے کے بہانے اُس کے قریب ہوگیا۔ پولیس مین ایک طرف اشارہ کرنے کے لیے مڑا تو ساپچے کو موقع مل گیا۔ اُس نے پتلون میں اڑسا ہوا جیک ہینڈل نکالا اور پولیس مین کے سر پر وار کردیا۔

قونصل خانے کا دروازہ کھلا۔ گارڈ نے جھانکا۔ چند لمحوں میں گارڈ کو احساس ہوگیا کہ نووارد کی وردی مختلف ہے۔ اُس نے ساپچے کو سینے پر ہاتھ رکھ کر باہر روک دیا۔

”معاف کیجیے جناب۔ آپ اندر نہیں آسکتے۔ یہ امریکی علاقہ نہیں ہے۔“

”مجھے بھی معلوم ہے بے وقوف۔ تم مجھے اندر آنے سے نہیں روک سکتے۔ میں امریکی نہیں ہوں۔ تم مجھے نہیں پہچانتے؟“

گارڈ نے آنکھیں سکوڑ کر اُسے دیکھا۔ وہ اُسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا۔

گارڈ کے پیچھے ایک اور شخص نمودار ہوا۔ ”کیا بات ہے؟ کون ہے یہ؟“

گارڈ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور ساپچے کے بہت قریب آگیا۔ ساپچے گیٹ سے اندر آگیا۔ اب وہ بالکل محفوظ تھا۔ گارڈ نے دروازہ بند کردیا۔

دوسرے شخص نے ساپچے کو بڑی بدمزگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آفیسر... تمھیں احساس ہونا چاہیے کہ تمھاری یہاں آمد مداخلت بے جا کے مترادف ہے۔ اصولاً تم ہماری اجازت کے بغیر یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔“

روشنی میں ساپچے نے اُس شخص کو پہچان لیا۔ وہ کوئی بڑا افسر نہیں تھا۔ اِل جیف کی ہدایت پر چھوٹے موٹے کاموں کے سلسلے میں یہاں آتا رہتا تھا۔ ساپچے کو فوراً اپنی اہمیت کا احساس ہوگیا۔ اب وہ ایک اہم شخصیت تھا اور اس غیر اہم شخص سے بات کرکے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”مجھے فوراً قونصل کے پاس لے چلو۔“ ساپچے نے کہا۔

”اب میں ہی قونصل ہوں۔“

ساپچے نے اُسے غور سے دیکھا۔ اِل جیف بھی عجیب مَن موجی تھا۔ اُس کی تلوّن مزاجی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ کسی بھی وقت ترنگ میں آکر کسی کو کچھ بھی بخش دے... اور کسی بھی وقت غصّے میں کسی کو بھی برباد کردے۔ ”میں ایرک ساپچے ہوں۔“ بالآخر ساپچے نے لب کشائی کی۔ ”مجھے یہاں پناہ چاہیے۔ اور ہاں... مجھے اِل جیف کو ایک اہم پیغام بھی بھیجنا ہے۔“

نئے قونصل کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہوگیا۔ ”ساپچے۔“ اُس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم نے شاید شام کا اخبار نہیں پڑھا۔ اِل جیف کو تم جو بھی پیغام دینا چاہتے ہو، اب خود بھی جاکر دے سکتے ہو۔ اِل جیف مرچکا ہے۔ جوآن دالیجو کا قتل اِل جیف کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔ اُس کے خلاف برسوں سے جو لاوا پک رہا تھا، بالآخر پھٹ پڑا۔ اس قونصل خانے پر اب تمھارے اور اِل جیف کے دُشمنوں کا راج ہے ساپچے۔ کیونکہ وطن میں انقلاب آچکا ہے۔ سمجھے کچھ...“

THE LONG ARM OF EL-JEFF
Edward Wellen.

Faisal Ahmed

راہِ بلوغت

شکیل عدنان

اُسے کم سنی کی دہلیز ہی پر ایک ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا کہ اس نے بڑھ کر بلوغت کے دروازے پر دستک دے دی۔

پڑھنے والے پر لمحہ بہ لمحہ منکشف ہوتی ہوئی روداد

وہ موسم بہار کی ایک خوشگوار سہ پہر تھی۔ ننھا جوڈی ہاتھ میں کھانے کا برتن، کمر پر بستہ اور کندھے سے خیالی رائفل لٹکائے گھاس پر کودتا اور جھاڑیوں کو پھلانگتا اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ یہ اس کے اسکول سے واپس آنے کا وقت تھا۔ ہاتھ میں کھانے کا برتن درحقیقت ایک چھوٹے سائز کی بالٹی تھی جس میں اب کھانا تو نہیں تھا مگر پھر بھی وہ خالی نہ تھی۔ اس میں تین سینگ دار مینڈک، چار چھوٹی چھپکلیاں، ایک کینچوا، سولہ گھاس کے ٹڈے اور ایک کیچڑ میں لت پت آبی چھپکلی تھی۔

بظاہر تو وہ اکیلا ہی تھا مگر دراصل اس کے ساتھ پوری فوج چل رہی تھی۔ اس کا سربراہ خود جوڈی تھا اور یہ فوج صرف جوڈی ہی دیکھ سکتا تھا۔ موسمِ بہار کی یہ سہ پہر سبزے اور زردی کا حسین امتزاج تھی۔ رخصت ہوتی ہوئی خزاں کی جگہ رفتہ رفتہ بہار لے رہی تھی۔ سڑک تک پہنچنے سے پہلے جوڈی نے کئی شیر اور چیتے شکار کیے مگر سڑک کا موڑ آنے تک وہ بھی اس کی تصوّراتی فوج اور رائفل کی طرح فضا میں تحلیل ہوگئے۔ تاہم کھانے کی بالٹی سے آنے والی آوازیں نہ صرف اس میں

حشرات الارض کی موجودگی کا اعلان کر رہی تھیں بلکہ اس بات کی بھی غماز تھیں کہ یہ اپنے قید کیے جانے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے خلاف بھی ناپسندیدگی اور شدید غصّے کے جذبات رکھتے ہیں۔

سڑک کے دوسری جانب موڑ کے بعد سے جوڈی کے فارم کی حدود شروع ہوتی تھیں جہاں شروع ہی میں ایک میل بکس ایستادہ تھا۔ اس وقت اس کا سرخ جھنڈا اوپر تھا جو اس میں ڈاک کی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ جوڈی نے منٹگمری وارڈ کی فہرست اور ویکلی جرنل پر مشتمل ڈاک نکالی اور سرخ جھنڈا نیچے کر دیا۔

گھر کے دروازے میں داخل ہوتے ہی اس نے چیخ کر اپنی ماں کو ڈاک کی اطلاع دی۔

اس کی ماں مسز ٹفلن اس وقت کچن میں مصروف تھیں۔ "یہاں جوڈی" انھوں نے وہیں سے پکارا "میں یہاں ہوں، باورچی خانے میں۔"

جوڈی دوڑتا ہوا کچن میں پہنچا اور کھانے کی بالٹی سنک میں رکھ کر ان سے پوچھا۔ "ممی! میں یہ فہرست کھول لوں؟"

"نہیں جوڈی!" مسز ٹفلن نے اپنے فارم کا پنیر ریفریجریٹر میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تمھارے ڈیڈی نے کہا تھا کہ جوڈی کو آتے ہی میرے پاس بھیجنا۔ تم جاؤ، روزمرّہ کے کام بعد میں کر لینا۔"

جوڈی کو خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئیں۔ "ممّی۔۔!" اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔

"تم ایک مرتبہ میں کیوں نہیں سن لیتے؟" اس مرتبہ مسز ٹفلن نے ذرا غصّے سے کہا "میں نے کہا ہے کہ تمھیں ڈیڈی نے فوراً بلایا ہے۔"

جوڈی نے کانپتے ہاتھوں سے ڈاک میز پر رکھ دی "ممی۔۔۔ کیا آپ۔۔۔ میں نے کچھ کیا ہے کیا؟"

اس کی معصومیّت اور خوف پر مسز ٹفلن کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ تم خود بتاؤ تم نے کیا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی وہ اپنا قصور بھی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ اس کے لیے یہ جاننا بہت مشکل تھا کہ اس کا کون سا کام کب کسی جرم کی حیثیت اختیار کر جائے۔

"جاؤ، میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تمھیں اصطبل کی طرف ملیں گے۔" یہ کہہ کر مسز ٹفلن میلے برتنوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

جوڈی مڑا اور تیزی سے کچن کے پچھلے دروازے سے جو فارم کی طرف کھلتا تھا باہر نکل گیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا تھا کہ اسے اپنی ماں کی چیخ اور پھر شدید غصّے میں اپنا نام پکارنے کی آواز آئی۔ شاید انھوں نے جوڈی کی کھانے کی بالٹی ہی سب سے پہلے دھونے کو منتخب کی تھی۔

جوڈی کے ڈیڈی کارل ٹفلن اصطبل کے جنگلے سے ٹیک لگائے پیٹر بلک سے گفتگو کر رہے تھے۔ پیٹر کا کام فارم کی نگرانی کرنا تھا اور گھوڑوں کے بارے میں اس کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع تھیں۔ وہ اس علاقے میں اپنے کام کا ماہر ترین شخص تھا۔

احاطے میں نصف درجن سے زائد گھوڑے چرنے میں مشغول تھے مگر ایک گھوڑی نیلی سب سے الگ تھلگ کھڑی جنگلے سے اپنے جسم کا پچھلا حصّہ رگڑ رہی تھی۔ جوڈی اس کی وجہ خوب سمجھتا تھا مگر خود کو معصوم اور لاعلم ظاہر کرتا ہوا وہ کارل ٹفلن کے قریب پہنچا اور کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"میں نے تمھیں ایک کام سے بلایا تھا۔" کارل نے درشت لہجے میں کہا جو جانوروں اور بچوں کے لیے مخصوص تھا۔ "پیٹر نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے گھوڑی کے بچّے کی پیدائش کے بعد بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی۔" اس نے پیٹر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس طرح کہا جیسے یہ بھی جوڈی کی خطا رہی ہو۔

"جی ڈیڈی۔" اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت پیٹر کے لیے اپنے دل میں زبردست جذبۂ تشکر محسوس کر رہا تھا۔ "مگر میری اتنی محنت اور کوشش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکی تھی۔"

"جوڈی نے اس بچّے کی اتنی اچھی طرح پرورش کی تھی کہ کم از کم میں نے آج تک کسی اور کو نہیں دیکھا۔" پیٹر نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا۔

"اگر تمھیں ایک اور گھوڑا دیا جائے تو کیا تم اس پر بھی اتنی ہی محنت کر سکو گے؟" کارل نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ پیٹر کا کہنا ہے کہ اس کام میں مہارت حاصل کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ تم ایک بچھیرے کی پرورش کرو۔" کارل نے کہا۔ پیٹر نے شدّت سے گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔ کارل نے جواب طلب نگاہوں سے جوڈی کو دیکھا۔ جوڈی نے مرتعش آواز میں "جی ڈیڈی" کہنے پر اکتفا کیا۔

"ٹھیک ہے۔" کارل نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "علاقے کا سب سے اچھا نسل کش گھوڑا جیس ٹیلر کے پاس ہے۔ کل تم نیلی کو جیس ٹیلر کے فارم پر لے جانا۔ اس کام میں پانچ ڈالر خرچ ہوں گے۔ میں یہ خرچہ برداشت کرنے کو تیار ہوں مگر تم کان کھول کر سن لو۔ تمھارے سپرد جو کام بھی کیا جائے، پوری ذمّے داری سے کرنا۔ یہ بہانہ نہ سنوں کہ بھول گیا تھا یا وقت نہیں ملا۔ بچّے کی ولادت تک نیلی اور ولادت کے بعد بچّے کی دیکھ بھال تمھاری ذمّے داری ہو گی۔ تمھیں موسمِ گرما کے پورے عرصے سخت محنت کرنا ہو گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔"

"جی بہت اچھا۔" جوڈی نے بمشکل تھوک نگل کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر تم اب جا کر اپنے روزمرّہ کے کام انجام دو۔"

جوڈی گھر کی جانب مڑا اور پیٹر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بے حد محبت سے جینز میں ملبوس اس کی صحت مند ران کو آہستگی سے چھوا، اس طرح کہ کارل نہ دیکھ سکے۔ اب اسے اپنے کندھے بڑائی اور احساسِ ذمّے داری کے بوجھ تلے جھکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

کام کے دوران تمام دن وہ بے حد سنجیدہ رہا اور محنت بھی عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ کی۔ آتش دان کے لیے اس نے اتنی لکڑی کمرے میں جمع کر دی کہ جب اس کی ممّی وہاں پہنچیں تو یہ سمجھ کر حیران اور پریشان ہو گئیں کہ شاید یہاں سے لکڑی کے طوفان کا گزر ہوا ہے۔

مسز ٹفلن آئی تو اس نیّت سے تھیں کہ جوڈی کو سہ پہر والی حرکت پر ڈانٹ پلائیں گی مگر اتنی محنت کرتے دیکھ کر انھیں اس پر بہت ترس آیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے نرمی سے سمجھانا بہتر سمجھا۔ جوڈی نے ایسی حرکت کا اعادہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو اب پختہ کار اور باشعور محسوس کرنے لگا تھا اور عہد کر چکا تھا کہ اب بچکانہ حرکتیں بالکل چھوڑ دے گا۔

تمام کاموں سے فراغت پا کر وہ اصطبل کی طرف چلا گیا اور جنگلے کے اس حصّے پر چڑھ بیٹھا جہاں قریب ہی نیلی چرنے میں مصروف تھی۔ وہ اب بھی وقفے وقفے سے اپنا جسم جنگلے سے رگڑتی۔ جوڈی کچھ دیر اسے انتہائی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر نیچے اترا اور پیار سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "مائی ڈیئر نیلی۔۔۔۔ میری گڑیا۔۔۔ میری رانی۔"

نیلی نے چرتے چرتے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اوپری ہونٹ اوپر چڑھا کر اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرنے لگی۔ جوڈی نے اس کی پیٹھ تھپکی اور دوبارہ جنگلے پر سوار ہو گیا۔

تاریکی کی چادر آہستہ آہستہ دبیز ہوتی جا رہی تھی اور چمگادڑوں نے فضا میں منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ پیٹر فارم کے اندرونی حصّے سے دودھ سے بھری بالٹی لیے نمودار ہوا۔ اس کا رُخ گھر کی طرف تھا مگر جوڈی کو وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ رک گیا اور مسکرا کر بولا "ارے ابھی تو پیدائش میں کافی عرصہ لگے گا۔ اگر تم اس طرح انتظار کرو گے تو بہت جلد تھک جاؤ گے۔ ابھی کم و بیش ایک سال لگے گا۔"

"اچھا!" جوڈی نے مایوسی اور اشتیاق کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ "مگر میں تھکوں گا نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ جنگلے سے کودا اور پیٹر کے ساتھ دودھ کی بالٹی رضاکارانہ طور پر پکڑوا کر گھر کی طرف لے چلا۔

اگلی صبح ناشتا کرتے ہی جوڈی اور پیٹر، نیلی کو لے کر روانہ ہو گئے۔ جیس کا فارم تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ صبح بے حد خوشگوار تھی۔ موسم کے زیرِ اثر جوڈی بھی ترنگ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں نیلی کے گلے میں پڑے پھندے کا ایک سرا تھا اور اپنی تمامتر سنجیدگی کے باوجود وقفے وقفے سے ایک پاؤں پر کود کر چلنے سے خود کو نہ روک پاتا۔ پیٹر نے اسے رسّی پکڑاتے ہوئے تنبیہہ کی تھی کہ نہایت ہوشیاری سے پکڑنا، اس طرح کہ یہ تمھیں کاٹ نہ سکے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایسے وقت میں گھوڑیوں کی حالت جنونی سی ہو جاتی ہے۔

کلاس میں ایک لڑکے کو اُداس بیٹھا دیکھ کر ایک ساتھی نے اُداسی کا سبب پوچھا۔
لڑکے نے اُسے بتایا کہ کسی لڑکی نے اُسے مسترد کر دیا ہے۔
"مگر وہ تو کلاس کی سب سے بدصورت اور احمق لڑکی ہے۔" ساتھی نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "اِس میں اُداسی کی کیا بات ہے۔ کسی اور لڑکی سے کوشش کر لو۔"
"اِسی لیے تو اُداس ہوں۔ جب مجھے کلاس کی سب سے بدصورت اور سب سے احمق لڑکی نے مسترد کر دیا ہے تو بھلا دوسری لڑکیاں مجھے گھاس کیوں ڈالنے لگیں۔"

متحدہ عرب امارات سے
فرخ مہدی کا عطیہ

ایک گھنٹے کی چڑھائی کے بعد انھیں بالآخر جیس ٹیلر کے گھر اور اصطبل کی سرخ چھتیں نظر آنے لگیں۔ فارم کے قریب پہنچنے پر اچانک ہی نیلی نے زبردست جھٹکا لے کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی ٹھیک اسی لمحے جوڈی کے کانوں میں فارم کی جانب سے سیٹی سے مشابہ چیخ کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی آدمی کی پکار۔ نیلی دو چار قدم پیچھے ہٹی اور ہلکی آواز میں ہنہنائی۔ جوڈی نے رسّی کھینچ کر اسے روکنا چاہا۔ گردن پر دباؤ محسوس کرتے ہی نیلی دانت نکال کر اس کی طرف لپکی۔ جوڈی نے بدحواس ہو کر رسّی چھوڑ دی اور بچنے کے لیے قریبی جھاڑی کی طرف بھاگا۔ اسی وقت سیٹی نما چیخ دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ ذرا قریب سے سنائی دینے کی وجہ سے جوڈی نے اچھی طرح پہچان لیا کہ یہ کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ ہے۔ نیلی نے بھی اس ہنہناہٹ کا جواب دیا اور اپنے کھر زمین پر مارے۔ ذرا دیر بعد دوسری جانب سے ایک نہایت خوبصورت اور توانا گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اس کے گلے میں پھندا پڑا ہوا تھا مگر اس کا دوسرا ٹوٹا ہوا سرا اس بات کا مظہر تھا کہ وہ پھندا تڑا کر بھاگا ہے۔ اس کا جسم دھوپ میں چمک رہا تھا اور وہ اس قدر رفتار سے بھاگ رہا تھا کہ نیلی کے پاس پہنچ کر بھی نہ رک سکا۔ رکنے کی کوشش میں وہ نیلی سے ٹکرا کر کچھ آگے جا کر رکا اور واپس پلٹ کر اس نے اپنے اگلے دو پیر نیلی کی کمر پر رسید کیے اور قبل اس کے کہ نیلی سنبھل پاتی اس نے اپنے دانت نیلی کی گردن میں گاڑ دیے۔ ذرا ہی دیر بعد نیلی کی گردن پر سرخی نمودار ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا موڈ بھی یکسر بدل گیا۔ اچانک ہی اس نے عشوہ گری شروع کر دی اور بڑے ناز و انداز سے گردن گھما کر اپنی تھوتھنی اس صحت مند گھوڑے کی گردن سے رگڑی۔ کچھ دیر بعد اس نے اٹھلا کر اس کے گرد ایک چکّر لگایا اور پھر اس کے جسم سے اپنا جسم رگڑنا شروع

کر دیا۔

جوڈی اب بھی جھاڑی کے پیچھے روپوش تھا اور جھانک جھانک کر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دی اور اس سے پہلے کہ وہ پیچھے مڑ کر صورتِ حال کا جائزہ لیتا کسی نے پیچھے سے اس کے کالر میں ہاتھ ڈال کر اسے فضا میں اُٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسی لحیم شحیم شخص کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ آگے بیٹھا ہوا شخص جیس ٹیلر تھا۔

"اس شیطان نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔" جیس ٹیلر نے جوڈی سے کہا۔ "کمبخت نے رسّی تڑائی اور سیدھا یہاں بھاگا چلا آیا۔"

جوڈی ایک لمحے خاموش رہا پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ تڑپ کر بولا۔ "اس گھوڑے کو نیلی سے دور ہٹاؤ۔ وہ اسے مار ڈالے گا۔ دیکھو! زخمی تو کر ہی دیا ہے۔"

"اسے کچھ نہیں ہوگا۔" جیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ اندر جاؤ اور کچھ کھا پی لو۔"

جوڈی نے انکار کر دیا اور کہا۔ "یہ میری گھوڑی ہے اور جو بچّہ یہ دے گی اُسے مجھے پالنا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" جیس نے قہقہہ لگایا۔ "کارل بھی کبھی کبھی عقل مندی کے کام کر ہی جاتا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد خطرے کی مخصوص گھڑیاں گزر چکی تھیں۔ جیس نے جوڈی کو نیچے اتار دیا اور گھوڑے کی رسّی پکڑ کر اپنے اصطبل کی طرف چلا۔ جوڈی بھی جیس ٹیلر کو ادائیگی کرنے کے بعد اپنے فارم کی طرف روانہ ہوا۔ گزشتہ سفر کے برعکس اس وقت نیلی بے حد خاموش اور انتہائی اطاعت شعاری سے اُن کے ساتھ چل رہی تھی۔ جوڈی نے سفر کا زیادہ تر حصّہ اس کی پیٹھ پر ہی طے کیا۔

نیلی بتدریج مطمئن، خوش اور بے حد فرماں بردار ہوتی جا رہی تھی۔ جوڈی جب اسے چَرانے لے جاتا تو وہ انتہائی شاہانہ انداز میں خراماں خراماں قدم اُٹھاتی چلتی۔ جوڈی نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹ اب ہر وقت مسکراہٹ کے سے انداز میں پھیلے رہتے ہیں۔ جوڈی روزانہ نیلی کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتا لیکن اس کے علاوہ اُسے نیلی میں اور کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔

ایک روز جب جوڈی چراگاہ میں پیٹر کے ساتھ کام میں معروف تھا اچانک پیٹر نے گھاس اٹھانے والی دنگلی ایک طرف رکھی اور جوڈی سے بولا۔ "آؤ، ذرا نیلی کو ایک نظر دیکھ لیں۔"

دونوں جب اصطبل پہنچے تو نیلی نے انھیں دیکھتے ہی اپنے کان پچھلی جانب موڑ کر اپنا سر زور زور سے باغیانہ انداز میں اوپر نیچے ہلانا شروع کر دیا۔ پیٹر آہستہ آہستہ اس کے پاس گیا اور ایال کے قریب اس کی گردن تھپکنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی اس کے کان دوبارہ صحیح حالت میں آ گئے اور وہ آہستگی سے اپنی تھوتھنی پیٹر کی پشت سے رگڑنے لگی۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ اس کے ہاں بچّے کی ولادت ہوگی؟" جوڈی نے پیٹر سے پوچھا۔ لہجے میں بے یقینی تھی۔

پیٹر نے جواب دینے سے پہلے نیلی کے ہونٹ پکڑ کر اندر جھانکا اور پھر نچلا ہونٹ انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی مدد سے ٹٹولا اور بولا۔ "اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"پچھلے ماہ سے میں نے تو اس میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی۔" جوڈی نے اعتراض پیش کیا۔

"میں نے تمھیں پہلے ہی کہا تھا کہ اگر تم اس طرح انتظار کرو گے تو تھک جاؤ گے۔ اب بھی کم از کم پانچ ماہ تم ایسی کوئی تبدیلی نہیں دیکھ سکو گے۔ جبکہ پیدائش میں کم و بیش آٹھ ماہ ہیں۔" پیٹر نے نیلی کی پیشانی سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اور اس کے بعد بھی تمھیں اس پر سواری کے لیے مزید دو برس انتظار کرنا ہوگا۔"

"ابھی تو بہت وقت ہے۔" جوڈی نے ایک طویل آہ خارج کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک میں بھی بڑا ہو جاؤں گا۔"

"ہاں، اس وقت تک تم بھی پورے آدمی ہو جاؤ گے۔" پیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ویسے بچّہ ہوگا کس رنگ کا؟ میں چاہتا ہوں کہ بالکل سیاہ اور چمکدار ہو اور نر ہو۔" جوڈی نے خوابناک لہجے میں کہا پھر اچانک ہی وہ جیسے اس کیفیت سے باہر آ گیا۔ اس نے پُراشتیاق لہجے میں پیٹر سے پوچھا۔ "اچھا تم یہ تو بتاؤ کہ وہ ہوگا کیسے؟ بالکل ویسے جیسے گائے کے بچھڑے ہوتے ہیں؟"

"تقریباً ویسے ہی۔ ویسے گھوڑیاں ذرا حساس ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ہمیں اس دوران ان کی مدد کرنا پڑتی ہے اور کبھی کبھی جب معاملہ ذرا گڑبڑ ہو جائے تو..."

"تو ... تو کیا پیٹر؟ بتاؤ نا۔" جوڈی نے بے قراری سے پوچھا۔

"تو ہمیں ہر وہ کام کرنا پڑتا ہے جو گھوڑی کو بچانے کے لیے ضروری ہو ورنہ گھوڑی کی جان جا سکتی ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ نیلی کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اس سے پہلے بھی ان مراحل سے بخیر و خوبی گزر چکی ہے۔"

"پیٹر! تمھیں یاد رہے گا نا؟" جوڈی کے لہجے میں معصوم سی التجا تھی۔ "دیکھو! مجھے ضرور بلانا۔ آخر وہ بچّہ میری ذمّے داری ہوگا۔"

"ارے فکر نہیں کرو۔" اس نے پیار سے اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں ضرور بلاؤں گا۔"

"تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ تو کہ یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے؟" جوڈی نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"آ..." پیٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ننھے جوڈی کے سامنے اس معاملے کی منظر کشی کس طرح کرے۔ "تم نے کبھی کسی گائے کے ہاں بچھڑے کی ولادت تو ہوتے دیکھی ہوگی۔ گھوڑی کا بھی بالکل یہی معاملہ ہوتا ہے اور... اور ترتیب بھی وہی... پہلے سر اور اگلے کُھر۔ پھر بچہ سانس لینا شروع کر دیتا ہے، بالکل گائے کے بچّے کی طرح مگر اس مرحلے سے گزرنے سے پہلے گھوڑی زمین پر ڈھیر ہو جاتی ہے اور کراہنا شروع کر دیتی ہے۔ ہمارا وہاں ہونا اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اگر کسی وجہ سے بچّے کے پیر باہر نہ آ سکیں تو وہ دَم گھٹنے سے ہی مر سکتا ہے۔"

فضا پر بوجھل خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اب اصطبل سے نکل کر گھر کی طرف جا رہے تھے۔ جوڈی کے ذہن میں بے شمار سوالات مچل رہے تھے اور دل مختلف اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے پیٹر سے بہت کچھ پوچھنا تھا کہنا تھا۔ وہ کچھ جو وہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ "پیٹر!" اس نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم اس بچھڑے کو کچھ نہیں ہونے دو گے، ہے نا؟"

پیٹر جانتا تھا کہ جوڈی کا اشارہ اس بچّے کی طرف تھا جو بالآخر جانبر نہ ہو سکا تھا اور سانس نہ لے پانے کے باعث مر گیا تھا۔ اس واقعے سے قبل پیٹر کا ریکارڈ بے داغ تھا جبکہ اب صورتِ حال مختلف تھی۔ اب اُس سے بھی غلطی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس احساس نے پیٹر کی خود اعتمادی کی مضبوط بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ اب اس کا خود پر سے بھی یقین اُٹھ رہا تھا۔ "کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" اس مرتبہ اس نے بے حد اکھڑ انداز میں جواب دیا۔ "اور اگر کچھ ہوا تو اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہوگی۔ میں قادرِ مطلق تو ہوں نہیں۔" اُسے اس وقت اپنے کھوئے ہوئے وقار کا شدت سے احساس ہو رہا تھا اور اس احساس کے زیرِ اثر اس نے بہت خراب لہجے میں کہا۔ "میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ نیلی اس سے پہلے کئی مرتبہ ایسے مرحلوں سے بہ آسانی گزر چکی ہے۔ اسے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کرنا چاہیے، تاہم میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اصطبل کے عقب میں بنے ہوئے اپنے مکان کی طرف چلا گیا کیونکہ اس کے احساسات کو اس وقت زبردست ٹھیس لگی تھی اور وہ اپنے وجود کو زخمی محسوس کر رہا تھا۔

فارم کی شمالی جانب ایک ندی بہتی تھی۔ جس کے آس پاس کی زمین پر گھاس اُگ آئی تھی۔ جوڈی کو جب کبھی بھی کسی بات پر ڈانٹ پڑتی یا وہ اُداس ہوا کرتا تو اس قطعۂ زمین پر آ بیٹھتا تھا۔ آج بھی پیٹر کے اس طرح ناراض ہو کر چلے جانے کے بعد وہ اسی طرف چلا آیا۔ اس کے ذہن پر اس وقت بھی نیلی ہی کی سوچیں سوار تھیں۔ بیٹھے بیٹھے اس کے خیالات نہ جانے کہاں نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ نیلی کو سبز مخملیں گھاس چرتا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبی ٹانگوں اور مضبوط جسم والا بچہ بھی تھا جس کی جلد دھوپ میں چمک رہی تھی۔ وہ نیلی سے دودھ کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے بچھیرے کو بڑے گھوڑے میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ وہ مضبوط تن و توش کا مالک تھا اور اس کی صحت مند گردن اونچی اور کسی کمان کی طرح خم دار تھی۔ اس کے اسکول کے ساتھی اُس سے سیاہ عفریت پر سواری کرنے کی درخواست کرتے ہیں اور وہ کمال مہربانی سے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اُنھیں اجازت مرحمت فرما دیتا ہے مگر سیاہ عفریت اُنھیں بیٹھتے ہی اُچھال دیتا ہے۔

'واہ، کیا نام ذہن میں آیا ہے' جوڈی نے خود کو سراہتے ہوئے سوچا۔ بعض اوقات گاؤں کے لوگ رات گئے، اپنے بستروں میں دبکے ہوئے، گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنتے ہیں اور کہہ اُٹھتے ہیں 'یہ جوڈی ہے، اپنے سیاہ عفریت پر سوار آج پھر وہ شیرف کی مدد کو جا رہا ہے۔ اور پھر...

ریس کورس میں بے شمار گھوڑے قطار سے کھڑے ہیں۔ اچانک جوڈی ایک جانب سے سیاہ عفریت پر نمودار ہوتا ہے۔ اناؤنسر مائک پر اس کا نام پکارتا ہے اور تمام جاکی کندھے اُچکا کر مقابلے سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ وہ تمام لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس جوڑی کے مقابل جیتنا ناممکن ہے۔ اور پھر...

ملک کے صدر نے جوڈی کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں اس سے درخواست کی گئی ہے کہ قزاقوں کے ایک گروہ کو پکڑنے میں وہ حکومت کی مدد کرے۔

موسیقی کی ا، ب، ت کا قاعدہ
گانا سیکھنے کے لیے نہایت موزوں کتاب

ابجدِ موسیقی

برصغیر کے نامور گلوکار مہدی حسن کہتے ہیں کہ:

موسیقی کے اُستاد نظام الدین خاں کہتے ہیں کہ:

معروف ادیب و صحافی شکیل عادل زادہ کہتے ہیں کہ:

جواں نسل معروف شاعر جمال احسان کہتے ہیں کہ:

ان حضرات کا تفصیلی اظہارِ رائے کتاب میں شائع کیا گیا ہے۔

کتابیات پبلی کیشنز

جوڈی گھاس پر لیٹے لیٹے دیر تک ایسے ہی خوابوں سے دل بہلاتا اور اُداسی کے تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

وقت جوڈی کے لیے کچھوے سے زیادہ سُست رَو ہو گیا تھا۔ سال گزارے نہ گزر رہا تھا۔ کارل ٹفلن اب بھی نیلی کو چھکڑے میں جوتتا تھا اور اسے بار برداری کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس دوران جوڈی نے کتنی ہی مرتبہ بچھڑے کی اُمید چھوڑی لیکن جلد ہی غیر محسوس طور پر خود کو بے چینی سے مقررہ وقت کا منتظر پاتا۔

دن گن گن کر اس نے موسم گرما اور خزاں کا عرصہ گزارا۔ رفتہ رفتہ صبحیں سرد ہونے لگیں اور پھر جھکڑ چلنا شروع ہو گئے۔

ایک ایسی ہی سرد صبح جب وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو اس کی ممی نے اسے باورچی خانے میں بُلا لیا۔ وہ اس وقت ایک بالٹی میں کھولتا ہوا پانی ڈال رہی تھیں۔ بالٹی میں کسی قسم کے چِنے پڑے تھے جو پانی سے پھول کر نرم پڑ گئے تھے جنھیں بعد میں مسز ٹفلن نے گھوٹ گھوٹ کر بالکل کچل دیا تھا۔ ”تم یہ سب کچھ غور سے دیکھ لو۔ آج کے بعد سے یہ تمھیں ہر صبح کرنا ہو گا۔“

”یہ ہے کیا؟“

”یہ نیلی کی غذا ہے۔ یہ غذا نیلی کو تندرست رکھنے کے لیے ضروری ہے۔“

جوڈی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنی پیشانی سہلائی پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”نیلی ٹھیک تو ہے نا؟“

”ہاں ہاں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔“ مسز ٹفلن نے لکڑی کی ڈوئی بالٹی میں چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تو ہم اس کی بہتر نگہداشت کے لیے کر رہے ہیں۔ لو اس کا ناشتا تیار ہے، لے جاؤ۔“

نیلی اس وقت چراگاہ میں تھی۔ جوڈی بالٹی لے کر سیدھا اصطبل میں گیا اور بالٹی رکھ کر نیلی کو لانے کے لیے چراگاہ کی طرف چلا۔ جنگلا کود کر وہ چراگاہ میں داخل ہوا اور نیلی کی طرف دیکھا تب ہی پہلی مرتبہ اسے نیلی میں تبدیلی نظر آئی۔ اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کا درمیانی حصّہ اسے معمول سے کہیں زیادہ اُبھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ چلتی تو نہایت آہستگی اور وقار کے ساتھ چلتی تھی۔ اس کے پیر زمین پر بہت نرمی سے پڑتے۔ جوڈی اسے اصطبل میں لے آیا اور بالٹی اس کے سامنے کر دی۔ نیلی نے بالٹی خالی کی اور نہایت مہربان نگاہوں سے جوڈی کی طرف دیکھا۔ وہ جوڈی کے قریب آئی اور اپنا گال آہستہ آہستہ جوڈی کے کندھے سے رگڑنے لگی۔

کچھ دیر بعد پیٹر اصطبل میں داخل ہوا اور جوڈی کو دیکھ کر مسکرایا۔ ”یہ کتنی پیاری ہوتی جا رہی ہے نا؟ اور اس کی آنکھیں دیکھو کتنی خوبصورت ہو گئی ہیں۔ بعض گھوڑیاں ایسی حالت میں بہت چڑچڑی ہو جاتی ہیں مگر جو گھوڑیاں خوش مزاج ہو جائیں تو بس وہ ہر چیز سے پیار کرتی ہیں۔“ نیلی اب پیٹر کے بازو اور پہلو کے درمیان اپنا مُنہ رگڑ رہی تھی۔ ”اب تم اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا شروع کر دو۔“ پیٹر نے جوڈی کو ہدایت کی۔

”اب کتنا عرصہ لگے گا؟“ جوڈی نے اپنی پُرجوش کیفیت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

پیٹر نے زیرِ لب اپنی انگلیوں پر کچھ گِنا پھر بولا۔ ”تین ماہ کم و بیش۔ بالکل صحیح تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ مخصوص دن سے مقررہ وقت گیارہ ماہ کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ دو ہفتے قبل ہی ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک مہینہ دیر سے، بغیر کوئی نقصان پہنچائے۔“

جوڈی کے چہرے پر پھر اندیشوں کے سائے لرزنے لگے۔ وہ بولا۔ ”پیٹر! دیکھو، مجھے بلانا بھول نہ جانا۔“

”تم بالکل فکر نہ کرو۔“ پیٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تمھارے ڈیڈی نے بھی یہی کہا ہے کہ تمھاری تربیّت کی ابتدا بالکل ابتدائی مراحل سے کی جائے۔ خود میرے والد نے بھی مجھے اسی مرحلے سے سکھانا شروع کیا تھا۔ میں اس وقت تمھاری ہی عمر کا تھا۔ ایک دن کیا واقعہ پیش آیا۔ میں نے گھوڑے پر زین کسی، زین کے کمبل میں ایک شکن رہ گئی۔ اس شکن نے گھوڑے کو بہت تکلیف دی اور اسے زخمی بھی کر دیا۔ میرے والد مجھ پر بالکل ناراض نہ ہوئے لیکن اگلے روز انھوں نے مجھ پر چالیس پاؤنڈ وزنی زین لاد دی جو لے کر مجھے تیز دھوپ میں پہاڑ پر چڑھنا پڑا۔ اس فٹیگ نے مجھے اَدھ مُوا کر دیا تھا لیکن اس کے بعد میں نے کبھی زین کے کمبل میں شکن نہیں چھوڑی۔ میں جب بھی زین کے کمبل پر شکنیں دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کمر پر وہی وزنی زین محسوس ہونے لگتی ہے۔“

جوڈی کچھ دیر خاموشی سے نیلی کے ایال پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر بولا۔ ”تم مجھے ہر چیز کے بارے میں بتانا کہ کون سا کام کیسے کیا جاتا ہے۔ تمھیں تو گھوڑوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے نا؟“ اس نے بہت معصومیّت سے پوچھا۔

پیٹر کے مُنہ سے قہقہہ اُبل پڑا۔ ”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں خود آدھا گھوڑا ہوں۔“ اس نے ہنسی کے دوران کہا۔ ”میری ماں مجھے جنم دیتے ہی مر گئی تھی اور چونکہ میرے والد سرکاری اصطبل کے نگراں تھے تو اُس پاس گھوڑے ہی گھوڑے تھے۔ نہ گائے نہ بھینس۔ لہٰذا مجھے گھوڑیوں کا دودھ ہی زیادہ تر پینا پڑتا تھا۔“ اب وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ ”اور یہ بات گھوڑے فوراً جان لیتے ہیں۔ کیوں نیلی؟ تمھیں تو معلوم ہے نا؟“ اس نے نیلی کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

نیلی نے گردن اُٹھا کر براہِ راست پیٹر کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو عموماً گھوڑے نہیں کرتے۔ پیٹر کو خود پر فخر محسوس ہونے لگا۔ اسے خود بھی اپنی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اب وہ اپنا کھویا ہوا اعتماد بھی بحال محسوس کر رہا تھا۔ وہ جوڈی کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”تم ایک بہترین بچھیرے کے مالک ہو گے اور اگر تم نے میرے کہنے پر ہو بہو عمل کیا تو تم اس پوری کاؤنٹی کے سب سے عمدہ اور اعلیٰ گھوڑے کے مالک کہلاؤ گے۔“

پیٹر کے مُنہ سے یہ بات سُن کر جوڈی کے خون کی گردش میں تیزی آ گئی۔ اب وہ خود کو بے حد ہلکا پھُلکا محسوس کر رہا تھا۔

موسم سرما تیزی سے اپنے عروج کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابتدائی چند پھواروں اور چھینٹے پڑنے کے بعد باقاعدہ مُوسلا دھار تیز بارش ہو چکی تھی جس سے پہاڑوں کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ مشروم اور نئی سبز گھاس دُور دُور تک دکھائی دیتی اور کرسمس کا انتظار کرتی معلوم ہوتی مگر جوڈی کے لیے اس مرتبہ کرسمس مرکزیّت کی حامل نہ تھی۔ اسے تو جنوری کے اُس دن کا انتظار تھا جو کہ ابھی معیّن نہیں تھا۔ وہ ہر روز ازحد توجہ اور محنت سے نیلی کی خدمت کیا کرتا۔ صبح سویرے اُٹھ کر ناشتا تیار کر کے اسے کھِلاتا، پھر مالش کیا کرتا اور گھمانے پھرانے لے جایا کرتا۔ نیلی اتنی تیزی سے پھول رہی تھی کہ جوڈی کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور ایک دن وہ پیٹر سے کہہ بیٹھا۔ ”یہ کسی روز پھٹ نہ جائے۔“

جواب میں پیٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نیلی کے پیٹ پر رکھا اور پوچھا۔ ”کچھ محسوس ہوا؟“ پھر خود ہی بولا۔ ”میں حرکت تک محسوس کر سکتا ہوں، بلکہ میرا تو اندازہ ہے کہ یہ عین وقت پر تمھیں حیرانی سے ہمکنار کر دے گی، جُڑواں بچّوں کو جنم دے کر۔ ویسے مجھے یقین تو نہیں کہ ایسا ہو، تاہم ایسا بعض اوقات ہوتا ضرور ہے۔“

جنوری کے ابتدائی دو ہفتے دُھواں دھار بارش ہوتی رہی۔ جوڈی کا بیشتر وقت اب نیلی کے ساتھ ہی گزرتا۔ وہ جب اسکول میں نہیں ہوتا تھا تو اصطبل میں ہوا کرتا تھا۔ نیلی کے اطوار میں بھی مزید نرمی اور جوڈی کے لیے بے حد دوستی پیدا ہو گئی تھی۔ جوڈی کے اصطبل میں داخل ہوتے ہی وہ خوشی سے ہنہنانا شروع کر دیتی۔

ایک روز کارل ٹفلن جوڈی کے ساتھ اصطبل آیا اور ستائشی نظروں سے نیلی کا سرتاپا جائزہ لیا۔ جوڈی کی محنت رنگ لا رہی تھی اور روزانہ کی غذا اور مالش سے نیلی صحت مند اور چمکدار نظر آ رہی تھی۔ کارل نے نیلی کی ران اور گردن پر ہاتھ پھیرا اور جوڈی کو سراہتے ہوئے کہا۔ ”ہوں۔ تم واقعی محنت کر رہے ہو، لڑکے، شاباش!“

جوڈی فخر و انبساط سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ یہ داد اس کی اب تک کی زندگی میں کی جانے والی تمام تعریفوں سے زیادہ تھی۔

جنوری کی پندرہ تاریخ آئی اور چلی بھی گئی، مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر مزید پانچ روز گزرے اور بیس تاریخ بھی آ کر چلی گئی۔ اب جوڈی کے دل میں وسوسے پلنے شروع ہو گئے۔ اس نے پیٹر سے پوچھا۔ ”نیلی ٹھیک تو ہے نا؟“

”ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔“ پیٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے تمھیں بتایا ہے نا جوڈی کہ صورتِ حال ہر بار یکساں نہیں ہوتی۔ تم بس انتظار کرو۔“

جب مہینے کا اختتام بھی بغیر ولادت ہوئے گزر گیا تو جوڈی کا اضطراب حد سے گزر گیا۔ نیلی اب اس قدر بھاری بھرکم ہو چکی تھی کہ اس کے لیے ٹھیک طور سے سانس لینا بھی محال ہو گیا تھا۔ اس کے کان بالکل کھڑے اور ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے سر میں شدید درد محسوس کر رہی ہو۔ خود جوڈی راتوں کو ٹھیک طرح نہیں سوتا تھا۔ تمام رات بے چین رہتا اور پریشان کُن سپنے مزید ڈراتے۔

دو فروری کی شب جوڈی کی آنکھ کُھلی تو اس نے خود کو روتا اور چیختا پایا۔ اس کی ممی اس پر جھکی ہوئی اس سے کہہ رہی تھیں۔ ”کیا ہوا جوڈی؟ اٹھو، شاید تم کوئی بُرا خواب دیکھ رہے ہو۔“

جوڈی اس کے بعد دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ خوف اور مایوسی نے بُری طرح اسے اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ چند لمحے لیٹا وہ ممی کے دوبارہ کمرے میں جانے اور سونے کا انتظار کرتا رہا، پھر آہستگی سے بستر سے نکل آیا۔ باہر رات بے حد تاریک اور سرد تھی۔ وہ ننگے پیر ہی کچن کی طرف بڑھا اور پچھلے دروازے سے نکل کر اصطبل کی طرف چل دیا۔ کیچڑ میں چلتا ہوا وہ دروازے تک پہنچا اور دروازہ دھکیلا جو ایک چرچراہٹ کے ساتھ کُھل گیا۔ جوڈی نے دن کے اوقات میں کبھی دروازے کی چرچراہٹ محسوس نہ کی تھی اس لیے اسے یہ اجنبی لگی۔ اس نے ریک پر سے ماچس اُٹھا کر لالٹین روشن کی اور نیلی کے اسٹال کی طرف بڑھا۔ زرد روشنی میں اس نے دیکھا کہ نیلی ایک طرف سے دوسری طرف اس طرح ہل رہی ہے جیسے اس کا بھاری بدن سنبھالنا اب اس کی ٹانگوں کے بس میں نہ رہا ہو۔ جوڈی نے آہستہ سے اُسے پکارا۔ ”نیلی! پیاری

سال ہوئے انگلستان کے ایک مشہور ماہرِ تعلیم یہاں (ہمارے ملک میں) آئے۔ ہم انھیں ایک انگلش میڈیم اسکول دکھا چکے تو کسی قدر فخر کے ساتھ ان کی رائے پوچھی۔ ان کی رائے سننے کے قابل ہے، کہنے لگے۔

”بھئی آپ کی ہمت قابلِ داد ہے، جو اپنے بچّوں کو ایک غیر زبان میں تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر میں انگلستان میں انگریز بچّوں کو اُردو کے ذریعے تعلیم دینے کی سفارش کروں تو مجھے یقیناً اگلی رات کسی اسپتال میں کاٹنی پڑے گی۔ آپ واقعی بہادر ہیں۔“

خُدا جانے اس انگریز کے ذہن میں کون سا لفظ تھا جس کی جگہ بہادر استعمال کر رہا تھا۔

کرنل محمد خان کی ”بزم آرائیاں“

نیلی؟ مگر نہ تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی اس کا ہلنا بند ہوا۔ جوڈی نے اسٹال میں قدم رکھا اور نیلی کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ اسے نیلی کے جسم میں ارتعاش محسوس ہوا۔ اسی وقت عقب سے پیٹر کی آواز آئی۔ "جوڈی! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ نیلی کی بروقت مدد کو پہنچنے کے لیے یہیں قریب ہی سویا کرتا تھا۔

جوڈی اسٹال سے نکلا اور پیٹر کے قریب پہنچ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے حد غمگین انداز میں پوچھا "نیلی ٹھیک ہے نا؟ تم اسے کچھ نہیں ہونے دوگے نا؟"

"ارے ہاں بھئی! بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا "جب میں نے تم سے کہہ دیا ہے تو یقین کرو کہ میں تمھیں ضرور بلاؤں گا۔ اب تم یہاں سے جاؤ اور اس کی فکر چھوڑ دو۔" اس نے نیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ "اسے تمھاری ان فکروں اور پریشانیوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔"

جوڈی پیٹر کے اس لہجے سے بالکل ناآشنا تھا چنانچہ وہ بڑی لجاجت سے منمنایا "میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے سوچا ذرا دیکھ ہی لوں۔"

پیٹر کا لہجہ ایک دم نرم ہو گیا "چلو خیر، تم جاؤ۔ نہ خود پریشان ہو اور نہ اسے کرو۔ میں نے تم سے کہا ہے نا کہ میں تمھیں ایک بہترین بچھیرا دوں گا۔ تم اطمینان رکھو۔"

جوڈی بوجھل بوجھل قدموں سے واپسی کے لیے پلٹا۔ باہر رات کی سیاہی اور خون جما دینے والی سرد ہوائیں اس کی منتظر تھیں۔ آتے ہوئے اسے سرد ہواؤں کی موجودگی کا احساس ذرا بھی نہیں ہوا تھا۔ کیچڑ میں چلتے ہوئے اب اس کے پیر سُن ہونے لگے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ کاش! اسے پیٹر کی کہی ہوئی ہر بات کا یقین آجائے مگر اسے پچھلی ولادت یاد آرہی تھی جس میں بچہ مر گیا تھا۔ اُس بار بھی تو پیٹر نے ایسی ہی پُریقین باتیں کی تھیں۔

باورچی خانے سے گزرتے ہوئے وہ ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ کارل نے اپنے بیڈ روم سے پکار کر پوچھا "کون ہے؟ کون ہے، باورچی خانے میں؟"

ساتھ ہی مسز ٹفلن کی غنودہ آواز سنائی دی "کیا بات ہے، کارل؟ کیا ہوا؟"

اگلے ہی لمحے کارل ہاتھ میں موم بتی لیے نمودار ہوا "تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں... وہ... نیلی کو دیکھنے گیا تھا۔" جوڈی نے نظریں جھکائے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

اس بات نے جیسے کارل کے غصے کو ایک دم ہی دبا دیا "سنو" بالآخر وہ ممکنہ حد تک نرم لہجے میں بولا "اس ملک میں بچھیروں اور ان کی پیدائش کے متعلق پیٹر سے زیادہ کوئی شخص معلومات نہیں رکھتا۔ تم سب کچھ اس پر چھوڑ دو اور بے فکر ہو جاؤ۔"

نہ جانے کون سا جذبہ اس وقت کارفرما تھا کہ الفاظ جوڈی کے منہ سے دھماکے کی صورت نکلے "لیکن پچھلی مرتبہ تو بچہ مر گیا...!"

"تم اس کا الزام پیٹر کو نہیں دے سکتے۔" کارل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس مرتبہ سختی سے کہا "اگر کسی بچھیرے کو پیٹر بک نہیں بچا سکتا تو سمجھو وہ بچ ہی نہیں سکتا۔"

"اسے پیر صاف کر کے لیٹنے دو، کارل۔" مسز ٹفلن کی خمار آلود آواز آئی "ورنہ کل یہ تمام دن اونگھتا رہے گا۔"

جوڈی کو ایسا لگا کہ جیسے ابھی اس نے پلکیں جھپکی ہی تھیں کہ کسی نے اس کا کندھا بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو پیٹر اس کے بیڈ کے پہلو میں لالٹین لیے کھڑا تھا "جلدی اٹھو۔" اس نے دروازے کی طرف تیزی سے واپس مڑتے ہوئے کہا "آؤ، جلدی آؤ۔"

"کیا بات ہے؟" مسز ٹفلن کی آواز آئی "پیٹر، یہ تم ہی ہو نا؟"

"جی مادام!"

"کیا نیلی تیار ہے؟"

"جی مادام!"

"ٹھیک ہے۔ میں کچھ پانی گرم کر دیتی ہوں۔ ممکن ہے تمھیں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

پیٹر اور جوڈی تیزی سے باہر نکلے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے سے صبح نمودار ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اصطبل میں پہنچ کر پیٹر نے لالٹین نیلی کے اسٹال میں ایک کیل پر لٹکا دی اور اپنا کوٹ اتار دیا جس کے نیچے ایک بغیر آستین کی شرٹ تھی جو پیٹر نے خاص طور پر اسی موقع کے لیے پہنی تھی۔

نیلی بالکل ساکت اور اکڑی ہوئی کھڑی تھی جیسے کلف لگا ہوا ہو۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دبکنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اب اس کے جسم کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد یہ جھٹکے ختم ہو گئے مگر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ہلکے ہلکے جھٹکے شروع ہو جاتے اور کبھی یہ سلسلہ بند ہو جاتا۔

پیٹر اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور پریشانی کے عالم میں زیرِ لب بڑبڑایا "اوہ گاڈ! کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اس انداز سے نیلی کے نزدیک بیٹھا کہ ننھے جوڈی کی طرف اس کی پیٹھ ہو اور وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ پھر اس کے منہ سے نکلا "اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔"

نیلی نے پھر جھٹکے لیے اور اس مرتبہ پیٹر نے اپنے آپ کو پوری قوت سے کھینچا۔ اس کے بازو اور کندھے کے پٹھے واضح نظر آنے لگے تھے۔ وہ بری طرح ہانپ گیا اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ نیلی تکلیف سے بری طرح تڑپ رہی تھی۔ پیٹر بدستور بڑبڑا رہا تھا "سب غلط ہو گیا۔ یہ اس طرح گھوم چکا ہے کہ میں اسے سیدھا بھی نہیں کر سکتا۔"

اس نے پریشانی اور بے بسی سے چند لمحے جوڈی کو گھورا پھر اچانک جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ جبڑے سختی سے بھنچ گئے اور ہڈیاں نمایاں ہو گئیں۔ وہ اُٹھا اور ڈبے میں سے ایک ہتھوڑا نکال لیا جس سے گھوڑے کے کھروں میں نعل ٹھونکی جاتی ہے "جوڈی! تم باہر جاؤ۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

جوڈی اسے خالی خالی نگاہوں سے تکتا رہا۔

"تم باہر انتظار کرو۔ ابھی کافی وقت لگے گا۔"

جوڈی نے اب بھی حرکت نہ کی۔

پیٹر گردن جھٹک کر پھرتی سے نیلی کے سر کی جانب پہنچ گیا اور پھر چیخا "اپنا چہرہ ہی دوسری جانب پھیر لو، ڈھیٹ انسان! دوسری طرف گھوم جاؤ۔"

لیکن جوڈی تو جیسے کسی سحر میں گرفتار تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے پیٹر کی بات سنی ہی نہیں۔

پیٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ اچانک اس کے چہرے پر نرمی کا سایہ سا لہرا گیا "جوڈی... میری بات غور سے سنو۔" اس نے کہا۔

پیٹر کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ جوڈی کا سحر ٹوٹ گیا "میں سن رہا ہوں۔"

"دیکھو... آدمی کو دنیا میں سب کچھ نہیں ملتا۔" پیٹر نے کہنا شروع کیا "یہ قانونِ قدرت ہے، جس سے لڑا نہیں جا سکتا۔ آدمی کو انتخاب کا موقع مل جائے تو یہ بھی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ ورنہ قدرت کے فیصلوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ تمھیں خوش قسمتی سے فیصلہ کرنے کا حق مل گیا ہے۔ اس پر خدا کا شکر ادا کرو۔ وقت بہت کم ہے۔ تمھیں فوری طور پر فیصلہ کرنا ہے، گھوڑی کو بچانا چاہتے ہو یا بچھیرے کو؟ دونوں نہیں بچ سکتے... اور فیصلہ جلدی کرو۔ ورنہ دونوں ہی جاتے رہیں گے۔"

جوڈی سناٹے میں آگیا۔ اسے احساس ہوا کہ آدمی کی حاکمیت بھی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ زندگی کا بھی تھا اور موت کا بھی۔ اس نے نظر بھر کر اپنی چہیتی نیلی کو دیکھا۔ وہ تڑپتی اور پھر نڈھال ہو کر ساکت ہو جاتی۔ جوڈی کے ننھے سے ذہن کے لیے فیصلہ ناممکن ہو رہا تھا۔

"جلدی کرو، جوڈی!" پیٹر نے اسے ٹوکا۔

"بچھیرے کو بچا لو۔" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ذرا منہ پھیر لو۔"

اس بار جوڈی نے تعمیل کی۔ وہ نیلی کے اسٹال کی طرف پُشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پیٹر کی جنونی سرگوشیاں سنیں اور پھر ہڈی چٹخنے کی اذیت ناک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ نیلی کی دلخراش چیخوں نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ پیٹر کا ہتھوڑے والا ہاتھ پھر بلند ہوا۔ اگلے ہی لمحے ہتھوڑا نیلی کی پیشانی سے ٹکرا گیا۔ نیلی پہلو کے بل گری... کچھ دیر لرزی اور پھر ساکت ہو گئی۔

پیٹر ہتھوڑا پھینک کر تیزی سے دوسری جانب آیا۔ اب اس کے ہاتھ میں شکاری چاقو بھی نظر آرہا تھا...

کچھ دیر بعد جب وہ اپنا کام ختم کر چکا تو اس نے اپنے ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے بچھیرے کو جوڈی کے قدموں میں گھاس پر لٹا دیا۔ پیٹر اس وقت سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ دانت بری طرح بج رہے تھے۔ لگتا تھا، وہ بولنا بھول گیا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں سرگوشی کی "یہ رہا تمھارا بچھیرا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ یہ یادگار دن ہے۔ تم نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا... اور میرے خیال میں درست فیصلہ کیا ہے۔ نیلی حال تھی..." اس نے مُردہ گھوڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور یہ بچھیرا مستقبل ہے۔ آج تم نے مستقبل کی خاطر حال کو قربان کرنے کا سبق سیکھا ہے۔"

جوڈی نے بچھیرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی کھال سیاہ، چمک دار اور بے داغ تھی۔ وہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھا... سیاہ عفریت۔ اس نے خوش ہونا چاہا مگر پہلی بار اپنے دل میں خوشی اور غم کو گلے ملتے دیکھا۔ وہ غم میں بھیگی ہوئی خوشی تھی... یا شاید خوشی میں لپٹا ہوا میٹھا غم۔ وہ سمجھ نہیں سکا۔

"جاؤ، اب جا کر اسفنج اور پانی لے آؤ۔" پیٹر نے سرگوشی کی اور ویران نگاہوں سے مردہ نیلی کو دیکھتے ہوئے بولا "اس بچے کو نہلاؤ، خشک کرو، جیسے اس کی ماں کرتی۔ اب تمھیں ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی خوراک کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔" پیٹر کی آواز بھرا گئی۔

جوڈی ہونقوں کی طرح زمین پر پڑے پھوٹتے بلکتے نوزائیدہ بچے کو دیکھتا رہا۔ بچھیرا سر اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔

"اب جاؤ بھی۔" پیٹر نے دہاڑ کر کہا "جاؤ... پانی اور اسفنج لاؤ۔"

جوڈی آہستگی سے مُڑا اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ صبح کا اُجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ جوڈی کو اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ حلق میں گولا سا اٹکا ہوا تھا اور پیر مَن مَن بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ بچھیرے کی پیدائش پر خوش ہونے کی کوشش کرتا تو پیٹر بک کا مضمحل چہرہ اور نیلی کی آسیبی آنکھیں دل میں انجانا دکھ جگا دیتیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے ذہن پر زندگی کی سرّیت کا پہلا باب کُھل گیا ہے۔

☆

THE PROMISE
John Steinbeck.

Faisal Ahmed

گزشتہ قسط کا خلاصہ

پارس سوسانہ کو لے کر اندھے کنوئیں سے نکلا تو معلوم ہوا کہ جبریل پیرس جارہا ہے۔ وہ دونوں بھی اسی جہاز میں سوار ہوگئے۔ راستے میں جہاز کو سپر ماسٹر کے آدمیوں نے اغواء کرنے کی کوشش کی۔ پارس نے ببرل اور سوسانہ کی مدد سے جہاز کو بچانا چاہا مگر اس کے کامیاب ہونے سے پہلے ہی جہاز ایک جزیرے پر اتر چکا تھا۔ جزیرے کے مالک کبانہ نے خفیہ طور پر سپر ماسٹر سے معاہدہ کرکے جبریل اور سوسانہ کی موت کا بندوبست کردیا تھا مگر پارس نے چالاکی سے اس کا منصوبہ ناکام بنادیا۔ دوسری طرف میں نے لڑکے نماٹری پر سے پاسکل بوبا کا اثر آہستہ آہستہ زائل کرنا شروع کرایا۔ ادھر سونیا نے سپر ماسٹر کی ناک میں نکیل ڈالنے کے لئے اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو قابو میں کرنا شروع کردیا تھا۔ میں مصروفیات میں یہ بات بالکل بھول گیا تھا کہ ایک عورت مجھے معمول بنا چکی ہے۔ اس نے جیسے ہی اپنی موجودگی کا احساس دلایا' میں نے اس سے جان چھڑانے کی کوشش شروع کی۔ معلوم ہوا' وہ میری محبت میں گرفتار ہے مگر مجھے اپنا محکوم رکھنا چاہتی ہے۔ رات کو ایک بے حد خوبصورت لڑکی نہ جانے کیسے میرے کمرے میں گھس آئی۔ صبح اٹھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ خواب تھا یا حقیقت! کاٹیج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں فوراً جینا کے کمرے میں اس کے بستر کے قریب پہنچا اور وہاں لیٹی ہوئی ہستی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ دراصل وہ نہیں تھی بلکہ وہ تھی۔

اب آپ مزید واقعات کا مطالعہ کیجیے

جی ہاں، اب میں کیا بتاؤں کہ اُس 'وہ' کا کیا نام تھا۔ جب کسی کا نام نہیں جانتے تو اُسے وہ یا یہ۔ کہتے ہیں۔ اور میں اس عورت کا نام نہیں جانتا تھا جو میرے دماغ پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی تھی اور میرے اندر انقلاب لانے کی تدبیر پر عمل کر رہی تھی۔ جو کام شیخ الفارس مرحوم محبّت اور نصیحت سے نہ کر سکے تھے، اُسے وہ جبر سے کر رہی تھی۔

ایک پتے کی بات ہے۔ محبّت اور نصیحت سے کسی کی عادت کو بدلا جاسکتا ہے مگر فطرت کو کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ کسی سرکش اور فولادی عزم رکھنے والے کو زنجیریں پہنا کر غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ اُسے کوڑے مارو، اُس کی ہڈیاں توڑ دو، اس کا خون نچوڑ لو۔ اس کے اندر سے ساری توانائیاں نکال لو، تب بھی وہ دم توڑتے ہوئے غلامی سے انکار کرے گا کیونکہ اُس کی فطرت میں غلامی نہیں لکھی گئی۔ اس لیے فطرت کو کسی طور بدلا نہیں جا سکتا۔ کاتبِ تقدیر نے میری فطرت میں غلامی نہیں لکھی ہے پھر وہ عورت مجھے اپنا محکوم کیسے بنا سکتی تھی؟

مانا کہ اس کے ارادے نیک تھے مگر کسی کو غلام اور محکوم بنا کر نیکی نہیں کی جا سکتی۔ یہ نیکی ایسی نماز کی طرح ہے جیسے ڈاکو اور اسمگلر پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں چوری ہمارا پیشہ اور نماز ہمارا فرض ہے۔ غلط طرزِ عمل سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن نماز اور نیکی نہیں ہو سکتی۔

اور وہ میرے سامنے بستر پر کافرانہ انداز میں پڑی ہوئی تھی اور سچ مچ پڑی ہوئی چیز تھی، میں جدھر سے چاہتا، اُدھر سے اُٹھا لیتا۔ وہ 'نہ' کہنے والی نہیں تھی۔ اپنی دانست میں نیک ارادے سے آئی تھی جبکہ نیکی بیڈ روم سے کبھی شروع نہیں ہوتی۔

میں نے نیند کے دوران آنکھ کھلنے پر جس حسینہ کو دیکھا تھا، یہ وہی تھی، وہی دیدہ زیب لباس پہنے ہوئے بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی اور اُس کے لبوں پر کوئی بات نہ تھی۔ ان حالات میں عورت زبان سے کچھ نہیں کہتی پھر بھی سب کچھ سمجھا دیتی ہے۔

میں جذبات کے دھارے میں بہہ گیا۔ جب سنبھلا تو غصہ دکھانے کے انداز میں پوچھا۔"جینا کہاں ہے؟"

"وہ جہاں سے آئی تھی، وہیں چلی گئی ہے۔"

"کہاں چلی گئی ہے؟ وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتی۔"

"ہاں وہ تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتی۔ اس لیے میں نے اُسے روانہ کر دیا۔ جب تم سو رہے تھے، تب پاسکل بوبا اُس کے دماغ میں آیا تھا۔ میں نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ اگر جینا کی زندگی چاہتے ہو تو اسے واپس لے جاؤ۔ ورنہ یہ صبح سے پہلے فوجیوں کے انڈر گراؤنڈ قید خانے میں پہنچا دی جائے گی۔ وُولف اسے رہائی نہیں دلا سکے گا۔ سونیا اور بابا صاحب کے ادارے والے اُسے جینا کے عشق میں بغاوت کرنے نہیں دیں گے۔ میری بات سُن کر جانتے ہو پاسکل نے کیا جواب دیا تھا؟"

"تم کہنا چاہتی ہو، وہ جواب میں یہاں آکر جینا کو لے گیا؟"

"نہیں، اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ماسک مین یہی چاہتا ہے کہ وُولف زیادہ سے زیادہ جینا کا دیوانہ ہو جائے۔ اُس کے عشق میں بغاوت کرے۔ بابا صاحب کے ادارے کے اثر سے نکلے اور جینا کے ساتھ ہمارے پاس چلا آئے۔"

"میں اتنا نادان نہیں ہوں۔"

"عشق میں دانائی نہیں رہتی۔ یہی سوچ کر میں نے یہاں کے اعلیٰ فوجی افسر کو بتایا کہ جہاں ان کے جاسوس سوچ بھی نہیں سکتے، وہاں جینا چھپی ہوئی ہے۔ اگر ابھی آجائیں تو اُس سیکرٹ ایجنٹ حسینہ کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی گاڑیوں میں آئے۔ میں جینا کو نیند میں چلاتی ہوئی کاٹیج کے باہر لے گئی پھر اُسے فوجیوں کے حوالے کر دیا۔"

میں نے شدید غصے کے عالم میں اسے کاٹیج سے نکال دیا مگر افسوس اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتا تھا۔

میں نے فوراً ہی خیال خوانی کی پرواز کی۔ رسونتی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ بابا صاحب کے ادارے میں بڑی کامیابی سے علاج ہو رہا تھا۔ وہ نارمل ہوگئی تھی۔ اسے ماضی کی تمام باتیں یاد آگئی تھیں۔ اُسے میری آمد کی خبر نہیں تھی۔ کیونکہ دماغ ابھی کمزور تھا۔ نہ وہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کر سکتی تھی، نہ ہی خیال خوانی کے قابل تھی۔

میں مایوس ہو کر دماغی طور پر حاضر ہوگیا۔ میں نے سوچا تھا رسونتی کو اس ساحرہ کے متعلق بتاؤں گا پھر کہوں گا کہ وہ مجھ پر تنویمی عمل کر کے میرے دماغ کو اس طرح لاک کر دے کہ اس ساحرہ کو بھی میرے اندر آنے کا راستہ نہ ملے۔

افسوس! رسونتی مجھے اس سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ ہماری ٹیم میں اور کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا اور تنویمی عمل کرنے والا نہیں تھا۔ ویسے میں کئی تنویمی عمل کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُن کی خدمات حاصل کر سکتا تھا لیکن وہ مجھے معمول بنانے کے بعد اُس ساحرہ کی طرح اپنا محکوم بھی بنا سکتے تھے۔

میں نے سونیا کو مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔"شاباش فرہاد! تم نے جینا کو ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تم حسن پرست ہو مگر ڈرلوا نے نہیں ہو۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ جینا کو میں نے نہیں اس ساحرہ نے ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کیا ہے۔ اس عورت نے میرے دماغ کو بُری طرح جکڑ لیا ہے۔ میں اس کا محکوم اور غلام بن کر نہیں رہوں گا۔ پلیز میرے لیے کچھ کرو۔"

اس نے پوچھا۔"کیا ابھی وہ تمہارے دماغ میں نہیں ہے؟"

"نہیں ہے۔"

"تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"بھئی میں ٹوائلٹ میں ہوں۔"

"پھر تو یقین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب وہ تمہارے دماغ میں آنے والی ہوگی اور جب آئے گی تو تمہارے چور خیالات اُسے بتا دیں گے کہ تم آئندہ ٹوائلٹ جانے کے بہانے کسی سے خود پر تنویمی عمل کرا سکتے ہو۔"

"ہاں میں اُسے چور خیالات پڑھنے سے روک نہیں سکوں گا۔ وہ کب آتی ہے اور کب جاتی ہے، مجھے محسوس تک نہیں ہوتا۔"

"یہ بتاؤ اُس سے اب تک کیا نقصان پہنچا ہے؟"

"سب سے بڑا اور ناقابلِ برداشت نقصان یہی ہے کہ وہ میرے دماغ پر قبضہ جما چکی ہے۔"

"یہ تو ہو چکا ہے۔ کوئی دوسرا نقصان بتاؤ۔"

"اور کوئی نقصان نہیں ہے۔ وہ خود کو بہترین دوست ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"دوستی کا ثبوت کیسے دے رہی ہے؟"

"اس نے پاسکل بوبا کے تنویمی عمل سے مجھے بچایا ہے ورنہ آج میں پاسکل اور ماسک مین کا محکوم ہوتا۔"

سونیا نے کہا۔"اُس نے صرف دوستی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ تم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تم نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اُس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے اور وہ کیا چاہتی ہے؟"

"وہ جب مجھ سے مخاطب ہوتی ہے تو میں سوالات کرنا بھول جاتا ہوں وہ پچھلے چھ گھنٹے سے میرے ساتھ تھی۔ میں اس کی پٹائی کرنا چاہتا تھا نہ کر سکا۔ اسے پکڑ کر بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا مگر وہ کب یہاں سے گئی مجھے خبر نہ ہوئی۔"

"اچھا تو تمہارے ساتھ چھ گھنٹے تک تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ حسین اور دل نشین ہے۔ وہ تم سے کیا چاہتی ہے' یہ اس کی چھ گھنٹے کی رفاقت سے معلوم ہو گیا۔"

"تم نہیں سمجھیں وہ کیا چاہتی ہے۔"

"تم سمجھا دو۔"

"وہ کہتی ہے اپنے سوا کسی دوسری عورت کو میری تنہائیوں میں نہیں آنے دے گی۔ اسی لیے اس نے جینا کو مجھ سے دُور کر دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے وہ میری حسن پرستی اور ہوس پرستی کو ختم کر دے گی۔"

"یہ تو بے چارے شیخ الفارس مرحوم بھی نہ کر سکے۔"

"مجھے طعنے نہ دو۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا ہے وہ شیخ الفارس مرحوم کی عقیدت مند ہے۔ اس کا یہ عزم ہے کہ مجھے فرہاد کی حیثیت سے ظاہر نہیں ہونے دے گی۔ مرحوم نے میری موت کی تصدیق کی تھی۔ اس صداقت پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ جینا جیسی دُشمن کی آلۂ کار میری رفاقت کی تفصیلات بیان کرے گی تو میں اسی طرح فرہاد تسلیم کیا جاؤں گا جس طرح تم نے میری مخصوص بُو سے مجھے پہچان کر تسلیم کیا تھا۔"

سونیا نے کہا۔"جو عورت تمہارے دماغ پر حاوی ہے، وہ ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ اس کی باتوں اور حرکتوں سے دوستی کا یقین ہوتا ہے۔"

"کیا دماغ پر جبراً قبضہ جمانا دوستی ہے؟"

"تم ایک عالمِ دین کے بیان کو جھٹلا کر کون سی دوستی محبت اور عقیدت کا ثبوت دے رہے ہو؟"

"میں اُس عورت کو برداشت نہیں کروں گا۔"

"نہ کرو۔ دماغ سے نکال سکتے ہو تو نکال دو۔"

"تم اس سلسلے میں تعاون نہیں کرو گی؟"

نہ آؤ، میرا گلا نہ جاؤ۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

وہ قالین پر سے اُٹھ کر دُور چلی گئی۔ جلدی جلدی لباس پہنتے ہوئے کہنے لگی: "مجھے اسپتال واپس جانے دو۔ میں فوجیوں کی پناہ میں رہوں گی۔ میں اسپتال کے باہر دوست اور دشمن کو نہیں پہچان سکتی، مجھے جانے دو۔"

وہ روشنی میں جینا تھی۔ سر سے پاؤں تک جینا تھی۔ میں پریشان ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اُسے کیا سمجھوں۔ وہ دروازے کی طرف جارہی تھی۔ میں نے کہا: "رُک جاؤ میں تمھیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"میں کسی درندے کے پاس ایک منٹ بھی نہیں رہوں گی۔"

وہ جانا چاہتی تھی۔ میں نے اُس کے دماغ پر قبضہ جمالیا وہ پلٹ کر میرے پاس آئی پھر بستر پر بیٹھ گئی میں نے اُسکے دماغ کو آزاد چھوڑا تو مجھے قریب دیکھتے ہی چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے پھر خیال خوانی کے ذریعے بٹھایا پھر دماغ کو آزاد چھوڑا۔ وہ اُٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی، نہ بھاگ سکی۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولی: "تم جادو جانتے ہو، اب میں سمجھ گئی، میں اپنے کمرے میں سونا چاہتی تھی، تم نے جادو کے ذریعے مجھے اس بستر پر آنے کے لیے مجبور کردیا۔ میں نے تمھیں اپنا سب کچھ دے دیا، ایک جان نہیں دے سکتی، مجھے معاف کردو، مجھے چھوڑ دو۔"

اب میں اُس پر ظلم کر کے پچھتا رہا تھا اگر وہ میرے دماغ میں آنے والی عورت ہوتی تو میں اُس کے دماغ میں نہیں جاسکتا تھا جبکہ جینا کے اندر پہنچ رہا تھا اور اُسے اپنی مرضی پر چلا رہا تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی، چھڑا نہ سکی: "مجھے جانے دو، پلیز مجھے جانے دو۔"

"میں ہاتھ چھوڑ دوں گا پھر بھی تم جا نہیں سکو گی یہ تم دیکھ چکی ہو۔"

"تم مجھے مارنا کیوں چاہتے ہو؟"

"مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں سوری کہتا ہوں۔ اپنے دل سے خوف نکال دو، میرے پاس آؤ۔"

وہ ڈرتے ڈرتے میرے پاس آئی۔ میں نے بازوؤں میں سمیٹ لیا پھر کہا: "سوری جینا! تم مجھے اتنا بتادو، کیا تمھاری ہنسی کا انداز کبھی بدل جاتا ہے؟ اور کبھی گفتگو کے دوران لہجہ بھی بدل جاتا ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولی: "تم کیسی باتیں پوچھ رہے ہو۔ میں کیسے جان سکتی ہوں کہ میری کون سی بات کب بدل جاتی ہے۔ میں تو پچھلی تمام باتیں بھول چکی ہوں۔"

"لیکن تھوڑی دیر پہلے تمھاری ہنسی بدل گئی تھی۔"

"میں نہیں ہنس رہی تھی تم نے ہنسنے کو کہا تو اپنی ہنسی سُنائی تھی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی لیکن میں نے اُس اجنبی عورت کی ہنسی سنی تھی۔ میں نے پوچھا: "تھوڑی دیر پہلے بولتے بولتے تمھارا لہجہ بدل گیا تھا کیا تم انکار کرو گی؟"

"انکار کروں گی تو تم مجھے مار ڈالو گے۔"

"سچ بولو۔ میں تمھیں کسی حال میں بھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

وہ بولی: "میں اپنی آواز میں بول رہی تھی، میرا لہجہ نہیں بدلا تھا۔ پتا نہیں تم کیوں ایسا سمجھ رہے ہو۔"

میں بُری طرح اُلجھ گیا۔ میں نے اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر اُسے تھپکتے ہوئے کہا: "سو جاؤ، میں ابھی کوئی بات نہیں کروں گا، مجھے خاموشی سے سوچنے دو۔"

میں نے خیال خوانی کے ذریعے اُسے تھپک کر سُلا دیا۔ مجھے بھی نیند آرہی تھی مگر میں بیدار رہ کر سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ عورت اب بھی میرے دماغ میں ہے یا نہیں خواہ مخواہ اس کی موجودگی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ سونیا کا خیال تھا کہ وہ اب کبھی میرے دماغ میں نہیں آئے گی لیکن میں ہی اُسے سوچتا اور محسوس کرتا رہوں گا کیونکہ وہ میرے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے، میرے حواس پر چھا گئی ہے۔

میں سوچ رہا تھا اور اونگھ رہا تھا پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کب نیند غالب آگئی اور میں سو گیا۔

ہاں، میں سو رہا ہوں، گہری نیند سو رہا ہوں۔ نیند میں آدمی بڑبڑاتا ہے مگر ہوش کی باتیں نہیں کرتا۔ جب ہوش کی باتیں نہیں ہو سکتیں تو میں اپنی داستان کیسے سُنا سکتا ہوں؟ یارو! مجھے معاف کرو، میں نیند کے نشے میں ہوں۔

میں ہوش میں ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ میرا سر فرہاد کے بازو پر رکھا ہوا ہے اور میں بڑی آہستگی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی ہوں۔ اس داستان کا ہیرو، ٹیلی پیتھی کا شہنشاہ، طوفانوں کا رُخ پھیر دینے والا فرہاد میری زندگی، میرا مرد سو رہا ہے اِسے سونے دو۔ اس داستان کا کچھ حصّہ میں سنا رہی ہوں۔

شروع کرتی ہوں اُس ربِّ کریم کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

صاحبو! میں شیخ الفارس مرحوم کی بیٹی ہوں۔

ٹیلی پیتھی کے فسوں کار فرہاد علی تیمور کی اس مقبول عام سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے

تاوان

ناہید سلطانہ اختر

عشق کا ایسا رنگ اور ایسا ڈھنگ اہل مشرق ہی کو آتا ہے جس میں جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی امیرزادی کی کتھا ہے جس نے ماں باپ کی مرضی کے آگے سر تو جھکا لیا مگر ناموسِ محبت پر آنچ نہ آنے دی۔ وہ خود خاکستر ہو گئی مگر اُس نے اہلِ دل کو امر بنا دیا۔ ماں باپ کو بیٹی کے ایثار کا بہت بھاری تاوان ادا کرنا پڑا۔

ایسی بازی عشق جس میں مات بھی جیت بن جاتی ہے

Faisal Ahmed

شوکیس میں آراستہ "نگارِ وطن" کے تازہ شمارے کے سرورق پر "تاباں رزاق کی شادی خانہ آبادی" کی شہ سُرخی کے ساتھ چھپی تاباں کی بڑی سی خوب صورت رنگین تصویر پر نظر پڑتے ہی میں دم بخود رہ گیا۔ لحظہ بھر کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن تھم گئی ہو۔ لہو رنگ زرتار عروسی جوڑے میں ملبوس، ستواں ناک کی اُنی پر نتھ، مرمریں گردن میں گلوبند، نازک کلائیوں میں چوڑیاں اور محرابی ماتھے پر ٹیکہ سجائے وہ اپنی بڑی بڑی روشن آنکھیں کھولے بیٹھی تھی۔ زرتار دوپٹے کی اوٹ سے جڑاؤ جھمکے جھانک رہے تھے۔ زیرِ تصویر ایک مستطیل جو کھٹے میں جلی حروف میں لکھا تھا:

"یادگار تقریب کا آنکھوں دیکھا حال۔ (صہ ۱۲ پر)"

میں نے دکان دار سے نگارِ وطن کے تازہ شمارے کی

ایک کاپی طلب کی۔ قیمت ادا کرنا مجھے ایک کارِ گراں محسوس ہوا۔ رسالہ لیتے ہی میں دکان سے باہر نکل آیا۔ وہیں فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر میں نے خاصی بے تابی سے صفحہ بارہ کھولا اور میری آنکھیں زخم خوردہ ہرن کے مانند اُس صفحے کے دائیں جانب اوپر تلے موجود چار تصاویر کا بے تابانہ جائزہ لینے لگیں۔ میں اُس خوش نصیب کو دیکھنا چاہتا تھا جسے تاباں کی ہمسفری کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ میری کور چشمی کہ میں جملہ سیاق و سباق کی موجودگی کے باوجود اُسے نہ پہچان سکا۔ ناچار مجھے ان تصاویر کی بابت حوالہ جاتی اشاروں کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑانا پڑیں۔ سب سے نیچے چھپی تصویر کے بائیں پہلو میں چاروں تصاویر کی بابت اجمالی اشارے موجود تھے۔ اِن اشاروں کی روشنی میں میں نے چاروں تصاویر کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیتے ہوئے اس نصیب وَر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں جس کے آنگن میں وہ تاباں چاند جا اُترا تھا۔

پہلی تصویر میں نکاح پڑھایا جا رہا تھا۔ بھاری تن و توش والے نکاح خواں کے دائیں پہلو میں تاباں نگاہیں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ بائیں جانب رو پہلے بالوں والے ایک بڑے میاں بیٹھے تھے جن کی پیشانی کی لکیریں اور آنکھوں کے نیچے ڈھلکی ہوئی جلد تکان اور اضمحلال کی غماز تھیں۔

دوسری تصویر میں دُلھن کو نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ نکاح خواں کے بائیں جانب بیٹھے بڑے میاں دزدیدہ نظروں سے دُلھن کو نکاح نامے پر دستخط کرتے دیکھ رہے تھے۔

مذکورہ حوالہ جاتی اشاروں کے مطابق تیسری تصویر میں دولھا اور دُولھن کو احباب اور چند معززینِ شہر کے ساتھ بیٹھے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر میں میں تاباں کے ڈیڈی، ممی، اُس کی ایک سہیلی اور دو نامی گرامی معززین کو تو پہچان گیا مگر اپنی کور چشمی کے سبب اس نصیب ور کو پھر بھی نہ پہچان سکا جسے دیکھنے کو میرا دل بے تاب ہوئے جا رہا تھا۔

چوتھی اور آخری تصویر کو میں نے اس حوالے کی روشنی میں دیکھا کہ نو بیاہتا جوڑا آرسی مصحف کے وقت دُولھن کی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ اس تصویر میں دُلھن اور اس کی ہم عمر ہنستی مُسکراتی سکھیوں کے علاوہ وہی رو پہلے بالوں اور ڈھلکے ہوئے چہرے والے بڑے میاں واحد مرد تھے جو تاباں کے بہت قریب بیٹھے تھے۔ اُن کے گلے میں سُرخ پھولوں کا ہار تھا اور خمیدہ شانوں پر سُرخ زرتار دوپٹے کا دایاں پلو پھیلا ہوا تھا۔ دوپٹے کا بایاں پلو تاباں کے شانے پر دراز تھا۔ تاباں اپنے دونوں ہاتھ پہلو بہ پہلو جوڑے اوک بنائے بیٹھی تھی۔ اس اوک میں گلاب کی پنکھڑیاں بھری تھیں اور تاباں کے رُوبرُو بیٹھی ایک خاتون بیضوی طشت سے مٹھی بھر گلاب کی پنکھڑیاں لے کر رو پہلے بالوں والے بڑے میاں کے ہاتھوں کی اوک میں ڈال رہی تھیں۔

مجھے یُوں لگا جیسے اب کی بار میرے دل کی تھمی ہوئی دھڑکن دوبارہ جاری نہیں ہو گی اور میری آنکھوں کے سامنے چھا جانے والا اندھیرا اب کبھی نہیں چھٹے گا۔ ایک ناقابلِ بیاں دکھ میرے دل کو اپنی مٹھی میں دبوچے لے جا رہا تھا۔ پردیس میں اتنی بے بسی اور دل گرفتگی کا احساس مجھے اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے چھائے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں یک بیک روشنی کی ایک کرن اُبھری اور سُرخ چوڑیوں سے آراستہ کلائیوں والے ہاتھوں کی اوک میں گلاب کی مخملیں پنکھڑیاں سمیٹے بیٹھی تاباں کے عقب سے ساون کی ایک ہفت رنگ شام ریگِ ساحل پر بیٹھی اپنی اوک میں متلاشی نگاہوں سے کچھ ڈھونڈتی تاباں میری چشمِ تصوّر میں در آئی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا تھا۔

وہ بڑے جاں فزا انداز میں مسکرائی۔ پل بھر کو میری طرف دیکھا پھر اپنی نگاہیں دوبارہ اپنی ہتھیلیوں پر مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھ رہی ہوں کہ تم کہاں ہو؟“

میں نے اپنی ہتھیلیاں اپنے عقب میں ٹکا کر اپنے سر کو پچھلے رُخ جھکاتے ہوئے مُنہ اوپر کر کے سمندر اور آسمان کو بوس و کنار کرتے دیکھا اور کہا۔ ”وقت ضائع مت کرو۔ تمھارے ہاتھوں کی ریکھاؤں میں کوئی اور ہے۔ ۔ ۔ تم میرے لیے نہیں بنائی گئی ہو۔“

اُس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنا نرم و ملائم ہاتھ میرے مُنہ پر دھر دیا اور اپنی بڑی بڑی روشن اور خوب صورت آنکھوں میں دھیمی سی خفگی اور ہلکی سی ناگواری سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”مجھے صرف اور صرف تمھارے لیے بنایا گیا ہے۔“

”تم فلک کا تارا ہو، تابی اور میں راہ کی دھول۔“

”فلمی مکالمے بولنے کی کوشش مت کرو۔ ۔ ۔ میں تمھارے لیے ہوں۔ تمھارے لیے ہوں۔ صرف اور صرف تمھارے لیے ہوں۔“

’کاش ایسا ممکن ہو۔‘ میں نے جی ہی جی میں سوچا۔

مجھ سا حقیقت پسند آدمی جسے اپنے اور اپنے باس کی ولد جانشین کے سماجی مراتب کے مابین فرق کا بخوبی احساس تھا،

صرف تمنا کر سکتا تھا۔

تاباں، رزاق گروپ آف انڈسٹریز کے مختارِ کل رزاق احمد کی اکلوتی بیٹی تھی۔ رزاق گروپ آف انڈسٹریز، رزاق ٹیکسٹائلز، رزاق کیمیکلز، رزاق سرامکس اور رزاق فوڈز جیسے مشہور و معروف صنعتی اداروں پر مشتمل ایک مستحکم صنعتی تنظیم تھی جس کی ملکی صنعت میں بڑی اچھی ساکھ تھی۔ رزاق احمد کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تاباں کے نام کا سکہ یوں تو مذکورہ چاروں صنعتی اداروں میں چلتا تھا مگر رزاق سرامکس کا ملا اسی کے زیرِ انتظام تھا۔ وہ رزاق سرامکس کی مینجنگ ڈائریکٹر تھی جبکہ میں رزاق سرامکس کا مارکیٹنگ منیجر ہوا کرتا تھا۔

تاباں اور میں کامرس کالج میں ہم جماعت رہے تھے۔ انٹر کامرس کے بعد اُس نے امریکا کی ایک جامعہ میں داخلہ لے لیا تھا اور ایم بی اے کرنے کے ارادے سے بیرونِ ملک چلی گئی تھی جبکہ میں اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر مقامی جامعہ کا طالب علم بن گیا تھا۔ آنرز کے بعد میں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز ڈگری لی۔ کچھ عرصے ایک نیم سرکاری ادارے سے وابستہ رہا۔ تقریباً ڈھائی برس بسلسلۂ ملازمت گویا شہر بدر رہا۔ پھر اس شہر بدری اور اپنوں بالخصوص ماں سے دُوری کا زہراب گھونٹ گھونٹ پیے جانے سے عاجز ہو کر اس ملازمت کو خیر باد کہہ کر اپنے شہر واپس لوٹ آیا۔ نئی ملازمت کی تلاش میں تھا کہ ایک روز تاباں سے کئی برس بعد اس طور آمنا سامنا ہو گیا کہ وہ رزاق سرامکس کی مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت میں ایک آراستہ و پیراستہ دفتر میں ریوالونگ چیئر پر متمکن تھی اور میں اسی دفتر میں اُس کے اور بورڈ کے ارکان کے سامنے اُمیدوارِ ملازمت کے روپ میں بیٹھا تھا۔

مجھے رزاق سرامکس کے مارکیٹنگ منیجر کے طور پر منتخب کر کے نہایت اطمینان بخش مشاہرے اور دل کش مراعات پر ملازم رکھ لیا گیا۔ تاباں، جو ماضی میں میری ہم جماعت رہی تھی، اب میری باس بن چکی تھی اور میں اُس کا ماتحت اور ملازم قرار پا گیا تھا۔ اطمینان بخش مشاہرے اور دل کش مراعات سے زیادہ خوشی مجھے اس امر کی تھی کہ مذکورہ نئی ملازمت مجھے والدین اور بہنوں کے نزدیک رہنے کا موقع فراہم کر رہی تھی۔

سماجی اعتبار سے میں متوسّط گھرانے کا نوجوان تھا۔ والد ایک سرکاری محکمے میں افسر تھے۔ میں والدین کی واحد اولادِ نرینہ تھا۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں۔ گو ہمارے وسائل محدود تھے مگر ہمارا مختصر کنبہ کم سے کم خوش حال گھرانے کی چلتی پھرتی تفسیر تھا۔

استاد

نے شاگرد سے ناراض ہو کر کہا۔ ”تم حساب میں بہت کمزور ہو اور بہت غلطیاں کرتے ہو۔ ہر سوال کو دس مرتبہ جوڑ کر دیکھ لیا کرو۔“

بچّے نے استاد سے سوال حل کرنے کی اجازت لی۔ اور تھوڑی دیر بعد کاپی لے کر آیا۔

استاد نے پوچھا۔ ”کہو، تم نے دس مرتبہ جوڑ کر دیکھ لیا؟“

بچّے نے کہا۔ ”جی ہاں، یہ دیکھیے، اس سوال کے دس جواب حاضر ہیں۔“

——— اُمِّ رباب جعفری کا عطیہ

ہر باپ کی طرح میرے والد صاحب بھی مجھے زندگی کے عملی میدان میں سرخرو اور سربلند دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کے تجربۂ حیات نے اُنھیں جو کچھ سکھایا تھا اُس کے پیشِ نظر انھوں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود مجھے تحصیلِ علم کے بہترین مواقع فراہم کرنے کی کوشش کی اور تحصیلِ علم کے بعد مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کے بجائے مجھے اپنی پسند کا راستہ منتخب کرنے کا اختیار دیا۔ اسی اختیار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے تقریباً ڈھائی برس ایک نیم سرکاری ادارے کی نوکری کی پھر رزاق سرامکس میں ملازمت اختیار کر لی جو قطعاً نجی ادارہ تھا مگر اس نے مجھے دل کش شرائطِ ملازمت پیش کی تھیں۔

رزاق سرامکس کی ملازمت اختیار کرنے سے قبل تاباں سے میں سابقہ ہم جماعت کی حیثیت سے واقف تھا اور بس۔ کالج کے دو برسوں میں ہمارے مابین بہت رسمی سے تعلقات رہے تھے۔ نوٹس دینے اور لینے یا کسی ضروری کام کی حد تک۔ میں اپنی جماعت کا لائق ترین طالب علم سمجھا جاتا تھا اور وہ ایک مغرور امیر زادی کے طور پر مشہور تھی۔ ہم جماعت لڑکیوں میں سے اُس کی ایک دو لڑکیوں سے دوستی تھی۔ لڑکوں میں وہ کسی کو قابلِ التفات نہ گردانتی تھی۔ مجھ سے بھی رسمی سیلو ہائے تھی اور وہ بھی اس لیے کہ اکثر اُسے مجھ سے نوٹس مستعار لینے کی ضرورت در پیش آتی رہتی تھی۔ یہ رسمی مراسم سالِ دوم کے سالانہ امتحانات کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہو گئے تھے۔ نتیجے کے بعد اپنے ایک ہم جماعت کی زبانی مجھے تاباں کے حصولِ علم کے لیے امریکا جانے کی خبر ملی تھی اور اس خبر سے مجھے نہ خوشی ہوئی تھی اور نہ دُکھ البتہ تاباں کے مقدّر پر رشک ضرور آیا تھا کہ دوسرے درجے کی طالبہ ہونے کے باوجود اپنے وسائل کے بل بوتے پر ایک

ہی حیثیت میں وہاں جا بیٹھی تھی جہاں ہم جیسوں کا پہنچنا ناممکن نہیں تو کارِگراں ضرور ہوا کرتا ہے۔

رزاق سرامکس کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد میرے اور تاباں کے مابین کچھ عرصے خاصے مودبانہ روابط رہے لیکن تاباں کی حوصلہ افزائی سے ان روابط نے بتدریج بے تکلفی کی صورت اختیار کرلی۔ رزاق سرامکس میں میری حیثیت روز بروز اہم سے اہم تر ہوتی چلی گئی۔ تاباں مجھے اپنا ماتحت اور ملازم گردانے کے بجائے دوست اور مشیرِ خاص کا درجہ دینے لگی اور پھر ایک وقت آیا کہ جب وہ ازخود میرے اس قدر نزدیک ہوگئی کہ مجھے دفتر کے علاوہ بھی اپنے فارغ اوقات میں بصد اصرار اپنے ہمراہ رہنے پر مجبور کرنے لگی۔ ہماری شامیں اکٹھی گزرنے لگیں اور اُس نے اشاروں کنایوں میں مجھ پر یہ واضح کرنا شروع کر دیا کہ وہ زندگی کے سفر میں مجھے اپنا رفیقِ سفر بنا لینے کی خواہاں ہے ویسے اشاروں کنایوں کی ترکیب تو میں نے تکلفاً استعمال کر ڈالی ورنہ امرِ واقع یہ ہے کہ متوسط طبقے کی پڑھی لکھی اور روشن خیال دوشیزاؤں کے حسابوں تو اُس کے اشارے کنایوں میں بھی خاصی بے محابگی تھی۔ مثلاً ایک شام جیم خانے کے ایک خاموش گوشے میں اُس نے مجھ سے کہا۔ "وقار! کیا تم ساری زندگی میرے ساتھ گزار سکتے ہو؟"

"کس جُرم کی پاداش میں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"اس جُرم کی پاداش میں کہ تم بہت اچھے ہو۔" اُس نے لحظ بھر کو توقف کیا پھر بڑے مزے سے بولی۔ "آئی لو یو وقار۔"

میں کٹر ہونے حد تک حقیقت پسند آدمی نہ ہوتا تو تاباں جیسی خوش جمال، دلرُبا اور دولت مند حسینہ کی زبان سے اپنے لیے یہ جملہ سُن کر خوشی سے دیوانہ ہوگیا ہوتا مگر مجھے اس کے اور اپنے سماجی مراتب کے مابین فرق کا بخوبی احساس تھا سو میں نے کہا۔ "تھینک یو ویری مچ۔"

"یعنی تم راضی ہو؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم غلط سمجھی ہو۔ شکریہ تو میں اس بات کا ادا کر رہا ہوں کہ تم میرے بارے میں اچھی رائے رکھتی ہو۔"

"یعنی شکریہ ادا کرنے پر ٹال رہے ہو، شادی کا وعدہ نہیں کر رہے ہو۔" وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ بولی۔

"ہمارے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے تابی۔" میں نے سچائی بیان کر دینے میں تردّد سے کام نہیں لیا۔

"کوئی فرق نہیں ہے۔" وہ میری بیان کردہ صداقت کو یکسر مسترد کرتے ہوئے بولی۔ پھر اُس نے کہا۔ "ہم دونوں انسان ہیں اور بس۔"

"ہاں مگر دو مختلف دنیاؤں کے۔" میں نے رسان سے کہا۔ "تم سونے کا چمچہ مُنہ میں لے کر پیدا ہونے والوں کی دنیا سے تعلق رکھتی ہو جبکہ میں . . . تمھارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔"

"دیکھو۔" اُس نے سرفروشانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "اگر تم میرے اس پیدائشی عیب کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہو تو میں ایک پل میں سونے کے اس چمچے کو اپنے مُنہ سے نکال پھینکنے کو تیار ہوں۔"

"پھر باقی زندگی اس کی تلاش میں سرگرداں رہوگی۔" میں نے طنزاً کہا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ فیصلہ کُن انداز میں بولی۔ "تم آزما کر دیکھو تو سہی۔"

اپنی حقیقت پسندی کے سبب میں بہت دنوں اپنے اس مؤقف پر ڈٹا رہا کہ تاباں کا اور میرا کوئی جوڑ نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہر جذبے، ہر دعوے کی ایک عمر ہوتی ہے اور اپنی طبعی عمر کو پہنچنے پر ہر جذبے کی حدّت برودت میں بدل جاتی ہے۔ ہر دعوے کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ محل نما گھر میں رہنے اور شاہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرنے والی تاباں میرے چھوٹے سے گھر میں مطمئن اور مسرور نہ رہ سکے گی جو میرے حسابوں تو خاصا آرام دہ تھا مگر تاباں کے سماجی مرتبے کے اعتبار سے خاصا ہیچ تھا۔

بہت دنوں میں اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا پھر تاباں کی مستقل مزاجی نے میرے جی کو برمانا اور میری حقیقت پسندی کو پگھلانا شروع کر دیا اور بالآخر میں اُس کے استقلال کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ تاباں کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"بس مجھے تمھارے راضی ہونے کا انتظار تھا۔ میں جلد ہی ممی ڈیڈی سے بات کروں گی۔"

میں تلخی سے ہنس دیا۔

"ایسے کیوں ہنسے ہو؟" اُس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"کیونکہ گنگا کو اُلٹی بہتے دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مردانہ مکالمے کی تانیث سُن رہا ہوں۔"

"جناب!" اُس نے مجھے تنبیہی تیوروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تسلیم کہ دنیا آپ مردوں ہی کی ہے مگر کبھی تو ہمارا بھی جی چاہتا ہے پہل کرنے کو۔"

تاباں کو یقین تھا کہ اُس کے والدین اُس کی خوشی کو اپنے سرآنکھوں پر جگہ دیں گے اور اپنی زندگی کی بابت اُس نے جو فیصلہ کیا تھا اُسے بصد خوشی تسلیم کریں گے۔

اُس کے اس ایقان کو ٹھیس نہیں پہنچی۔

ظاہراً اُس کے والدین نے اُس کے فیصلے کو تسلیم کر لینے میں کوئی تردّد نہیں کیا مگر درپردہ انھوں نے اُس کے اس فیصلے کو بڑی خوب صورتی سے مسترد کر دیا۔

تاباں کو یہ تاثر دیتے ہوئے کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے قبل وہ مجھے قطعاً خود مختار حیثیت میں مستحکم کر دینا چاہتے تھے انھوں نے میرا تبادلہ رزاق سرامکس سے رزاق فوڈز میں نسبتاً اعلیٰ تر منصب پر کر دیا۔

چند ماہ بڑے اطمینان سے گزرے پھر ایک روز رزاق احمد نے مجھے 'رزاق گروپ آف انڈسٹریز' کے مرکزی دفتر میں طلب فرمایا اور بڑے دھیمے لہجے میں بولے۔ "وقار صاحب! تاباں ہماری زندگی کی سب سے بڑی اُمید اور ہماری خوشیوں کا مرکز ہے۔ ہم نے ہمیشہ اس کی ہر خواہش کو سرآنکھوں پر جگہ دی ہے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں تاباں نے جو فیصلہ کیا ہے مجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں مگر . . . اُس کی ماں اُس کے اس فیصلے سے متفق نہیں اگرچہ تاباں کی ضدی اور خودسر طبیعت کے سبب بظاہر اُس نے بھی اتفاق ظاہر کیا ہے مگر درحقیقت وہ تاباں کی شادی اپنے سگے بھتیجے سے کرنے کی خواہش مند ہے اور اس سلسلے میں اُس نے اپنے بھائی کو زبان بھی دے رکھی ہے۔ مجھے بھی اُس کے اس فیصلے سے کوئی اختلاف نہ تھا کیونکہ لڑکا ہینڈسم، ایجوکیٹڈ اور ویل سیٹ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنا ہے اور بلحاظ اسٹیٹس تاباں اور اُس کے درمیان زیادہ فرق نہیں۔ تاباں اگر رزاق گروپ آف انڈسٹریز کی جانشین ہے تو وہ بھی ایک صنعت کار باپ کا بیٹا ہے۔ اگرچہ تاباں سے ہم نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی کیونکہ اس کی ممی کا خیال تھا کہ جب وقت آئے گا تو بات کر لیں گے مگر تاباں اور اُس کے کزن کے درمیان جو گہری ذہنی ہم آہنگی ہے اس کے پیشِ نظر ہمیں یقین تھا کہ وہ بزرگوں کے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کرے گی مگر درمیان میں آپ آگئے اور تاباں نے ہمارا فیصلہ سُننے کے بجائے ہمیں اپنا فیصلہ سُنا ڈالا۔ مجھے جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے کہا، تاباں کے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کوئی تردّد نہیں بلکہ اُس کی خوشی

"کیا وہ مجھ سے 'بھی' عشق کر رہے ہیں؟"
لفظ 'بھی' مجھے کسی کھائی میں پھینک گیا۔ اُف میری یہ اوقات کہ خاندان بھر کا گیا گذرا بندہ میری تمنا کرے
"وہ جسے کوئی نظر بھر کر نہ دیکھے اُسے میں اپنے ماتھے کا جھومر بنا لوں"
یہ تذلیل تھی میری ذات کی
یہ سراسر توہین تھی میرے حُسن کی۔
اُن کے خیالات بھانپ کر میں اپنی نظروں میں آپ ہی گر گئی

"چاندنی! تم بہت جھوٹی ہو، بے حد جھوٹی۔" وہ اپنی گہری آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں ایسا کون سا سچ اپنے من میں دابے بیٹھی ہوں جو وہ مجھ سے اُگلوانا چاہتے ہیں۔

۔ میرے سر آنکھوں پر مگر۔ ۔ ۔ اُس کی ماں جو اپنے بھائی کو زبان دے بیٹھی ہے، خاصی پریشان ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ تاباں کی ضدی طبیعت کے پیشِ نظر اُس سے تو اس سلسلے میں بات نہیں کرسکتی لیکن اگر تاباں کی شادی اُس کے بھتیجے کے علاوہ کسی اور سے ہوئی تو وہ خود کو شوٹ کرلے گی۔" رزاق احمد نے کچھ دیر توقف کیا پھر رقّت آمیز لہجے میں بولے۔ "وقار صاحب! میں اپنے مختصر سے گھرانے کو اس وقت ایک بڑی تباہی کے دہانے پر کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ تاباں کو آج تک اُس کے کسی ارادے سے باز رکھنا میرے اور اُس کی ماں کے لیے ممکن نہیں رہا۔ تاباں کی ممی کو اُس کے اِس فیصلے سے اس قدر صدمہ پہنچا ہے کہ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر تاباں کی شادی اُس کے ماموں زاد سے نہ ہوئی تو تاباں کی ماں واقعتاً اپنی جان دینے سے بھی گریز نہ کرے گی۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ ۔" رزاق صاحب نے دوبارہ کچھ دیر کو توقف کیا پھر بولے۔ "اب میرے گھر کو صرف اور صرف آپ ہی تباہی سے بچا سکتے ہیں۔"

"میں؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"ہاں، اگر آپ تاباں سے شادی سے انکار کردیں تو ہم تباہ ہونے سے بچ سکتے ہیں۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

بجا کہ مجھے اپنے اور تاباں کے سماجی مراتب کے درمیان واضح فرق کا بخوبی احساس تھا اور میں اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کافی عرصے تک تاباں کے التفات سے گریزاں بھی رہا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ بظاہر اس پہلو تہی کے باوجود میرا دل تاباں کی چاہت کا اسیر تھا اور تاباں کے سامنے ایک مرتبہ اس اسیری کا اعتراف کرلینے کے بعد فرار کی گویا ہر راہ مسدود ہوچکی تھی۔

لیکن رزاق احمد نے کچھ اس طور میرا گھیراؤ کیا کہ مجھے بے دست و پا کرکے رکھ دیا۔ رزاق احمد جیسے دبنگ، دولت مند اور زمانے کو اپنی ٹھوکر پر رکھنے والے صنعت کار کو یوں گڑگڑاتے دیکھ کر میرا دل پسیج گیا۔

"وقار احسن!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "تم اِس وقت ایک دوراہے پر کھڑے ہو۔ کبھی کبھی محبت اپنی سرخروئی اور سربلندی کے لیے اسی طرح قربانی طلب کیا کرتی ہے۔ تمھاری نسبت تاباں کے والدین کو اپنی خوشیوں کی بقا کے لیے اِس کی تم سے بڑھ کر ضرورت ہے بہتر یہی ہے کہ تم فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تاباں کے خیال سے دستبردار ہوجاؤ۔"

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اپنے آنسوؤں کو دل میں اُتار لیا۔ بہتر ملازمت مل جانے کا ڈھونگ رچا کر رزاق گروپ آف انڈسٹریز کی دل کش مشاہرے اور بہترین مراعات والی نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ تاباں میرے اس طرزِ عمل پر پہلے حیران ہوئی پھر پریشان۔ اُس نے مجھے سمجھایا بجھایا پھر منت سماجت کی مگر اُس کا سمجھانا بجھانا اور منت سماجت مجھے میرے اس فیصلے سے باز نہ رکھ سکے جو اُس سے میرے ترکِ تعلق کا ایک محض بہانہ تھا۔ میں نے بظاہر رزاق گروپ کو خیرباد کہا تھا مگر درحقیقت میں نے تاباں سے بھی اپنا تعلق توڑ لیا تھا۔ وہ بے تابانہ میرے پیچھے دوڑی ہوئی آئی مگر میری سرد مہری اور بے اعتنائی نے اُسے مایوس لوٹایا۔

اُن مایوس اور تنہا شاموں کی یاد مجھے آج بھی دل گرفتہ کر دیتی ہے۔ کس قدر شکستہ دل محسوس کیا تھا اُن دنوں میں نے خود کو۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے شہر اُجڑ گیا تھا۔ ساحل ویران ہو گیا تھا۔ فضائیں مغموم تھیں۔ پھولوں سے خوشبو کافور ہوگئی تھی۔ چاند ستارے بجھ گئے تھے۔ دیارِ دل اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔

تاباں کی بابت مجھے مختلف ذرائع سے کچھ اِس نوعیت کی خبریں ملیں کہ وہ اعصابی تناؤ اور وحشت کا شکار ہو رہی تھی۔ ایک شام جب میں اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی یادوں کو سینے سے لگائے ساحل پر پہنچا تو میں نے دیکھا وہ مغرب کی سمت سُرخ کیے سورج کو سمندر میں اُترتے دیکھ رہی تھی اور سمندر اس کی آنکھوں میں اُترا ہوا تھا!

اس وحشت، تنہائی اور دیارِ دل میں پھیل جانے والے اندھیرے سے گھبرا کر میں نے دیارِ غیر میں ملازمت اختیار کی اور اپنے تئیں تاباں سے اتنی دُور نکل آنے کی کوشش کی کہ اس کی وحشتوں اور یاسیت کی خبریں مجھ تک نہ پہنچ سکیں مگر ہزاروں میل دُور چلے آنے کے بعد مجھ پر عقدہ کھُلا کہ تاباں تو اپنی یادوں کی صورت میں میرے ساتھ چلی آئی تھی۔

دامانِ دل کو کسی کی یادوں سے چھُڑا لینے کے لیے تین ساڑھے تین برس کوئی معمولی مدّت نہیں ہوتی۔ میں نے تاباں کو بھُلا دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میری کوشش نے میرا مُنہ چڑایا۔ اَنگ اَنگ میں بس جانے والوں کے خیال سے دامنِ دل کو چھڑانے کے لیے تو ساڑھے تین صدیاں بھی ناکافی ہوتی ہیں۔ تاباں کو بھُلا دینا بھی میرے لیے ممکن نہ ہوسکا کیونکہ وہ میرے نفس نفس میں بس چکی تھی۔

تیسری مرتبہ جب میں سالانہ تعطیلات گزارنے کے لیے دیارِ غیر سے کوئے یار لوٹا تو ایک روز رزاق احمد سے اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ میرا خیال تھا وہ خوش ہوں گے اور مطمئن بھی کہ تاباں کی شادی اُس کے عم زاد سے ہوچکی ہوگی اور وہ ایک دو بچوں کی ماں بنی ایک پرسکون اور خوش و خرّم ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہوگی مگر میرا اندازہ خیالِ خام نکلا۔ رزاق احمد نے مجھے بتایا کہ وہ اور اُن کی اہلیہ کوششِ بسیار کے باوجود تاباں کو شادی کے لیے آمادہ نہ کرپائے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ میں جلد یا بدیر واپس ضرور لوٹوں گا اور اپنے اس ایقان کے سبب وہ میری منتظر تھی۔ رزاق احمد نے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ اس وقت تک شادی پر آمادہ نہ ہوگی جب تک اُسے یہ یقین نہ ہوجائے کہ آپ کہیں اور شادی کرچکے ہیں۔" رزاق صاحب نے توقف کیا پھر بولے۔ "وقار صاحب! بس یوں سمجھیے کہ تاباں کی نسبت ہماری خوشیاں آپ کی شادی کے ساتھ مشروط ہوگئی ہیں۔"

ایک گھٹی گھٹی سرد آہ کے دباؤ سے میرا سینہ پھٹنے سا لگا۔ رزاق احمد نہیں جانتے تھے کہ وہ اشاروں کنایوں میں جو بات کہہ رہے تھے وہ عملاً کتنی گراں تھی۔ میں تاباں سے ترکِ تعلق ضرور کرچکا تھا مگر وہ میرے نفس نفس میں بسی تھی۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کم از کم اس وقت تک تو ہرگز نہیں جب تک میرے قلب و روح پر رقصاں تاباں سے وابستہ یادوں کی پرچھائیاں معدوم نہ ہوجاتیں مگر زندگی ہمیشہ اسی طور نہیں گزاری جاسکتی جس طور ہم چاہتے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی راستے بدلنے پڑ جاتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تاباں سے ترکِ تعلق کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ مجھے خود اپنے آپ سے عہد شکنی کرکے تاباں کے مستقبل اور اُس کے والدین کی خوشیوں کی خاطر شادی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ نہ صرف یہ بلکہ تاباں کو اپنی شادی کی خبر بہم پہنچانے کی خاطر اس انگریزی جریدے میں بھی اپنی شادی کی تصویر چھپوا دی جن کے تاباں کی میز پر پہنچنے کا یقینِ واثق تھا۔

شادی کے بعد میرے روز و شب بدل گئے۔ مہناز میری شریکِ زندگی ایک مثالی عورت ثابت ہوئی۔ اس کی محبت اور ریاضت نے مجھے یوں اپنا اسیر کیا کہ میرے دل کے نہاں خانوں میں پنہاں تاباں کی یادوں کی پرچھائیاں معدوم کرکے رکھ دیں۔ مہناز کی بے پایاں چاہت کے حصار نے مجھے یوں مقید کیا کہ تاباں ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گئی۔ وقت سے بڑا آمر اور جابر دوسرا کوئی نہیں کہ

مشہور مُوجد ٹامس ایڈلیسن دعوتوں میں جانے سے بہت گھبراتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک دعوت میں پھنس گیا تو فرار کا راستہ تلاش کرنے لگا تاکہ وہ اپنی تجربہ گاہ میں پہنچ کر اپنے تجربات مکمل کرسکے۔

وہ دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ دعوت کے میزبان کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ خوش دلی سے مسکراتا ہوا ایڈلیسن کے پاس پہنچا اور بولا۔

"جناب، آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ میری دعوت میں تشریف لائے۔" پھر کچھ توقف سے بولا۔ "ویسے ان دنوں آپ کس مسئلے پر غور کر رہے ہیں؟"

"اس مسئلے پر کہ میں اس دعوت سے کیسے فرار اختیار کروں۔" ایڈلیسن نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

کراچی سے احمد علی صدیقی کی ڈاک

وقت کا بے رحم ہاتھ ہمارے ہر دعوے کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے۔

چار پانچ برس اور بیت گئے۔ بلال اور گلنار کی اس دنیا میں آمد نے میری زندگی کو فزوں تر کر دیا تھا۔ زندگی پلکوں تلے ٹھہرا ایک دلفروز خواب بن گئی تھی۔ مجھے تاباں کا خیال کبھی آتا بھی تو کچھ اس طور جیسے کوئی حسین سپنا دیکھتے دیکھتے نیم خوابی کے عالم میں پل بھر کو آنکھ کھلے اور پھر آنکھیں بند کرلینے پر سلسلۂ خواب وہیں سے شروع ہوجائے۔ برس کے برس سالانہ تعطیلات میں اَن گنت غریب الوطنوں کی طرح میں بھی وطن آتا جاتا رہا مگر نہ تو رزاق احمد سے ملنا ہوا اور نہ تاباں کے بارے میں کوئی خبر ملی۔ اس کے بارے میں خبر نہ ملنے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ وہ کہاں تھی؟ کیا کر رہی تھی؟ میری شادی کا اُس پر کیا ردِعمل ہوا تھا، اور اپنی شادی کے بعد وہ کیسی گزار رہی تھی؟

مگر پھر ایک روز وطن سے ہزاروں میل دُور نگارِ وطن میں تاباں کی شادی کی تصویروں نے بند زخموں کے مُنہ کھول دیے۔ میں تو اس گمان میں تھا کہ اپنے محبوب جریدے میں میری اور مہناز کی تصویرِ عروسی دیکھ کر اُس نے مجھ پر دو حرف بھیجنے کے بعد اپنے عم زاد سے شادی پر آمادگی ظاہر کردی ہوگی اور پُرمسرت ازدواجی زندگی گزار رہی ہوگی مگر۔ ۔ ۔

لہو رنگ زرتار عروسی جوڑے میں وہ قیامت خیز حد تک دلربا نظر آرہی تھی۔ اُس کا چہرہ آج بھی گل نورستہ کی کھلی

تفسیر تھا اور آنکھیں اتنی ہی روشن۔ اس کے رخساروں کی دلکش ڈھلانیں آج بھی للکارتی محسوس ہوتی تھیں۔ اُس کے لبوں پر ویسی ہی جانفزا مسکان تھی۔ وہ آج بھی ویسی ہی دلکش تھی مگر اس کے پہلو میں سفید بالوں والے مضمحل بوڑھے کو دولہا کے روپ میں دیکھنا میرے لیے ایک ایسا عذاب گراں تھا کہ اس بے جوڑ شادی کا پس منظر جاننے کے لیے میں نے اُسی روز رزاق احمد کو ٹرنک کال کی۔

"آپ تو جانتے ہیں وقار صاحب! تاباں کیسی ضدی طبیعت رکھتی ہے۔" رزاق احمد کی دُکھ اور پچھتاوؤں میں ڈوبی آواز ہزاروں میل دور سے مجھ تک پہنچی۔ "میرا اور اُس کی ممی کا خیال تھا کہ آپ کے شادی کر لینے کے بعد وہ آپ کا خیال چھوڑ دے گی اور ہماری رضا میں راضی ہو جائے گی کیونکہ اور کسی جانب ہم نے اُس کا رجحان دیکھا ہی نہیں تھا مگر . . . اس نے ہمیں قطعاً مایوس کر دیا۔ بالآخر اُس کے کزن نے خاندان ہی کی ایک اور لڑکی سے شادی کر لی۔ کیونکہ وہ آخر کب تک انتظار کر سکتا تھا۔ میں اور تاباں کی ممی اُسے کسی اور کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور کرتے رہے کیونکہ یہ ہماری فطری خواہش تھی۔ گزشتہ ماہ اس کی ممی پر یک بیک دل کا دورہ پڑا۔ حالت میں قدرے افاقہ ہونے پر جب انھوں نے بسترِ علالت پر لیٹے ہوئے تاباں کو شادی پر مجبور کرنے کے لیے اپنی جان کی قسم دی تو اُس نے گھٹنے ٹیک دیے مگر فیصلہ اس بوڑھے اور بے نوا شاعر کے حق میں دیا جسے خطیر معاوضہ ادا کر کے تاباں نے 'گئی رُتوں کے نام' سے نظموں پر مشتمل ایک ایسی منظوم داستانِ محبت ترتیب دلوائی ہے، جس کی اشاعت کی ادبی اور عوامی حلقوں میں بے نظیر پذیرائی ہوئی ہے۔"

"اور آپ نے تاباں کو اجازت دے دی؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

رزاق احمد نے ایک سرد آہ کھینچی اور بولے۔ "وقار صاحب! اجازت کیا دی بس یہ سمجھیے کہ اپنی ایک غلطی کا ایسا تاوان ادا کیا کہ احساسِ زیاں نوکِ خنجر کی صورت ہمارے دل میں اُتر گیا ہے۔ ہم نے اپنی اَنا اور اُن کی خاطر اُس کے اور آپ کے بیچ آنے کی کوشش کی اور خود مارے گئے۔ تاباں نے ہم سے بہت بھاری تاوان وصول کیا وقار صاحب!"

"وہ خود بھی تو صلیب پر چڑھ گئی۔" میری آواز بھیگ رہی تھی۔

"ہاں۔" رزاق احمد کی آواز مجھے اُفق پار سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"تاباں کی اور اُس شخص کی عمروں میں تو زمین آسمان کا تفاوت ہے رزاق صاحب!" میں نے بہت دُکھ سے کہا۔

"بالکل۔" رزاق احمد نے تائید کی پھر بولے۔ "بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ چار شادی شدہ بیٹیوں کا باپ اور نواسے نواسیوں والا شخص ہے۔ تاباں اُس کی سب سے چھوٹی بیٹی کی ہم عمر ہو گی۔"

"اُس بوڑھے کو تاباں سے شادی کرتے ہوئے شرم نہ آئی؟" میں نے کہا۔

رزاق صاحب آہستہ سے یوں ہنسے جیسے میں نے کوئی حد درجے احمقانہ بات کہہ دی ہو پھر بولے۔ "وقار صاحب! کون احمق تاباں جیسی لڑکی سے شادی کرنے سے انکاری ہو سکتا ہے؟"

میرے دل میں میخ سی اُترتی چلی گئی۔

ہاں میں واقعی احمق تھا!

'نگارِ وطن' کا تازہ شمارہ میرے سامنے کھلا پڑا ہے نمائندۂ خصوصی کے حوالے سے تاباں کی شادی کی روداد کا متن یہ ہے کہ ملک بھر میں فقط 'نگارِ وطن' کو ملک کے مشہور و معروف صنعت کار رزاق احمد کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال اور تصاویر چھاپنے کا اعزاز حاصل ہو سکا ہے ورنہ اس تقریب میں اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کا داخلہ یکسر ممنوع تھا۔

تاباں نے تاوان محض اپنے والدین ہی سے وصول نہیں کیا مجھ سے بھی کیا ہے۔ وہ سفید بالوں والے اس مضمحل بوڑھے سے خاموشی اور سادگی سے بھی شادی کر سکتی تھی مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے اپنی شادی کی روداد مع تصاویر ایک ایسے جریدے میں بطورِ خاص چھپوائی ہیں جو دیارِ غیر میں اپنے دُکھ کا زہر آب پینے والے غریب الوطنوں اور وطنِ عزیز کے مابین فاصلوں کو قربتوں میں بدل دینے کا نقیب اور علمبردار ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ 'نگارِ وطن' میں یہ تصاویر تاباں نے فقط اسی لیے چھپوائی ہیں کہ میں انھیں دیکھ لوں۔

تاباں کی اوک گلاب کی سُرخ پنکھڑیوں سے بھری ہوئی ہے اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں مجھ پر جمی ہیں۔ اُس کے لب بند ہیں مگر اس کی آنکھیں مجھے یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔

'یہ کیا ہو گیا وقار! یہ پھول تو تمھارے لیے تھے!'

'تاباں جیتے جی مر گئی ہے'

زندہ تو شاید اب میں بھی نہیں رہا!

Faisal Ahmed

مصنف کی سادگی و پُرکاری کا دلچسپ امتزاج

جڑواں عشق

جڑواں بہنوں کی ایک ایسی حکایت جو شروع سے آخر تک عقدۂ دُشوار رہی۔ اس کہانی کے دیگر کردار قابلِ رحم بھی ہیں اور قابلِ محبت بھی۔ بہت دلچسپ بہت حیران کُن۔

کلیم ظفر

آدمی سال کے گیارہ مہینے وطن سے دور رہ کر گزارے تو بارہویں مہینے میں رونما ہونے والے واقعات میں خود کو شامل کیسے تصور کر سکتا ہے! ایسے میں سب کچھ غیر حقیقی لگتا ہے، جیسے ٹی وی کی کوئی سیریل ہو، جس میں ایک کردار ایک قسط میں اداکاری کرنے کے بعد غائب ہو جائے اور اچانک پانچ چھ قسطوں کے بعد پھر نمودار ہو۔

میں بھی کیا کر سکتا تھا... کیا کرتا؟ میں نے جولی سے وعدہ کر لیا تھا۔ کیا پتا، جولی سے نہیں، اینا سے کیا ہو۔ بہرحال میں نے ان دونوں میں سے کسی ایک سے وعدہ کیا ضرور تھا۔

کچھ یوں بھی ہے کہ لندن میں میرا بارہواں مہینہ بڑی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ میرا ایڈیٹر جو اپنے اسٹاف کو ڈسپلن پڑھانے کے معاملے میں لاجواب ہے، اخبار کے غیر ملکی نمائندوں کو اُن دنوں ڈسپلن پڑھانے پر کچھ زیادہ ہی زور دیتا ہے، جب وہ اس کی رینج میں ہوں۔ قدرتی بات ہے، میں فرانس میں ہوں تو وہ مجھے کنٹرول نہیں کر سکتا لیکن میں لندن میں ہوں تو خاص طور پر سال بھر کی کسر پوری کر لیتا ہے۔ وہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ ہمارے قارئین یعنی میرے ہم وطن کس انداز میں سوچتے اور کیسے بولتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ گیارہ ماہ پردیس میں گزارنے کی وجہ سے میں اپنی مادری زبان بھولتا جا رہا ہوں۔ جبکہ میرے نزدیک وطن میں گزرنے والا وہ ایک مہینہ تعطیلات کی حیثیت رکھتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں اس کھیل میں ریفری کا... یا ریزرو کھلاڑی کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ کم از کم میرا تو یہی خیال تھا۔

آپ اسے عُذرِ گناہ سمجھیں گے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ مجھے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ وہ پورا سیٹ اَپ قانونی اعتبار سے بھی غلط تھا اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں۔ یہ خیال کہ اگر وہ جڑواں بہنیں اتنی زیادہ پُرکشش نہ ہوتیں تو شاید میں اس طرح نہ بہکتا... شاید غلطی سے بچ جاتا، میری شرمندگی اور بڑھا دیتا ہے۔

دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی اس بات کا علم شروع ہی میں ہو گیا تھا کہ جُولی کی ایک جڑواں بہن ہے۔ یہ بات کبھی نہیں کھُلی کہ وہ اس کی ہم شکل بھی ہے یا نہیں، اس بات کی بہت زیادہ اہمیت اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنے آبائی شہر ملبورن میں رہتی تھی۔ یہ بات بھی تقریباً تمام لوگ جانتے

تھے۔ درحقیقت میرے سوا تمام لوگ یہی جانتے تھے کہ جولی کی جڑواں بہن ملبورن میں رہتی ہے۔

اگر اُس رات میں اُن کے ساتھ ڈنر نہ کرتا تو میں بھی اس بات پر یقین کرتا رہتا۔

اسٹانسٹیڈ اچھی جگہ ہے لیکن وہاں ڈنر کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ان سے ہٹ کر کوئی وہاں ڈنر کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ آدمی کا گھر وہیں ہو اور دوسری یہ کہ وہ کار کے ذریعے لندن جا رہا ہو اور اتنا بھوکا ہو کہ لندن تک پہنچنے کا انتظار نہ کر سکے جو وہاں سے صرف تیس میل دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ڈنر کرتے ہوئے اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ کوئی شناسا ہمیں دیکھ لے گا۔

اس رات میری یہی کیفیت تھی۔ بھوک اتنی شدّت سے لگی تھی کہ تیس میل کی ڈرائیو کے دوران اُسے برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسٹانسٹیڈ میں ایک ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔

طعام گاہ میں داخل ہوتے ہی میری نظر جُولی پر پڑی۔ وہ ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی جس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ میری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ جُولی اتنی حسین عورت ہے کہ کسی بڑے سے بڑے ہوٹل کے ڈائننگ روم میں، جہاں روشنی بھی بہت کم ہو، سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ سیکڑوں کے مجمع میں بھی نظر جا کر اسی پر ٹھہرے۔ اس کے بال سنہری اور آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کی رگوں میں مشرقی یورپ کا خون ہے لیکن وہ آسٹریلیا میں پلی بڑھی ہے۔

میں خودکار انداز میں جولی کی طرف بڑھ گیا۔ ”جولی!“ میں نے اُسے پکارا۔

اس کا ردِعمل بہت عجیب تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بُری طرح چونکی۔ پھر اس کی نگاہوں میں الجھن ابھری، جیسے میں نے اُسے کسی لڑکی کے ساتھ نہیں، کسی مرد کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا ہو۔ میں تو اس تاثر کو احساسِ جرم ہی کہہ سکتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ چارلی کی بیوی تھی اور میں چارلی کا عزیز ترین دوست تھا لیکن اس وقت اس کا احساسِ جرم مجھے بے محل لگا کیونکہ وہ کسی مرد کے ساتھ نہیں بیٹھی تھی۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ شناسائی کے احساس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں خود بھی الجھ گیا۔ وہ یہ تاثر کیوں دے رہی ہے کہ مجھے نہیں پہچان سکی ہے۔

”ہیلو ڈونالڈ!“ دوسری لڑکی نے کہا۔ ”بیٹھو نا!“

میں جلدی سے بیٹھ گیا۔ میرے گھٹنے اچانک ہی جواب دینے لگے تھے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ دوسری لڑکی بھی جولی تھی ―― میں باری باری دونوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک وہ دونوں ایک جیسی تھیں۔ ایک بال کا بھی تو فرق نہیں تھا دونوں میں۔ لباس بھی ایک جیسا تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود میں جولی کو شناخت نہیں کر سکا۔

بہرحال میں نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ میں پہلی لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تم یقیناً اینا ہو لیکن میں تو سمجھا تھا کہ تم ملبورن میں رہتی ہو۔“

انھوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے بات کی اور جیسے کوئی فیصلہ کر لیا۔ جڑواں بہن بھائیوں کے درمیان ایسی انڈر اسٹینڈنگ تو ہوتی ہی ہے۔ ”یہ اینا ہے۔“ جولی نے کہا۔ ”اور یہ ہے ڈونالڈ۔ میرا اور چارلی کا بہت پرانا دوست۔ اور ڈونالڈ... میری بات غور سے سنو۔ تم نے اینا کو نہیں دیکھا۔ تم اینا سے نہیں ملے۔ اینا ملبورن میں ہے۔“ اس نے کسی ہپناٹسٹ کی طرح مجھے ہدایت دی۔ ”یاد رکھنا یہ بات۔“

”لیکن...“

”وعدہ کرو مجھ سے کہ یہ راز کبھی فاش نہیں کرو گے۔“

”ہاں... وعدہ کرو۔“ اینا بولی۔

میں ٹھہرا سنہری بالوں اور گہری نیلی آنکھوں کا دیوانہ... اور وہاں تو معاملہ بھی ایک کا نہیں، دو کا تھا۔ دو حسیناؤں کے سامنے میں کیا ٹھہرتا۔ ایک ہوتی تو میں خود سے لڑ بھی لیتا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ عزیز ترین دوست کی بیوی ہو۔ چنانچہ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ راز کبھی فاش نہیں کروں گا۔ اب تم بھی مجھے سب کچھ بتا دو۔“

”پہلے کھانا کھا لیا جائے۔“ ان دونوں نے بیک آواز کہا۔

چنانچہ ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جولی نے سُوپ کا چمچہ مُنہ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال تھا، یہ جگہ محفوظ ہے۔ یہاں کوئی جاننے والا بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ بہرحال، تمھیں دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن یہ تو بتاؤ، تم یہاں کیسے ٹپک پڑے؟“

”میں سفوک آیا تھا اور لندن واپس جا رہا تھا۔ بھوک ناقابلِ برداشت ہو گئی تو سوچا، کھانا کھا لوں۔“

”تو یہ جگہ سفوک کے راستے میں پڑتی ہے؟“ اس نے بے حد سرسری لہجے میں پوچھا۔

”تم پوچھ رہی ہو یہ بات جبکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بی اے آنرز میں جغرافیہ تمھارا مضمون رہا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔

اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ”دراصل جغرافیہ اینا کا مضمون تھا۔

میرا سبجیکٹ تو ہسٹری تھا اور وہ بھی آنرز نہیں، عام ڈگری تھی۔“

میرا مُنہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ پھر بات میری سمجھ میں آنے لگی۔

”درحقیقت یہ ڈیڈی کا آئیڈیا تھا۔“ اینا نے ستائشی لہجے میں کہا...

مسٹر ایکسل چھ سال پہلے انگلینڈ آئے تھے۔ اُن کے ساتھ ان کی اٹھارہ سالہ جڑواں بیٹیاں بھی تھیں۔ وہ نئے نئے رنڈوے ہوئے تھے۔ جولی کو یہاں آتے ہی یونیورسٹی میں اسکالرشپ مل گیا۔ مسٹر ایکسل نے ریڈ لینڈ میں ایک مکان خرید لیا۔ جولی کی پڑھائی شروع ہو گئی۔ اینا تین ماہ بعد ملبورن واپس چلی گئی۔ کیونکہ وہاں اسے ایک اچھی جاب مل گئی تھی۔ یہ میرے جولی سے ملنے سے دو سال پہلے کی بات ہے لیکن اس کے بتاتے ہی مجھے یہ کہانی یاد آ گئی۔

لیکن اب یہ ثابت ہو رہا تھا کہ اینا سرے سے ملبورن گئی ہی نہیں تھی۔ وہ ریڈ لینڈ کے اسی مکان میں رہتی رہی جہاں کبھی کسی کو مدعو نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ جولی یہ بتاتی تھی۔ ”ڈیڈی بہت خوش مزاج ہیں لیکن بہت زیادہ تنہائی پسند ہیں۔“ اور جولی تین سال تک تاریخ اور فلسفے کے لیکچرز اٹینڈ کرتی رہی جبکہ اینا جولی کی حیثیت سے جغرافیہ کی کلاسیں اٹینڈ کرتی تھی۔

اُن دونوں کے اور ان کے ڈیڈی کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا کہ اینا انگلینڈ ہی میں رہ رہی ہے۔ اس دوران جولی ایکسل نے بی اے کی جنرل ڈگری حاصل کر لی تھی۔ پھر اُسے ایک جاب مل گئی جہاں اس کی ملاقات چارلی بینٹ سے ہوئی۔ چھ ماہ کے اندر اندر دونوں کی شادی ہو گئی۔ کچھ ہی عرصے بعد مسٹر ایکسل کا انتقال ہو گیا۔

جتنی دیر میں انھوں نے مجھے یہ سب کچھ بتایا، میں کھانے کے معاملے میں سویٹ ڈش تک پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے کچھ ایسے قصّے بھی سنائے کہ ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں درد ہو گیا۔ ”تم دونوں بہت بدمعاش ہو۔“ میں نے کہا۔

اینا نے اچانک ہی مجھ سے پوچھا۔ ”دو تین سال پہلے تو آپ کے داڑھی تھی نا؟“

”ہاں... تھی تو سہی۔“

”تب تو میں تمھیں جانتی ہوں۔“ اس نے بے تکلّفی سے کہا۔ ”میں یہی سوچ رہی تھی کہ کہیں دیکھا ہے تمھیں۔ ہم کیمبرج میں ملے تھے۔“

میں نے اسے بغور دیکھا۔ مجھے اپنا چہرہ تپتا محسوس ہوا۔ ”تو کیا وہ تم تھیں اینا؟ اور میں آج تک چارلی کو بتانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ حالانکہ اس وقت تک چارلی نے تم سے شادی کی درخواست بھی نہیں کی تھی۔“

”تمھارا اشارہ میری طرف ہے۔“ جولی نے جلدی سے کہا۔ ”اور تم چارلی کو اب بھی نہیں بتاؤ گے۔ یاد ہے، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“

میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”تمھارا مطلب ہے چارلی کو کچھ بھی معلوم نہیں؟“ میری عقل خبط ہوئی جا رہی تھی۔

”ہاں... اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔ ڈیڈی نے ہمارے لیے ترکے میں کچھ رقم چھوڑی تھی۔ اینا یہیں قریب ہی، ایک کاٹیج میں رہتی ہے لیکن چارلی سمجھتا ہے کہ یہ ملبورن میں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اینا سے کبھی نہیں ملا۔ یہ پورا سیٹ اپ بے حد طمانیت بخش ہے۔“

میں اینا کی طرف مڑا۔ ”اور تم چارلی کو کس حد تک جانتی ہو؟“

اینا مسکرا دی۔ ”میں کافی اچھی طرح جانتی ہوں اُسے!“

* * *

دو دن بعد مجھے مڈل ایسٹ جانا تھا۔ لہٰذا اس روز کے بعد میری ان سے ملاقات اگلے سال ہی ہوئی۔ وقتاً فوقتاً میں ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ ابتدا میں مجھے اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ بوجھ ہٹتا گیا۔ میں نے سوچا، چارلی کا نقصان ہی کیا ہے۔ وہ ایک پُرکشش، مطمئن اور خوش مزاج عورت کا شوہر ہے۔ جو پورا سال اس کے ساتھ رہنے

ایک بار کسی محفلِ سماع میں مولانا عبدالمجید سالک شریک تھے اور قوّال بڑے زنّاٹے سے یہ مصرع الاپ رہے تھے۔ ؏

جہاں ہو ذکرِ خیراں کا، رسولؐ اللہ آتے ہیں

جب محفل ختم ہوئی تو مولانا سالک نے دریافت کیا ”بھئی، یہ خیراں کون ہے؟“

قوّالوں میں سے ایک نے کہا ”واہ صاحب، آپ کو خیراں کا علم نہیں؟ یہ حضورؐ کی ایک خادمہ تھیں جو پانچوں وقت آپ کو وضو کرایا کرتی تھیں۔“

سالک بڑے جز بز ہوئے کہ یہ کیا پہیلی ہے۔ تھوڑا سا غور کیا تو عقدہ کھُلا کہ مصرعے میں ”ذکرِ خیراں کا“ نہیں بلکہ ”ذکرِ خیر اُن کا“ ہے۔ اور قوّالوں کی بے علمی کے باعث یہ حماقت اُن سے سرزد ہو رہی ہے۔

کراچی سے علی حسن نقوی کی نوازش

کے باوجود ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ چارلی کا دوست ہونے کے باوجود میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ بہت مشکل آدمی اور مشکل ترین شوہر ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں وعدہ توڑتا تو اس سے چارلی کی زندگی تباہ ہوتی، اور وہ بھی بے بات۔ وہ اُن کا نجی معاملہ تھا... اور یونیورسٹی کا بھی۔ اس سے مجھے کچھ غرض نہیں ہونا چاہیے تھی۔ یونیورسٹی کا اس لیے کہ جولی یونیورسٹی میں ملازم تھی اور مجھے دوستوں نے بتایا تھا کہ وہ جتنی تنخواہ لیتی ہے، اس سے زیادہ کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے، دو مل کر تو پہاڑ بھی ڈھا سکتے ہیں۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں اب آئی تھی۔

دوسری طرف اخلاقی اعتبار سے میں کیسا ہی آدمی سہی، کوئی وعدہ کرلوں تو اسے توڑنا بہت بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔ خواہ وہ وعدہ کسی اخلاقی بگاڑ کا باعث بن رہا ہو۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اخلاقی بگاڑ لندن میں ہو اور میں بیروت میں۔

لیکن اگلے سال یہ بات اتنی آسان نہیں رہی۔

لندن پہنچتے ہی میرا دل سب سے پہلے چارلی اور اس کی بیوی سے ملنے کو چاہا۔ میری جگہ کوئی مضبوط آدمی ہوتا تو وہ بھی اس ترغیب سے نہیں بچ سکتا تھا۔

ہم نے پورا دن ایک ساتھ گزارا۔ اور بہت اچھا گزارا۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ چارلی کی بیوی کا کردار جولی ادا کر رہی ہے یا اینا، اور وہ جو کوئی بھی تھی، یہ جانتی تھی کہ میں یہ سوچ کر الجھ رہا ہوں۔ وہ میری الجھن سے محظوظ بھی ہو رہی تھی۔

لندن میں میرا اپنا گھر نہیں۔ البتہ ایک بوڑھی خالہ ہیں، جن کا ملنے سے لمبا ڈوز میں بے حد شوق سے بارہ گھنٹے کے وقفے سے لیتا ہوں۔ بارہ گھنٹے سے جلدی ان کا ڈوز لے لوں تو ان کی کڑواہٹ میرے رگ و پے میں اُتر جاتی ہے۔

چنانچہ میں نے ان کی مہمان نوازی کے بدلے انھیں دعوت دے ڈالی۔ اس کے علاوہ میں نے چند اور لوگوں کو بھی سوہو میں مدعو کر لیا۔ انھوں نے بھی میری مہمان نوازی کی تھی۔

لیکن جب ہم دعوت کے لیے اکٹھے ہوئے تو چارلی غائب تھا۔ اسے غیر متوقع طور پر کسی کام سے برمنگھم جانا پڑ گیا تھا۔ پیٹر اور جین البتہ آ گئے تھے لیکن میں پارٹی کو مکمل اور جفت کرنے کی غرض سے اپنے ایڈیٹر کی سیکریٹری سوسن کو لے آیا تھا۔ اب چارلی کے غائب ہونے کی وجہ سے پارٹی غیر متوازن ہو گئی تھی لیکن شاید وہ دن ہی کچھ ایسا تھا جب کام خود بخود سنور جاتے ہیں۔ مجھے بار میں اینڈریو نظر آ گیا۔ وہ بہت تنہا اور اداس تھا۔ میں نے اُسے بھی پارٹی میں شامل کر لیا۔ اس کی شمولیت پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا کیونکہ وہ بہت خوش مزاج آدمی ہے۔ وہ اور جولی (اگر وہ جولی ہی تھی) جلد ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔

ہم نے پہلے تو بار میں بیٹھ کر دو دو جام پیے۔ پھر ریسٹورنٹ میں چلے آئے۔ وہاں لابسٹر بہت اچھا ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے ایک نائٹ کلب کا رخ کیا۔ نائٹ کلب کا فلور شو بھی بہت اچھا ثابت ہوا۔ فلور شو کے بعد ہم لوگ نائٹ کلب بند ہونے تک رقص میں مصروف رہے۔ میں نے اس دوران جولی سے اگلوانے کی کوشش کی کہ وہ درحقیقت جولی ہے یا اینا۔ لیکن وہ بہت پکی ثابت ہوئی۔ مجھے بھی اس بات کی ایسی کوئی پروا نہیں تھی۔ پارٹی ختم ہونے پر میں نے اور سوسن نے اُسے اُس کے گھر کے دروازے پر چھوڑا۔ پھر میں سوسن کو اس کے گھر پہنچانے چلا گیا۔

وہ پارٹی مجھے بہت مہنگی پڑی تھی۔ مگر میں نے انجوائے بہت زیادہ کیا تھا۔ اخراجات مجھے بُرے بھی نہیں لگتے کیونکہ میں سال میں ایک بار ہی تو لندن آتا ہوں۔ اگلے روز لنچ سے ذرا پہلے میں آفس پہنچا تو بے حد خوش تھا۔

ڈیسک پر مجھے بتایا گیا کہ کوئی انسپکٹر بلیک میرا منتظر ہے۔

※

نہ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ تھا اور نہ ہی میں نے کوئی جُرم کیا تھا۔ میں نے سوچا، یہ میرے ایڈیٹر کی حرکت ہے۔ وہ میرے لندن میں قیام کے دوران میری تنخواہ حلال کرنے کے لیے اسی طرح کی مصروفیات تخلیق کرتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ بھی ایسا ہی کوئی کیس ہو۔

"کوئی ایسی جگہ ہے، جہاں ہم تخلیے میں گفتگو کر سکیں؟" انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

آفس میں ایک انٹرویو روم ہے۔ میں اسے وہیں لے گیا۔ چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھنے کے بعد میں نے اس سے کہا: "فرمائیے... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ مسز جولی بینٹ کو جانتے ہیں؟"

"ہاں" میں نے مختصراً کہا لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا کہ ضرور کوئی سنگین گڑبڑ ہے۔

"آپ نے انھیں آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"کل رات ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔"

"اگر مائنڈ نہ کریں تو تفصیل سے بتائیں۔ میں شکر گزار ہوں گا۔"

"ضرور۔" میں نے کہا اور پارٹی کے ایک ایک لمحے کا حال سنا دیا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ آخر میں ہم نائٹ کلب گئے اور اس کے بند ہونے تک وہیں رہے۔

"صبح کے تین بجے تک!" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں۔ ساڑھے تین بجے تک۔ پھر میں اور ایک لڑکی جولی کو اس کے گھر تک چھوڑنے گئے۔"

انسپکٹر پُر خیال انداز میں پنسل سے اپنے دانت بجاتا رہا۔

"اوہ... اور اس پارٹی میں کون کون شریک تھا؟"

"پیٹر مینسفورڈ، موسیقار... آپ اسے جانتے ہی ہوں گے۔ اس کی بیوی، ہمارے اخبار کے ایڈیٹر کی سیکریٹری مس سوسن جیفری... اور اینڈریو فاؤلر..."

"دی گلوب کا نامہ نگار؟"

"جی ہاں... وہی۔"

دانتوں پر پنسل کی ٹھک ٹھک اور تیز ہو گئی۔

"چکر کیا ہے انسپکٹر؟" میں نے پوچھا۔

اس نے آہ بھر کر کہا: "غلط شناخت کا کیس ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی بات ہے۔ آپ... اور دیگر شرکا اس تمام عرصے میں مسز جولی بینٹ کے ساتھ رہے ہیں نا؟ وہ ایک منٹ کے لیے بھی آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئیں؟"

"بس ایک بار تینوں خواتین میک اپ تازہ کرنے کے لیے لیڈیز روم میں گئی تھیں۔" میں نے اپنے لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا: "آپ نے کہا کہ غلط شناخت کا چکر ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"کسی سے انھیں پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کسی نے بڑی کامیابی سے ان کا روپ دھارا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس ہفتے سینٹ مارٹن لین میں اٹلی کی بنی ہوئی چاندی کی اشیا کی نمائش ہو رہی ہے؟"

"نہیں... مجھے تو علم نہیں اس کا۔"

"نمائش رات دس بجے تک کھلی رہتی ہے۔ کل رات پونے نو بجے ایک خاتون بڑے کرّوفر سے، اعتماد کے ساتھ وہاں پہنچیں۔ انھوں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں سب سے قیمتی چیزیں رکھی تھیں۔ انھوں نے ایکسکیوز می کہتے ہوئے لوگوں کو بڑے اعتماد سے ایک طرف ہٹایا۔ ایک مجسمے کو اسٹینڈ سے اُٹھایا اور مزے سے دروازے کی طرف چل دیں۔ سب لوگ یہ سمجھے کہ اس کا تعلق انتظامیہ سے ہے۔ دروازے پر اس وقت ایک بُڈھا محافظ تھا۔ شروع میں تو وہ بھی کچھ نہ سمجھا اور جب اسے احساس ہوا کہ ماجرا کیا ہے تو خاتون غائب ہو چکی تھیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ نمائش میں موجود تین مختلف افراد نے اس خاتون کو مسز جولی بینٹ کی حیثیت سے پہچانا۔ ان میں سے ایک نے تو اُن سے

اُردو ادب کا نیا رُخ

آپ کے جانے پہچانے مشہور ادیب اثر نعمانی کے قلم سے

قہقہے ہی قہقہے

طنز و مزاح سے لبالب ہلکے پھلکے رُومانی ناولوں کے دلچسپ سلسلے کی چار کتابیں

گھر کی مُرغی

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

حکیمی ٹیکسی

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

بے وقوف

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

آپ کے سر پر

قیمت ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

بور ہونا چھوڑیے مسکرانا سیکھیے — یہ ناول آج ہی خریدیے

چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

علیک سلیک بھی کی تھی۔ ہے نا عجیب بات؟"
"خدایا!" میں نے کمزور آواز میں کہا "خدا کی پناہ!"
"سچ تو یہ ہے کہ تمام شہادتیں سُن کر میں نے سوچا تھا کہ یہ کوئی عملی مذاق ہے مگر آپ نے جو کچھ بتایا ہے، اس کے بعد میں تو چکرا گیا ہوں۔ دیکھیں نا، آپ کے دوست مسٹر مینسفورڈ ایک معزز اور مشہور آدمی ہیں۔ مسٹر فاؤلر کو بھی میں برسوں سے جانتا ہوں اور پھر... میرے خدا!"

ہم دونوں کے درمیان مزید چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس نے چائے کی پیالی خالی کی اور رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے تک میں نے اپنے چہرے کو بے تاثر رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ حالانکہ میں اندر ہی اندر اُبل رہا تھا۔ میں نے فوراً جولی کے فلیٹ کا نمبر ملایا۔

اس کی آواز سنتے ہی میں نے کہا "تم گھر پہ ہی رہو۔ میں آرہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور پٹخ دیا۔ غصّے کے مارے میرا بُرا حال تھا۔

وہ فلیٹ کے دروازے پر میری منتظر تھی۔ جلدی سے مجھے اندر لے گئی۔ سبز رنگ کے ہاؤس کوٹ میں وہ چلتی پھرتی قیامت لگ رہی تھی "بھئی تمھاری پارٹی میں بہت لطف آیا۔ میں تمھاری شکر گزار..."

"پہلے یہ بتاؤ، تم ہو کون سی؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا کہہ رہے ہو ڈونالڈ؟ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"دیکھو، اس وقت میں غصّے میں ہوں اور جب مجھے غصہ آتا ہے تو..."

"میں اینا ہوں۔"

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"خدا کی قسم..."

"دیکھو اینا... تمھیں وہ چاندی کا مجسمہ فوری طور پر واپس کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تم دونوں کے سلسلے میں خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ وعدہ نبھانے کی خاطر..."

اس کے لبوں پر بے حد حسین مسکراہٹ لہرائی "لیکن ڈارلنگ، وہ مجسمہ تو واپس کیا بھی جاچکا۔ میں نے چیئرنگ کراس پوسٹ آفس سے خود اسے رجسٹرڈ پارسل کے ذریعے بھیجا تھا..."

میں کرسی پر ڈھے گیا۔ تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑگئے تھے "تو انسپکٹر کا پہلا خیال درست تھا؟"

"کیسا خیال؟"

"یہی کہ یہ ایک عملی مذاق معلوم ہوتا ہے۔"

"میں تو اسے تجربہ قرار دوں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بہت لطف آیا۔ کافی پیو گے؟"

"ضرور... لیکن میں تمھیں وارننگ دے رہا ہوں کہ..."

"ڈارلنگ... تم اتنے اڑیل کیوں ہو؟" وہ اِٹھلائی۔

"سوری... اب میں تم سے معقولیت کے ساتھ گفتگو کروں گا۔ دیکھو، تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو۔ اگر تم نے سنجیدگی سے کوئی واردات کرنے کی کوشش کی تو پولیس کو معلوم ہوجائے گا کہ تم ملبورن میں نہیں ہو، اور پھر چارلی..." وہ اس کے پیچھے کچن کی طرف چل دیا۔ وہ بڑی بے پروائی سے اُٹھ گئی تھی اور اب میں اپنی تشویش پر خود کو احمق سمجھ رہا تھا۔

"میں یہ بات جانتی ہوں ڈونالڈ" اس نے کہا۔

"تو پھر؟"

"لیکن ہمارے پاس دو ایک ایسے اچھوتے خیال ہیں کہ تمھارا دماغ وہاں تک پہنچ بھی نہیں سکتا۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا، جاننا بھی نہیں چاہتا۔ بس میں تمھیں اتنا بتا رہا ہوں کہ اگر آیندہ ایسا ہوا تو میں اپنا وعدہ توڑنے پر..."

"مجبور ہوجاؤ گے۔" اس نے میرا جملہ مکمل کردیا۔ پھر اس نے کافی کا مگ ایک طرف رکھا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں "مجھے یقین ہے کہ تم اپنا وعدہ کبھی نہیں توڑو گے۔"

جب اتنی حسین لڑکی مائل بہ التفات ہو تو آدمی کو اُلّو بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے لیکن کمزور لمحوں کی گرفت سے نکلتے ہی اخلاقی قدروں نے مجھے آدبوچا۔ میں لرز کر رہ گیا "سچ سچ بتاؤ۔ تم کون سی ہو؟" میں نے پوچھا۔ میری نگاہوں میں اپنے عزیز ترین دوست کی مظلوم صورت پھر گئی۔

"تم کتنے بے اصول ہو ڈارلنگ۔" وہ بڑبڑائی "یہ تو تمھیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

※

آپ یقیناً مایوس ہوں گے اور میں اس پر معذرت خواہ ہوں لیکن اس دن کے بعد اگر انھوں نے کوئی مجرمانہ حرکت کی بھی تو کم از کم مجھے اس کی خبر نہیں۔ آپ مجھے بزدل سمجھ لیں لیکن دس ماہ بعد میں لندن واپس آیا تو یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ اس باران دونوں سے دور ہی رہوں گا۔ خواہ مخواہ اپنے ذہن پر بوجھ لینے سے کیا فائدہ؟

لیکن مجھے آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ چارلی بینٹ کا فون آگیا۔ چارلی فضول اور لغو گفتگو بہت کثرت سے کرتا ہے اور بہت دیر تک کرنے کا قائل ہے۔ چنانچہ وہ فون پر بھی دیر تک اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا پھر اچانک اس نے مجھ سے پوچھا "کہو بھئی... اگر تمھیں گاڈ فادر بنادیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"کون، میں! گاڈ فادر؟" میں بوکھلا گیا۔

"ہاں، تم۔ اور اتنے خوش قسمت ہو کہ تمھیں انتخاب کا موقع بھی حاصل ہے۔ چاہو تو بچّی کے گاڈ فادر بن جاؤ اور چاہو تو بچّے کے!"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ میرے ہاں جڑواں بچے ہوئے ہیں۔ تین ہفتے پہلے... ایک بیٹا، ایک بیٹی۔"

"خدا کا شکر کہ دونوں ایک جیسے نہیں۔ ان کے درمیان سب سے بڑا فرق موجود ہے۔ اب ہم شکل بھی ہوں تو کوئی بات نہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ارے... کچھ نہیں۔ یونہی بکواس کرنے کی عادت ہے چارلی۔ بہت بہت مبارک ہو۔ مجھے تمھاری پیشکش قبول ہے۔"

"شکریہ۔ اب بتاؤ، لڑکا لوگے یا لڑکی۔"

"میرے خیال میں لڑکا ہی مناسب رہے گا۔"

"بہت خوب۔ تو بچے کا درمیانی نام ڈونالڈ ہوگا۔ رچرڈ ڈونالڈ بینٹ۔"

بعد میں میں نے بچے کو دیکھا تو دل خوش ہوگیا۔ بے حد خوش شکل بچہ تھا۔ میں نے یہ بات چارلی سے بھی کہی اور یہ بات واضح تھی کہ لڑکا اپنی جڑواں بہن سے زیادہ خوب صورت ہے۔

"مجھے یہ تو بتادو کہ اس کا برتھ ڈے کب ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... گاڈ فادر بننا ہے تو یہ معلوم ہونا ضروری ہے۔ یہ آٹھ جون کو پیدا ہوا تھا۔"

"یعنی بُرج جوزا۔"

"ہاں... ہے نا شاندار۔"

میں نے تاریخ نوٹ کرنے کے لیے اپنی جیب سے ڈائری نکالی۔

"اور ننھی اینا دس جون کو پیدا ہوئی۔" چارلی نے دھماکا کیا۔

میری تو سانسیں رُک گئیں۔ پھر میں نے بے حد محتاط انداز میں کہا "یہ وقفہ تو غیر معمولی ہے۔"

> **زن بیزار**
>
> برطانیہ کے مشہور ماہر طبیعیات اور کیمیادان ہنری کیونڈش کو عورتوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ ان سے گفت و شنید کرنے کے بجائے تحریر کو اظہار کا ذریعہ بناتا تھا اور اگر کوئی ملازمہ اس کے کمرے میں غلطی سے داخل ہوجاتی تو وہ فوراً اسے نوکری سے برخواست کردیتا تھا۔

"ہاں... عام طور پر جڑواں بچوں میں چند منٹ... زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا فرق ہوتا ہے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ یہ فرق غیر معمولی ہے لیکن ڈاکٹر بھی کم تجربہ کار نہیں تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کم وقفہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر، جولی کے باپ کے دوستوں میں سے ہے۔"

"زچگی میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"جولی کہتی ہے، سب کچھ آسانی سے ہوگیا۔ میں وہاں موجود نہیں تھا۔ دراصل جولی نے اصرار کیا تھا کہ زچگی اسکاٹ لینڈ میں ہو۔ کہتی تھی، وہاں کی آب و ہوا مناسب رہے گی اور پھر وہاں ڈاکٹر بھی اس کے ڈیڈی کا دوست تھا۔ بہرحال سب کچھ خوش اسلوبی سے ہوگیا۔ جولی دو ہفتے وہاں رہی۔ پھر دونوں بچوں کو لے کر واپس آگئی۔ کچھ پیو گے؟"

"ضرور پیوں گا... اور ایک نہیں، بیک وقت دو جام پیوں گا۔"

وہ گلاس لینے کے لیے اندر گیا تو جولی چلی آئی۔ ماں بننے کے بعد وہ اور خوب صورت ہوگئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی اور اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"ڈونالڈ... تمھارے لیے اینا کا ایک پیغام ہے۔" وہ بولی۔

میرا گلا خشک ہوگیا "کیا؟"

"وہ خوش ہے کہ تم نے اپنے لیے لڑکے کا انتخاب کیا۔"

میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کی تصدیق ہوگئی۔ ننھا رچرڈ میرا ہی بیٹا تھا۔ گویا اب میرے لیے اینا سے شادی کرنا ضروری ہوگیا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کے بعد بھی میں اپنے بیٹے کا گاڈ فادر ہی رہوں گا۔

زچگی کے لیے اسکاٹ لینڈ جانے کا اور کیا مطلب ہوسکتا تھا اور پھر جڑواں بچوں کے درمیان دو دن کا فرق پیدائش! سب کچھ واضح تھا۔

THE GIMINI RACKET
Stewart Ferrar.

ضیا تسنیم بلگرامی

عہدِ اکبری کے اس عالمِ باعمل اور صوفیِ بے مثل کے حالات جس کی بزرگی اور کمال کے بڑے بڑے لوگ قائل تھے۔ اکبرِ اعظم کا معتمدِ خاص ملّا عبد القادر بدایونی اُن کا مرید و معتقد تھا۔ اُس کی علمیت کا چراغ آپ کے سامنے نہیں جلتا تھا۔ آپ کو اپنے ہم عصروں میں جو ایک خاص خوبی حاصل تھی وہ یہ تھی کہ آپ اپنے ملنے جلنے والوں کو باتوں ہی باتوں میں ایسے اشارے کر جاتے تھے کہ مخاطب کو آنے والے دنوں میں پیش آنے والے واقعے کا سایہ محسوس ہو جاتا تھا۔
کبھی علمی موضوع زیرِ بحث آتا تو علما گنگ ہو جاتے۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے نفور اور گریزاں یہ شخص بڑی کامیاب زندگی گزار کے چلا گیا اور اپنے حالات و واقعات سے لکھ گیا ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ہندوستان کے مشہور شہر لکھنؤ کا ایک قصبہ ہے امیٹھی۔ جس کو قدیم مؤرخ اور تذکرہ نگار امیٹھی لکھتے رہے ہیں۔ اس قصبے کو اس دَور میں یوں تو بہت زیادہ شہرت حاصل رہی ہے کہ یہ ہندوستان کے نامی گرامی نہرو خاندان کا حلقۂ انتخاب رہا ہے۔ یہ دَورِ اکبری کے امیٹھی کے واقعات ہیں۔ یہاں ایک مشہورِ زمانہ ذات حضرت شیخ نظام الدین نے اپنے عہد کے خاص و عام کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ علومِ ظاہری و باطنی میں یکتا اور فرد۔ اُن پر حکومت اور حکام کا کوئی رُعب نہیں تھا۔ یہاں حاضری دینے والے اپنے عہدے، مراتب یا ذاتی علم و فضل سے ان پر دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔

کسی بھی بڑے اور مشہورِ زمانہ آدمی کی طرح آپ کے حالات اور سوانح بھی وہیں سے ہمارے علم میں آئے ہیں جب سے آپ نے شہرت حاصل کرنی شروع کی۔ کسی بھی پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں اس کا ماحول اور دوسرے لوگ یہ نہیں جانتے کہ وہ آگے چل کے کسی بھی شعبۂ زندگی میں کوئی غیر معمولی کام انجام دے کر غیر معمولی شہرت کا حامل ہو جائے گا۔ شیخ نظام الدین بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں۔

اُن کے ماضی کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مروّجہ علوم کے اکتساب میں بڑی محنت کی اور اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

جب آپ مروّجہ علوم کے اکتساب میں مشغول تھے تو آپ بیزاری سے غور فرماتے تھے کہ یہ سب آخر ہے کیا۔ کیا انسانی معراجِ کمال یہی ہے کہ انسان انھیں حاصل کر کے کسی دربار یا سرکار سے وابستہ ہو جائے اور فکرِ معیشت کا دباؤ کم کرے۔ اسی عالم میں آپ نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آپ نے اس دَور کے ایک صوفی شیخ معروف چشتی کے در پر ہجوم دیکھا۔ یہاں جس قسم کے لوگ نظر آئے۔ آپ کو اُن سے غور و فکر کا موقع ملا۔ یہاں دنیاوی دولت اور کشش نہیں تھی۔ بوریہ نشینی اِس حال میں کہ رہنے کو صحیح حالت میں گھر بھی میسّر نہیں تھا۔ یہاں دنیا کے منصب اور عہدے نہیں ملتے تھے۔ یہاں جاگیروں اور زمینوں کی تقسیم کا کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہاں سے روپیہ اور خلعت نہیں ملتی تھی۔ یہاں معاشی سہولت بھی پیشِ نظر نہیں تھی لیکن پھر بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔

آپ نے آنے جانے والوں سے پوچھا: "یہ شیخ معروف چشتی لوگوں میں کیا تقسیم کرتے ہیں کہ وہاں ہر وقت ہجوم سا لگا رہتا ہے؟"

آپ کو جواب دیا گیا: "وہاں سب کچھ ملتا ہے۔ وہاں کیا نہیں ملتا!"

آپ نے پوچھا: "کیا شیخ کو بادشاہ یا حاکمِ علاقہ کے دربار میں رسائی حاصل ہے؟"

جواب دیا گیا: "شیخ کو دنیا کے کسی بھی دربار کی رسائی حاصل نہیں، لیکن دونوں جہان کا وہ دربار جہاں سے ہر شخص کو مقسوم ہوتا ہے، جہاں کی تقسیم کو قسمت سمجھ کر قبول کر لیا جاتا ہے، شیخ کو اُس دربار کی رسائی حاصل ہے۔"

آپ نے پوچھا: "شیخ عادات و اخلاق کے کیسے ہیں؟"

مخاطب نے جواب دیا: "جا کر اور مل کر خود دیکھ لیں۔ اُن کی نظر میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا، ہاں وہ قابلِ توجہ اور محترم ہے

جو متقی اور پرہیزگار ہے جو جاہل نہیں ہے جس کو علوم حاصل ہیں اور عالمِ باعمل ہے۔"

آپ نے فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ بات ہے تو میں ضرور ملوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ میری بے کیفی کو کس طرح دُور کرتے ہیں۔ آپ شیخ معروف چشتی کے دَر پر گئے تو معلوم ہوا، شیخ اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ہجوم میں شامل تھے اور شیخ معروف چشتی وعظ فرما رہے تھے۔ موضوع تھا۔ دنیا دار المحن ہے۔ اُن کی تقریر میں جادو تھا سحر تھا۔ بات دل سے نکل کر دل میں گھر کر رہی تھی۔

نظام الدین خود بھی عالم تھے اور اس موضوع پر خود بھی سوچ سکتے تھے اور بول بھی سکتے تھے۔ شیخ چشتی جو کچھ کہہ رہے تھے نظام الدین بھی اس سے واقف تھے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اس طرح بات نہیں کر سکتے۔

وہ یہ سب سوچتے سوچتے کسی اور ہی عالم میں چلے گئے۔ تقریر ختم ہوئی اور ایک شخص نے آپ کو جھنجوڑ کر پوچھا۔ "شیخ نظام الدین آپ ہی کا نام ہے؟"

وہ اپنے ہوش میں آ گئے اور جواب دیا "ہاں میں ہی شیخ نظام الدین ہوں۔"

اس نے کہا: "شیخ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

ان کو حیرت ہوئی، پوچھا۔ "کیا شیخ ہمیں جانتے ہیں؟"

اُس شخص نے جواب دیا: "اگر جانتے نہیں تو آپ کو بلوایا کیوں ہے؟"

ان کو حیرت تو ہوئی مگر خاموشی سے اُس کے ساتھ شیخ چشتی کے پاس چلے گئے۔

شیخ چشتی کی نظریں دوسری طرف تھیں۔ اسی عالم میں پوچھا: "نظام الدین! کیا حال ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ٹھیک ہوں۔"

شیخ نے کہا۔ "پریشان ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "پریشان تو ہوں مگر۔ . ."

شیخ نے جواب دیا: "پریشانی میں اگر مگر کیا ہوتی ہے، پریشانی، پریشانی ہے۔"

آپ نے کہا: "میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ . . ."

شیخ نے کہا: "تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو اس پر تمھیں قدرت بھی حاصل نہیں۔"

آپ نے کہا: "یہ بھی درست ہے مگر میں معاشی یا۔ . ."

شیخ نے فرمایا: "میں جانتا ہوں کہ تم معاشی طور پر پریشان نہیں ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھاری پریشانی اندر کی ہے۔"

آپ کی زبان کو معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ نہ تو دل پہ قابو تھا، نہ زبان پر، نہ لفظوں پر اور نہ اسلوب پر۔

شیخ نے کہا: "نظام الدین! محض علم، حیرت اور تشنگی میں تو اضافہ کرتا ہے لیکن دلوں میں سوز اور سرمستی پیدا نہیں کر سکتا اور یہی تیرا مرض ہے۔" شیخ نے مزید فرمایا: "اے نظام الدین! یہ دنیا عارضی اور فانی ہے اور انسان بحرِ عالم میں بُلبلے کی طرح ہے۔ بُلبلے کی زندگی ہی کیا ہوتی ہے۔"

آپ پر رقّت طاری ہو گئی۔ "بس یہی سوچ اور یہی فکر مجھ کو پریشان کر دیتی ہے۔"

شیخ نے فرمایا: "مجھ کو بتایا گیا تھا کہ یہاں ایک شہباز آ رہا ہے۔ میں کئی دن سے تیرا منتظر ہوں میں اُس شہباز کو دیکھنا چاہتا تھا اس سے ملنا چاہتا تھا۔"

آپ نے حیرت سے پوچھا: "وہ شہباز کہاں ہے؟"

شیخ نے جواب دیا: "وہ شہباز تُو ہے، صرف تُو۔"

آپ فرطِ جوش میں شیخ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

شیخ نے فرطِ شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ دیا: "رو لے، خوب رو لے، کیونکہ یہ بادل اُسی وقت برستے ہیں جب دلوں پر گھٹا چھا جاتی ہے۔"

آپ دیر تک روتے رہے اور کسی قدر سکون بھی حاصل کرتے رہے۔ اب آپ میں سکون پیدا ہو چلا تھا۔

شیخ نے فرمایا: "اے نظام الدین! پوری دنیا بازار بن گئی ہے، یہاں دکانیں لگی ہوئی ہیں، ہر طرف دکاندار ہیں یا گاہک۔ دنیاداروں کی دکانیں آباد ہیں وہاں خریداروں کا ہجوم ہے لیکن ہماری دکان پر وہ ہجوم نہیں ہے۔ یہاں کم گاہک آتے ہیں لیکن جو گاہک آتے ہیں وہ

منفرد اور کمیاب ہوتے ہیں۔"

آپ نے کہا "میں نے اپنے شب و روز بڑی بے کیفی میں گزارے ہیں۔ میں نا آسودہ اور گرسنہ محسوس کرتا رہا ہوں۔ میری تشنگی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا مگر یہاں آکر ایسا محسوس ہوا کہ آخر کار میں نے وہ جگہ معلوم کرلی ہے اور اس شخص کو پالیا جو میرا علاج کردے گا۔"

شیخ نے جواب دیا "تم عالم ہو اور اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے وہ اس مقام کے لیے بہت ضروری ہے جو تم حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تم پچاس فی صد کامیاب ہوچکے ہو۔"

آپ نے دریافت کیا "شیخ! کیا میں آپ کی خانقاہ میں رہ سکتا ہوں؟"

شیخ نے جواب دیا "کیوں نہیں، یہ خانقاہ ہے کس کے لیے؟ تم یہاں رہو اور شوق سے رہو۔"

آپ نے اسی وقت سے خانقاہ میں سکونت اختیار کرلی۔

شیخ نے اس دن اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ بس آخر میں یہ کہا کہ "میں جو کچھ کررہا ہوں اس پر دھیان دو اور میں جو کچھ بتاؤں اس کو غور سے سنو اور خلوص سے اس پر عمل کرو۔"

آپ نے وہاں غسل کیا، وضو کیا اور نماز ادا کی اور اپنے ہر کام میں یہی محسوس کیا کہ جیسے وہ یہ سارے کام اور مشاغل آج پہلی بار ادا کررہے ہیں۔ اُن کو اپنے ہر کام میں لذت اور لطف محسوس ہورہا تھا۔ نماز میں اُن کو جو لذت اور کیفیت محسوس ہوئی وہ نادر تھی۔ اس سے پہلے اُن کو یہ مزہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ رات ہوئی تو ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ چاند موجود نہ تھا۔ فضا میں سناٹا بھی تھا اور تاریکی بھی۔ ہاں اس تاریکی میں جگنوؤں کی بھرمار تھی۔ ہر طرف چمک رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے زمین کے تاریک آسمان پر ستارے دمکتے پھر رہے ہوں۔ ستارے جو متحرک اور رواں دواں ہوں۔ آپ خانقاہ کے باہر ایک چبوترے پر بیٹھ کر اس منظر سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ کچھ دیر بعد اندر سے شیخ نمودار ہوئے اور پوچھا۔ "اے نظام الدین! یہاں بیٹھے کیا کررہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا "شیخ محترم! ان جگنوؤں کو تو دیکھیں، یہ زمینی آسمان پر ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔"

شیخ مسکرانے لگے اور فرمایا "اے نظام الدین! تم شاعر بھی ہو جو اتنی خوب صورت تشبیہہ سے مجھ کو متاثر کررہے ہو۔"

آپ نے جواب دیا "حضرت! میں یہاں آنے سے پہلے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ جو کچھ بھی ہے آپ کا فیض ہے، آپ کا فیضان ہے۔"

شیخ نے فرمایا "تم غور کرو، تمہارے دل کی فضا بھی تیرہ و تار تھی۔ وہاں بھی اندھیرا تھا لیکن اب وہاں بھی معرفت و عرفان کے جگنو چمک رہے ہیں۔"

آپ نے شیخ چشتی کے قول کا اعتراف کیا۔ اب ان کے دل میں نور اُتر چکا تھا۔ شیخ نے اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت شروع کردی۔

آپ کو اپنے پیر و مرشد کی طرف سے اجازت دی گئی کہ خیرآباد جاؤ اور شیخ سعد بن بڈھن کے مزار پر حاضری دو۔ آپ خیرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ سعد کے خلیفہ اللہ دیہ سے ملاقات ہوئی۔ شیخ اللہ دیہ کا نام بھی نظام الدین تھا۔ اور ان کے علمی تبحر کا بڑا شہرہ تھا۔ اکبر مغل شہنشاہ اور فیضی ان کی قابلیت کے معترف اور قدر دان تھے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے انھیں بلوایا بھی تھا مگر طبیعت کی بے نیازی اور درویشی نے یہ دعوت قبول نہیں کی۔ امیٹھی کے شیخ نظام الدین ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ مہک اور خوشبو جو ایک درویش دوسرے درویش میں محسوس کرتا ہے، دونوں نے ایک دوسرے میں محسوس کی اور آپس میں بغل گیر ہوگئے۔ آپ نے کہا "پیر مرشد معروف چشتی کے حکم پر یہاں آیا ہوں۔ مخدوم سعد کے مزار پر حاضری دے کر فیوضِ باطنی حاصل کروں گا اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہے گا۔"

اللہ دیہ نے جواب دیا "یہ آپ کا گھر ہے جب چاہیں تشریف لائیں اور جب تک چاہیں رہیں۔"

آپ مخدوم سعد کے مزار پر تشریف لے گئے اور فاتحہ پڑھ کر ایک عجیب سی لذت اور کیفیت محسوس کرتے رہے۔

کچھ دن رہ کر امیٹھی واپس گئے۔ انھیں جو کچھ قلیل مدت میں حاصل ہوگیا تھا، دوسرے پوری زندگی تک بھی نہیں حاصل کرسکتے تھے۔

آپ نے گوپامئو کے قاضی مبارک کے والد کی خانقاہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس وقت یہ بچے تھے اور قاضی مبارک بھی ان کے ہم سن تھے۔ جب درجۂ کمال کو پہنچے تو گوپامئو کی خانقاہ بھی یاد آئی۔ گوپامئو اودھ کے ضلع ہردوئی میں واقع ہے۔ یہیں قصبہ بلگرام بھی واقع ہے۔ آپ گوپامئو گئے تو قاضی مبارک نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

قاضی مبارک ان دنوں کسی الجھن میں گرفتار تھے اور معاملہ کسی طرح سلجھ نہیں رہا تھا۔ آپ نے ان سے پوچھا بھی نہیں کہ کیا پریشانی ہے۔ ایک دن قاضی مبارک کہیں جارہے تھے کہ آپ نے انھیں روک لیا اور فرمایا "سنو۔"

قاضی مبارک کھڑے ہوگئے۔ آپ نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بسم اللہ، نصر من اللہ و فتح قریب۔"

قاضی مبارک نے پوچھا "یعنی؟"

آپ نے فرمایا "بس اب تم جاؤ۔"

قاضی مبارک نے ان کی حالت میں غیر معمولی تغیر محسوس کیا اور خاموشی سے چلے گئے۔ وہ جس مشکل میں دوچار تھے وہ دور ہوگئی اور قاضی مبارک سرخرو ہوئے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ شیخ نظام نے جو طرزِ تخاطب اختیار کیا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔

قاضی مبارک نے کہا "شیخ! آپ چاہتے تو اپنی بات واضح طور پر کہہ سکتے تھے۔"

آپ نے قاضی مبارک کی بات جیسے سنی ہی نہیں، فرمایا "اب میں امیٹھی واپس جاؤں گا۔"

آپ امیٹھی واپس چلے گئے مگر قاضی مبارک کو جو تجربہ ہوا تھا اس کا انھیں بڑا احساس تھا۔ ان کو یقین تھا کہ یہ سب کچھ اتفاق سے نہیں پیش آیا۔ انھوں نے دوسروں سے اس کا ذکر کردیا اور یہ بات دور دور تک مشہور ہوگئی۔

آپ امیٹھی میں جامع مسجد کے علاوہ کہیں نہیں جاتے تھے اور خاص و عام سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ قاضی مبارک کی باتیں امیٹھی تک پہنچیں تو لوگوں کو بڑا اشتیاق ہوا اور وہ حاضریاں دینے لگے۔ وہ آپ کے پاس مختلف بہانوں سے پہنچنے لگے۔

اسی دوران آپ دوبارہ خیرآباد تشریف لے گئے۔ اور شیخ اللہ دیہ کی خدمت میں بطور نذرانہ ایک تنکہ (سکہ) پیش کیا۔

شیخ اللہ دیہ نے اسے قبول کرلیا اور پوچھا "آپ کے بارے میں جو کچھ مشہور ہورہا ہے یہ کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں نے کیا کہا اور کیا ہوگیا۔"

اللہ دیہ اپنی عمر کے آخری حصے میں تھے۔ شام کو انھوں نے اپنے مہمان سے کہا "گھر کی فضا میں دم گھٹتا ہے، چلو باہر چلیں، وہاں کی سیر کریں۔"

آپ پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی، فرمایا "سبحان اللہ، سیر اور دور تک سیر، کئی دنوں کی سیر، خلیفۂ زماں، سبحان اللہ۔"

شیخ اللہ دیہ نے ان کی طرف بہ غور دیکھا تو وہ عام حالت میں نہیں تھے، انھوں نے پوچھا "شیخ! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "سیر، طویل سیر، خلیفۂ زماں، سبحان اللہ۔" اور مزید فرمایا "میں یہیں رہوں گا۔"

شیخ اللہ دیہ کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ تنہا سیر کو نکل گئے۔ وہ ابھی گھاس پر چل رہے تھے کہ چند گھڑسواروں نے ان کے پاس اپنی باگیں کھینچ لیں، پوچھا "حضرت! کیا آپ یہیں اسی شہر میں رہتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "ہاں، میں یہیں رہتا ہوں، کیوں؟"

ایک گھڑسوار نے پوچھا "تو آپ یہاں کے ذی علم اور مشہور لوگوں سے بھی واقف ہوں گے؟"

انھوں نے جواب دیا "بالکل، تم کو کس سے ملنا ہے؟"

اس گھڑسوار نے جواب دیا "مشہور صوفی مخدوم سعد کے خلیفہ اللہ دیہ سے۔"

آپ نے پوچھا "ہاں میں جانتا ہوں، ان سے کیوں ملنا ہے؟"

سوار نے جواب دیا "ہم فتح پور سیکری سے آرہے ہیں۔ مغل شہنشاہ اکبر نے اُن کو یاد فرمایا ہے۔"

اس کے بعد وہ اپنے جھولے میں شاہی فرمان تلاش کرنے لگا۔

آپ نے جواب دیا "میں ہی شیخ اللہ دیہ ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک میرے گھر چلا جائے اور میرے بیٹے سے کہے کہ وہ گھوڑا، دو خادم اور پالکی یہیں بھیج دیں۔"

سوار گھر گیا اور کچھ دیر کے بعد مطلوبہ چیزوں کے ساتھ واپس آگیا۔

آپ پالکی میں بیٹھ گئے اور دونوں خادموں سے فرمایا "مجھ کو ان سواروں کے ساتھ لے چلو۔"

سواروں کو حیرت ہوئی، پوچھا "آپ اپنے گھر نہیں جائیں گے؟ ان سے جاکر ملاقات تو کرلیں۔"

شیخ نے فرمایا "اس ملاقات کا فائدہ۔ وہ تو روزانہ ہی ہوتی ہے لیکن بادشاہ سے یہ پہلی ملاقات ہوگی۔"

سواروں کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی اور فتح پور سیکری میں انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کردیا گیا اور بادشاہ کو ساری تفصیل بتادی گئی۔

بادشاہ بہت خوش ہوا۔ "میں ایسے آدمیوں کی بے حد قدر کرتا ہوں۔"

آپ اس طرح کھڑے رہے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔

بادشاہ کے ساتھ فیضی بھی تھا، اس نے کہا "شیخ اللہ دیہ! آپ یقین کریں خلیفۂ زماں اکبر کی طرح میں بھی آپ سے ملنے کے

لیے بے چین تھا۔
آپ اسی طرح لاتعلق اور لاعلم کھڑے رہے جس طرح کھڑے تھے۔
بادشاہ اور فیضی کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ دونوں کی کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔
فیضی نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ "خلیفۂ زماں آپ سے بہت خوش ہیں اور وہ آپ کو مبارک باد دے رہے ہیں۔"
شیخ اللہ دیہ نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور کہا۔ "کیا فرمایا آپ نے؟"

بادشاہ نے فیضی سے کہا۔ "یہ مجھ کو تو ثقلِ سماعت کے مریض معلوم ہوتے ہیں۔"
فیضی نے بھی بادشاہ کی رائے سے اتفاق کیا اور شیخ سے زیادہ اونچی آواز میں پوچھا۔ "کیا آپ اونچا سنتے ہیں؟"
شیخ نے جواب دیا۔ "ذرا اور اونچی آواز میں۔ میں ثقلِ سماعت کا مریض ہوں۔"
بادشاہ نے فیضی سے کہا۔ "یہ تو دربار کے لیے بالکل موزوں نہیں، انھیں واپس بھیج دیا جائے۔"
فیضی نے بھی اتفاق کیا۔ "بے شک، شیخ یوں تو بحرِ ناپیدا کنار معلوم ہیں لیکن بیکار۔ ہم ان سے فیض نہیں اٹھا سکتے۔"
بادشاہ نے حکم دیا۔ "شیخ کو اسی وقت بہ عزت و احترام واپس بھیج دیا جائے۔"

فیضی انھیں باہر تک رخصت کرنے آیا۔ شیخ کو جو سوار اپنے ساتھ لائے تھے، فیضی نے ان میں سے ایک کو الگ لے جا کر پوچھا۔ "جب تم شیخ سے ملے تھے تو کیا اس وقت یہ اونچا سنتے تھے؟"
اس نے جواب دیا۔ "نہیں، شیخ بالکل اونچا نہیں سنتے تھے۔"
فیضی نے شیخ کو رخصت کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "شیخ! میں آپ کی مجبوری سمجھ گیا۔ آپ اس دربار میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ثقلِ سماعت کی شکایت نے آپ کی جان بچا لی لیکن آپ یہ نہیں سمجھیں کہ بادشاہ کی طرح میں بھی آپ کے دروغِ مصلحت آمیز کا شکار ہو گیا۔"
شیخ نے جواب دیا۔ "میں اس بے دین ماحول میں کس طرح رہتا۔ تیرا شکر گزار ہوں کہ میرے مصلحت آمیز عذر کی لاج رکھ لی۔" شیخ اللہ دیہ فتح پور سیکری سے واپس آ گئے لیکن انھیں امیٹھی کے نظام الدین کی باتیں یاد آتی رہیں۔ وہ جذب میں بلا اختصار جو کچھ بھی کہہ گئے تھے وہ حرف بہ حرف پورا ہوا تھا۔

مریدوں اور طالب علموں نے دیکھا کہ شیخ حاتم نامی مرید پر آپ خاص توجہ فرماتے ہیں اور شیخ حاتم مالی اعتبار سے بہت کم تر تھے۔ دوسروں کو شیخ حاتم سے حسد ہو گیا۔ گوپامئو سے قاضی مبارک آئے تو مریدوں نے انھیں وسیلہ بنایا اور عرض کیا۔ "حضرت! آپ ہی اس سلسلے میں کچھ کریں۔ مرید اور طالب علم بہت ہیں لیکن شیخ خصوصی توجہ بس ایک مرید پر دیتے ہیں۔"
قاضی مبارک نے پوچھا۔ "وہ کون ہے جس کا نام؟"
مریدوں نے عرض کیا۔ "شیخ حاتم۔"
قاضی مبارک اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جواب دیا۔ "جی تو نہیں چاہتا مگر تم سب یہ چاہتے ہو تو ضرور بات کروں گا۔"
وہ موقع کی تلاش میں رہے اور آخر ایک دن اُن سے پوچھا۔ "شیخ نظام! ہمیں آپ کی بارگاہ میں تقرب حاصل ہے یا نہیں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "بہت زیادہ۔ ایسا ویسا! کیا بات ہے؟"
قاضی مبارک نے کہا۔ "آج کتنے دن سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ شیخ حاتم کو جو اہمیت دیتے ہیں اس سے ہم سب محروم ہیں۔"
آپ نے جواب دیا۔ "وہ ایک غیر معمولی مرید اور طالب علم ہے وہ جس توجہ کا مستحق ہے وہ میں دیتا ہوں۔"
قاضی مبارک نے کہا۔ "حضرت! اس طرح تو ہم حسد کرنے لگیں گے۔"
آپ نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ "یہ بری چیز ہے۔ آگ کی طرح جس دل میں پیدا ہوتا ہے سارے وجود کو آگ کی طرح چاٹ جاتا ہے۔"
بات ختم ہو گئی۔ قاضی مبارک گوپامئو سے آتے جاتے رہے۔ ایک دن جب وہ شیخ کے پاس آ رہے تھے تو شیخ حاتم کو ایک میکدے کے پاس سے گزرتے دیکھا۔ انھوں نے شیخ حاتم کو روک کر سوال کیا۔ "صاحبزادے! یہاں کیوں

آئے تھے؟"
شیخ حاتم گھبرا گئے اور جواب دیا۔ "میں جھوٹ نہیں بولوں گا مگر... میں یہاں ایک ہندو لڑکی پر عاشق ہو گیا ہوں اور اس کے فراق اور شوقِ دید میں چکر لگایا کرتا ہوں۔"
قاضی مبارک کو حاتم کی ایک کمزوری مل گئی، پوچھا۔ "تیرے شیخ کو اس کا علم ہے؟"
شیخ حاتم نے جواب دیا۔ "نہیں ان کو اس کا علم نہیں ہے۔"
قاضی مبارک کے لیے اتنی بات کافی تھی۔ شام کو قاضی نے دیکھا کہ شیخ نظام اور شیخ حاتم میں کسی علمی اور دینی مسئلے پر گرما گرم باتیں ہو رہی ہیں۔
قاضی مبارک ان دونوں کے پاس بیٹھ گئے اور باتیں سننے لگے۔
شیخ حاتم نے ان کی موجودگی کو اس طرح نہیں محسوس کیا جس طرح قاضی مبارک محسوس کرانا چاہتے تھے۔ قاضی مبارک کو شیخ نظام سے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے اپنے ایک مرید کے مقابلے میں قاضی مبارک کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے طیش میں اٹھے اور وہاں سے جانے لگے۔
آپ کو خیال آیا اور اس تلخی کو محسوس کر کے قاضی مبارک سے پوچھا۔ "حضرت، کہاں چلے تشریف رکھیں۔"
قاضی مبارک نے غصے میں جواب دیا۔ "تشریف کیا خاک رکھوں۔ آپ میرے پاس گوپامئو آتے ہیں تو میں آپ کو اپنی پوری توجہ دیتا ہوں مگر آپ نے اس کا یہ جواب دیا کہ میں آپ کے پاس اتنی دیر سے بیٹھا ہوں اور آپ مجھ پر کوئی توجہ نہیں دے رہے۔"
آپ نے فرمایا۔ "میں شیخ حاتم سے ایک خاص دینی اور علمی مسئلے پر بات کر رہا تھا۔"
قاضی مبارک نے جواب دیا۔ "میں بھی ایک علمی آدمی ہوں۔ میں بھی اس بات چیت میں شریک ہو سکتا تھا۔"
آپ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "قاضی مبارک! بعض دینی اور علمی مسائل ایسے ہیں کہ ان پر بات کرنے کے لیے محض علمی اور دینی ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دل کا پُرسوز اور گداز ہونا بھی ضروری ہے اور یہ چیز آپ کے پاس نہیں ہے۔"
قاضی مبارک نے شیخ حاتم پر طنز کیا۔ "بیشک بیشک۔ شیخ حاتم کے پاس جو شے ہے وہ میرے پاس نہیں ہے۔ یہ ہندو لڑکی سے عشق کر کے اس کی گلی میں چکر لگا سکتے ہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"
شیخ حاتم شرمندہ ہو گئے اور شاکی لہجے میں کہا۔ "قاضی مبارک! آپ نے یہ کیا ظلم کر دیا۔"
لیکن آپ پر قاضی مبارک کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا اور فرمایا۔ "قاضی مبارک! آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ کے دل میں وہ آگ سرے سے ہے ہی نہیں جو انسان کو اچھے بھلے انسان کو گلیوں کی خاک چھنوا دیتی ہے۔"
قاضی مبارک نے جس جسارت اور بے ادبی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کا فوراً ہی احساس بھی ہو گیا۔ پوچھا۔ "میں نے جو کچھ کہا آپ کو اس کا علم ہے؟"
آپ نے شیخ حاتم سے کہا۔ "اب تم یہاں سے جاؤ، میں تم سے پھر باتیں کروں گا۔"
جب شیخ حاتم چلے گئے تو آپ نے کہا۔ "قاضی مبارک! میں اس کی ہر بات سے واقف ہوں لیکن افسوس کہ اس کے علاوہ میں جو کچھ جانتا ہوں آپ نہیں جانتے۔"
قاضی مبارک نے پوچھا۔ "حضرت! اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟"
آپ نے سرد آہ بھری۔ "ہاں اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ شیخ حاتم کو اللہ نے ایک خاص عزت دی ہے اور میں مشیتِ ایزدی کے تابع ہوں۔"
قاضی مبارک کو مسلسل اپنی زیادتی پر افسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے خجالت سے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں مجھ کو معاف فرما دیں۔"
آپ نے فرمایا۔ "قاضی مبارک! میں کیا معاف کر دوں، معاف کرنے والا تو اللہ ہے۔" اس کے بعد آپ نے دوبارہ سرد آہ بھری اور آہستہ آہستہ زیرِ لب کہا۔ "اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔"
قاضی مبارک خوف زدہ ہو گئے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ پوچھا۔ "یہ آپ نے کس کے لیے پڑھا ہے؟ میرے لیے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اللہ کے ایک بندے کے لیے۔"
قاضی مبارک نے آپ کے چہرے پر وہی جذب و کیفیت محسوس کیا جو ایک بار گوپامئو میں بھی محسوس کر چکے

تھے۔ انھیں اندازہ ہوگیا کہ شیخ نظام اس وقت جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں خود انھیں بھی اس کا علم نہیں ہے۔

قاضی مبارک وہاں سے چلے آئے اور ان پر خوف سے تپ طاری ہوگئی۔ قیام کے لیے ان کو جو کمرا ملا تھا اس میں پیشانی پر پٹی باندھ کر لیٹ گئے۔ اس وقت ان کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

کافی دیر بعد آپ کو کسی نے بتایا کہ قاضی مبارک بیمار اپنے کمرے میں دراز ہیں۔

آپ ان کو دیکھنے گئے اور پوچھا۔ "قاضی مبارک! آپ کیسے ہیں؟"

قاضی مبارک نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "جب سے آپ نے اناللہ پڑھی ہے زندگی کی سانسیں پوری کر رہا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "آپ اٹھیں، زندگی کی سانسیں بہت زیادہ باقی ہیں اور وہ یہاں میرے بستر پر پوری نہیں ہوں گی۔"

قاضی مبارک نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں گوپامئو واپس جاکر مروں گا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں اور کب مرے گا۔ میں تو زندگی کی سانسوں کی بات کر رہا تھا۔"

قاضی مبارک نے پوچھا۔ "آپ نے اناللہ کس کے لیے پڑھی تھی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا۔ میں بالکل نہیں جانتا۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا بخار کی تیزی نے ہذیان بھی پیدا کر دیا ہے۔"

قاضی مبارک کو کچھ کچھ حوصلہ ہوا کہ وہ محفوظ ہیں۔

تیسرے دن کسی نے قاضی مبارک کو بتایا کہ شیخ حاتم بیمار ہیں۔

یہ ان کی عیادت کے لیے گئے، وہاں آپ بھی موجود تھے۔

قاضی مبارک جھجکے۔ آپ نے ان سے پوچھا۔ "آپ کو شیخ حاتم کی بیماری کی خبر کس نے دی؟"

قاضی مبارک نے جواب دیا۔ "آپ کے ایک مرید نے۔"

آپ نے سرد آہ بھری۔ "یہاں سانسوں کا حساب ہوتا ہے۔ سانسیں پوری ہو جاتی ہیں تو اللہ کا بندہ چلا جاتا ہے۔"

اور جب سانسیں پوری ہوگئیں تو شیخ حاتم کا انتقال ہوگیا۔ آپ وہاں سے اٹھ گئے اور مریدوں سے کہا۔ "اب تم لوگ شکایت نہیں کرو گے کہ میں شیخ حاتم پر بہت زیادہ توجہ دیتا ہوں۔"

قاضی مبارک نے پھر معافی مانگی۔ "میں شرمندہ اور خجل ہوں، آپ مجھ کو معاف فرمادیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اس میں معافی یا شرمندگی کی کیا بات ہے۔ تقدیرِ الٰہی کو کون بدل سکتا ہے۔" اس کے بعد آپ نے کسی کو مخاطب کیے بغیر فرمایا۔ "اللہ کا ایک بندہ تھا کہ میں جب بھی اس سے اللہ کی باتیں کرتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا۔ اب میں کس سے اللہ کی باتیں کروں گا۔"

شیخ نے اپنے ایک مرید عبدالرزاق کی بہن سے شادی کرلی تھی اور ان سے شیخ محمد پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے شیخ محمد پر بڑی توجہ دی اور جوان ہوتے ہوتے ان کو علومِ ظاہری اور باطنی میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اپنے سالے عبدالرزاق کو تعلیم و تربیت دے کر عالم بنا دیا تھا اور آپ ان دونوں سے علمی اور دینی باتیں کرکے خوشی محسوس کرتے تھے۔ جب عبدالرزاق کی بہن کا انتقال ہوگیا تو عبدالرزاق نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی۔

اکبرِ اعظم کی طرف سے ایک درباری امیر اور نامور فوجی سردار حسین خان کو لکھنؤ بطور جاگیر مرحمت ہوا۔ یہ ۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) کی بات ہے۔ محمد حسین خان نے دوسرے نامور امیر سید اصغر بدایونی اور قاضی مبارک کو اپنے ساتھ لیا اور لکھنؤ روانہ ہوا۔ حسین خان بھی آپ کا بے حد عقیدت مند تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے امیٹھی جائے گا آپ سے ملے گا۔ اس کے بعد لکھنؤ کی جاگیر سنبھالے گا۔ ملا عبدالقادر بدایونی جو بادشاہ کا معتمد بھی تھا اور شاہی کتب خانے کا نگراں بھی، اس کی علمیت کا ایک زمانہ معترف تھا۔ ابوالفضل اور فیضی اس کے علمی حریف تھے۔ بادشاہ کے حکم پر کئی کتابیں لکھیں اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیں۔ ملا عبدالقادر نے درخواست کی۔ "تم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں بھی اس بزرگ کی زیارت کرلوں گا۔"

حسین خان کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا، ملا کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ راستے میں ملا عبدالقادر کو سمجھایا گیا کہ شیخ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ وہ ایسی باتیں پسند نہیں کرتے۔ ملا عبدالقادر راستے بھر آپ کے بارے میں سوالات کرتا آیا۔

قاضی مبارک نے جواب دیا۔ "اب اس کے بارے میں آپ کوئی سوال کیوں کریں، جو آپ سے اچھی طرح واقف ہے اور آپ

اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

یہ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے ان کا خوش دلی سے استقبال کیا۔

حسین خان نے کہا۔ "میں اپنی جاگیر لکھنؤ جانے سے پہلے آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔"

آپ نے حسین خان سے مصافحہ کیا تو فرمایا۔ "ماشاءاللہ مبارک ہو، اللہ تجھ کو نظرِ بد سے بچائے۔"

سید اصغر سے ہاتھ ملایا تو فرمایا۔ "درود شریف پڑھو اور مجھے بھی سناؤ۔"

سید اصغر نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا حکم صادر فرمایا آپ نے؟"

آپ نے فرمایا۔ "درود پڑھو درود، درود پڑھتا رہ۔"

سید اصغر کے بعد آپ قاضی مبارک سے رجوع ہوئے اور فرمایا۔ "سبحان اللہ۔"

قاضی مبارک نے عرض کیا۔ "سبحان اللہ یا اور کچھ؟"

آپ نے فرمایا۔ "ہاں بس سبحان اللہ۔"

اس کے بعد آپ کی نظر ملا عبدالقادر بدایونی پر پڑی۔ آپ ان سے مخاطب ہوئے۔ ان سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"بسم اللہ، بسم اللہ۔"

کسی مرید نے عرض کیا۔ "حضرت، آپ بڑے لوگوں سے مل لیے، اِدھر ایک نادار طالب علم بھی آپ کی توجہ کا مستحق موجود ہے۔"

آپ نے طالب علم کی طرف دیکھا اور بے ساختہ فرمایا۔ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔" اور فوراً عبدالرزاق کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "کل شیٔ ہالک الا وجہہ۔"

اور اس کے بعد آپ نے وہ واقعات بیان کرنا شروع کردیے جن سے آدمی یا کوئی بھی جاندار شے ہلاک ہو جاتی ہے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ شیطان کیوں مردودِ بارگاہ ہوا۔ اور تاریخ کے بڑے لوگ چشم زدن میں کس طرح ذلیل و خوار ہوگئے۔ طالب علم آپ کی باتیں غور سے سنتا رہا اور آخر میں کہا۔ "آپ جن بڑوں پر اعتراض کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی ہلاکتوں کے اسباب میں ان کا غرور اور ناانصافیاں شامل تھیں اگر میں یہ کہوں کہ ایسا نہیں ہوا اور اس کے اسباب کچھ اور بھی ہوسکتے ہیں تو؟"

آپ نے فرمایا۔ "میں نے تجھ پر پہلے ہی تعوذ پڑھ دیا ہے۔ اب تو اپنی باتوں سے اس کی تائید ہی کرتا رہے گا۔"

ملا عبدالقادر بدایونی نے اب تک جو دیکھا اور محسوس کیا اس سے اسے خوف لگ رہا تھا۔ آپ نے جس کسی کے بارے میں جو اشارہ کردیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ ملا عبدالقادر ملوک شاہ کو اپنے بارے میں ڈر پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں اس کا اندرونی معاملہ سب کے سامنے نہ آجائے۔

ملوک شاہ نے سوچا کہ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگا جائے۔ وہ اپنے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا کہ کہاں سے فرار ہوا جا سکتا ہے۔ اچانک طالب علم کی آواز سنائی دی۔ "کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ان سے اتفاق کرلیں جو اب تک لکھا جاتا رہا ہے اور ہمیں باور کرایا جاتا رہا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اگر یہ بات ہے کہ اب تک جو کام ہوا ہے وہ شک و شبہے سے بالاتر نہیں اور یہ کہ ہم جنھیں پڑھتے اور پڑھاتے ہیں وہ سرے سے اس لائق ہی نہیں کہ ان پر اعتماد اور بھروسا کیا جائے تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟ یہاں تو کیا پڑھے گا؟ میں تجھ کو کیوں پڑھاؤں گا؟"

شیخ پر جلال طاری تھا۔ آپ نے حکم دیا۔ "اس کو اس مجلس سے نکال دیا جائے۔"

لوگوں نے طالب علم کو مجلس سے نکال دیا۔

حالتِ جلال کچھ دیر قائم رہی، اس کے بعد پوچھا۔ "وہ طالب علم کہاں ہے؟"

بتایا گیا۔ "وہ باہر دالان میں بیٹھا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اس کو بلاؤ۔"

لیکن پھر خود کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔ "اچھا ٹھہرو، میں خود اس سے بات کروں گا۔"

اور آپ خود طالب علم کے پاس پہنچ گئے۔ طالب علم اداس بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔

دوسرے لوگ ان باتوں کو توجہ سے دیکھ رہے تھے اور آپ کے مزاجی تغیر و تبدل پر حیران ہو رہے تھے۔

آپ طالب علم کے پاس بیٹھ گئے اور نرمی سے پوچھا۔ "کیا تو ناراض ہوگیا؟"

طالب علم نے جواب دیا۔ "آپ استاد ہیں اور میں ادنیٰ شاگرد، میں کیوں ناراض ہوں گا آپ سے؟"

آپ نے فرمایا "تیری یہ سوچ درست ہے۔ اب میں تجھ کو یہ سمجھاؤں گا کہ تیرا اختلاف بجا۔ اختلاف ضروری بھی ہے لیکن یہ اختلاف فطری، علمی اور بربنائے خلوص ہونا چاہیے۔ اختلاف اس کو نہیں کہتے کہ ہر دور کے پورے کام کو ہی مسترد کر دیا جائے اختلاف کسی کسی سے اور کام کے کسی کسی حصے سے کیا جا سکتا ہے اگر ایسا نہیں ہو گا تو سابقہ علما اور ان کے کاموں کی عمارت گر جائے گی اور پھر ہم کیا پڑھیں گے اور کیا پڑھائیں گے؟"

طالب علم نے عرض کیا "میں رہنمائی چاہتا ہوں، رہنمائی کا مستحق ہوں۔"

آپ نے فرمایا "میں تیری رہنمائی کروں گا اور تیری فکری کجی کو دور کر دوں گا تو فکر مت کر۔"

بادشاہ کے معتمد ملوک شاہ کو سب سے زیادہ حیرت تھی۔ وہ اب بھی خوفزدہ تھا اور اس کو یہی ڈر ستا رہا تھا کہ کہیں سب کے سامنے اس کا باطن ظاہر نہ کر دیا جائے۔

رات ہو گئی۔ ملوک شاہ کو جہاں ٹھہرایا گیا تھا وہ حصہ بیرونی دروازے سے دور تھا۔ ملوک شاہ نے اٹھ کر اس حصے کا جائزہ لیا کہ وہ کہاں سے اور کس طرح فرار ہو سکتا ہے۔

آپ نے ملوک شاہ کو آواز دی "عبدالقادر پریشان مت ہو اور سو جاؤ۔"

ملوک شاہ کی جان نکل گئی "حضرت، مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

آپ نے جواب دیا "نیند تیری سوچ تیرے افکار کے تابع ہے۔ اس سے نجات حاصل کر نیند آ جائے گی۔"

ملوک شاہ نے عرض کیا "میں آپ کے مشورے پر عمل کر کے سونے کی کوشش کروں گا۔"

آپ نے ملوک شاہ کو اپنے پاس بلایا۔ یہاں ایک معمولی چراغ جل رہا تھا اور اس کی روشنی اتنی کم تھی کہ اُس سے زیادہ دُور تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

آپ نے ملوک شاہ سے پوچھا "رات کیسی ہے؟"

ملوک شاہ نے جواب دیا "رات بہت زیادہ اندھیری تیرہ و تار ہے باہر کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

آپ نے ایک طرف اشارہ کیا "اُدھر دیکھو، وہاں شناسا موجود ہیں۔ انھیں پہچانو کہ کون کہاں لیٹا ہے۔"

ملوک شاہ نے اندھیرے کمرے میں ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر کوئی نظر نہیں آیا۔

آپ نے پوچھا "کچھ دکھائی دیا؟"

ملوک شاہ نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔"

آپ نے فرمایا "پھر تم باہر کس طرح جاؤ گے؟ سوچو، غور کرو۔"

ملوک شاہ اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے اس کے پیچھے ملوک شاہ کے ارادوں کا شائبہ موجود تھا۔ ملوک شاہ نے خود کو بستر پر گرا دیا اور سونے کی کوشش کی۔ رات کے پچھلے پہر ملوک شاہ نے کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیا۔ وہاں ہر روز سے زیادہ اندھیرا تھا۔

کسی نے ملوک شاہ کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا "آج روز سے زیادہ اندھیرا ہے۔"

ملوک شاہ نے اندھیرے میں اُس کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پوچھا "تو کون ہے اور یہاں یہ کیا لینے آیا ہے؟"

اُس نے جواب دیا "میں حضرت کا خادم ہوں اور مجھ کو آپ کے پاس یہ جاننے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ آپ کو کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟"

ملوک شاہ نے حیرت سے پوچھا "لیکن تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میں جاگ رہا ہوں؟"

خادم نے جواب دیا "میں یہاں خود سے نہیں آیا، مجھ کو بھیجا گیا ہے۔"

ملوک شاہ نے پوچھا "کیا میں تجھ کو دکھائی دے رہا ہوں؟"

خادم نے جواب دیا "خوب اچھی طرح۔ میری نگاہ تیز ہے اور میں اندھیرے میں بھی دیکھ لیتا ہوں۔"

ملوک شاہ نے زچ ہو کر پوچھا "صبح ہونے میں کتنی دیر ہے؟"

خادم نے جواب دیا "زیادہ دیر نہیں۔ اذان ہو گی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ صبح ہو چکی ہے۔"

ملوک شاہ نے اُس کو رخصت کر دیا "اب تو جا سکتا ہے میرا تجھ سے کوئی کام نہیں۔"

خادم نے جاتے جاتے کہا "حضرت فرما رہے تھے کہ انسان کو اپنے آپ سے ڈرنا چاہیے کسی اور سے نہیں۔ باہر تو بہت

اندھیرا ہے۔"

خادم چلا گیا اور ملوک شاہ کو سوچنے کی دعوت دے گیا۔

فجر کی اذان ہوئی اور ملوک شاہ نمازیوں میں شامل ہو گیا۔ وہاں حسین خان، سید اصغر اور قاضی مبارک بھی موجود تھے۔ تینوں ملوک شاہ کو دیکھ کر مسکرائے۔ آپ نے فجر کی نماز پڑھائی اور اپنے حجرے میں واپس چلے گئے۔ تینوں مہمان ملوک شاہ کو نظر انداز کر کے اپنے اپنے حجروں میں چلے گئے۔ ملوک شاہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ملوک شاہ نے آپ کے بیٹے شیخ محمد کو دیکھا وہ سامنے سے گزر رہا تھا۔ ملوک شاہ نے اُس کو بُلایا اور کہا "صاحبزادے! میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھ کو جانے کی اجازت دلوا دیں۔"

شیخ محمد نے جاتے جاتے کہا "میں بات کرتا ہوں۔"

اور کچھ دیر بعد واپس آ کر جواب دیا "آپ ابھی نہیں جائیں گے والدِ محترم نے آپ کا سوال ٹال دیا ہے۔"

جب دن نمودار ہوا اور روشنی نے صبح اور دن کا فرق واضح کر دیا تو آپ حجرے سے نکل کر مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے میں نمک۔ اس حال میں آپ نے حکم دیا "مہمانوں کو لایا جائے۔"

ملوک شاہ، سید اصغر اور قاضی مبارک کو حاضر کر دیا گیا۔ ان میں حسین خان نہیں تھا۔ صاحبزادے شیخ محمد نے عرض کیا "حسین خان اسول جا چکے ہیں کیونکہ شاہی فرمان کے بموجب اُن کا آج ہی وہاں پہنچنا ضروری تھا۔"

آپ نے فرمایا "میں جانتا ہوں اور میں نے ہی اُس کو جانے کی اجازت دی تھی، وہ میرا طوطا ہے۔"

ملوک شاہ کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ آہستہ سے عرض کیا "حضرت! میں... میرے بارے میں کیا حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا "آیۂ کریمہ کا ورد بہت ضروری ہے پہلے یہ کام بعد میں کوئی اور کام۔"

آپ نے دوسروں کو ذرا ذرا سا نمک اور ملوک شاہ کو ایک تنکہ مرحمت فرمایا اور بتایا "کیا تو اس سے واقف ہے جو پردۂ غیب سے ظاہر ہونے والا ہے؟"

ملوک شاہ نے جواب دیا "میں نہیں جانتا۔"

آپ نے فرمایا "آگرے میں لادین تیرے درپے آزار ہیں آیۂ کریمہ کا ورد ضروری ہے۔"

ملوک شاہ کو بھی اس کا کچھ اندازہ تھا کہ آگرے میں ابوالفضل اور فیضی اس سے خوش نہیں ہیں۔ اکبر دینِ الٰہی میں لوگوں کو داخل کرنے میں کوشاں تھا۔ بیربل بھی اس دین میں داخل ہو چکا تھا۔ ملوک شاہ نے انکار کر دیا تھا، ابوالفضل اور فیضی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے اور ملوک شاہ کے انکار کو بادشاہ کی نظر میں بغاوت ثابت کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان حالات سے ملوک شاہ بھی واقف تھا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، ملوک شاہ نے اُس سے سب کچھ پا لیا۔ ملوک شاہ نے خود کو آپ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

آپ نے تینوں سے کہا "تم یہاں پڑے پڑے اُکتا گئے ہو۔ جاؤ کہیں سیر و تفریح کر آؤ۔"

تینوں آپ کی اجازت پا کر سیر و تفریح کو نکل گئے، امیٹھی کے باہر۔

امیٹھی کے باہر ان لوگوں نے ایک جگہ شور و غل ہوتے سنا۔ وہاں چند سپاہی کسی کو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ تینوں اُن کے قریب گئے۔ دیکھا ایک درویش کو سپاہیوں نے پکڑ رکھا ہے۔

قاضی مبارک نے سپاہیوں سے پوچھا "اس درویش کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا "یہ درویش نہیں چور ہے۔ اس نے چوری کی ہے اور مسروقہ چیز اس کے پاس سے برآمد ہو گئی ہے۔"

ملوک شاہ نے اپنے دوست کو منع کیا "آپ اس معاملے میں نہ پڑیں۔"

بات ختم ہو گئی اور تینوں گھوم پھر کے آپ کے پاس پہنچے۔

کئی گھنٹے بعد ان تینوں نے آپ کے ڈانٹنے کی آواز سنی۔ آپ کسی کو ڈانٹ رہے تھے۔ ملوک شاہ آپ کے پاس گیا اور پوچھا "حضرت! کیا بات ہے؟"

آپ نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا "اس شخص کو دیکھو، درویشوں کے بھیس میں چوریاں کرتا ہے اور یہاں درویشی کا رُعب ڈالتا ہے۔"

ملوک شاہ نے اُسے پہچان لیا۔ اور اُس سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

اُس نے جواب دیا "بات کچھ بھی نہیں، یہ شاہ صاحب، ایک درویش کو چور کہہ رہے ہیں جو کسی طرح مناسب نہیں۔"

ملوک شاہ نے کہا "تو مومن کی فراست کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ہمارے سامنے سپاہیوں نے چوری میں تجھ کو پکڑا تھا پھر تو کس طرح چھوٹ گیا؟"

درویش چور کو جیسے ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ یہاں اس کے جاننے والے موجود ہیں وہ خاموش ہو گیا۔

آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا "اس چور کو یہاں سے نکال دو۔"

اور چور کو وہاں سے نکال دیا گیا۔

اس روز ملوک شاہ کو جانے کی اجازت مل گئی۔ آپ نے کہا "اب تم جا سکتے ہو لیکن تم تینوں حسین خان کے پاس جاؤ اور کچھ دن اس کے مہمان بنو۔ آگرہ نہ جانا۔ جب جانا مجھے مل کر جانا۔"

ملوک شاہ اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر حسین خان کے پاس چلا گیا۔ اس دوران آگرے میں ملوک شاہ کے خلاف بہت بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ملوک شاہ کو ان باتوں کی خبر کیسے نہ ہوئی اور کچھ دن حسین خان کے پاس رہ کر وہ آپ کے پاس واپس ہوا۔ سفر میں حسین خان بھی ان تینوں کے ساتھ تھا۔ رات کو سفر شروع کیا گیا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ نمازِ فجر آپ کے پیچھے پڑھی جائے۔

صبح بالکل قریب تھی۔ راستے میں ایک جگہ بستی کے لوگوں سے پوچھا گیا "یہاں سے امیٹھی کتنی دور ہے؟"

جواب ملا "تین کوس دور۔" (چھ میل)

ملوک شاہ نے اپنے دوستوں سے کہا "اب شاید فجر کی نماز ہم حضرت کے پیچھے نہیں پڑھ سکیں گے کیونکہ صبح ہو چکی ہے۔"

حسین خان نے مایوسی سے کہا "اور جب وہاں پہنچیں گے تو وہ فجر کی نماز پڑھ چکے ہوں گے۔"

دھن کے پکے یہ لوگ امیٹھی میں اس وقت داخل ہوئے جب سورج طلوع ہونے والا تھا۔ حجرے کے در پر کھڑے ہوئے آپ فرما رہے تھے "آؤ فجر کی نماز پڑھ لیں، اب مزید گنجائش نہیں ہے۔"

چاروں کو بڑی حیرت ہوئی اور فجر کی نماز بڑے استعجاب میں ادا کی۔

ملوک شاہ نے پوچھا "حضرت، اب میں جا سکتا ہوں؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں، جاؤ اللہ فضل کرے گا۔"

ملوک شاہ آگرے پہنچا تو وہاں اکبر کی خفگی نے زمانے کو دشمن بنا دیا تھا۔

اس کے ہمدردوں نے بتایا یہ سارا بگاڑ فیضی اور ابوالفضل کا پیدا کردہ ہے۔

ملوک شاہ نے اپنے وطن بدایوں کا رخ کیا۔ وہاں شاہی معتوب کو کسی نے پناہ نہ دی لیکن اسی دوران ابوالفضل کے دل میں رحم پیدا ہوا اور اس نے بادشاہ کو راضی کر لیا۔ ملوک شاہ کو معاف کر کے اس کے منصب پر بحال کر دیا گیا۔

ملوک شاہ کو آپ کی باتیں یاد آئیں اور آیۂ کریمہ کا ورد بھی، وہ ان کا اور زیادہ مداح ہو گیا۔

ملوک شاہ نے ایک بار پھر امیٹھی کا سفر کیا اور حسین خان کے ساتھ حاضری دی۔ ان کو سارا حال کہہ سنایا۔

آپ نے کہا "بھائی، یہ دنیا دھوپ چھاؤں ہے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ، اس سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔"

ملوک شاہ نے چند دنوں کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا۔ آپ نے فرمایا "لیکن تم ہمارے مہمان ہو، کھانا ہمارا ہی کھاؤ گے۔"

اس دوران وہ ملوک شاہ سے ناراض بھی ہوئے اور کئی دن ناراض رہے، پھر مَن بھی گئے۔

یہیں ملوک شاہ نے اپنے بھائی کو بھی ان کا مرید کر دیا۔

اب آپ اسّی سال کے ہو چکے تھے۔ آپ نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اللہ کا ایک بندہ بہت جی لیا اب کب تک جیے گا۔

آپ کے مریدوں کو فکر لاحق ہو گئی اور وہ رونے لگے۔

آپ نے انھیں رونے سے منع کر دیا اور کہا "اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے۔"

آپ ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور آپ کی وفات نے عام و خاص، غریب اور امیر کو یکساں متاثر کیا۔

مضمون کے ماخذ

منتخب التواریخ	گلزارِ ابرار	خیر آباد	ندائے اردو لکھنؤ ۲۱ اگست ۱۹۷۲ء	مقبول میاں خیر آبادی
ملا عبدالقادر بدایونی	محمد غوثی شطاری	مفتی نجم الحسن رضوی خیر آبادی	مخدوم مقبول میاں نمبر	مفتی نجم الحسن رضوی خیر آبادی

پادری کلب

وہ راسخ العقیدہ پادری تھا۔ وہ لوگوں کو بھی عقیدے کی پختگی کا درس دیتا اور دنیاوی سہاروں سے دور رہنے کی تلقین اس کے وعظ کا جزوِ اعظم تھی۔ دیکھنے والے اس کی خوش اعتقادی پر حیران تھے اور حیران ہی رہے۔

ایک ایسی صحبت کا ذکر جس میں عقیدہ اور عمل زیر و زبر کر دیے گئے

محسن رضا

مغربی لندن کے نواحی علاقے میں واقع ہمارے چرچ کی طرف سے ہر سال ایک امدادی بازار لگایا جاتا تھا۔ اس بازار میں فروخت کے لیے رکھی جانے والی چیزیں بھی لوگ عطیے کے طور پر دیتے تھے۔ یہ بازار صرف ایک دن کے لیے لگتا تھا اور اس کی آمدنی چرچ کی توسیع یا اس کے دیگر منصوبوں پر خرچ ہوتی تھی۔ میں اس چرچ میں معاون پادری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

اس سال بھی امدادی بازار ستمبر کے پہلے سنیچر کو لگنا تھا لیکن اس کی تیاریاں وسط جون سے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ تمام انتظامات ہمارے بڑے پادری فادر چارلس ڈیوڈ کے ہاتھ میں تھے۔ انھوں نے ایک اتوار کو چرچ کے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے بتایا "چرچ کمیٹی نے اس سال امدادی بازار سے بارہ سو پاؤنڈ

آمدنی حاصل کرنے کا ہدف مقرر کیا ہے۔ اس رقم سے چرچ کا نیا ہال تعمیر کیا جائے گا۔ میں یسوع مسیحؑ کے حضور دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ لوگوں کے جذبۂ سخاوت کو زیادہ سے زیادہ وسعت عطا فرمائے۔"

اس کے بعد ہر اتوار کو چرچ کے عقب میں ٹوکریاں رکھی جانے لگیں۔ ان میں لوگ وہ چیزیں ڈال جاتے تھے جو اُن کے لیے فاضل اور غیر ضروری ہوتی تھیں۔ بعض لوگ کارِ ثواب کے طور پر نئی چیزیں بھی خرید کر ان میں ڈال جاتے تھے۔ یہی سب چیزیں جمع کر کے امدادی بازار میں فروخت کے لیے رکھی جاتی تھیں۔

پہلے ہفتے زیادہ تر خشک خوراک کے سربند ڈبے جمع ہوئے یا پھر پکی ہوئی ایسی چیزیں جو مدتوں خراب نہیں ہوتیں۔ دوسرے ہفتے فادر چارلس نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ کتابیں عطیہ کریں۔ لیکن ساتھ ہی ہدایت کی ”کتابیں تعمیری، صاف ستھری اور بامقصد ہونی چاہئیں، مخربِ اخلاق قسم کی نہیں۔“

اس سے اگلے ہفتے کھلونوں اور ادنیٰ کپڑوں کی اپیل کی گئی۔ یہ چیزیں تو اتنی تعداد میں جمع ہوئیں کہ جب فادر چارلس نے ان کا جائزہ لیا تو بے اختیار پکار اُٹھے ”بہت خوب! کس قدر فراخ دل ہیں میرے علاقے کے لوگ، مجھے فخر ہے ان پر... مجھے پیار ہے ان سے۔“

آخری اتوار کو فادر چارلس نے اعلان کر دیا کہ آرگس کیمیکل فیکٹری سے ملحق میدان میں بازار لگایا جائے گا۔ ساتھ ہی انھوں نے لوگوں سے درخواست کی ”جتنی مرتبہ بھی آپ کو توفیق ہو دعا کریں کہ جس روز بازار لگے اس روز مطلع صاف رہے، موسم اتنا خوشگوار ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ رہا ہو۔“

میں نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں فادر کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ گزشتہ تین ہفتے سے غیر معمولی طور پر حبس اور گرمی کی لہر آئی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ موسم گرما کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گیا تھا اس لیے کوئی بعید نہیں تھا کہ اس ہفتے بارش ہو جائے، چنانچہ بازار کے لیے بہت بڑا شامیانہ کرائے پر لے لینا بہتر تھا۔ کم از کم چیزیں تو محفوظ رہتیں۔

”فادر نیل! کیا تمھیں خدا پر بھروسا نہیں ہے؟“ فادر چارلس نے شرم دلانے والے لہجے میں سوال کیا۔

”میں نے بارہا ایسے لوگوں کو بھی بارش میں بھیگتے دیکھا ہے جنھیں خدا پر غیر متزلزل یقین ہوتا ہے۔“ میں نے ادب سے عرض کیا۔

”وہ صدقِ دل سے خداوند یسوع مسیحؑ کے ماننے والے نہیں ہوتے۔“ فادر چارلس نے فیصلہ دے دیا۔ ”جن لوگوں کا خداوند یسوع مسیحؑ پر اعتقاد انتہائی مضبوط ہوتا ہے اور وہ اُسی کی خوشنودی کے لیے کوئی کام شروع کرتے ہیں تو اس کام میں کبھی گڑبڑ نہیں ہوتی۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا کام خراب ہوتے نہیں دیکھا۔ اور ان ساری باتوں سے قطعِ نظر... میں نے شامیانہ کرائے پر لینے کے امکان پر غور کیا تھا، معلوم ہے بڑے شامیانے کا کرایہ کیا ہے فادر نیل؟ ایک سو پاؤنڈ۔“

”اگر بارش ہو گئی تو یہ ایک سو پاؤنڈ رائیگاں نہیں جائیں گے۔ گرمی کی لہر دم توڑ رہی ہے۔ مجھے بارش کے آثار محسوس ہو رہے ہیں۔“ میں نے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

”بدگمانی کے دیوتاؤں نے تمھارے کمزور دل کو ڈگمگا دیا ہے فادر نیل!“ فادر چارلس نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں بارہ سال سے یہ بازار لگواتا آ رہا ہوں اور ہر سال ہم نے اپنے ہدف سے زیادہ رقم جمع کی ہے۔ اس سال بھی ایسا ہی ہو گا۔ تم یسوع مسیحؑ کے الفاظ یاد رکھا کرو۔ انھوں نے فرمایا تھا، مانگو! صدقِ دل سے جو مانگو گے ضرور ملے گا! مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ تمھارا اعتقاد کچھ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔“

اس کے بعد فادر چارلس نے اسکول اور یتیم خانے کے بچوں سے بازار کی کامیابی کے لیے دعا بھی کرائی اور چرچ واپس آنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”کیا خیال ہے فادر نیل! کیا خداوند ان چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی دعا بھی قبول نہیں کرے گا؟“

میں نے تصور ہی تصور میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ جب کوئی آپ کے اعتقاد اور ایمان کی آڑ لے کر آپ کو شرمندہ کرنے لگے تو آپ بھلا کیا کہہ سکتے ہیں؟

آنے والے دنوں میں آسمان صاف ہی رہا تاہم درجۂ حرارت بتدریج کم ہو رہا تھا اور نہایت مدھم سی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ ہفتے کا سورج طلوع ہوا تو فضا میں ہلکی سی دھندلاہٹ تھی۔ محکمۂ موسمیات نے ہلکی بارش کی پیشین گوئی کی تھی اور خفیف سا امکان ظاہر کیا تھا کہ شاید کسی مقام پر بارش کچھ زیادہ بھی ہو جائے لیکن ہماری خادمہ مسز پرنگ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں فادر نیل! ہمارے فادر چارلس کے ابلیس سے بھی خصوصی مراسم ہیں۔ اگر خداوند یسوع مسیحؑ نے ان کی بات نہ مانی تو وہ ابلیس سے مدد مانگ لیں گے۔“

یہ زبان دراز خادمہ موقع ملتے ہی ہم پادریوں پر طنز کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔ تاہم میں جب سائیکل پر میدان کی طرف روانہ ہوا تو بدستور تشویش زدہ تھا۔ میدان میں بازار لگائے جانے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ چرچ کی سرگرمیوں میں عملی دلچسپی رکھنے والے شہری رضاکارانہ طور پر اسٹال وغیرہ لگا رہے تھے۔ دو ٹرکوں میں چرچ سے سارا جمع شدہ سامان آ گیا تھا۔ دو دیگنوں میں کچھ پالتو جانور

بھی لائے گئے تھے جو لوگوں نے عطیے کے طور پر دیے تھے۔ ان میں خرگوش، پرندے اور سفید چوہے وغیرہ شامل تھے حتیٰ کہ ایک ٹرک سے چھ عدد مریل سے گدھے بھی اتارے گئے، یہ بھی برائے فروخت تھے۔ قطار در قطار کچھ خواتین بھی چلی آ رہی تھیں جو بازار میں فروخت کی غرض سے رکھنے کے لیے کچھ تازہ کیک، بسکٹ اور پیسٹریاں وغیرہ بھی تیار کر کے لا رہی تھیں۔

فادر چارلس چھلاوے کی طرح چاروں طرف گھوم پھر کر ہر مرد و زن کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور یقیناً دل ہی دل میں دعا بھی کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد چند بوندیں میری چندیا پر گریں اور میں نے تشویش زدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا مگر فادر چارلس نے فوراً ہی خبردار کرنے والے انداز میں مجھے کہنی ماری اور گھٹی گھٹی آواز میں صرف میرا نام لیا۔ وہ گویا مجھے تلقین کر رہے تھے کہ خواہ مخواہ تشویش زدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر لوگوں میں گھبراہٹ مت پھیلاؤ۔

بازار کو باضابطہ طور پر کھلے صرف آٹھ ہی منٹ گزرے تھے کہ جنت کے دروازے بھی کھل گئے۔ ابرِ رحمت، اُمنڈ کر آیا اور وہ دھواں دھار بارش شروع ہوئی کہ خدا کی پناہ! ہالی ووڈ کی کسی فلم میں بھی آج تک ایسی بارش پکچرائز نہیں کی گئی تھی۔ بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں اور بادلوں کی گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔

بے چارے باہمت رضاکاروں نے اسٹالوں کو بچائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن طوفانِ باد و باراں اور بعض دوسرے عوامل کے سامنے ان کی پیش نہیں چل رہی تھی۔ موسلادھار بارش میں سامنے کی چیز نظر نہیں آ رہی تھی اور ہوا ہر چیز کو اُڑائے لیے جا رہی تھی۔ اس آسمانی انقلاب سے گھبرا کر گدھے بے قابو ہو گئے۔ وہ خود تو اپنی رسمی بندشیں تڑا کر آزاد ہوئے سو ہوئے لیکن ساتھ ہی انھوں نے نہایت دردمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کمزور ساتھیوں کی رہائی کا بھی سامان کر دیا یعنی دولتیاں مار مار کر پالتو جانوروں کے نازک پنجرے توڑ دیے چنانچہ خرگوش اور چوہے اِدھر اُدھر پھدکتے بالآخر غائب ہو گئے۔ پرندے کسی نہ کسی طرح بھیگے پَر پھڑپھڑاتے نامعلوم منزلوں کی طرف نکل گئے۔ تازہ پکی ہوئی چیزیں پانی کے دھاروں میں بہتی اور تحلیل ہوتی دکھائی دیں۔

فادر چارلس نے اپنی عینک کے دھندلائے ہوئے شیشوں کے اوپر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”فادر نیل! اچھا ہی ہوا جو تم نے شامیانہ نہیں لگوایا تھا۔ اس طوفان میں تو وہ گر پڑتا، اس طرح کوئی زخمی یا ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔“

اس رات کھانے کی میز پر فادر چارلس چُپ چُپ تھے۔ دوسرے روز چرچ میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بدلی بدلی سی آواز میں کہا کہ آج وہ واعظانہ تقریر نہیں کر سکیں گے کیونکہ گزشتہ روز کے طوفانِ باد و باراں میں بھیگنے سے انھیں ٹھنڈ لگ گئی ہے۔

بازار کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ”صرف خوراک کے ڈبے محفوظ رہ گئے تھے، وہ یتیم خانے میں بھجوا دیے گئے ہیں۔ بہر حال میں ان تمام لوگوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس بازار کے لیے عطیات دیے، کام کیا یا کچھ نہ کچھ خریداری کی۔ ابھی مختلف مدوں میں حاصل ہونے والی رقم کا حساب نہیں کیا گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ جب تخمینہ لگایا جائے گا تو ہمارا ہدف پورا ہو چکا ہو گا۔“

اس حیرت انگیز اعلان کے بعد وہ آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مسز پرنگ نے ان کے کمرے سے آنے کے بعد مجھے بتایا۔ ”فادر چارلس مستحق تو نمونیے کے تھے لیکن انھیں صرف ہلکا فلو ہوا ہے۔ ٹمپریچر ایک سو دو ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اڑتالیس گھنٹے میں وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

مسز پرنگ کا خیال درست ثابت ہوا۔ بدھ کی صبح ناشتے کی میز پر میرا اُن سے سامنا ہوا۔ ان کی پلیٹوں کے پاس ہی خطوط کا ایک پلندہ رکھا تھا۔ مسز پرنگ نے بتایا۔ ”ان خطوط کے علاوہ بھی دو بنڈل آپ کی اسٹڈی میں رکھے ہیں۔“

ایک

ڈاکو کو اس کے جرائم کی سزا کے طور پر فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کیا جا چکا تھا۔ اسکواڈ کے کیپٹن نے اسے مرنے سے پہلے سگریٹ پینے کی پیش کش کی۔ ڈاکو نے کہا۔ ”بہتر ہو گا تم مجھے پانی کا ایک گلاس پلوا دو۔“

کیپٹن نے حیرت سے کہا۔ ”تم پانی مانگ رہے ہو؟ ویسے اگر تم چاہو تو میں تمھیں شراب کا ایک پیگ پلوا سکتا ہوں۔ اس سے تمھارے اعصاب پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”اوہ نہیں۔“ ڈاکو نے جواب دیا۔ ”میں پانی ہی پینا چاہتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں شراب ترک کرنا چاہتا ہوں۔“

دبئی سے فرخ مہدی کی شوخی

فادر چارلس نے ناشتا بھی جاری رکھا اور ساتھ ساتھ مکھن لگانے والی چھری سے خطوط بھی کھولتے چلے گئے۔ خطوط پر وہ رواں تبصرہ بھی کرتے جارہے تھے۔ دراصل وہ خطوط چرچ کے بہی خواہوں کے تھے اور ہر بہی خواہ نے خط کے ساتھ چھوٹی موٹی رقم کا چیک یا پوسٹل آرڈر بھیجا تھا تاکہ امدادی بازار کی تباہی کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوسکے۔

" واہ وا... کیا کہنے میرے علاقوں کے لوگوں کے جذبۂ سخاوت کے... یہ دیکھو... ایک پنشن یافتہ شخص نے دو پاؤنڈ کا چیک بھیجا ہے... اور یہ دیکھو... اس خط میں میری جلد از جلد صحت یابی کی دعا کی گئی ہے اور ساتھ ہی ایک پاؤنڈ کا پوسٹل آرڈر منسلک ہے۔" فادر چارلس کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ ہوا جارہا تھا۔

تاہم مجھے پھر بھی قطعاً اُمید نہیں تھی کہ ساری کی ساری ڈاک کھولنے کے بعد بھی ہم بارہ سو پاؤنڈ کا ہدف پورا کرسکیں گے۔ فادر چارلس گویا میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے بولے۔" فادر نیل! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کبھی ایک راسخ العقیدہ کرسچین نہیں بن سکو گے۔"

اس دوران اسٹڈی میں رکھی ہوئی ڈاک کا پلندہ بھی ان کے سامنے پہنچ چکا تھا اس میں سے ایک لمبا سا لفافہ چاک کرنے کے بعد وہ مسرّت بھرے انداز میں تقریباً چلّا اُٹھے۔" یہ ہے وہ چیک جس کا درحقیقت مجھے انتظار تھا۔"

انھوں نے چیک عین میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ تب میں نے دیکھا وہ مون لائٹ انشورنس کمپنی کی طرف سے پوری بارہ سو پاؤنڈ کی رقم کا چیک تھا۔

" آپ... کا مطلب ہے..." میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ " آپ نے امدادی بازار کا بیمہ کروا لیا تھا...؟"

" ہاں فادر نیل! بیمہ تو میں ہر سال ہی کروالیتا ہوں۔" فادر چارلس نے جواب دیا۔" اور چونکہ گزشتہ بارہ سال سے امدادی بازار کے موقع پر کبھی بارش نہیں ہوئی تھی اس لیے کمپنی ہم سے صرف بیس پاؤنڈ سالانہ پریمیم لے رہی تھی۔"

" یعنی یہ سودا شامیانے کے مقابلے میں سستا تھا۔" میں نے کہا۔

" واضح رہے کہ ہمیں پوری بارہ سو پاؤنڈ کی رقم اس لیے ملی ہے کہ بازار مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا اگر شامیانہ لگا ہوتا اور نقصان جزوی ہوتا تو ہمیں رقم شاید بالکل ہی نہ ملتی یا بہت کم ملتی۔"

مسز پرنگ نے ایک اور پھولا سا لفافہ اٹھا کر فادر چارلس کو تھماتے ہوئے کہا۔" یہ تو کسی بہت ہی بڑے مخیر کی طرف سے آیا معلوم ہوتا ہے۔"

فادر چارلس نے لفافہ چاک کرکے میز پر اُلٹ دیا اور میرے سامنے دس پاؤنڈ والے اتنے نوٹ بکھر گئے جتنے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے کیونکہ میرا ایسی جگہوں سے گزر ہی شاذونادر ہوا تھا جہاں رقومات پائی جاتی ہیں۔

" واہ... واہ... یہ تو چرچ کا کوئی بہت ہی بڑا عقیدت مند اور بہی خواہ معلوم ہوتا ہے۔" مسز پرنگ نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

" بننے کی ضرورت نہیں مسز پرنگ!" فادر چارلس بولے۔" میری طرح تمھیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔"

" کہاں سے آئی ہے؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

" بلی برینڈ کی طرف سے۔" مسز پرنگ نے جواب دیا۔

بلی برینڈ چرچ کے قریب ہی رہتا تھا۔ اس کے کئی طرح کے کاروبار تھے لیکن سب کچھ مشکوک سے ہی تھے۔ اس کے علاوہ وہ بُکی بھی تھا شرطوں کا کاروبار کرتا تھا۔

" کتنی رقم ہے فادر؟ بارہ سو پاؤنڈ؟" مسز پرنگ نے پوچھا۔

" بارہ سو ساٹھ پاؤنڈ۔" فادر چارلس نے تصحیح کی۔" میری شرط کی رقم بھی تو واپس ملی ہے نا۔"

" آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے بارش کے سلسلے میں شرط لگا رکھی تھی؟" میں نے میٹھی میٹھی آواز میں پوچھا۔

" ہاں، میں نے سوچا ایک کے مقابلے میں بیس کی شرط لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ اُدھر بلی برینڈ نے سوچا کہ بارہ سال سے ان دنوں میں بارش نہیں ہوئی اس لیے اس سال کہاں سے ہوگی چنانچہ اس نے بے خوف و خطر شرط بُک کرلی۔" فادر چارلس نے جواب دیا۔

" اس کا مطلب ہے آپ کو تو اصل ہدف کے علاوہ بھی بارہ سو پاؤنڈ کا منافع ہوگیا۔" میں نے بے تعینی سے کہا۔

" اس سے بھی زیادہ۔" فادر نے جواب دیا۔" ڈاک میں آئے ہوئے عطیات کو بھول رہے ہو کیا؟ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا کہ ہم نے بازار کی تباہی کے باوجود اپنے ہدف سے زیادہ رقم حاصل کرلی تو خداوند پر ان کا ایمان و ایقان اور مضبوط ہوجائے گا۔"

" لیکن فادر...!" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔" آپ خداوند پر ایمان و ایقان کی باتیں کس مُنہ سے کریں گے جبکہ آپ بازار لگانے سے پہلے ہی انشورنس کمپنی سے معاملت کرتے پھر رہے تھے... ایک سٹے باز سے شرط لگاتے پھر رہے تھے۔"

" تم ٹھیک کہتے ہو فادر نیل!" فادر چارلس آہ بھر کر بولے۔" معلوم نہیں میرا انجام کیا ہوگا، کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ میں سچا کرسچین ہوں بھی یا نہیں، لیکن دیکھو نا... تم خود سوچو۔" ان کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک اُبھر آئی۔" خداوند بھی تو انھی کی مدد کرتے ہیں نا جو خود اپنی مدد آپ کرنا بھی جانتے ہوں، کیا خیال ہے؟"

FATHER DUDDLESWELL'S
SILVER LINING.
Neil Boyd.

قامت

علیم شام

دیارِ محبت میں دُنیاوی حساب کتاب نہیں چلتے بلکہ اس نگر کے اپنے اُصول، اپنے قانون ہوتے ہیں۔ اس بستی کے رہنے والوں کی سزائیں بھی الگ ہوتی ہیں اور جزائیں بھی۔ ان صفحات میں جو کہانی پیش کی جارہی ہے اُس میں چند بونے خود کو ایک آدم قد انسان سے وابستہ و پیوستہ سمجھتے ہیں۔ تعلق کے اس سچے رشتے کے درمیان وہ کسی دوسرے کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے

اُن کم قامتوں کا ماجرا جن کی محبت بڑی قد آور تھی

سرکس کا سب سے مقبول اسٹار دراز قد میکسی اپنے چھ ساتھی بونوں کے ساتھ اسٹاک ہوم کی پرواز سے آنے والا تھا۔ وہ صبح مجھے آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ایک چمکیلا دن تھا۔ میکسی کی رولز رائس میں ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ہم اس موسمِ گرما کے شکر گزار تھے جس نے پاپا گوڈین کو سرکس شو مزید چار ہفتے جاری رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میکسی کو برمنگھم میں شو کا آغاز کرنا تھا۔ معمول کے مطابق... بغیر کسی چھٹی کے۔

مجھے امید تھی کہ ثانوی اور معاون پروگرام اسے پسند آئیں گے۔ پروگرام کا شیڈول اسے پسند آیا تھا۔ اس دوران جو سفر بھی انھیں کرنا تھا، وہ مختصر تھا۔ تمام سہولتیں میسّر تھیں۔ بونوں کو اتوار کا دن کار کے سفر میں گزارنا پڑتا تو میکسی بہت ناخوش رہتا تھا۔ وہ ہر جگہ ایسے پہنچنا چاہتا تھا کہ بونے لنچ نئی جگہ کر سکیں تاکہ وہ قصبے والوں کو اور قصبے والے بونوں کو دیکھ سکیں۔ یہ بہت اچھی پبلسٹی ہوتی تھی۔ بونے تعریف سے بہت خوش ہوتے تھے۔ میکسی ہنستا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا۔ انھیں پروگرام کے پوسٹر دکھاتا۔ میکسی بونوں سے اسی طرح محبت کرتا جیسے وہ اس کے بچّے ہوں۔

وہ بونوں سے پہلی بار جنگ کے بعد ملا تھا اور پہلی ملاقات میں ہی وہ اُسے پسند آگئے تھے۔ وہ جنگ سے تباہ شدہ یورپ میں سفر کر رہا تھا کہ جرمنی کی سرحد پر اُسے کاغذات کے باوجود دھر لیا گیا۔ کچھ دیر پوچھ گچھ کے بعد اسے کیمپ پہنچا دیا گیا۔

میکسی کی سمجھ میں افسران کا رویّہ ہی نہیں آرہا تھا۔ اس نے ان کا موقف سمجھنے کی کئی ناکام کوششیں کیں اور پھر تن بہ تقدیر ہوگیا۔ وہ خاردار تاروں کی باڑھ کے پاس جاتا اور باہر کی دنیا کا نظارہ کرتا جو اس کے لیے ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔

ایسے ہی ایک موقع پر اس نے انھیں دیکھا۔ نظر بندوں کے لیے جو لیٹرین بنے ہوئے تھے، ان کے عقب میں وہ چھ بونے اہرام کی شکل ترتیب دیے کھڑے تھے۔ میکسی نیم تاریکی میں کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔

پھر وہ ترتیب بکھری اور تمام بونے سر کے بل کھڑے ہوگئے۔ پھر وہ گاڑی کے پہیّوں کی طرح گول مول ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے ایک نیا اہرام ترتیب دے ڈالا۔ ان کے انداز میں بلا کی پھُرتی اور مہارت تھی۔

میکسی کو ایک نظر میں اندازہ ہوگیا کہ وہ بھی اُس کی طرح پیدائشی فن کار ہیں۔ اس لمحے اسے شدّت سے بے گھر بے وطن ہونے کا احساس ہوا لیکن ساتھ ہی وہ خوشی بھی ہوئی جو کسی کو پردیس میں اپنے کسی ہم وطن سے ملنے، اپنی زبان بولتے سننے سے ہوتی ہے۔

بونوں نے ریہرسل ختم کی اور چلے گئے۔ تب میکسی کو شدّت سے بدبو کا احساس ہوا۔ نظر بندوں کے لیٹرین کی صفائی کا خیال کہاں رکھا جاتا ہے۔ اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ وہ وہاں سے ہٹ آیا۔

پھر وہ ہر روز وہاں پہنچتا۔ بونے باقاعدگی سے ایک مخصوص وقت میں وہاں آتے اور یوں ریہرسل کرتے جیسے انھیں اپنے اور اپنے فن کے تابناک مستقبل پر ناقابلِ شکست اعتماد ہو۔ میکسی جانتا تھا کہ یہ وہ کیمپ ہے جہاں لوگوں کو ڈالنے کے بعد بے کار چیزوں کی طرح بھُلا دیا جاتا ہے۔ ایسے میں ان بونوں کا حوصلہ اور خود اعتمادی اسے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

آٹھویں دن میکسی نے دیکھا کہ کیمپ کا ایک افسر انھیں وہاں سے بھگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس روز اس نے اس منّنک بونے کی آواز سنی جسے دوسرے اسپیرو کہتے تھے۔ وہ احتجاج کر رہا تھا۔ فرانسیسی زبان میں کہہ رہا تھا کہ پورے کیمپ میں یہ واحد جگہ ہے جہاں وہ کسی مداخلت کے خوف کے بغیر اپنے ایکٹ کی ریہرسل کر سکتے ہیں۔ جہاں کوئی انھیں ڈسٹرب نہیں کرتا۔ اس لیے کہ بدبو کی وجہ سے کوئی اس طرف آتا ہی نہیں۔

کیمپ کا افسر بے حد تھکا ہوا اور چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ دن بھر مختلف زبانوں میں اسے طرح طرح کے سوالات اور شکایات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس نے اسپیرو کو دھکّا دیا۔ اسپیرو زمین پر گر گیا۔

اسی لمحے افسر نے محسوس کیا کہ ایک بہت بڑا ہاتھ اسے اٹھا رہا ہے۔ وہ زمین سے اٹھتا چلا گیا۔ پھر سنہرے بالوں والے دیو نے پولش زبان میں اس سے کہا: ”یہ فن کار ہیں۔ ان کے لیے ریہرسل ضروری ہے۔ سمجھے؟“

میں تصور کر سکتا ہوں کہ میکسی نے جس وقت افسر کو زمین پر اتارا ہوگا تو وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا ہوگا۔

بونوں نے میکسی کو دیکھا۔ طاقت ور، مضبوط اور دراز قد میکسی کو۔ میکسی نے اسپیرو کو اٹھایا اور اپنی ہتھیلی پر کھڑا کر لیا۔ پھر وہ اپنے چوڑے چکلے ہاتھ کو جس پر اسپیرو کھڑا تھا، اپنے چہرے کے سامنے لایا کہ دو بدو بات کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔ اس نے اسپیرو کا جائزہ لیا، بڑی احتیاط سے اُسے فضا میں اُچھالا اور گیند کی طرح کیچ کر لیا۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے میں گرم جوشی تھی۔ بونوں کو احساس ہوا کہ انھیں ایک طاقت ور دوست مل گیا ہے۔

اسپیرو نے بھی فوراً ہی ہر امکان کو سمجھ لیا۔ وہ پڑھا لکھا بونا تھا۔ ادب کا مطالعہ اس کی ہابی تھی۔ اس نے میکسی کو گلیورز ٹریول کی خوبصورت کہانی سنائی۔ ان دونوں نے مل کر اس ایکٹ کی جزئیات طے کیں۔ پھر میکسی اور بونوں نے ہر روز اس ایکٹ کی ریہرسل کی، یہاں تک کہ اسے پرفیکشن تک پہنچا دیا۔ پھر وہ اماوس کی کسی رات کے انتظار میں بیٹھ گئے... اماوس کی پہلی ہی

رات وہ خاردار تاروں کے نیچے سے پھسل کر آزادی کی منزل تک پہنچ گئے۔

پیرس میں میکسی کی ملاقات پاپا گوڈین سے ہوگئی۔

پاپا گوڈین میکسی سے اپنی ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ بگ ٹاپ تھیٹر میں ریہرسل ہو رہی تھی کہ میکسی اس انداز میں داخل ہوا کہ کوئی بونا اس کے کندھے پر چڑھا ہوا تھا، کوئی اس کے بازو سے جھول رہا تھا۔ وہ ایک درخت کی طرح تھا اور بونے جیسے اس کے وجود کی شاخوں کی طرح تھے۔ پاپا گوڈین نے جو نسلاً فرانسیسی تھا، میکسی کو سینے سے لگا لیا۔ اس نے اتنا مضبوط اور اتنا بہادر آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بونے بھی بہت مطمئن تھے۔ وہ خود کو بہت محفوظ سمجھ رہے تھے۔ اسپیرو نے انھیں بتا دیا تھا کہ وہ میکسی کو خود سے جدا نہ سمجھیں۔ وہ اور میکسی ایک ہیں۔

پاپا گوڈین اپنے وجدان پر بھروسا کرنے کا عادی تھا۔ وہ کسی چیز کو ایک نظر دیکھ کر اس کا کھرا کھوٹا پرکھ لیتا تھا۔ اس نے اسی رات میکسی اور اس کے چھ بونوں کو اپنے سرکس میں موقع دیا۔ وہ کامیاب رہے اور آنے والے مہینوں میں کامیاب تر ثابت ہوئے۔

میکسی اس ٹیم کا شومین تھا اور اسپیرو دماغ۔ میں نے اسپیرو کو جب دیکھا، اپنے سے زیادہ وزن کی کتابیں بغل میں دبائے دیکھا۔ اس کی گفتگو آنکھ بند کر کے سنی جاتی تو لگتا کہ کوئی پروفیسر عالمانہ اور پُرمغز گفتگو کر رہا ہے۔ اس کے پاس نالج تھی اور وہ اس کا بھرپور مظاہرہ بھی کرتا تھا۔ مجھے بونوں پر کبھی اعتماد نہیں رہا لیکن وہ بونا اسپیرو ایک عام جسامت والے کسی شخص سے زیادہ پُراعتماد تھا۔ اُس کے اس اعتماد پر مجھے اُس سے نفرت محسوس ہوتی۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ بونوں کو بونا ہی رہنا چاہیے...

اب ائر پورٹ کی عمارت نظر آنے لگی تھی۔ میری کار ایک اشتہاری بورڈ کے قریب سے گزری۔ بورڈ پر سرخ بالوں والی ایک حسینہ کی تصویر تھی جو کہہ رہی تھی کہ میرا دل جیتنے والی مسکراہٹ لومی ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے والوں کو ہی میسّر آسکتی ہے۔ میں نے اس حسینہ کو زیرِ لب بددُعا دی کیونکہ اُسے دیکھ کر مجھے ڈیلا رائے اور اس کا ایکٹ یاد آگیا تھا۔ پھر میں نے سر جھٹک کر گویا ڈیلا رائے کو بھی ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

مجھے یاد تھا کہ اسپیرو نے نٹ بازی پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود فرینکی کا گروپ ٹوٹا تو میں نے ڈیلا کو بُک کر لیا۔ اسپیرو کے پروگرام میں جھولے کے ایک کرتب کی گنجائش بہرحال موجود تھی۔ میں نے سوچا، اسپیرو کو ڈیلا کو قبول کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے اس کے لیے پروگرام ترتیب دیتے وقت جو تاریخیں ترتیب دی تھیں، وہ اس کے لیے گُڑ کی ڈلی کی طرح تھیں جس کی وجہ سے وہ ڈیلا کی تلخی برداشت کر سکتا تھا۔

طیارے نے زمین کو چھوا تو میں فوٹوگرافرز کو جمع کر چکا تھا۔ میکسی بونوں کے ساتھ جہاز کے دروازے پر نمودار ہوا۔ انھیں فوٹوگرافرز کو دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ کیونکہ بونے تو میکسی پر بری طرح لد گئے تھے۔ وہ میکسی پر لدے لدے اپنے اونٹ کی کھال کے کوٹوں کی بیلٹس کس رہے تھے۔ میکسی کی طرح وہ بھی ہاتھوں میں چرمی دستانے پہنے ہوئے تھے۔ ساتوں کے کوٹ اور جوتے بھی ایک سے تھے۔ میں اُن کی شومین شپ کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا اور میکسی یوں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے انھیں تلاش کر رہا ہو۔ جیسے اسے یہ علم ہی نہ ہو کہ جنھیں وہ ڈھونڈ رہا ہے، وہ تو اس پر ہی لدے ہوئے ہیں۔ جیسے بونوں نے دیو کو بے وقوف بنا دیا ہو۔ فوٹوگرافرز کے کیمرے ہر چیز کو سیلولائیڈ پر منتقل کر رہے تھے اور میں فوٹوگرافرز کا شکر گزار تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ تصویریں ہنگامہ برپا کر دیں گی، تہلکہ مچا دیں گی۔ وہ شاہکار پبلسٹی تھی۔

میکسی نے گویا مجھے دیکھا تو اس نے ہاتھ ہلایا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح میکسی کو خوش آمدید کہنے کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ موسمِ گرما کی چلچلاتی دھوپ ہو یا برف باری، وہ ٹرین سے آئے، جہاز سے آئے یا بحری جہاز سے، میں اس کا استقبال خود کرتا تھا اور وہ ہر بار پہلے مجھے دیکھ کر حیران ہوتا اور پھر اس کے چہرے سے شکر گزاری کا تاثر جھلکنے لگتا۔

اُس روز اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھتے ہوئے میں بہت خوش تھا۔ میکسی سے مل کر ہمیشہ تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ پچھلے عرصے کی گھٹن شدت سے محسوس ہونے لگتی تھی۔ میکسی دیو قامت آدمی تھا۔ اس کی ٹانگیں، بازو اور جسم بے حد توانا اور مضبوط تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں ہر وقت ہنستی محسوس ہوتیں۔ میکسی بہت اچھا انسان تھا۔ لگتا تھا، شیطنت اُسے چھُو کر بھی نہیں گزری ہے۔

ہم دونوں نے مل کر چھ عدد بونوں کو کسٹم کے مراحل سے گزارا۔ کیمرے تمام راستے ہمارا تعاقب کرتے رہے۔ عالم و فاضل بونے یعنی اسپیرو نے معمول کے مطابق عالمانہ انگریزی میں

انٹرویو دیا۔ یہ اس کی عجیب خصوصیت تھی۔ کسی کرتب باز بونے سے کوئی بھی علمیت اور مطالعے کی توقع نہیں رکھتا۔ وہ شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی زبان بولتا تو اس کی کشش بڑھنے لگتی۔ جب میکسی کو محسوس ہوتا کہ اسپیرو ضرورت بھر بول چکا ہے تو وہ نرمی سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا۔ اسپیرو جیسے ہی اس کے ہاتھ کے دوستانہ دباؤ کو محسوس کرتا، خاموش ہو جاتا۔ وہ میکسی سے بہت محبت کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا کہ ایک نہ ایک دن میکسی کے چوڑے چکلے کندھوں کے درمیان اسپیرو ہی کا چاقو پیوست ہوگا۔

لیکن میری یہ سوچ غلط تھی۔ اسپیرو واقعی میکسی سے عشق کرتا تھا۔ اس کے عشق میں سادگی اور کاملیت تھی۔

ہم ائرپورٹ سے نکلے۔ میکسی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھا اور بونے عقبی نشست پر۔ ہم ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کے قریب سے گزرے تو مجھے ڈیلا کا خیال آگیا۔ میں نے میکسی کو بتایا کہ اس بار اس کے شو کا آغاز جھولے کے کرتب سے ہوگا۔ مجھے اپنی گردن کے قریب اسپیرو کی لہسن کی بو میں رچی سانسیں محسوس ہوئیں۔ لہسن کی بو سے مجھے شدید الرجی تھی لیکن یہ بو مجھے برداشت کرنا پڑتی تھی۔ میں نے جلدی سے وضاحت کی کہ ڈیلا کو ڈراپ کرنا کس کس اعتبار سے ناممکن ہے۔ میکسی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ عقبی نشست پر اسپیرو اپنے ساتھی بونوں کو کسی ایسی زبان میں سب کچھ بتا رہا تھا جسے وہ سب سمجھتے تھے۔

مجھے ان بونوں کے بارے میں عجیب سا احساس رہتا تھا۔ مجھے وہ ایک معلوم ہوتے تھے۔ اسپیرو سر تھا اور باقی جسم۔

لہسن کی بو پھر آئی اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ اسپیرو میری طرف جھکا ہے۔ "ایکٹ کا معیار متاثر نہ ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے کہا۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ لہسن کی بو پھر دور ہوگئی تھی۔

اوکس برج سے گزرتے ہی میکسی نے گاڑی ایک درخت کے سائے میں روکی اور اسپیرو سے بادام طلب کیے۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔ میکسی سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جا سکتی تھی لیکن یہ اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ اب کیا سامنے آنے والا ہے۔

میکسی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو بال دار جانور برآمد کیے۔ "یہ سنہرے چوہے ہیں۔ تھیلیوں والے۔" اس نے وضاحت کی۔

اسپیرو نے بادام کی تھیلی میکسی کی گود میں ڈال دی۔ میکسی نے ہتھیلی پر بادام رکھ کر چوہوں کو کھلائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوہوں کی تھیلیاں بھر گئیں اور ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ میکسی ہنسنے لگا۔ ہنستا رہا۔ بونے اسے خوش دیکھ کر خوش تھے۔

میکسی نے چوہوں کو پھر جیب میں رکھ لیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسپیرو کو دیکھا۔

"میکسی کا کہنا تھا کہ اِن کا پنجرہ بہت چھوٹا ہے۔" اسپیرو نے بتایا۔

"کسٹم والوں کو پتا چل گیا تو یہ اسمگلنگ کا کیس بنے گا اور تم پر تگڑا جرمانہ ہوگا۔" میں نے میکسی سے کہا۔

"ہم ان کے لیے بڑا پنجرہ بنوالیں گے۔" میکسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی روز چوہوں کے لیے پنجرہ خرید لیا گیا۔ انھیں سُلانے کے بعد میکسی ایک گیت گانے لگا۔ میرا خیال ہے، وہ اس کا اپنا گیت تھا۔ وہ اسے اسی دُھن میں مختلف زبانوں میں گاتا تھا۔ بونے بھی اس کے ساتھ شامل ہوجاتے۔ دُھن انھیں یاد تھی اور زبان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ نتیجہ بے حد متاثر کن ہوتا تھا۔

برمنگھم تک وہ گاتے رہے۔ کبھی گاڑی کسی سگنل پر رکتی تو دوسری کاروں میں بیٹھے لوگ بڑی دلچسپی سے انھیں غور سے دیکھتے اور سنتے۔ مجھے خوشی تھی کہ میکسی محظوظ ہو رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگلی رات شو کے افتتاح کے موقع پر میکسی نروس ہوگا۔ ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔

میری بات درست ثابت ہوئی۔ میکسی اتنا نروس تھا کہ جب تک اسپیرو اُسے بُلانے نہیں آیا، وہ ڈریسنگ روم ہی میں بیٹھا رہا۔ اسپیرو یوں بھی کال بوائز پر بھروسا نہیں کرتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی پر بھی اعتماد نہیں کرتا تھا۔

ایک بار پھر میکسی اور بونوں نے کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ للی پُٹ کے ٹاؤن اسکوائر کا منظر تھا۔ میکسی چھتوں سے بہت زیادہ بلند دکھائی دے رہا تھا۔ بونے کھڑکیوں اور دروازوں سے اسے جھانک رہے تھے۔ دو بونے بالکل ایک جیسے تھے۔ جُڑواں بھائی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے چند کرتب دکھلائے۔ حالانکہ درحقیقت دونوں بونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان کی قومیت تک جُدا تھی لیکن دیکھنے والے انھیں جڑواں بھائی ہی سمجھے۔ شو ختم ہونے کے بعد بھی ریستورانوں میں ان کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ اسپیرو کا کمال تھا۔ اس نے ان دونوں

کے بال سرخ رنگوا کر یہ بھرپور تاثر ڈالا تھا۔

سب سے چھوٹا بونا نسلاً اسپینی تھا۔ وہ ٹرمپٹ بجاتا تھا اور کمال کا بجاتا تھا۔ ایک ترک تھا۔ وہ بیک وقت کم و بیش سولہ گیندیں ہوا میں اچھالتا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ ہلتا بھی نہیں تھا اور تمام گیندیں اس کی کسی نہ کسی جیب میں آکر گرتی تھیں۔ اپنے اس کمال پر اس نے بھی بڑی داد سمیٹی۔

لیکن سب سے کامیاب وہ بونا تھا جو تنی ہوئی رسّی پر چلتا اور والہانہ انداز میں رقص کر کے دکھاتا۔ اسپیرو نے اس کے لیے وزن کی حد مقرر کر دی تھی اور اس کی ڈائٹنگ کے سلسلے میں بڑی سختی برتتا تھا۔ وہ اس کا وزن ایک اونس بھی نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ بات معقول بھی تھی۔ بونوں کا وزن اونس میں بڑھنا عام لوگوں کے پونڈز میں بڑھنے کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے بہرحال اس بے چارے پر بڑا ترس آتا تھا۔ ایک رات میں نے چپکے سے اسے ٹافیوں کا ایک پیکٹ دیا لیکن اگلی صبح وہی پیکٹ مجھے اپنے بریف کیس میں رکھا ملا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اسپیرو کی حرکت ہے۔

اسپیرو مزاحیہ فقرے بولتے ہوئے رسّیوں کو جھلاتا گھما رہا جو اس کے چھوٹے اور موٹے موٹے ہاتھوں میں سانپوں کی طرح لہرا، بل کھا رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ شیکسپیئر کی شاعری دہراتا رہا۔

یہ تفصیل سن کر آپ کہیں گے کہ شاید میکسی نے کچھ نہیں کیا لیکن ایسا نہیں تھا۔

گلیور والے ایکٹ کو انھوں نے کیمپ میں تیار کیا تھا۔ وہ ایکٹ یوں شروع ہوا کہ اسپیرو میکسی کو رسّیوں سے باندھ رہا تھا۔ دوسرے تمام بونے ہنسی خوشی باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ انھوں نے میکسی کو جال میں الجھا کر گرا لیا تھا اور اپنی دانست میں اسے قیدی بنا کر خوش تھے۔ ایک چھوٹے سے مکان سے وہ رنگ برنگے اسٹیل ہتھوڑے اور کیلیں لا کر میکسی کو اسٹیج پر فکس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر میکسی نے ایک زبردست کروٹ لی۔ اس نے جال کو کھینچا اور بونے بھی جال سے چپکے کھنچے چلے آئے۔ میکسی نے جال کو گھمانا شروع کیا۔ بونے جال سے چپکے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں آئینے تھے، جن سے اسٹیج کی روشنیاں منعکس ہو کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چُندھیائے دے رہی تھیں۔ وہ عجیب سا جادوئی منظر تھا۔ تاثر سے بھرپور۔ پس منظر موسیقی اس کی اثر انگیزی کو اور بڑھا رہی تھی۔

تماشائی مبہوت ہو کر رہ گئے اور پھر اچانک تالیوں کا طوفان اُمڈ آیا۔ میں بھی بے اختیار کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔

وہ میرے لیے خوشی کا دن تھا۔ میں میکسی کا ایجنٹ تھا، آمدنی کا دس فی صد میرا تھا۔

میکسی اور بونے کبھی کسی ہوٹل میں ٹھہرتے اور کبھی کسی سرائے میں۔ مگر ہوتے وہ ساتھ ہی تھے۔ برمنگھم میں انھیں ایجبسٹن ہوٹل میں شاندار کمرے ملے تھے۔ اس رات ہم نے زوردار کھانا کھایا۔ سب کے سامنے اپنی اپنی پسندیدہ ڈشیں رکھی تھیں۔ بونے اپنے ساتھ اپنے کُشن لائے تھے جن کی مدد سے وہ میز تک پہنچے تھے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ بونا اسپیرو مجھ سے بڑا ہے۔ اس رات ترک بہت خوش تھا کیونکہ میکسی نے اس کے لیے گلاب کا جام اور یوگارٹ فراہم کی تھی۔ وہ بہت زور و شور سے کھا رہا تھا۔ پھر اسپیرو نے میز کے نیچے اس کی پسلیوں میں کہنیاں ماریں۔ ترک رونے لگا۔

میکسی نے ترک کو اٹھا کر اپنے گھٹنوں پر بٹھایا اور اپنے رومال سے اس کی گول سیاہ آنکھیں پونچھیں۔ پھر وہ گنگنانے لگا، یہاں تک کہ ترک اپنا دُکھ بھول گیا۔ وہ میکسی کا گیت گانے لگا۔ اس کی باریک مگر سُریلی آواز بے حد خوب صورت تھی۔

ترک کا موڈ ٹھیک ہونے کے بعد ہم سب پوکر کھیلنے لگے۔ داؤ بہت چھوٹے لگائے جاتے تھے اور ہارنے والا آئی او یو کی تحریر دیتا تھا، جو اگلے گیم میں... اور اس سے

اگلے گیم میں بھی چلتی تھی... بلکہ لگتا تھا، زندگی بھر چلتی رہے گی۔
یہ میکسی اور بونوں کا اپنا مالی نظام تھا۔ ایکٹ سے حاصل ہونے والی حقیقی دولت کا حساب کتاب اسپیرو رکھتا تھا وہی منتظم اعلیٰ بھی تھا۔ وہ سب متفق تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جنوب میں نارنگیوں کا ایک باغ خریدیں گے۔

میرے حساب کے مطابق وہ اس وقت بھی نارنگیوں کے تین باغ خرید سکتے تھے لیکن میں نے ان کے مستقبل کو کبھی اس انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ میں تو یہ جانتا تھا کہ ان کا ایکٹ عمر بھر یونہی چلتا رہے گا اور وہ کبھی ریٹائر نہیں ہوں گے۔

اس رات میرا ارادہ رات کی ٹرین سے لندن جانے کا تھا لیکن معمول کے مطابق میں اس ارادے پر عمل نہ کر سکا اور صبح کے چھ بج گئے۔

میکسی نے مجھے اوپر بھیجا تاکہ میں اپنے بال دھو آؤں جن میں اسپیرو کے سگار کی بو رچ گئی تھی۔ میں نیچے واپس آیا تو وہ ہال میں میرے منتظر تھے اور اتنے تروتازہ لگ رہے تھے جیسے آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر جاگے ہوں۔

ہم ہوٹل کے دروازے سے نکلے۔ اسپیرو کے پیچھے جسم اچھل کود کر میکسی کو اور ایک دوسرے کو پانچ چھ مختلف زبانوں میں صبح بخیر کہہ رہے تھے۔ جسم یعنی وہ باقی پانچ بونے۔

اسپیرو نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ "تمھارے لیے ایک نیا ایکٹ۔" اسپیرو نے کہا۔ "دنیا کا سب سے لمبا آدمی..."

اسپیرو کے اشارے پر میں نے اس لیمپ پوسٹ کی طرف دیکھا۔ لکڑی کی ایک صلیب کے سہارے میرا کوٹ لٹکا صبح کی نرم ہوا میں جھول رہا تھا۔ لیمپ پوسٹ کے اوپر میرا ہیٹ تھا۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی کے سامنے کپڑے کی ایک نقاب سی تھی جس میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے، جو روشن نظر آ رہے تھے۔

میں تیزی سے میکسی کی طرف مڑا جو دروازے سے ٹیک لگائے ہنس رہا تھا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ یہ بے ہودہ مذاق ہے۔ مگر اس نے اپنا اونٹ کی کھال والا کوٹ اتار کر میرے جسم پر لپیٹ دیا اور بولا۔ "یہ مجھے پارسل کے ذریعے واپس بھجوا دینا۔ ورنہ دنیا کے سب سے لمبے آدمی کو نیچے اتارنے کے چکر میں تمھاری ایک ٹرین اور نکل جائے گی۔"

اپنے نئے کوٹ کے حشر نشر کی وجہ سے آنے والا میرا غصہ اس کی نرمی اور گرم جوشی کی دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گیا۔ میں معمول کے مطابق کار میں میکسی کے ساتھ بیٹھا۔ اسپیرو اور جسم کے تمام اعضا یعنی وہ تمام بونے پچھلی نشست پر تھے۔

میں نے عقبی کھڑکی سے اپنے کوٹ کو لیمپ پوسٹ پر لہراتے دیکھا، دنیا کا سب سے لمبا آدمی مجھے ساری دنیا کا منہ چڑاتا محسوس ہوا۔

میں ٹرین میں بیٹھا۔ ٹرین چل دی۔ میکسی اور اس کے ساتھی بونے کافی دور تک میرے ڈبے کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے۔ وہ ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ میکسی اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

مجھے ایک ماہ بعد میکسی کو نوٹنگھم میں ریسیو کرنا تھا لیکن مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ میں اس کے لیے وقت نہیں نکال سکا۔ کرسمس سے پہلے کے چند ماہ میرے لیے ہمیشہ بہت زیادہ مصروفیت لاتے ہیں۔ مجھے اپنی نئی دریافت کے لیے پروگرام مرتب کرنا تھے۔ وہ کامیڈین تھا۔

کوئی نو ہفتے بعد میں نے میکسی کو دیکھا۔ اس عرصے میں مجھے ایک بار بھی ڈیلا رائے کا خیال نہیں آیا تھا۔

یہ ملاقات لیورپول میں ہوئی تھی۔ میکسی اور بونے ریلوے اسٹیشن پر اپنے خیر مقدم کے منتظر تھے۔ میں نے جسم سے ہاتھ ملایا، ایک کے کان کھینچے۔ ایک کی ناک مروڑی، پھر احتراماً اسپیرو کے سامنے سر خم کیا۔ نہ جانے کیوں، مجھے احساس ہوا کہ اسپیرو کی نگاہوں میں فکر مندی ہے۔

میکسی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹیشن کی حدود سے نکالی اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اس نے بلا ضرورت کہا۔ "تمھارے لیے پہلی قطار میں نشست محفوظ ہوگی۔ ہے نا؟"

"ہاں... لیکن پہلے میں آرڈن میں ایک ایکٹ دیکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "البتہ تمھارے دوسرے شو سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

"جلدی نہ بھاگ لینا۔ میں تمھیں زبردست سرپرائز دوں گا۔" میکسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ معمول کے مطابق اپنا گیت گنگنانے لگا لیکن مجھے کسی نہ کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر اچانک بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ اکیلا گا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بونے اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

ہم نے دوپہر کا کھانا ہوٹل میں ایک ساتھ کھایا۔ گفتگو کے لیے مسالہ بہت تھا۔ میں نے یہ ایکٹ کرسمس کے لیے پیرس میں پاپا گوڈین کی وساطت سے بک کر لیا تھا۔ اگلے موسم بہار میں یورپ کے ٹور کے لیے مذاکرات چل رہے تھے۔

"جلد بازی نہ کرنا۔" میکسی نے مجھ سے کہا۔ مجھے حیرت

ہوئی۔ "کون جانے، آگے کیا ہوگا۔" میکسی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسپیرو اُسے جن نظروں سے دیکھ رہا تھا، انھوں نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اسپیرو فکر مند نظر آ رہا تھا۔ میکسی اِدھر اُدھر یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُسے کسی کی تلاش ہو۔ پھر اچانک وہ اٹھا اور اس نے کسی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تجسس نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ڈیلا رائے شاید اُسی وقت ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی تھی اور ایک خالی میز پر بیٹھ رہی تھی۔ میں پلٹا تو اسپیرو مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مگر اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ اُبھرا جس سے میں کچھ اندازہ لگا سکتا۔

میری گردن کے بال مرتعش ہو گئے۔ یہ بال میرے لیے خطرے کی گھنٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈیلا کافی کے موقع پر ہماری میز پر آگئی تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی لیکن اس کے آتے ہی اسپیرو اٹھ کھڑا ہوا تو میں متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "مجھے بہت مطالعہ کرنا ہے۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔ اس کے اٹھتے ہی جسم کے تمام اعضاء یعنی باقی بونے بھی اٹھ کر چل دیے۔

میں نے اُن کو ریسٹورنٹ سے نکلتے دیکھا اور اپنی گردن کو سہلایا۔ خطرے کی گھنٹی بہت زور سے بج رہی تھی۔ میں نے تشویش میں گھر کر سوچا کہ مجھے اس سلسلے میں میکسی سے بات کرنا چاہیے۔ بونوں کا انداز غیر معمولی تھا۔ کوئی الجھن ضرور تھی اور مجھے جلد از جلد اُسے سلجھانا تھا۔

میں نے میکسی کی طرف دیکھا لیکن اس کی تمام تر توجہ ڈیلا پر تھی۔ شاید میری نگاہوں کی مداخلت نے میکسی کو چونکایا۔ اس نے مجھے کار میں چیسٹر چلنے کی پیشکش کی۔

"میری نیند بہت جمع ہو گئی ہے۔ مجھے سونا ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

میکسی نے بلا حجت میرا عذر قبول کر لیا اور ڈیلا کو لے کر ڈرائیو کے لیے نکل گیا۔

رولز ہوٹل سے نکل رہی تھی کہ میں نے میکسی کا بلند آہنگ قہقہہ سنا۔ پھر اسے شاید میرا خیال آگیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے رومال لہرایا۔ مجھے اس کے نیلے رومال کی ایک جھلک دکھائی دی پھر رولز میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں ذہین ترین بونے اسپیرو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اسپیرو ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ میں تھیٹر چلا گیا۔ وہاں تمام ڈریسنگ روم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کیا تو مجھے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ اسے مطالعہ کرنا ہے۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ کہاں ملے گا۔

میں پبلک لائبریری پہنچا۔ مگر وہ اس وقت تک وہاں نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اسپیرو کو وہاں آنا تھا، وہ ضرور آتا۔

جلد ہی مجھے لائبریری کے کاؤنٹر کے اوپر اس کے ہیٹ کی جھلک دکھائی دی۔ لائبریرین دوستانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اسپیرو کا ایسی لائبریریوں سے برسوں کا ناتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے بے تکلف تھا۔

پھر اسپیرو خود نوشت سوانح کے شیلف کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ تب میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا حیران نہیں ہوا۔ "کہو... کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نپولین کی سوانح نکالی۔

"نپولین کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ تم مجھے بتاؤ، میں نے سوچا کہ میں تمھیں بتا دوں کہ مجھے یہ بات معلوم ہے۔"

وہ مسکرا دیا۔ "کاش... تم مجھے پسند کرتے۔" اس نے کہا۔

"میں تم سے بڑی وابستگی محسوس کرتا ہوں۔"

اس لمحے مجھے اس پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ وہ خوب صورت اور تیز ذہن جو چھوٹے سے جسم کے پنجرے میں مقید تھا۔

وہ ہنسا۔ اور اس کے منہ سے اٹھنے والی لہسن کی بُو بہت تیز تھی۔ پرانی ناپسندیدگی نے پھر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیا چکر چل رہا ہے یہاں؟ میکسی ڈیلا پر کب فدا ہوا... اور کیسے؟"

بونے نے تفصیل بیان کرنا شروع کر دی۔ شروع میں اس کی آواز دھیمی اور قابو میں تھی لیکن پھر اس کا لہجہ تند اور آواز بلند ہوتی گئی۔ اس کا جسم پسینہ اُگلنے لگا۔

اسپیرو نے بتایا کہ [illegible] مہم میں پہلی رات، دوسرے شو کے دوران وہ میکسی کو ڈیلا کی کارکردگی دکھانے لے گیا۔ میکسی نے تسلیم کیا کہ ڈیلا کا ایکٹ شو کے معیار سے بہت کمتر ہے۔ اس نے اسپیرو سے کہا کہ ایکٹ ختم ہونے پر وہ ڈیلا کو اس کے ڈریسنگ روم میں لے آئے لیکن وہاں میکسی سے بات نہیں کی گئی۔ جوراً اسپیرو ہی کو بات کرنا پڑی۔ "تمھارا ایکٹ غیر معیاری ہے۔" اس نے ڈیلا سے کہا۔ "ہم تمھیں ڈراپ کر رہے ہیں لیکن ٹور ختم ہونے تک تمھیں طے شدہ معاوضہ ملتا رہے گا۔"

میں نے سوچا، یہ تو تمھیں کرنا ہی تھا اسپیرو۔ ڈیلا رائے کے پاس ناقابلِ شکست کنٹریکٹ تھا۔ پھر میں نے ایک ایجنٹ

کے انداز میں سوچنے پر دل ہی دل میں خود کو بُرا بھلا کہا۔ ڈیلا کی میرے لیے اہمیت ہی کیا تھی۔ میں جانتا تھا کہ ڈیلا دل شکستہ ہو کر روئی ہوگی۔

اسپیرو نے غصّے اور نفرت بھرے لہجے میں ڈیلا کے رونے کا احوال بیان کیا۔

میں اس کی بات پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ میں تصوّر کر سکتا تھا۔ حسین چہرے والی دُبلی پتلی لڑکی کے چہرے پر بے بسی کا تاثر ہوگا۔ وہ میکسی کو ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہوگی۔ وہ اپنے جسم کے نشیب و فراز بھی نمایاں کر رہی ہوگی۔ اس نے پوچھا ہوگا کہ وہ اپنے ایکٹ کو کس طرح بہتر بنا سکتی ہے۔

"میں نے اُسے فوراً ہی باہر کا راستہ دکھایا۔" اسپیرو نے بتایا۔ "لیکن میں جانتا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ میں نے ایک بار میڈرڈ میں ایک آوارہ کتّے کو دیکھا تھا اور روم میں ایک بار برہنہ لڑکے کو..." اتنا کہہ کر اس نے کندھے جھٹکے اور چشمہ اتار کر اس کے شیشے صاف کیے۔ "یورپ کے ہر دارالحکومت سے ایسی کوئی نہ کوئی یاد وابستہ ہے۔" اس نے مزید کہا۔ "اور ان میں سے کچھ ایسی ہیں جنھیں آسانی سے بُھلایا نہیں جا سکتا۔ جن سے آسانی سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ دراصل میکسی بہت نرم دل ہے..."

"سنہرے چوہوں کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اُن کے لیے ایک ٹھکانا ڈھونڈ لیا تھا۔"

"مگر افسوس کہ تم ڈیلا کے لیے کوئی ٹھکانا نہ ڈھونڈ سکے۔"

اسپیرو کی آنکھوں میں شدید برہمی کی چمک ابھری۔

"خیر... آگے کی بتاؤ۔ کیا ہوا؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"ڈیلا ڈریسنگ روم سے نکلی اور کوریڈور میں تقریباً بھاگتی چلی گئی۔ میکسی اسے عجیب سی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میکسی نے تولیے سے رگڑ رگڑ کر اپنا جسم چمکایا۔ پھر وہ بولا۔ 'اسپیرو... ہم نے اس لڑکی سے بہت زیادہ سختی برتی ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے اور مدد کرنے سے کبھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے میڈرڈ کا آوارہ کتّا... اور پھر روم کا وہ لڑکا یاد آیا جسے جوتوں کی ضرورت تھی...'" اسپیرو نے سرد آہ بھری اور اپنی بات جاری رکھی۔ "برمنگھم سے وہ لوگ مانچسٹر گئے۔ ڈیلا کا ایکٹ روک دیا گیا تھا لیکن وہ ٹروپ کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اس نے اسٹیج منیجر کو، جو بڑا جذباتی اور حسّاس آدمی تھا، بتایا کہ وہ پارٹی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں ہے اور کنٹریکٹ کی وجہ سے وہ کہیں اور کام بھی نہیں کر سکتی۔ پھر پورے ٹور کے لیے ہر جگہ اس کے لیے بھی کمر اہم ہے۔

"اسٹیج منیجر نے میکسی سے بات کی اور کہا کہ اسے لڑکی پر بڑا ترس آتا ہے اور اگر میکسی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ اسے ریہرسل کے لیے کبھی کبھی اسٹیج استعمال کرنے کی اجازت دے دے۔"

اس موقع پر میں نے اسپیرو کو دیکھا۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

"تم جانتے ہو کہ صبح ساڑھے گیارہ بجے کے بعد اسٹیج ہمارا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ میں میکسی کے بنائے ہوئے ضابطوں سے واقف تھا۔

اب کے اسپیرو بولا تو اس کی آواز غصّے سے لرز رہی تھی۔

"اگلے روز ہم اسٹیج پر پہنچے تو ڈیلا کا ایکٹ جاری تھا۔ وہ ایک سلاخ سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں اسے روکنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا مگر میکسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا..."

میرے ذہن میں میکسی کی واضح تصویر ابھری۔ وہ اسٹیج کی سائیڈ میں کٹ کیے کھڑا تھا۔ گبرڈین کی سیاہ پتلون اور اوپر سے تن برہنہ۔ اسپیرو اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بمشکل اس کے گھٹنوں سے اوپر پہنچ رہا تھا۔

اسپیرو نے بتایا کہ ڈیلا نے مسکراتے ہوئے اسٹیج کلاک کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں گیارہ بجے تھے۔ اسی لمحے اسٹیج کارپینٹر بڑھا اور بڑبڑایا کہ یہ کلاک میں کس نے گڑبڑ کی ہے؟ پھر اس نے سوئی آگے بڑھائی اور ساڑھے گیارہ بجا دیے۔

"وہ یقیناً ڈیلا کی حرکت ہوگی۔" میں نے تبصرہ کیا۔

اسپیرو نے اثبات میں سر ہلایا اور نفرت سے تھوک دیا۔

اس کے بعد ہر صبح جب وہ پہنچتے تو ڈیلا اسٹیج پر موجود ہوتی۔ وہ صرف اور صرف میکسی کو دیکھتی اور اپنا سامان سمیٹتی۔ میں بغیر پوچھے، بغیر سُنے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ دونوں کو دانستہ نظر انداز کرتی ہوگی۔

پھر ایک صبح وہ خاصی بلندی سے گری۔ اسپیرو نے بتایا کہ بلندی کافی زیادہ تھی اور اگر میکسی نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس کی کمر ٹوٹ چکی ہوتی۔ اس نے میکسی سے التجا کی کہ اسے ایک بار اور چڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ورنہ وہ ہمیشہ گرنے سے خوف زدہ رہے گی۔ اس کے اعصاب صرف اسی طرح قابو میں آ سکتے ہیں۔

• میکسی نے اسے اُٹھا کر رسّی پر چڑھا دیا اور وہ بندر کی طرح اوپر ہی اوپر چلی گئی۔ یہاں تک کہ سب سے اوپری سلاخ پر پہنچ گئی۔ وہاں بیٹھی ہوئی، وہ چھوٹی سی بچّی لگ رہی تھی۔ چند لمحے وہ جھولتی، قلابازیاں کھاتی رہی پھر اچانک اس

نے چیخ کر کہا "پکڑو مجھے" میکسی نے یہ سن کر سر اٹھایا۔ اتنی دیر میں وہ سلاخ چھوڑ چکی تھی۔ اس بار وہ دانستہ گری تھی۔ میکسی نے قہقہہ لگایا اور پھر اسے پکڑ کر گیند کی طرح اوپر اُچھال دیا۔ پھر اس نے نرمی اور آہستگی سے اُسے اسٹیج پر کھڑا کر دیا۔

اسپیرو خاموش ہو گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ہاتھ خشک کیے۔

"عورتیں تو اس کی زندگی میں پہلے بھی آتی رہی ہیں۔" میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"لیکن وہ ایکٹ میں کبھی مخل نہیں ہوئیں۔" اسپیرو نے کہا۔ میں اس کی بات پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ "اور اب وہ ہر روز ریہرسل کرتے ہیں۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اور نتیجہ کیا ہے؟"

"آج رات معلوم ہو جائے گا۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔ "آج میکسی ہم سب کو دکھائے گا۔"

میں بے اختیار سیٹی بجا کر رہ گیا۔ اگر میکسی کوئی مظاہرہ کرنے والا ہے تو وہ یقیناً قابلِ دید ہو گا۔

اسی وقت لائبریرین ہماری طرف آئی اور اس نے مجھ سے سگریٹ بجھانے کو کہا۔ میں حیرت سے لڑکی کو دیکھتا رہا، مجھے علم ہی نہیں تھا کہ میں نے سگریٹ سلگا لیا ہے۔ اسپیرو خفا نظر آنے لگا۔ اس نے کہا کہ پبلک لائبریری جیسے مقامات پر اصولوں اور ضابطوں کا احترام کرنا چاہیے اور بہر کر لوگ اس کے قد کی وجہ سے اسے کبھی نہیں بھولتے۔

مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس کی پوزیشن خراب کرا دی ہے۔ چنانچہ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "میں باہر تمہارا انتظار کروں گا۔ اس وقت مجھے سگریٹ کی بہت زیادہ طلب ہو رہی ہے۔"

میں لائبریری کے باہر جا کھڑا ہوا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ کچھ دیر بعد بونا بھی باہر آ گیا۔ وہ مجھ سے دو سیڑھیاں اوپر کھڑا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ سکتے تھے۔ اس نے میری طرف مراکشی سگار کا پیکٹ بڑھایا۔ میں نے اُس میں سے ایک سگار نکال لیا۔ ہم نے سگار سلگائے۔ اسپیرو تمباکو کے معاملے میں بے حد خوش ذوق تھا۔

"ہمارا ایکٹ بہت اچھا... بہت کامیاب ہے۔" اسپیرو نے پہلا کش اپنے مختصر وجود میں اتارتے ہوئے کہا۔ "اسے کوئی چیز ڈسٹرب کرے تو ہم خوش نہیں رہ سکتے۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرایا اور چلا گیا۔

میں وہیں کھڑا اسے سڑک پار کرتے اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ سامنے ہی میکسی اور چھ بونے کا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ اس کا ٹائیٹل مجھے بے حد مستقل محسوس ہوا۔ کبھی نہ تبدیل ہونے والا۔

میں عرشے کی طرف بڑھا اور نیچے پانی کو دیکھنے لگا۔ نیچے ایک جہاز پر نظر پڑی۔ اس کا نام واضح طور پر نظر آ رہا تھا... نیسٹا، بارسلونا، اسپین۔

بارسلونا کے ایک ہوٹل کے بیڈ روم میں رنگ رنگ کے روڑتے ہوئے چوہے میرے تصور میں ابھر آئے۔ میں خاموش کھڑا اپنے وجود میں ایک یاد کو ابھرتا محسوس کرتا رہا۔

تین سال پہلے کی بات ہے۔ میکسی اور بونے اسپین کے شہروں کا مختصر دورہ کر رہے تھے۔ بارسلونا سے مجھے اپنے ایک دوست کا خط موصول ہوا جو اس پروگرام میں شریک تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ایک فلم ایجنسی کا نمائندہ سام ایلرین اِن دنوں اسپیرو سے بکثرت مل رہا ہے۔ میرے دوست کو یہ علم نہیں تھا کہ اب تک کی گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ تاہم اصولاً مجھے اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا تھی۔ چنانچہ میں نے بارسلونا کی فلائٹ پکڑی اور بارسلونا پہنچ گیا۔

بارسلونا میں سام ایلرین کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ شہر کے شراب خانوں میں یہ خبر گرم تھی کہ سات رنگوں کے چوہوں نے اُسے ہوٹل سے دوڑا دیا اور وہ چوہے صرف اسی کو نظر آتے تھے لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ چوہے سچ مچ کے تھے۔

میں ایک ہفتہ بارسلونا میں رہا لیکن اسپیرو کی زبان نہ کھلوا سکا۔ اسپین کا ٹور ختم ہوا اور ہم پیرس جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔

سرحد پر فرانسیسی کسٹم والوں نے سامان کی بھرپور تلاشی لی۔ میں اسپیرو کے برابر بیٹھا تھا۔ اس کے اٹیچی کیس کھولے گئے۔ مجھے ایک اٹیچی کیس میں مختلف رنگوں کے چمکدار پینٹ کے ڈبے نظر آئے۔ میں نے ایک ڈبا اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔

"فاسفورس آمیز رنگ کے پوسٹر بہت نظر فریب ہوتے ہیں۔" اسپیرو نے کہا۔

میں نے ڈبا واپس رکھ دیا۔

میری جیب میں کچھ چاکلیٹ تھے۔ میں نے اس کی مدد سے ایک بونے کو پٹایا۔ وہ فرانسیسی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سام نے تمام بونوں کو ہالی ووڈ لے جانے کی پیشکش کی تھی۔ اس کی کمپنی ایک کامیڈی سیریل بنانا چاہتی تھی۔ معاوضہ فرسٹ کلاس تھا۔ معاہدہ طویل مدت کا تھا لیکن اس میں میکسی کی کوئی

گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا اسپیرو نے وہ پیشکش مسترد کر دی۔ میں نے بونے سے پوچھا کہ میکسی کو یہ سب معلوم ہے۔ جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ وہ بے حد نرم اور مہربان مسکراہٹ تھی، ایسی مسکراہٹ کسی بونے کے ہونٹوں پر شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

سام وفاداری اور عہد شناسی کے مفہوم سے ناواقف تھا۔ وہ معاوضہ بڑھاتا چلا گیا۔ تنگ آ کر اسپیرو نے اس کے پیچھے چوہے چھوڑ دیے۔ میں نے فرانسیسی بونے سے اس کی ترکیب پوچھی۔ اس نے بتایا کہ اسپیرو نسلاً ہسپانوی ہے۔ بارسلونا اس کے لیے گھر کی طرح ہے، جہاں اس کے ان گنت رشتے دار رہتے ہیں۔ اس کا ایک چچا ایسا ہے۔ جو چوہے پکڑنے کا دھندا کرتا ہے۔

اس کے آگے اندازہ لگانا میرے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بونا چاکلیٹ کھا کے، انگلیاں چاٹتا اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

اب میں حال کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ڈیلا رائے کو ڈرانے اور بھگانے کے لیے رنگ برنگے چوہے کافی ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ شو بزنس کے برسوں کے تجربے نے مجھے سکھا دیا تھا کہ دُبلی پتلی لڑکیاں سب سے زیادہ سخت جان ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے آرڈن پہنچ کر شو دیکھا اور وہاں سے جلدی سے نکل لیا۔

میں تھیٹر پہنچا تو پہلے شو کے تماشائی نکل رہے تھے۔ میں اسٹیج ڈور سے داخل ہوا تو ڈیلا رائے نظر آئی۔ میکسی اپنے ڈریسنگ روم میں تھا۔ وہ تولیے سے اپنا جسم چمکا رہا تھا۔

"آرڈن کا شو کیسا رہا؟" میکسی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ اگلی بار تمھیں کوئی گوہرِ نایاب مِل جائے۔"

تھیٹر کی بلی اندر چلی آئی۔ میکسی نے اس کی پیٹھ سہلائی تو وہ خرخرائی اور اس کے ہاتھ سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ میکسی بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا "ہوشیار میکسی۔ خرخرانے والی بلیاں پنجے بھی مار دیتی ہیں۔"

میکسی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے کبھی نہیں ماریں۔" پھر وہ ہنسنے لگا۔

میں نے باقی وقت تھیٹر کے بار میں گزارا اور میکسی کو شو کا اختتام کرتے دیکھا۔ خطرے کی گھنٹی والے بالوں کو میں نے وہسکی میں ڈبو دیا تھا۔ جب تھیٹر خالی ہو گیا تو میں اسٹیج کی طرف بڑھا۔ پہلی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میکسی نیا شو اسٹائل میں کرنا چاہتا ہے۔ وہاں فل آرکسٹرا اور تمام اسٹیج اسٹاف موجود تھا۔ اسپیرو اور دوسرے بونے دوسری قطار میں بیٹھے تھے۔ تھیٹر کا منیجر اپنی بیوی کے ساتھ میرے عین پیچھے بیٹھا تھا۔

پھر میوزک کنڈکٹر نمودار ہوا۔ اس کی چھڑی حرکت میں آئی اور سازندوں نے ساز چھیڑ دیے۔ ہال کی روشنیاں بُجھ گئیں۔ اسپیرو کے جلتے ہوئے سگار کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں، مجھ سے اس سگار سے نظریں نہیں ہٹائی جا رہی تھیں۔

پردہ اٹھا تو میں نے کوشش کر کے اپنی نظر سگار سے ہٹائی اور اسٹیج کی طرف متوجہ ہوا۔ سیاہ مخملی پردوں کی وجہ سے پورا اسٹیج تاریکی میں تھا۔ صرف ایک اسپاٹ لائٹ تھی، جو بیس فٹ اوپر چاندی جیسی ایک سلاخ پر پڑ رہی تھی۔ اسٹیج کا پردہ آخری حد تک اٹھایا گیا تھا۔ اسٹیج معمول سے کہیں زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔

وسطی دروازے سے میکسی اسٹیج پر آیا۔ اس پر ایک باریک اسپاٹ لائٹ پڑ رہی تھی۔ وہ ایک سلور اسٹک کو اچھالتا، تھامتا آگے بڑھتا رہا۔ پھر اس نے اسٹک کو اچھال کر ایک ہاتھ میں اور پھر اُچھال کر دوسرے ہاتھ میں پکڑا۔ اسٹک کی موٹائی معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ بے جان نہ تھی۔

پھر ڈرم بجنے لگے۔ بڑی اسپاٹ لائٹ حرکت میں آئی۔ میکسی نے ہاتھ بڑھا کر اسٹک کو گھمانا شروع کیا۔ دیر تک گھماتا رہا۔ اسٹک جب بھی روشنی سے گزرتی، اس کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی۔ اچانک اوپر کی طرف لے جاتے ہوئے میکسی نے اُسے چھوڑ دیا۔ اسٹک اوپر ہی اوپر روشنیوں سے بھی اوپر گئی اور اچانک یوں ٹھہر گئی جیسے معلق ہو گئی ہو۔ پھر اس نے اٹھنا شروع کیا اور وہ خود بخود یوں مڑی کہ چھلا سا بن گئی۔ وہ اوپر جاتی رہی، یہاں تک کہ بیس فٹ اوپر نصب راڈ کی سطح تک پہنچ گئی۔

روشنیاں بڑی ذہانت سے ترتیب دی گئی تھیں۔ ڈیلا رائے نے رسّی تھامنے کے لیے اپنے ہاتھ یقیناً نکالے ہوں گے لیکن دیکھنے والوں میں سے کسی کو کسی حرکت کا احساس نہیں ہوا۔ میں فن کے اس مظاہرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ انسانی اسٹک اوپر سلاخ پر تھرکتی رہی۔ میکسی نیچے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ پھر وہ روشنی میں آیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے سنہرے بال چمک رہے تھے۔ انسانی اسٹک سلاخ پر تھرکتی رہی۔ پھر متوازن ہوئی۔ میں نے اوپر نیچے اور پھر اوپر دیکھا۔ ڈرم خاموش ہو گئے تھے۔ اچانک تمام روشنیاں سلور اسٹک پر مرکوز ہو گئیں۔

"اوہ... وہ چھلانگ لگانے والی ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا اور مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میں نے کچھ کہا ہے۔

"یہ ناممکن ہے۔" پیچھے سے منیجر کی بیوی نے میری بات کی نفی کی۔ "نیچے جال نہیں۔۔۔" وہ جملہ پورا نہ کر سکی۔ فضا میں اس کی چیخ گونج کر رہ گئی۔

سلور اسٹک نیچے گر رہی تھی۔ گرتے ہوئے قلابازیاں کھا رہی تھی میکسی بدستور مسکرا رہا تھا۔ اس نے بغیر کسی دشواری اور خاص کوشش کے اسے کیچ کیا اور اپنے کندھوں کے اوپر سے گھمانا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اسٹک کو نیچے کھڑا کر دیا اور داد طلب انداز میں سر بہ خم کھڑا ہو گیا۔ ہنسی سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔

آرکسٹرا پھر شروع ہوا اور اس کے ساتھ ہی پردہ گر گیا۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ایکٹ کے دوران ڈیلا محض ایک اسٹک لگی تھی۔ اس کا ہاتھ تک ہلتا نظر نہیں آیا تھا۔ وہ سلور اسٹک تھی۔ سلور اسٹک نظر آتی تھی۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

اسٹیج پر رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ میکسی پردہ ہٹا کر آیا اور اس نے کال ریسیو کی۔ اس کا ہاتھ اسٹک پر یوں ٹکا ہوا تھا جیسے وہ اسٹک کے سہارے کھڑا ہو۔ پھر اچانک اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ ڈیلا رائے نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے' ٹانگوں کو حرکت دی اور جیسے اچانک زندہ ہو گئی۔ دونوں بڑے اسٹائل سے ہمارے سامنے جھکے جیسے وہاں صرف ہم کچھ افراد نہیں' ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہو۔

میں بلا ارادہ کھڑا ہوا اور چیخ کر کہا "ویل ڈن" پھر مجھے اسپیرو کے سگار کی چمک محسوس ہوئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ براہ راست مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے کندھے جھٹک دیے۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ ڈیلا اتنی کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔ میں تو میکسی اور بونوں کے ایکٹ کو ہی تفریح کا اعلیٰ ترین معیار سمجھتا آیا تھا۔

میکسی اسٹیج پر میرا منتظر تھا۔ اسٹیج پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اسٹیج کا فرش بھی سیاہ مخملی کپڑے کا تھا اور وہ رسّی بھی جس کے سہارے ڈیلا اوپر سلاخ تک گئی تھی۔ میکسی بڑے پیار سے ڈیلا کا کندھا سہلا رہا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ ان کے درمیان خصوصی تعلق استوار ہو چکا ہے۔

ڈیلا کا لڑکوں جیسا استخوانی جسم سیاہ رنگ کے نیام نما لباس میں ملفوف تھا۔ چہرے پر سیاہ جالی تھی اور سر پر چاندی جیسے بالوں کی وگ جو سیاہ چھڑی کی سفید مٹھ کا بھرپور تاثر دے رہی تھی۔ اس وقت اتنے قریب سے بھرپور روشنی کے باوجود بھی وہ مجھے ڈیلا نہیں کوئی چاندی کی چھڑی لگ رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ میکسی بے چینی سے میرے تبصرے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک میری رائے لاکھوں افراد کی تعریف و توصیف پر بھاری تھی۔

میں میکسی سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا یہ ایکٹ منفرد اور یکتا ہے۔

میری بات پوری ہوئی ہی تھی کہ مجھے اپنے عقب میں لہسن کی بُو محسوس ہوئی۔ اسپیرو اور اس کے پیچھے دیگر بونے قطار بنائے کھڑے تھے۔ اسپیرو نے بونوں کی طرف سے رسمی مبارک باد پیش کی۔ میکسی نے اپنے تمام بچّوں سے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے اور رسمی طور پر ڈیلا سے انھیں متعارف کرایا۔ اسپیرو نے احتراماً ڈیلا کے سامنے سر خم کیا۔ ڈیلا مسکرا دی۔

ڈیلا بلّی کی طرح میکسی کے بازو سے اپنا سر رگڑ رہی تھی اور میں ایکٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر مجھے تھیٹر کی بلّی کا خیال آ گیا۔

"اگر یہ ایک ایک کر کے آئیں تو میں انھیں دست بوسی کا موقع ضرور دوں گی۔" ڈیلا کہہ رہی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا کہ کہیں وہ بلّی کے پنجے تو نہیں۔

وہ میکسی سے چپکی جا رہی تھی۔ پھر اس نے مزید کہا "میری دست بوسی کے بعد یہ ایک بار پھر خود کو مرد محسوس کرنے لگیں گے۔"

اسپیرو کا جسم تن سا گیا۔ میری گردن پر خطرے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

"ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" اسپیرو نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ پلٹا اور واپس چل دیا۔ بونے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

لگتا تھا' ڈیلا رائے میکسی کے بارے میں بہت زیادہ پُراعتماد ہے جبکہ میکسی فکر مند اور کچھ برہم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بونوں کے ساتھ اس رویّے پر یقیناً ڈیلا کو ڈانٹتا لیکن اُسی وقت میوزک کنڈکٹر' تھیٹر کا منیجر اور اس کی بیوی مبارکباد دینے آ گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلی صبح میں نے لندن فون کیا اور اس کے نتیجے میں میکسی اور سلور اسٹک والا ایکٹ رات کے پروگرام میں شامل ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ لوگ اس نئے ایکٹ کو بے حد پسند کریں گے لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس ایکٹ کو جتنا پسند کیا گیا' اس کا میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پردہ گرا تو ہال پر سناٹا چھا گیا تھا۔ لگتا تھا' لوگوں کی سانسیں تک رُک گئی ہیں۔ پھر خاموشی ٹوٹی اور تالیوں کا وہ طوفان اٹھا کہ لگتا تھا' اب کبھی خاموشی نہیں ہو گی۔

میکسی اور سلور اسٹک ایکٹ نے تمام ریکارڈ توڑ دیے

انقلاب برپا ہو گیا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ اس ایکٹ میں جنسی پہلو بھی نمایاں تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت! اس ایکٹ میں میکسی اور ڈیلا کی ایک دوسرے کے لیے شدید طلب ہر ایکشن سے جھلکتی تھی۔ ان کے انداز میں سپردگی ہوتی' جو لوگوں کو بے حد متاثر بلکہ مسحور کرتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ میرے ہاتھ سونے کی کان لگ گئی ہے' اس کے باوجود مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ ڈیلا کو کنٹریکٹ کے ذریعے پابند کر لوں۔ اپنے ڈیڈی کی طرح میں بھی پرانے خیالات اور پرانی قدروں کا احترام کرتا ہوں۔ میرے ڈیڈی ہمیشہ کہتے تھے کہ زبان سے نکلی ہوئی ایک بات دس بار دستخطوں اور معاہدوں پر بھاری ہوتی ہے۔ اپنے ڈیڈی کے ریٹائرمنٹ کے بعد بیس سال سے میں اسی اصول کے تحت کام چلا رہا ہوں اور آج تک مجھے اس پر پچھتاوا کبھی نہیں ہوا۔

میں چند روز میکسی کے ساتھ ٹھہرا۔ پھر مجھے ایک کام سے لیڈز جانا پڑا۔ اس کے بعد مجھے لندن جانا تھا۔ میں اپنے آفس پہنچا تو پتا چلا کہ نوع بہ نوع پیش کشوں کا ڈھیر میرا منتظر ہے۔ میکسی اور سلور اسٹک نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے مقبول بنا دیا تھا' ایسا لگتا تھا کہ اب مہینوں مجھے اپنے طور پر لنچ کرنا نصیب نہیں ہو گا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ جلد بازی کی ضرورت نہیں معاملات کو یونہی چلنے دیا جائے۔ میکسی اور بونے کرسمس کے لیے پیرس میں بُک تھے۔ میں نے سوچا' ان کے پیرس میں قیام کے دوران میں یہاں پیش کشوں کی چھانٹی کر کے بہترین آفرز قبول کر لوں گا اور وہ ایک نئے سال کا اچھا آغاز ہو گا۔

مجھے لندن پہنچے ہوئے دس ہی دن ہوئے ہوں گے کہ اسپیرو نے مجھے ایڈن برگ سے فون کیا۔ اس وقت صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے اس کے دو تین جملے سنے اور سمجھ گیا کہ مجھے ہر حال میں صبح کی ٹرین پکڑنا ہو گی۔

میں شام پانچ بجے ایڈن برگ پہنچا۔ اسپیرو پلیٹ فارم پر میرا منتظر تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہوٹل پہنچا تو میری اپنی حالت بھی کچھ اچھی نہیں رہی تھی۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی مجھے جو پہلا شخص نظر آیا' وہ سام ایلرمین تھا۔ وہی سام جس نے اسپیرو اور بونوں کو بھاری معاوضے کے ساتھ فلموں میں کام کرنے کی آفر کی تھی۔ جس کی ثابت قدمی سے تنگ آ کر اسپیرو نے اس کے پیچھے جاسوس چھوڑ دیے تھے۔ میں نے سام سے علیک سلیک کی۔ مگر اس سے بات کرنے کے لیے رُکا نہیں۔ مجھے اسپیرو سے بہت کچھ سننا تھا۔ میں جلد از جلد کمرے میں پہنچنا چاہتا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے اسپیرو کو بولنے کا موقع دیا اور اس دوران کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس بار مجھے اس کے مُنہ سے اٹھنے والی لہسن کی بُو کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔

سام گزشتہ روز ایڈنبرگ پہنچا تھا اور اس نے پہلے اور دوسرے شو کے درمیان ایک پیشکش کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میکسی امریکا کا طویل دورہ کرے جس کا آغاز بھی نیویارک سے ہو اور اختتام بھی نیویارک پر۔ ڈیلا کو وہ آفر پسند آئی تھی اور وہ میکسی پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ کرسمس پر پیرس کی بکنگ منسوخ کر دے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسپیرو کو دیکھا۔

"اس پیشکش میں ہم شامل نہیں ہیں۔" اسپیرو نے آہستہ سے کہا۔

مجھے اپنا جسم سرد پڑتا محسوس ہوا۔ میکسی اور سلور اسٹک بہت اچھا ایکٹ سہی لیکن میں میکسی کو بونوں کے بغیر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میکسی بونوں کو چھوڑ کر امریکا گیا تو میرے نقطۂ نظر سے وہ مکمل نہیں۔۔ آدھا جاتا۔

"لیکن میکسی پاپا گوڈین کے ساتھ عہد شکنی نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"وہ اس عورت کے سحر میں گرفتار ہو چکا ہے اور مسحور لوگوں کو کسی ذمّے داری کا خیال نہیں رہتا۔" اسپیرو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

مجھے افسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنے ڈیڈی کے اصول بالائے طاق رکھ کر ان سبھوں کو کنٹریکٹ کے ذریعے پابند کر لینا چاہیے تھا "میں میکسی سے بات کروں گا۔" میں نے کہا۔

"دوسرے شو سے پہلے نہ کرنا۔" اسپیرو نے تحکّمانہ لہجے میں کہا "میکسی' اسٹک کے ساتھ بہت نروس رہتا ہے۔ لڑکی بہت متلوّن مزاج ہے۔"

مجھے اندازہ تھا۔ دُبلی پتلی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ذرا سی شہرت۔۔۔ ذرا سی کامیابی ان کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

میکسی سے شو کے بعد کھانے پر ملاقات ہوئی۔ اسپیرو' بونے اور ڈیلا رائے بھی موجود تھی۔ پھر سام ایلرمین بھی آ گیا۔ میری سمجھ میں وہاں اس کی موجودگی نہیں آ رہی تھی۔ مگر پھر اس کی بات نے وضاحت کر دی "آج سے میں اس خاتون کے مفادات کا نگراں ہوں۔" اس نے ڈیلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "البتہ میکسی اب بھی تمھارا ہے۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں نے میکسی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے ویٹر کو بُلانے کے بہانے مُنہ پھیر لیا۔

گفتگو آگے بڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ڈیلا محض جزوی طور پر کامیاب ہوئی تھی۔ میکسی اس بات پر ڈٹا ہوا تھا کہ پیرس کا دورہ منسوخ نہیں ہوگا۔ البتہ اس دورے کے بعد وہ امریکا جانے پر رضامند تھا۔ وہ اچانک یوں مسکرایا جیسے کوئی خوش گوار بات یاد آگئی ہو۔ اس نے بونوں کی طرف دیکھا اور بولا "تم لوگوں کو بھی کب سے فرصت نہیں ملی۔ یہ تعطیلات خوب انجوائے کرسکو گے اور تم لوگ ہمارے ساتھ اس طرح چل سکتے ہو جیسے پروگرام میں شامل ہو۔ تمھیں معاوضہ بھی ملے گا۔"

سادہ لوح میکسی یہ کہتے ہوئے بے حد خوش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے احساس بھی نہیں ہے کہ اس طرح وہ اپنے ساتھی بونوں کی توہین کر رہا ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ وہی سلوک ہے، جو کچھ عرصہ پہلے ڈیلا کے ساتھ کیا گیا تھا۔

لیکن ڈیلا کو سب یاد تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ بلی کی طرح خرخراتے ہوئے کہہ رہی ہے "اسے کہتے ہیں جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

"ہم اپنی ٹیم کو توڑنے اور اپنے ایکٹ کو ترک کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔" اسپیرو نے نرم لہجے میں کہا۔

دس منتظر نگاہیں کبھی اسپیرو پر جمتیں اور کبھی میکسی پر۔ جو زبان بولی جا رہی تھی، وہ ان کے لیے اجنبی تھی لیکن بونے اتنے حساس ہوتے ہیں کہ انھیں ماحول میں ہلکی سی کشیدگی کا احساس بھی فوراً ہو جاتا ہے۔

سام نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میکسی میز پر آگے کو، اسپیرو کی طرف جُھک آیا "لیکن اسپیرو، میں تم لوگوں کو تفریح کرانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم چھٹیاں گزارو۔" اس کے لہجے میں خلوص تھا، سچائی تھی "تم ان چھٹیوں کے مستحق ہو اور اس پروگرام کے بعد ہم پھر یکجا ہوں گے۔"

ترک بونا، جو اُسے بغور دیکھ رہا تھا، اس نے اچانک بلند آواز میں کچھ پوچھا۔ اسپیرو نے سرگوشی میں اسے جواب دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے سسکیوں کے درمیان وہ جواب اپنے ساتھی بونوں تک پہنچایا۔ اس کی انگلی ڈیلا رائے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

ڈیلا نے ترک بونے کو دیکھا اور چڑانے والے انداز میں قہقہے لگانے لگی۔

داڑھی والے ہسپانوی بونے نے پانی کا جگ اٹھایا اور ڈیلا پر انڈیل دیا۔

اسپیرو فوری طور پر تمام بونوں کو سمیٹ کر ریسٹورنٹ سے باہر لے گیا۔ ترک بونا اس وقت بھی رو رہا تھا۔ دوسرے تمام بونے اس سے چپک کر چل رہے تھے اور بار بار اسے چھونے اور دلاسا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بڑا دل گداز منظر تھا۔ میرا دل بھر آیا۔

میکسی پریشان نظروں سے انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

سام رومال سے ڈیلا کے کپڑے خشک کرنے میں لگا ہوا تھا۔ پھر میکسی نے ڈیلا سے بونوں کی طرف سے معذرت کی۔ اس کا انداز اس باپ کا سا تھا جس کے بچّوں سے بدتمیزی سرزد ہوئی ہو۔

ڈیلا رائے خاموش بیٹھی رہی۔

ہم ریسٹورنٹ میں تماشا بن گئے تھے۔ تمام لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ سام ڈیلا کو لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں اور میکسی ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر وہ پلٹی اور اس نے ہم دونوں کو دیکھا۔ پھر وہ بہت واضح اور ہموار آواز میں بولی "اب تم یا ان کا ساتھ دے لو یا میرا۔" یہ کہہ کر وہ کوریڈور میں چلی گئی۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ نہ صرف زور سے بند کیا بلکہ اگلے ہی لمحے ہم نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز بھی سنی۔

اس نے میکسی کو امتحان میں ڈال دیا تھا۔

میکسی بھی کوریڈور میں بڑھا۔ اس نے ڈیلا کے کمرے کے بند دروازے کو گھورا اور پھر اسٹینڈ پر رکھے ہوئے گلدان کو پوری قوّت سے فرش پر پٹخ دیا۔ پھر وہ بھاگتا ہوا سیڑھیوں سے اترا اور ہوٹل سے نکل گیا۔ میں نے میکسی کو پہلی بار برہم دیکھا تھا۔

میں میکسی کے پیچھے جانے کے لیے پلٹا۔ اسی لمحے عقب میں آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تمام بونے زینے کی اوپری لینڈنگ میں کھڑے تھے۔ وہ ریلنگ کے ڈیزائن والے خلا میں سے نیچے کوریڈور میں جھانک رہے تھے۔ ترک بونا اب بھی سسک رہا تھا۔

میں نے انھیں تسلّی دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن بے بسی کے احساس سے شل ہو کر فوراً ہی نیچے گرا لیا۔ اسپیرو کا ہاتھ بھی اسی انداز میں اٹھا اور گر گیا۔ مجھے اس لمحے اُس کے اور اپنے درمیان دوستی کے اٹوٹ بندھن کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"ہم اپنا ایکٹ جاری رکھیں گے۔" اسپیرو نے نرم لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے تسلّی دے رہا ہے۔ پھر وہ بونوں کو اوپر لے گیا۔ اب ترک بونا زور زور سے رو رہا تھا۔ پھر اس کے رونے کی آواز بھی گم ہو گئی۔

میں نے کندھے جھٹکے اور میکسی کی تلاش میں چل دیا۔ ایڈنبرگ کی بوڑھی سڑکوں پر چلتے ہوئے گول پتھر میرے پیروں کے نیچے آتے رہے۔ میں ٹرام کی پٹریوں کے ساتھ چلتا رہا۔

لیکن میکسی مجھے نہیں ملا۔

میں تھکا ہارا ہوٹل میں واپس آیا تو ہال میں صرف ایک مدھم فانوس روشن تھا۔ میں تاریک سایوں سے گزرتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آیا۔ اسپیرو مجھے اپنے بیڈ پر بیٹھا ملا۔

میں نے جھنجلا کر سوچا۔ آج تو میں اپنا دس فی صد پوری طرح حلال کر چکا ہوں۔

"اب تم سو جاؤ۔ میں نے سب ٹھیک کر لیا۔ مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے میں نے۔" اسپیرو نے کہا۔

وہ بھی بہت تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور فرش پر کھڑا کر دیا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ چشمے کے نم آلود شیشوں سے جھانکتی ہوئی اس کی آنکھیں کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور میرے کمرے سے چلا گیا۔

مجھے اسپیرو کی افسردگی کی وجہ معلوم تھی۔ وہ حقیقت پسند آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ انھیں میکسی سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

اگرچہ اسپیرو نے یقین دہانی کرائی تھی مگر نیند پھر بھی میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں دو بار میکسی کے کمرے کی طرف گیا۔ مگر وہ واپس نہیں آیا تھا۔ ڈیلا کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ خفیف سا کھلا ہوا ہے۔ میں نے سوچا شاید ڈیلا اس طرح میکسی کو بتانا چاہتی ہے کہ اس نے اُسے معاف کر دیا ہے۔

بہرکیف، میں نے سونے کا خیال چھوڑا اور طلوعِ سحر کا انتظار کرنے بیٹھ گیا۔

جس وقت میں لیمپ پوسٹ تک پہنچا، میکسی نے دنیا کے سب سے لمبے آدمی کو نوچ نوچ کر پھینک دیا تھا۔ ڈیلا کا سر اس کے کندھوں پر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی گردن سے سیاہ رسّی جھول رہی تھی۔

میکسی رو رہا تھا۔

اس نے بڑی احتیاط سے ڈیلا کو اتارا اور پلٹ کر پرنسس اسٹریٹ کی طرف دیکھا جو ابھی سنسان تھی۔ پھر وہ ڈیلا کو اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر اٹھا کر آگے بڑھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے ساتھ تھا۔ مگر اس نے میری طرف توجہ نہ دی۔ نہ وہ کچھ بولا۔

وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا تب بھی میں اس کے پیچھے تھا۔

بعد میں... بہت بعد میں... جب میں سام کے ساتھ بیٹھا اور خاموشی سے غور کیا تب میری سمجھ میں معاملہ آنا شروع ہوا۔ سام نے میری مدد کی۔ مجھے بولنے پر اکسایا۔ اگر وہ میرے ساتھ مہربان رویّہ نہ رکھتا، میری مدد نہ کرتا تو شاید میں پاگل ہو جاتا۔

جب میکسی ڈیلا کی لاش اٹھائے ایڈنبرگ کی مشہور سڑکوں پر چل رہا تھا اور میں اس کے پیچھے تھا تو میں نے سوچا تھا کہ وہ سلوراسٹک کے لیے رو رہا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ میکسی کے آنسو اپنے بچّوں کے لیے تھے، بونوں کے لیے تھے۔

پولیس اسٹیشن میں ڈیسک کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے آہستہ سے کہا "میں نے اِسے قتل کیا ہے۔" اس نے لاش متعجّب سارجنٹ کے سامنے رکھ دی۔

ڈیلا رائے مرنے کے بعد اور دُبلی... اور مختصر لگ رہی تھی۔

دو پولیس والے آئے اور میکسی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ پاگل ہے۔

میں نے ان سے التجا کی کہ جب تک میں کوئی وکیل نہ کرلوں، اُسے کسی سے بات نہ کرنے دیں۔ پھر میں سیدھا اسپیرو کے پاس گیا۔

وہ سو رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھایا اور اسے اس واقعے کے متعلق بتایا۔ وہ اٹھا، اِس نے توجہ سے میری بات سنی اور مجھے کچھ ہدایات دیں۔ میں نے فوری طور پر تعمیل کی اور فون اپنی طرف گھسیٹا۔

جس دوران میں ٹیلی فون کی مدد سے شہر کے سب سے اچھے وکیل کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اسپیرو نے کپڑے بدلے اور کمرے سے نکل گیا۔ میں نے وکیل کو پولیس اسٹیشن میں ملاقات کا وقت دیا اور ریسیور رکھ کر پلٹا۔ بونے میرے سامنے قطار لگائے کھڑے تھے۔ وہ پوری طرح تیار تھے اور تر و تازہ دکھائی دے رہے تھے۔

اسپیرو کے زرد چہرے پر عجیب سی چمک تھی "قتل ہم نے کیا ہے۔" اس نے کہا "میں انھیں پولیس اسٹیشن لے جا رہا ہوں۔ ہم اعترافِ جرم کریں گے۔"

میں نے ایک کے بعد ایک ان معصوم اور ننّھے منّے چہروں کو دیکھا۔ ترک بونے نے اپنے پیروں پر نظریں جما دی تھیں۔ میں انھیں ہوٹل سے باہر لے آیا۔ وہ سعادت مند بچّوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

انھوں نے بے حد تفصیلی اعترافِ جرم کیا۔

پولیس نے ان کی بیان کردہ کہانی کی پڑتال کی۔ ایک موقع پر ایسا لگتا تھا کہ ان کا بیان درست ثابت ہوگا لیکن

ہوٹل کے پورٹر نے عین اس وقت اسپیرو کو میرے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا جو ڈاکٹر نے ڈیلا کی موت کا متعین کیا تھا۔

پورٹر کی شہادت اسپیرو کو بے قصور ثابت کرتی تھی اور یہ بات کوئی نہیں مان سکتا تھا کہ جسم نے بغیر اپنے سر کے ارتکاب جرم کیا ہوگا۔

ایک پولیس مین نے گشت کے دوران میکسی کو تھیٹر کے اسٹیج ڈور کے باہر پروگرام کے پوسٹر دیکھتے پایا تھا۔ ڈیلا کی موت سے ۴۵ منٹ پہلے انھیں دروازے کے باہر ٹوٹا ہوا گلدان ملا تھا، جو میکسی کے غصّے کا ثبوت تھا۔ ڈیلا کے کمرے سے انھیں میکسی کا نیلا رومال ملا جس پر میکسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ جس لاکٹ سے ڈیلا کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ اس پر بھی میکسی کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ ہر چیز میکسی کے اس مسلسل بیان کی تائید کر رہی تھی کہ ڈیلا کو اس نے، تنہا اس نے قتل کیا ہے۔

میں نے بڑی التجاؤں کے بعد اپنے اور اسپیرو کے لیے میکسی سے ملاقات کی اجازت لی۔

میکسی بڑی نرمی، بڑی محبت سے ملا لیکن ہم اسے قائل نہ کر سکے۔ اسپیرو نے اس کے پاؤں تک پکڑ لیے۔ میکسی نے اسے اٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا تاکہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ سکیں۔ پھر اس نے اسپیرو کو جسم کے سلسلے میں اس کی ذمّے داری یاد دلائی۔

”واپس جاؤ میرے دوست“ اس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے اسپیرو کے کندھے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے بچّوں کی حفاظت کرنا۔ میری طرح انھیں نظرانداز نہ کر دینا۔ یاد رکھنا جو چیز ان کی سمجھ میں نہیں آتی، وہ اسے توڑ دیتے ہیں۔ ان کا جرم درحقیقت میرا گناہ ہے۔ میں نے انھیں اس حال کو پہنچایا۔“

میں اور اسپیرو ہوٹل واپس آگئے۔

اسپیرو ڈھے گیا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ بھول کر کہ وہ بونا ہے۔ وہ سسک سسک کر اس رات کی کہانی سناتا رہا اور میں سنتا رہا۔

اس نے بتایا کہ وہ بونوں کو اوپر لے کر گیا تو اس نے انھیں سمجھایا کہ انھیں میکسی کو بغیر کسی تلخی کے چھوڑ دینا چاہیے۔ اس نے وضاحت کی کہ یہ جدائی وقتی ہوگی۔ میکسی اس عورت سے بھی اسی طرح بیزار ہو جائے گا جیسے عرصہ پہلے میڈرڈ میں اس لنگڑے کتّے سے اور روم میں جوتوں سے محروم لڑکے سے... اور برمنگھم میں تھیلیوں والے سنہرے چوہوں سے ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا دل بھر جائے گا ڈیلا سے... اور وہ پہلے کی طرح ہمارے پاس واپس آجائے گا۔

اسپیرو نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے بھی یقین تھا کہ میکسی اپنے بچّوں سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا تھا۔

اسپیرو بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ سب اس کی بات سمجھ گئے تھے اور مان گئے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ انھیں چھوڑ کر میرے پاس کبھی نہ آتا۔

”ترک بونا بھی مان گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اسپیرو نے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اس نے کہا کہ وہ ترک بونے کو نظرانداز کر گیا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔ ترک ان بچّوں میں سب سے تباہ کار بچّہ تھا۔

میں نے تصوّر میں ترک بونے کو دوسرے بونوں کی قیادت کرتے دیکھا۔ وہ چہک رہا ہوگا۔ وہ ڈیلا کی سیاہ رسّی لینے تھیٹر جا رہے ہوں گے۔ پھر وہ ہوٹل واپس آئے ہوں گے۔ ڈیلا کے کمرے میں گئے ہوں گے۔ انھوں نے ڈیلا کے گلے میں رسّی ڈال کر پھندا کس دیا ہوگا۔

اسپیرو بتا رہا تھا کہ وہ کیسے آگ سے بچاؤ والے زینے کے راستے ڈیلا کو لے کر گئے۔ کیسے انھوں نے اپنے جسموں کی مدد سے لیمپ پوسٹ تک پہنچنے کے لیے سیڑھی بنائی۔ یہ سب کچھ وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ میرے کوٹ اور ہیٹ کی مدد سے لیمپ پوسٹ پر دنیا کے سب سے لمبے آدمی کا تماشا کرتے وقت۔

اسپیرو نے میکسی کے لیے سب سے مہنگا وکیل اور میں نے سب سے مہنگا سائیکیٹرسٹ ڈھونڈا۔ ان دونوں نے دو دن تک عدالت میں بھرپور جنگ کی اور بالآخر استغاثے کو ہرا دیا۔ میکسی کو دماغی امراض کے شفاخانے پہنچا دیا گیا۔ سال میں ایک بار میں اس سے ملنے جاتا ہوں۔ ہم نارنگیوں کے اس باغ کی باتیں کرتے ہیں جہاں بونے اس کے منتظر ہیں۔ جیسے ہی میکسی کو رہائی ملے گی، میں اسے وہاں پہنچا دوں گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ بروقت وہاں پہنچ جائے کیونکہ بونے عموماً لمبی عمر نہیں پاتے۔

کچھ بھی ہو، مجھے یقین ہے کہ کم از کم اسپیرو میکسی کے پہنچنے تک ضرور زندہ رہے گا۔ میکسی سے اس کی محبت اسے زندہ رکھے گی۔ مرنے نہیں دے گی۔

پچھلے سال میں نے ان کے ساتھ دو ہفتے گزارے۔ مجھے اب بونوں سے نہ نفرت محسوس ہوتی ہے نہ میں اُن کی قربت سے الجھتا ہوں۔ وہ تو دل شکستہ بچّے ہیں اور اسپیرو... اسپیرو اب میرا دوست ہے۔

THE TALLEST MAN IN
THE WORLD.
Janet Green.

Faisal Ahmed

آدھا چاند

طاہر جاوید مغل

اُس دوشیزۂ لالہ رنگ کی داستانِ محبت جس نے ایک خواب دیکھا اور پھر حصولِ تعبیر کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ وہ منزل پر پہنچ بھی گئی مگر اس کے باوجود منزل اُس سے کوسوں دُور رہی

راستے کی ہر چٹان کو ریزہ ریزہ کر دینے والی ایک نازک ادا کا قصہ

باسط ہمدانی ایک خوب صورت مگر نابینا لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سب احباب کو یہ بات معلوم تھی اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہمدانی ایسا کیوں سوچتا ہے۔ ہمدانی ایک ڈراما نویس اور شاعر تھا۔ یوں تو شاعر حضرات ایسی انہونی خواہشات کا شکار ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ہمدانی کا معاملہ دوسرا تھا۔ دو سال پہلے اسے ٹریفک کا ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثے میں نہ صرف اس کی کھٹارا موٹر سائیکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی بلکہ ہمدانی کو بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ خاص طور پر اس کا بایاں رخسار بُری طرح زخمی ہوا تھا۔ رخسار کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور کان سے آنکھ تک ایک گہرا زخم آیا تھا... یہ زخم اب مندمل ہو چکا تھا مگر ہمدانی کی وجاہت لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ وہ خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک عجیب امتزاج ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے کا دایاں حصّہ اسی طرح خوبصورت اور دلکش تھا، کسی خوبصورت نیم رُخ تصویر کی طرح مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ نہایت تاریک، مسخ شدہ اور بھیانک تھا۔ بائیں آنکھ کچھ چھوٹی ہو گئی تھی۔ ابرو غائب تھی اور جبڑے سے کنپٹی تک کھال بُری طرح تڑی مڑی ہوئی تھی۔ ہمدانی جوان اور دراز قد تھا۔ اگر کوئی لڑکی اسے دائیں جانب سے دیکھتی تو ہزار جان سے

اس پر فدا ہو جاتی۔ مگر افسوس کہ اس کے چہرے کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا جو کسی کو گوارا نہیں تھا۔

ہمدانی کو اپنے اس عیب کا شدید احساس تھا۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر لوگوں سے دُور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے دوستوں کو بہ خوبی علم تھا کہ اندھی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش میں کیا راز ہے۔ دراصل یہ بھی ایک خوبصورت شاعر کا حُسنِ تخیل تھا۔ اس نے اپنے مسئلے کا ایک رومانی حل ڈھونڈ لیا تھا۔ ایک خوبصورت لیکن اندھی لڑکی، ایک بدشکل لیکن آنکھوں والا شوہر۔ دونوں اپنے اپنے عیب بھول کر ایک دوسرے میں حسن تلاش کر سکتے تھے۔ اپنی زندگی مکمل کر سکتے تھے۔

باسط ہمدانی ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ ایک بیوہ ماں کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ عزیز و اقارب تو خوشحال لوگوں کے ہوتے ہیں اور ہمدانی کو خوشحالی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ کُل پندرہ سو روپے اس کی تنخواہ تھی جس میں سے کچھ مکان کے کرائے پر اُٹھ جاتا تھا۔ کبھی کبھار ریڈیو سے بھی کسی نغمے یا ڈرامے کا کوئی چیک آجاتا تھا۔ پیسہ پیسہ جوڑ کر ہمدانی کی ماں نے اس کی شادی کے لیے کچھ رقم اکٹھی کی تھی..... مگر ہمدانی کو پیش آنے والے حادثے کے نتیجے میں یہ رقم بھی علاج معالجے پر خرچ ہو گئی تھی۔ اب ہمدانی کے سر سہرا بندھنے کا دُور و نزدیک کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اٹھائیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے دفتر کے ساتھی تین تین بچوں کے باپ تھے۔

ندیم، ہمدانی کا ایک بے تکلف دوست تھا۔ وہ ایک ہفت روزہ رسالے میں ملازم تھا۔ ایک دن اس نے اپنے رسالے میں ہمدانی کا انٹرویو چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے اصرار پر ہمدانی نے مختصر سا انٹرویو اپنی چند تازہ غزلوں کے ساتھ دے دیا۔ ندیم نے اگلے ہی ہفتے یہ انٹرویو چھاپ دیا۔ لیکن اس میں اپنی طرف سے ایک اضافہ بھی کر دیا۔ انٹرویو کے آخر میں اس نے سوال و جواب پر مشتمل ایک اضافی عبارت بھی شامل کر دی۔ اس عبارت کے مطابق ہمدانی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ایک خوبصورت لیکن نابینا لڑکی سے شادی کا خواہشمند ہے۔ ہمدانی نے جب اپنا انٹرویو پڑھا تو ندیم کی شرارت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس وقت اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ہفت روزہ رسالے میں چھپنے والی یہ چند سطور اس کی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب لائیں گی۔

چند روز بعد کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ اس کی والدہ کسی پڑوسن کے گھر گئی ہوئی تھیں وہ اپنے کمرے میں بیٹھا مشقِ سخن میں مصروف تھا۔ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو پڑوسن کا لڑکا جمشید کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"بھائی جان، ایک اندھی لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"اندھی لڑکی..... مجھ سے!" ہمدانی نے حیرت سے کہا۔ پھر جیسے اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہفت روزہ رسالے میں چھپنے والے انٹرویو کی سطور اس کی نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ چند لمحوں تک وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ جمشید کو کیا جواب دے۔

"کہاں ہے وہ؟" آخر اس نے پوچھا۔

"میں نے انھیں اُدھر برآمدے میں بٹھا دیا ہے۔"

"اچھا، تم جاؤ میں آتا ہوں۔"

جمشید واپس چلا گیا۔ ہمدانی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے اپنا مفلر اٹھا کر اچھی طرح کانوں پر لپیٹا اور چپل پہن کر باہر نکل آیا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکی اندھی تھی۔ وہ برآمدے میں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ جمشید ابھی تک وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو تین ننگ دھڑنگ بچے اور بھی تھے۔ چارپائی پر ایک سروقد لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ وہ ایک چیک دار چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ سیاہ چادر میں اس کا دودھیا چہرہ کچھ اور بھی گورا نظر آتا تھا۔ لڑکی کی آنکھیں بہت بڑی بڑی اور گہری تھیں مگر یہ آنکھیں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ ان میں بینائی نہیں۔ لڑکی کی پیشانی پر چھوٹا سا نیلگوں نشان تھا۔ لگتا تھا ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اسے کوئی چوٹ لگی ہے۔

ہمدانی کے قدموں کی چاپ نے لڑکی کو چوکنا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کا رنگ بکھر گیا۔

"جی فرمایئے" ہمدانی نے قریب پہنچ کر کسی قدر رسمی سے انداز میں کہا۔

"آپ... آپ ہمدانی صاحب ہیں؟" لڑکی نے ہکلا کر پوچھا۔ اس کی آواز اس سے کم حسین نہیں تھی۔

اچانک ہمدانی کو یوں لگا کہ اسے اسی لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ سو فیصد یہی آنکھیں، یہی ہونٹ، یہی عارض، ایسی ہی شرمیلی شرمیلی باحیا دوشیزگی۔ اس کا دل آپ ہی آپ لڑکی کی طرف کھنچنے لگا۔ لڑکی کی مسحور کن آواز کی بازگشت ابھی تک اس کے کانوں میں تھی۔ "آپ ہی ہمدانی صاحب ہیں نا؟"

"جی ہاں، میں ہی ہمدانی ہوں... یہ آپ کی پیشانی پہ چوٹ کیسے آئی؟ اس سے تو خون رِس رہا ہے۔"

لڑکی کے گداز لب تھرتھرائے لیکن اس کے بولنے سے پہلے جمشید بول اٹھا۔ "بھائی جان، یہ باہر نالی پار کرتے ہوئے گر گئی تھیں کھمبے سے سر ٹکرا گیا تھا۔"

"اوہ... یہ تو بہت بُرا ہوا —" ہمدانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ "ٹھہریے، میں دوا لاتا ہوں لگانے کے لیے۔" پھر رُک کر بولا۔ "آجایئے... اندر ہی آجایئے، میں پٹی کر دیتا ہوں۔"

بچے ابھی تک تماشائی نگاہوں سے لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ ہمدانی نے انھیں خشمگیں نگاہوں سے گھور کر واپس بھیج دیا۔ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور ہمدانی نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔ یہ ایک میکانیکی عمل تھا۔ سوچے سمجھے بغیر سرزد ہونے والا۔ کتنا دشوار کام تھا جو اس نے غیر ارادی طور پر کر لیا تھا۔ لڑکی کی عریاں کلائی پر ہاتھ پڑتے ہی جیسے ہمدانی کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے اپنا دل کانوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ ڈولتے قدموں سے وہ لڑکی کو اندر لایا۔

دوا لگاتے اور پٹی باندھتے ہوئے اس کی لرزاں انگلیوں نے جذبات کی کئی پیچیدہ گرہیں کھول دیں۔ ابھی نہ لڑکی نے کچھ کہا تھا اور نہ ہمدانی نے کوئی بات کی تھی مگر دونوں کے ذہنوں کی غیر مرئی لہریں ہم کلام تھیں۔

ہمدانی سمجھ چکا تھا کہ یہ لڑکی اس انٹرویو کے حوالے سے یہاں پہنچی ہے... اور اگر اسی انٹرویو کے حوالے سے پہنچی ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟..... وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یقیناً وہ بطور قلم کار اسے جانتی تھی اور اس کی کوئی پرانی پرستار تھی۔ یکایک ایک اندیشہ ہمدانی کے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ کیا وہ اس کے عیب سے آگاہ ہے، کہیں کسی نے اسے بتا تو نہیں دیا کہ...

"آ.... آپ کہاں سے آئی ہیں؟"

"سرگودھا سے" لڑکی نے اپنی خوبصورت آواز میں شائستگی سے جواب دیا۔ اب اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ شاید ہمدانی کی لرزاں انگلیوں اور مہذب لہجے نے اسے حوصلہ بخشا تھا۔

"آپ سیدھی سرگودھا ہی سے آرہی ہیں؟"

"جی ہاں" لڑکی نے جواب دیا۔ "بس اسٹینڈ سے سیدھی یہاں پہنچی ہوں" پھر ذرا رُک کر بولی۔ "میں آپ کی شاعری کی گرویدہ ہوں۔ سب سے پہلے میں نے ریڈیو پر آپ کی ایک غزل سنی تھی۔ پھر میں نے آپ کا مجموعہ "آدھا چاند" منگوایا۔ میری ایک سہیلی بھی آپ کی پرستار ہے۔ وہ مجھے آپ کی تحریریں شوق سے سنایا کرتی ہے۔ آپ کی تقریباً ہر تخلیق ہماری نظر سے گزری ہے۔ میرے پاس آپ کا ایڈریس تھا..... دراصل..... مم..... میں نے آپ کا انٹرویو سنا..... مم... مجھے آپ کی باہمت والدہ سے ملنے کا شوق ہوا اور میں نکل کھڑی ہوئی۔"

لڑکی بہت کچھ کہہ رہی تھی مگر ہمدانی وہی کچھ سن رہا تھا جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے لفظ سن رہا تھا۔ اس کی آواز سن رہا تھا۔ صدا کا زیر و بم محسوس کر رہا تھا، ہونٹوں کی لرزش پڑھ رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور اس کی آگہی اسے ایک میٹھی میٹھی لذت سے ہمکنار کر رہی تھی، وہ لذت جو اس کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

دو ہی دن میں سب کچھ واضح ہو گیا۔ لڑکی نے اپنا نام جمیلہ بتایا۔ وہ بے آسرا تھی۔ ایک باپ کے سوا اس کا دُنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے باپ نے دبئی کا رُخ کیا اور جمیلہ کو اس کی خالہ کے سپرد کر گیا۔ وہ وہاں ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازم تھا۔ ایک دن اسے حادثہ پیش آیا اور فرم والوں نے اس کی لاش کے ساتھ معاوضے کی رقم ارسال کر کے سرخروئی پائی۔ آخری خونی رشتہ بھی جمیلہ کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اب وہ بالکل تنہا تھی۔ خالہ کے گھر اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا خالو کوئی نیک نام شخص نہیں تھا۔ اچھے بُرے لوگوں کا اس کے ہاں آنا جانا تھا۔ خالہ بھی اس کے سامنے بے بس تھیں۔ جمیلہ اب بھرپور جوان تھی۔ خالو کے دوستوں کی حریص نگاہیں اس کا جسم چھلنی کرتی رہتی تھیں۔ اور وہ جانتی تھی کہ کسی روز کسی آہنی ہاتھ کی گرفت میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ جائے گی۔

جمیلہ کی باتیں اثر انگیز تھیں۔ تاہم ہمدانی اور اس کی والدہ کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے اپنے پتے ٹھکانے کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ وہ نئے رشتوں کی بنیاد ہی اس بات پر رکھ رہی تھی کہ اس پر مکمل بھروسا کیا جائے۔ اور اس کا ماضی کریدنے کی کوشش نہ کی جائے۔

ہمدانی کی والدہ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر پاکیزگی کا اجالا تھا۔ اور اس کی باتوں سے سچائی کی مہک آرہی تھی اور پھر ان کا بیٹا بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکا تھا۔ انھوں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر ہمدانی نے اس لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ انکار نہیں کریں گی۔

اگلے چند روز میں حالات تیزی سے تبدیل ہوئے۔ جمیلہ کو اپنی والدہ کے پاس چھوڑ کر ہمدانی ایک مہم پر نکل کھڑا ہوا۔

اس نے کوئٹہ میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے رابطہ قائم کیا اور وہاں ایک چھوٹے سے اشاعتی ادارے میں نوکری ڈھونڈ لی۔ اسی دوست کی وساطت سے اسے کرائے کا ایک مکان بھی مل گیا۔ ان انتظامات کے بعد وہ لاہور واپس آیا۔ پرانی ملازمت سے استعفا دیا اور ماں اور جمیلہ کو لے کر کوئٹہ شفٹ ہو گیا۔ اس اجنبی شہر میں ایک ڈاکٹر تنویر شاہد کے سوا کوئی اس کا جاننے والا نہیں تھا اور وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ اپنے خوابوں کے مطابق ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ ایسی زندگی جس میں اس کی شکل کا عیب سات پردوں میں چھپا رہے اور وہ ایک نارمل انسان کی طرح اپنی شریکِ حیات کو محبت دے سکے اور اس کی محبت حاصل کر سکے... کوئٹہ پہنچتے ہی اس نے نہایت خاموشی کے ساتھ جمیلہ سے شادی کر لی۔

باسط ہمدانی اب قطعی ایک غیر معروف شخص تھا۔ اس نے شاعری چھوڑ دی تھی۔ شاعری کی اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے حسین جذبوں کو اظہار کا وسیلہ مل گیا تھا۔ اب اگر وہ شاعری کرتا بھی تھا تو اپنی حسین خلوتوں میں... وہ ایک ہی دلآویز غزل تھی جسے وہ بار بار پڑھتا تھا۔ اس کے ایک ایک مصرعے پر پلکیں رکھتا تھا اور ہر ہر لفظ کو دل میں اتارتا تھا۔

اس کی شادی کو اب دو سال گزر چکے تھے۔ اور وہ اپنی محبت میں اتنا خود غرض تھا کہ ابھی تک ان کے آنگن میں بچوں کی چہکار نہیں گونجی تھی۔ شاید وہ بچے چاہتا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی ایسے وجود کو گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا جو جمیلہ پر اس کا عیب کھول دے۔ وہ جمیلہ کی نظروں میں ایک خوبرو مرد تھا اور ہمیشہ رہنا چاہتا تھا۔ گھر میں صرف اس کی والدہ ہوتی تھیں اور والدہ نے کبھی بہو کو نہیں بتایا کہ اس کا شوہر "آدھا چاند" ہے۔ وہ بتا بھی کیسے سکتی تھیں۔ رہے اڑوس پڑوس کے لوگ اور محلے والے تو انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمدانی کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے کہاں سے آتا ہے۔ دو سال گزرنے کے باوجود وہ اس کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ کسی دفتر میں کام کرتا ہے۔ محلے کے بزرگوں نے اسے اکثر علی الصباح سائیکل پر دفتر جاتے اور رات پڑے واپس آتے دیکھا تھا۔ موسم کیسا ہی ہو۔ اس کے سر پر ہمیشہ ایک ٹوپی اور ٹوپی کے نیچے ایک مفلر ہوتا تھا۔ جو اس کے کانوں کو لپیٹتا ہوا کوٹ یا سویٹر کے اندر اتر جاتا تھا۔ آنکھوں پر ہمیشہ ہلکے رنگ دار شیشوں کی عینک ہوتی تھی۔ سائیکل کے ہینڈل پر جھکا ہوا وہ مخصوص رفتار سے پیڈل چلاتا گلی سے گزر جاتا تھا۔ بازار سے سودا سلف اس کی والدہ لے کر آتی تھیں۔

چھٹی کے دن بھی وہ عموماً گھر میں نہیں ملتا تھا۔ اگر کبھی کسی کو ملتا بھی تھا تو یہ ملاقات نہایت مختصر اور ضروری گفتگو تک محدود رہتی تھی۔ مفلر تو اس کی شناختی علامت بن چکا تھا۔ بعض لوگ از راہِ مزاح اسے مفلر والے کے نام سے یاد کرتے تھے۔

درحقیقت حساس طبع ہمدانی نے اپنے عیب کو ایک زبردست نفسیاتی مسئلہ بنا لیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی یہ خواہش شدید تر ہوتی جا رہی تھی کہ جمیلہ کبھی اس کے عیب سے آگاہ نہ ہو سکے۔ وہ اس کے دلکش چہرے پر ہمیشہ اپنی محبت کا یہی رنگ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے وہ تمام در بند کر دیے تھے جن سے اس کے عیب کی جھلک جمیلہ کو نظر آ سکتی تھی۔ قربت کے لمحوں میں بھی وہ بے حد محتاط رہتا تھا۔ جمیلہ کے بے قرار ہاتھوں کو اس نے کبھی اپنے مجروح رخسار تک نہیں پہنچنے دیا۔ جمیلہ کے ہاتھوں کا تعارف صرف اس کے دائیں رخسار سے تھا۔ جہاں وجاہت کسی خوبصورت پرندے کی طرح اپنی تمام تر بدقسمتی کے ساتھ پر سمیٹے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ ارادی یا غیر ارادی طور پر جمیلہ اس کے بائیں رخسار کو چھونا چاہتی ہے ایسے میں اس کی روح لرز اٹھتی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ سوچنے لگتا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جمیلہ کسی طور میرے عیب سے آگاہ ہو گئی ہو۔ جب وہ سرگودھا سے آئی تھی اور اس کے گھر کا پتا پوچھتی پھر رہی تھی تو کسی نے اسے اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا ہو۔ کسی بچے نے اس کے گھر کا پتا بتاتے ہوئے کہہ دیا ہو۔ "وہی ہمدانی جس کا چہرہ بگڑا ہوا ہے۔" یا... یا وہ پہلے سے اس بارے میں جانتی ہو۔ ماضی میں کسی کی زبانی اس کی بدصورتی سے آگاہ ہو گئی ہو لیکن ایسا تھا تو پھر اس نے اس سے شادی کیوں کی؟ نہیں، یہ خیال غلط ہے..... ہاں یہ امکان ضرور تھا..... کہ کسی رات جب وہ گہری نیند سو رہا ہو تو جمیلہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ ٹٹول لیا ہو..... یا پھر اس کی والدہ نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہو۔ والدہ کے علاوہ اس گھر میں اور کون تھا۔ صرف ایک ڈاکٹر تنویر کبھی کبھار آتا تھا اور اس پر ہمدانی کو ایک سو دس فیصد بھروسا تھا۔ وہ جمیلہ سے کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمدانی کے نفسیاتی مسئلے کی پیچیدگی کو اس سے بھی بہتر سمجھتا تھا... بہت سوچنے کے بعد آخر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر سہارا دیتا۔ "ٹھیک ہے، بہ فرضِ محال اگر جمیلہ کو کسی طرح معلوم ہو بھی گیا ہے تو کیا ہوا۔ تصور اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی ہو گی کہ اس کے شوہر کا ایک رخسار مجروح ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اس بدنمائی کو کب دیکھا ہے؟"

وقت گزرتا رہا۔ ہمدانی کے ماحول نے اور اس کے ملنے جلنے والوں نے اسے اس کے غیر معمولی رویوں سمیت قبول کر لیا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش کا جزو بن کر ایک عام زندگی گزار رہا تھا کہ زندگی کی اس پُرسکون جھیل میں ایک کنکر آ گرا۔ اس روز تعطیل تھی۔ بیوی کا ہاتھ بٹاتے ہوئے ہمدانی گھر کی صفائی کر رہا تھا۔ اس نے ایک صندوق کو اس کی جگہ سے سرکایا تو عقب میں لکڑی کا ایک چھوٹا ڈبا نظر آیا۔ یہ ڈبا خاصا وزنی تھا۔ اس نے ڈبے کا ڈھکن اٹھایا۔ وہ چھوٹے بڑے سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ چند بڑے نوٹ بھی ایک ربڑ بینڈ میں بندھے ایک جانب رکھے تھے۔ دو ڈھائی ہزار کی رقم تھی۔ ہمدانی سمجھ گیا کہ یہ رقم جمیلہ نے جمع کی ہے۔ لیکن اس نے اس سے چھپایا کیوں؟ وہ تو کبھی اس سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔ باتیں تو وہاں چھپائی جاتی ہیں جہاں مزاج میں ہم آہنگی نہ ہو اور وہ دونوں تو جیسے ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ اگر ان میں کوئی تنازعہ تھا تو وہ ایک ہی تھا۔ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے تھے جمیلہ اب بچے چاہتی تھی اور ہمدانی نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس ذمے داری سے کترا رہا تھا۔ تاہم اس تنازعے نے کبھی غیر معمولی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ وہ کافی دیر ڈبے میں جمع شدہ رقم کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے بند کر کے اسی جگہ رکھ دیا۔ رات کو اس نے جمیلہ سے اس بارے میں پوچھا... اپنا بھید کھلنے پر وہ ذرا پریشان ہوئی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"ہمدانی! میں علاج کرانا چاہتی ہوں۔"

"کس کا علاج؟" ہمدانی نے چونک کر پوچھا۔

وہ زیرِ لب مسکرائی، پھر اس کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔ "اپنی آنکھوں کا....."

یکایک ہمدانی پر جیسے بجلی گر پڑی۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟"

"کبھی آپ کے دماغ میں نہیں آیا نا... اس لیے میرے دماغ میں آ گیا۔" وہ اپنی خوبصورت آواز میں بولی۔

ہمدانی چمک کر بولا۔ "جمیلہ! میں مذاق میں بات نہیں کر رہا۔ آخر یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سوجھا ہے؟"

جمیلہ نے کہا۔ "کچھ دن پہلے جب آپ تونسہ گئے ہوئے تھے تو تنویر بھائی آئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں لیکن اس کے لیے رقم کی ضرورت ہے... میں نے سوچا، کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کروں، شاید کوئی بات بن جائے۔" جمیلہ نے کہا۔

ہمدانی غصے سے بولا۔ "اچھا، تو یہ سب کچھ اس گدھے کا کیا دھرا ہے۔ اس بے وقوف سے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو مریض بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتے۔ سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا ہے۔ کوئی اس سے پوچھے۔ اچھی بھلی آنکھیں ہیں۔ خواہ مخواہ چیر پھاڑ کے لیے ڈاکٹروں کے آگے رکھ دی جائیں۔ آنکھ کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ایسے آپریشنوں میں سے اسّی فیصد ناکام ہو جاتے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہمیں فی الحال یہ خطرہ مول لینے کی۔"

ہمدانی کا لہجہ بے حد جلا کٹا تھا۔ جمیلہ نے اسے مزید تاؤ دلانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور کروٹ بدل کر سو گئی... لیکن ہمدانی کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ اگلے ہی دن وہ تنویر کے کلینک جا پہنچا۔ اس نے تنویر سے پوچھا کہ اس نے جمیلہ سے کیا بات کی تھی۔

تنویر پہلے تو حیران ہوا، پھر بولا۔ "ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یونہی بھابی کی آنکھیں دیکھی تھیں اور کہا تھا کہ ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ مگر آپریشن کے لیے کافی رقم کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد نہ انھوں نے کوئی بات کی نہ میں نے۔"

ہمدانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آئندہ سے اب اس بارے میں کوئی بات کرنا بھی نہیں۔ کیوں میری زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو!"

ہمدانی کا غصہ دیکھ کر تنویر نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولا۔ "وہی ہو گا جناب جو آپ چاہتے ہیں۔"

اس واقعے کے بعد ہمدانی نے جمیلہ سے سختی سے کہہ دیا کہ وہ اس مہم جوئی کا خیال دل سے نکال دے۔ زندگی ٹھیک ٹھاک گزر رہی ہے اور وہ کسی پُرخطر تبدیلی کا خواہشمند نہیں۔ اس نے جمیلہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ رقم پس انداز کرنے کے بجائے وہ اسے اپنے اوپر خرچ کیا کرے۔ اس کی صحت روز بہ روز گرتی جا رہی ہے۔

جمیلہ کو سمجھانے کے بعد ہمدانی نے فرض کر لیا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ گئی ہے... مگر چند ہفتے بعد ایک روز چپکے سے اس نے چوبی ڈبا دوبارہ دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا خیال غلط تھا۔ رقم میں اضافہ ہوا تھا اور جمیلہ بدستور بچت میں مصروف تھی۔ اس کا پارہ ایک بار پھر چڑھ گیا لیکن اس دفعہ اس نے حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا... دو روز بعد اس نے جمیلہ کو بتایا کہ وہ اپنی سائیکل اور گھر کی کچھ فالتو چیزیں بیچ رہا ہے تو جمیلہ کا رنگ اڑ گیا۔

"کیوں، کیا بات ہوئی؟" اس کی دلکش آواز فکر کے

بوجھ سے لرز گئی۔

ہمدانی نے کہا۔ "دفتر میں مجھ سے کچھ رقم کا نقصان ہو گیا ہے۔ میں ہر صورت میں یہ نقصان پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

جمیلہ کا ردِعمل ہمدانی کی توقع کے عین مطابق تھا۔ وہ فکرمند نظر آنے لگی۔ اس کے پوچھنے پر ہمدانی نے بتایا کہ دفتر میں ایک فوٹو اسٹیٹ مشین اس کی بے پروائی سے خراب ہو گئی ہے۔ جس کی مرمّت پہ چار، پانچ ہزار روپے خرچ ہوں گے...

جمیلہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اندر گئی اور رقم والا چوبی ڈبّا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں تقریباً تین ہزار روپے تھے۔

"آپ اپنی ضرورت پوری کر لیں۔ پیسوں کا کیا ہے، پھر جمع ہو جائیں گے۔" وہ بولی۔

ہمدانی نے کچھ پس و پیش کے بعد رقم لے لی... نہ صرف رقم لے لی، بلکہ اس کے بعد گھر کا روزانہ خرچ بھی کم کر دیا۔ اس سے پہلے وہ جمیلہ کو بیس روپے دے کر جاتا تھا اب پندرہ روپے دینے شروع کر دیے اور عذر یہ پیش کیا کہ دفتر کا نقصان پورا کرنے کے لیے ابھی کفایت شعاری کی ضرورت ہے۔ اب وہ مطمئن تھا کہ جمیلہ بچت کا خیال دل میں نہیں لائے گی۔

وہ اکتوبر کی ایک دُھندلی صبح تھی۔ کوئٹہ پر سردی حملہ آور ہو چکی تھی۔ ہمدانی نے سوئٹر نکالنے کے لیے بڑے جستی بکس میں ہاتھ ڈالا۔ تو لحافوں، کھیسوں اور چادروں کے نیچے وہی چوبی ڈبّا پڑا ملا۔ اس نے ڈبّا نکالا۔ وہ خالی نہیں تھا، پہلے ہی کی طرح وزنی تھا۔ اس نے جلدی سے ڈھکنا اٹھایا۔ پچھلے چند مہینوں میں ہزار بارہ سو روپے پھر جمع ہو چکے تھے۔ وہ غصّے میں کھول اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جمیلہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آئی تھی۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اور لوگوں کے سوئٹر بُن بُن کر وہ بدستور رقم جمع کر رہی تھی۔ عورت ذات کے بارے میں بڑے بوڑھوں کی کہی ہوئی کئی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ عورت کی عقل اس کی ایڑی میں ہوتی ہے۔ عورت ہٹ کی پکّی ہوتی ہے۔ کوئی مرد عورت کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ جھلا کر رہ گیا۔ وہ اپنے منصوبے سے دستبردار کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اس کے مشورے پر چلتی۔ اگر اس نے منع کر دیا تھا تو اسے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ ضرور اس میں ان دونوں کی بھلائی ہو گی۔ وہ کیوں ہاتھ چھُڑا چھُڑا کر ایک خطرناک راستے پر بھاگ رہی تھی... ایک بار تو ہمدانی کے دل میں آئی کہ ڈبّا اٹھا کر پورے زور سے دیوار پر دے مارے اور جب سکّوں کی جھنکار سن کر جمیلہ لپک کر اندر آئے تو ایک دو طمانچے اس کے گال پر بھی جڑ دے اور کہے 'کیا لینا ہے تجھے اپنی آنکھوں سے۔ کیوں تُلی ہوئی ہے اس گھر کو برباد کرنے پر...' لیکن پھر اس کی فطری شرافت اس پر غالب آگئی۔ اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اس معاملے کو کسی اور طریقے سے حل کرے گا۔ اس نے ڈبّا چپکے سے اسی جگہ رکھ دیا اور فیصلہ کر لیا کہ آیندہ وہ جمیلہ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا اور وہ باز نہیں آ رہی تو وہ اسے رقم جمع کرنے کا پورا موقع دے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ تقریباً چھ مہینے اور گزر گئے۔ چوبی ڈبّے میں اب کافی رقم اکٹھی ہو چکی تھی۔ ہمدانی جانتا تھا کہ جمیلہ کے منصوبے کو زبردست دھچکا پہنچانے کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے پروگرام کے مطابق اب اسے رقم والا ڈبّا اٹھا کر جمیلہ کو اس کی بچت سے محروم کر دینا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ جمیلہ کو ذہنی اذیّت بھی پہنچانا چاہتا تھا۔ شوہر سے نافرمانی کی اسے کچھ تو سزا ملنی چاہیے تھی۔ اپنی پیسہ پیسہ جوڑی ہوئی رقم کے کھو جانے سے اسے یقیناً بہت دُکھ ہوتا لیکن یہ دُکھ اس کا اپنا مول لیا ہوا تھا۔

وہ اپریل کا ایک خنک دن تھا۔ ہمدانی بے قراری سے شام کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اسے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ جب بھی اسے کوئی اہم کام کرنا ہوتا تو اس پر عجیب سی اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس پر یہ اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ نتیجتاً اس نے دفتر سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی چھُٹی لے لی اور گھر روانہ ہو گیا۔

گھر کی دہلیز پار کرتے ہی اسے کسی تبدیلی کا احساس ہوا۔ جمیلہ کے وجود سے گھر کے در و دیوار پر جو رونق سی نظر آتی تھی وہ آج مفقود تھی۔ شاید جمیلہ گھر میں نہیں تھی۔ اس نے والدہ سے پوچھا تو اس کا خیال درست نکلا۔ انھوں نے بتایا کہ سہ پہر دو ڈھائی بجے وہ کسی ضروری کام سے گئی تھی۔ بار بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ کہتی تھی شام سے پہلے لوٹ آئے گی۔

'وہ کہاں جا سکتی ہے؟' ہمدانی نے پریشانی سے سوچا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خدشہ جاگا۔ وہ تیز قدموں سے کمرے میں گیا۔ جستی بکس کا ڈھکنا اٹھایا۔ لحافوں، کھیسوں اور چادروں کے نیچے وہ چوبی ڈبّا موجود تھا لیکن اس میں رقم نہیں تھی۔ پلک جھپکتے میں ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے اور رگوں میں خون کھول کر رہ گیا۔ جمیلہ

پہل کر گئی تھی۔ وہ جمع شدہ رقم لے کر... شاید ڈاکٹر تنویر کی طرف گئی تھی۔

غصّے میں بھنّایا اور اپنے آپ سے الجھتا ہوا وہ باہر نکلا اور بائیسکل لے کر ڈاکٹر تنویر شاہد کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کا راستہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا اور تنویر کے کلینک جا پہنچا۔ تنویر کا گھر کلینک کے عقب میں تھا اور اس وقت وہ گھر میں تھا۔ وہ دندناتا ہوا اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ تنویر اور جمیلہ برآمدے میں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب ہی میز پر جمیلہ کا کھلا ہوا پرس رکھا تھا۔ یقیناً اس پرس میں وہ رقم لے کر یہاں پہنچی تھی۔ ہمدانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جاتے ہی جمیلہ کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اور دو تین زوردار طمانچے اس کے گالوں پر جڑ دیے۔ اس اچانک حملے نے جمیلہ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ تنویر نے بیچ میں آکر بمشکل اس کی جان چھڑائی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھُپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ ہمدانی دہاڑا۔

"چھوڑ دے مجھے تنویر! میں اس حرام زادی کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

مہینوں کا دبا ہوا غصّہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ دھیمے لہجے میں بولنے والا ہمدانی آج آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ تنویر نے چیخ کر کہا۔

"ہمدانی! ہوش میں آؤ... ہوش میں آؤ۔ پاگل مت بنو۔" پھر وہ اسے گھسیٹتا اور دھکیلتا ہوا برابر والے کمرے میں لے گیا اور اسے اندر بند کر کے باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ ہمدانی کچھ دیر جوش میں دروازہ کھٹکھٹاتا رہا پھر نڈھال ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سر ہاتھوں میں تھام کر غصّہ پینے کی کوشش کرنے لگا۔

تنویر نے تقریباً نصف گھنٹے بعد دروازہ کھولا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ وہ شاید رویا بھی تھا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ "ہمدانی! تو نے بھابی کے ساتھ بڑا سنگدلانہ سلوک کیا ہے۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔"

ہمدانی غرّایا۔ "یہ تم کہہ رہے ہو، تنویر! یہ تم کہہ رہے ہو۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ کیا اس کی دیکھتی ہوئی آنکھیں مجھے زندہ رہنے دیں گی؟ کیا... کیا اس کے کامیاب آپریشن کا دن ہماری ازدواجی زندگی کا آخری دن ثابت نہیں ہو گا؟ تم سب جانتے ہو، پھر بھی اس ضدّی عورت کا ساتھ دے رہے ہو۔ تم دوست نہیں میرے دشمن ہو..."

تنویر نے رومال سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولا۔ "ہمدانی! تمھارا دشمن میں نہیں تمھاری بے خبری ہے۔ بھابی بیچاری کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ تمھیں ایک سرپرائز دینا چاہتی تھیں۔ تم جانتے ہو وہ پائی پائی رقم کس لیے جوڑ رہی تھیں؟ جانتے ہو تم؟"

ہمدانی نے کہا۔ "جانتا ہوں۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کا علاج کرانا چاہتی ہے۔"

تنویر بولا۔ "میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن حقیقت مجھے آج معلوم ہوئی ہے... ہمدانی! وہ اپنی آنکھوں کا علاج کرانا نہیں چاہتی تھی۔ تمھارے چہرے کا علاج کرانا چاہتی تھیں وہ.... وہ تمھاری پلاسٹک سرجری کرانا چاہتی ہیں۔ تمھارے جسم اور تمھاری روح کے زخموں کو مندمل کرنا چاہتی ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" ہمدانی کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ "کیا... کیا اُسے...؟"

"ہاں، انھیں سب معلوم ہے۔" تنویر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ تمھارے جسمانی عیب کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ایک حادثے نے تمھارا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔"

"لیکن... لیکن کیسے؟ کیسے معلوم ہوا یہ سب کچھ اسے؟"

ہمدانی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ڈاکٹر تنویر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میں تمھیں سب کچھ بتا دُوں گا لیکن میری ایک شرط ہے۔ اس سے پہلے تمھیں اپنے دو ہفتے مجھے دینے ہوں گے۔ تمھیں یہاں سے گھر نہیں جانا ہو گا۔ میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہو گا۔ اور وہی کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔ خدا کی قسم اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں تمھارا سر پھاڑ دوں گا اور تمھیں باندھ کر لے جاؤں گا۔"

ڈاکٹر تنویر کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ ہمدانی الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ان دنوں پلاسٹک سرجری اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ صرف کراچی میں ایک سینٹر تھا۔ ڈاکٹر تنویر، ہمدانی کو سیدھا کراچی لایا یہاں متعلقہ شعبے میں ایک ڈاکٹر اس کا واقف کار تھا۔ اس ڈاکٹر کی مہربانی سے ہمدانی کے کام میں زیادہ تاخیر نہیں ہوئی۔ اس کا آپریشن کیا گیا اور دو تین مرحلوں میں علاج مکمل ہو گیا۔ آخر وہ دن آیا جب ہمدانی اسپتال سے فارغ ہوا... اس کے چہرے کا تاریک رُخ روشن ہو چکا تھا۔ اب وہ پورا چاند تھا۔ آئینوں سے ڈرنے کا موسم گزر چکا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی اتنی جلدی انقلاب آشنا ہو سکتی ہے۔ اس روز ہمدانی

نے تنویر کو گھیر کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ اور وہ بات جو کئی روز سے اس کے سینے میں ہلچل مچا رہی تھی، اس کے لبوں تک آگئی۔ اس نے تنویر سے کہا۔ ”بتاؤ تنویر، یہ سب کیا معاملہ ہے؟“

تنویر نے سگریٹ پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا۔ ”سچ پوچھتے ہو ہمدانی، تو ٹھیک ٹھیک مجھے بھی معلوم نہیں۔ بس بھابی نے ایک اشارہ سا دیا تھا کہ انھیں تمھارے نقص کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ بہرحال... مجھے یقین ہے کہ وہ اب ساری بات تمھیں اپنی زبانی بتادیں گی۔ چلو آؤ گھر چلتے ہیں۔“

ہمدانی کے بہت اصرار کے باوجود تنویر اور کچھ نہیں بتا سکا۔ شاید وہ بتانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسی دن دونوں کراچی سے واپس کوئٹہ روانہ ہوئے۔ ریل کے ایک طویل سفر کے بعد وہ بالآخر کوئٹہ پہنچے... دوپہر کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے سواری لے کر وہ سیدھے گھر آئے۔ گھر کے دروازے پر قفل نظر آرہا تھا۔ ہمدانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی وہ دونوں پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے کہ ہمدانی کی پڑوسن نے دروازہ کھولا۔ ہمدانی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ یہ حیرت صرف اس لیے تھی کہ پچھلے ساڑھے تین برس میں آج پہلی بار اسے ہمدانی کے چہرے پر مفلر نظر نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ جھجکتی ہوئی اور اسے اجنبی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھی اور بولی۔

”بھائی جان! جمیلہ چابیاں مجھے دے گئی ہے۔ وہ پانچ چھ روز پہلے خوشاب جانے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ کوئی ضروری کام تھا۔ امی جان کو وہ ہمارے ہاں ٹھہرا گئی ہے کہ اکیلے میں انھیں گھبراہٹ نہ ہو... وہ تو اس وقت سو رہی ہیں۔ میں ابھی چابیاں لاتی ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے پڑوسن واپس گئی اور تھوڑی دیر میں چابیاں لاکر ہمدانی کے ہاتھ میں تھمادیں۔

”خوشاب... جمیلہ... ضروری کام۔“ ہمدانی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے پہلے بیرونی اور پھر اندرونی دروازہ کھولا۔ کمرے صاف ستھرے تھے ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ یہاں تک کہ ہمدانی کے استری شدہ کپڑے بھی کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے تھے۔ اگر نہیں تھی تو گھر والی نہیں تھی۔ ہمدانی اور تنویر ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہمدانی کی نظر میز پر رکھے ایک لفافے پر پڑی۔

بے تابی سے اس نے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک خط برآمد ہوا۔ وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

میرے سرتاج! میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبانی بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ لہٰذا اس تحریر کا سہارا لے رہی ہوں۔ ہمدانی! میں آپ کی گناہ گار ہوں۔ میں نے آپ سے بے وفائی کی ہے۔ یہ بے وفائی ہی تو تھی کہ میں نے اپنے شریکِ حیات کو اپنی زندگی کے ایک اہم راز سے آگاہ نہیں کیا... مجھے اپنا گناہ تسلیم ہے اور اس کی سزا کے لیے بھی تیار ہوں۔ تاہم میں ساری بات آپ کو آغاز سے بتانا چاہوں گی.... آپ اب تک مجھ سے جو سوال کرتے رہے ہیں، ان کا جواب بھی آپ کو ان سطروں میں مل جائے گا۔

ہمدانی! میں آپ کو سات آٹھ برس پہلے سے جانتی ہوں۔ اس وقت میں سرگودھا کے ایک ہائی اسکول میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ آپ کا لکھا ہوا ایک ڈراما یومِ فضائیہ کے موقع پر سرگودھا میں اسٹیج ہوا تھا۔ یہ ڈراما ہمارے ہی اسکول میں کھیلا گیا تھا اور اس میں تمام کردار اسکول کے طلبا نے ادا کیے تھے۔ آپ کے ڈرامے میں ایک فلائٹ لیفٹیننٹ کی بیمار بیٹی کا کردار تھا... یہ کردار میں نے ادا کیا تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ دو گھنٹے کے ڈرامے میں یہی کردار سب سے زیادہ پسند کیا گیا تھا۔ اس وقت آپ نے بھی میرے کام کی بے حد تعریف کی تھی۔ آپ تو یقیناً یہ واقعہ بھول چکے ہوں گے مگر مجھے آپ کی ”ستائش“ کے وہ لمحے اب تک یاد ہیں اور ہمیشہ یاد رہیں گے۔ آپ سچ پوچھتے ہیں تو مجھے اسی روز سے آپ سے ایک انسیت سی پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے آپ کی تحریریں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنا شروع کیں۔ پھر آپ کی کتاب ’آدھا چاند‘ میرے ہاتھ لگی اور اسے پڑھنے کے بعد میں آپ کی دائمی پرستار بن گئی۔ میں ریڈیو سے بھی آپ کے گیت اور غزلیں شوق سے سنا کرتی تھی۔

اپنے حالات کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتا ہی دیا تھا کہ وہ کس طرح میرے گرد جال بُن رہے تھے۔ خالو کے گھر نہ میری عزت

محفوظ تھی اور نہ مستقبل۔ انھی دنوں ایک ہفت روزہ میں چھپنے والے آپ کے انٹرویو کے حوالے سے مجھے پتا چلا کہ آپ ایک اندھی لڑکی سے شادی کرنے کے خواہشمند ہیں۔ آپ کی خواہش جان کر میرے دل میں ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ میں ایک دو روز سوچتی رہی پھر میں نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا... اور رختِ سفر باندھ کر آپ سے ملنے نکل کھڑی ہوئی۔

آگے کے واقعات آپ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح میں آپ سے ملی اور ہم نے زندگی کا نیا سفر شروع کیا۔ اب آپ یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں آپ کو کیا بتانے جارہی ہوں یہی وہ بات ہے جسے کہتے ہوئے میرا دل ہول رہا ہے اور جسے پڑھتے ہوئے آپ کی آنکھیں شعلہ بار ہوجائیں گی.... ہاں سرتاج... میں... اندھی نہیں ہوں اور... نہ کبھی تھی۔ میں نے صرف اندھے پن کا ناٹک رچایا تھا۔ ساڑھے تین سال میں آپ کو دھوکا دیتی رہی ہوں۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آپ کے سامنے اندھے پن کی اداکاری کرتی رہی ہوں۔ بحیثیت بیوی میرا رویہ ناقابلِ معافی ہے۔ اپنی صفائی میں صرف اتنا کہوں گی کہ اس وقت مجھ میں بچپنا بہت زیادہ تھا۔ آپ کو حاصل کرنے کے لیے میں نے خود کو اس ناٹک پر آمادہ کرلیا۔ یہاں پہنچ کر جب مجھے آپ کے چہرے کے نقص کا پتا چلا تو مجھے کچھ حیرانی ہوئی... ہمدانی! اگر آپ اسے ایک جھوٹی عورت کا ایک اور جھوٹ قرار نہ دیں تو یہ کہوں گی کہ میں... آپ سے محبت کرتی تھی۔ آپ کے فن اور شخصیت کی پرستار تھی۔ میرے نزدیک آپ کی ظاہری شباہت کی کبھی اتنی اہمیت نہیں رہی جتنی آپ کے اندر کے فن کار کی ہے.... مجھے آپ ہی کی قسم ہے، اگر آپ کا چہرہ ہمیشہ ویسا ہی رہتا تو میری چاہت میں ایک ذرّہ بھر فرق نہیں آتا... میں نے اگر آپ کے علاج کا سوچا تو یہ صرف اور صرف آپ کی خاطر تھا، مجھے اس کی مطلق ضرورت نہ تھی اور نہ ہے... شادی کے بعد میں نے کئی بار چاہا کہ آپ کو اپنے اندھے پن کی حقیقت سے آگاہ کردوں مگر میں آپ کی الجھنوں سے خوفزدہ تھی۔ اسی سبب مجھے اپنی آنکھوں سے بھی خوف آنے لگا تھا کئی بار دل چاہتا تھا کہ انھیں سچ مچ پھوڑ ڈالوں۔ آخر ضمیر پر بوجھ بہت بڑھ گیا تو میں نے آپ سے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا۔

میرے سرتاج! آپ کے ان ہاتھوں کے صدقے، جنھوں نے مجھے تھپٹر مارے، میں اسی لائق ہوں۔ مجرم اپنے جرم کا اقرار کرلے تو اس کی سزا معاف نہیں ہوجاتی۔ میں بھی اپنے انجام کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ کی دی ہوئی چار دیواری سے نکل کر خوشاب جا رہی ہوں۔ یہاں مضافات میں میری ایک دیرینہ سہیلی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے پناہ دے گی اور میرے لیے چھوٹی موٹی ملازمت کا بندوبست بھی کردے گی۔ اگر آپ اپنی جھوٹی بیوی کو معاف نہ کرسکے تو پھر اس سہیلی کا گھر ہی میری آخری پناہ گاہ ہوگا.... اس پناہ گاہ میں، اس گھر میں، میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کا راستہ دیکھوں گی۔... آپ کو یاد کروں گی۔

فقط آپ کی منتظر،

آپ کی گناہ گار بیوی جمیلہ۔

خط پڑھتے پڑھتے ہمدانی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ کچھ دیر گم صم کھڑا تنویر کی طرف دیکھتا رہا... شاید یقین کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا۔

”کیا بات ہے ہمدانی؟“ آخر تنویر نے پُراندیش لہجے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ ہمدانی نے آنسو پونچھے۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ”ہمیں اسی وقت خوشاب چلنا ہے۔“

”کس لیے؟“ تنویر نے دریافت کیا۔

”اس پاگل کو واپس لانے کے لیے۔“ ہمدانی نے جواب دیا۔

★★

نجمہ مسودی

انسان جب روئے زمین پر پہلا سانس لیتا ہے تو اُس کا وہ پہلا سانس شاہراہِ حیات پر پہلا قدم ہوتا ہے۔ یہ پہلا قدم اُس کی زندگی کے سفر کا آغاز بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنے روز و شب اسی عالمِ سفر میں گزارتا ہے۔ اُسے ہر آن نئی سے نئی مسافت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر سنگِ میل پر سفر کا نفع اور خمیازہ اس کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو سفر پر ایمان نہیں رکھتے، اپنے جذبوں اور خیالوں میں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ اُن کی ناکامی ہی نہیں، نامُرادی بھی ہوتی ہے۔ جب کہ اہلِ سفر اگر منزل کے حصول میں ناکام بھی ہو جائیں تو راستے کی لذّت اُنہیں سرشار و تر و تازہ رکھتی ہے کہ سفر بذاتِ خود منزل کے حصول سے زیادہ اہم چیز ہے۔ ذیل کے صفحات میں جو کہانی پیش کی جا رہی ہے وہ ایک لڑکی کی بپتا ہے جس کا ایک ایک لمحہ سفر میں گزرا۔ زندگی کے سفر میں۔ وہ تھکتی بھی رہی اور کُڑھتی بھی رہی مگر سفر سے باز نہیں آئی۔ وہ راہ کی گرد میں اٹی رہی مگر ہمّت نہیں ہاری اور پھر ایک روز اُس پر اُس کی منزل آئینہ ہو گئی:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

زندگی میں پہلے کبھی جن چیزوں پر اسے اعتبار نہیں رہا، یکے بعد دیگرے ان سب کا عمل دخل اس کی زندگی میں ہو گیا تھا۔ نو عمری، نوخیزی اور نوجوانی میں جب اس کی ساتھی لڑکیاں نجومیوں اور دست شناسوں کو اپنا ہاتھ دکھانے کے لیے بہت بے تاب رہتی تھیں، شمائلہ نے کبھی اپنا مرمریں ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیلایا تھا۔ اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس کے ہاتھ کی لکیروں میں کیا چھپا تھا؟

وہ سوچتی تھی کہ اگر ہاتھ دیکھنے والے نے کوئی بُری بات بتائی تو روز و شب خوامخواہ خوف میں گزریں گے نہ جانے کب وہ بُری بات سامنے آئے کب وہ حادثہ رونما ہو۔۔۔ اور اگر کوئی اچھی

بات معلوم ہوگئی، کوئی خوش خبری قبل از وقت مل گئی تو تجسس ہی ختم ہو جائے گا۔ اچانک خوشی ملنے پر جو احساس ہوتا ہے کہ زندگی نے انسان کو سرپرائز دی تھی' وہ احساس ختم ہو جائے گا۔ اس لیے جو کچھ پردے میں چھپا ہے اس کا چھپا رہنا ہی بہتر ہے۔

جب اس کا شعور ذرا پختہ ہوا تھا تو اس نے مشاہدہ کیا کہ ہاتھ دیکھنے والے سبھی کو خوشخبریاں سناتے ہیں. کوئی بھی تباہی کی پیشین گوئی نہیں کرتا جبکہ اس انسان کو بھی کوئی دست شناس زیادہ بُری خبر نہیں سناتا جسے خود اپنی تباہی صاف نظر آ رہی ہوتی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا اعتقاد ہی نجومیوں اور دست شناسوں سے اُٹھ گیا تھا۔

مگر اب جبکہ وہ اٹھائیس سال کی ایک پختہ عمر کی' زندگی کا کچھ تجربہ رکھنے والی لڑکی تھی تو وہ ایک غیر معروف سے دست شناس بابا کو اپنا ہاتھ دکھانے آئی تھی۔ قسمت کا حال جاننے آئی تھی۔ اسے خود بھی اپنے اس تغیر پر حیرت تھی۔ مگر کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ اس سے پہلے بھی جو اعتقادات تھے، وہ ان کے خلاف بہت کچھ کر گزری تھی۔

اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بعض ایسے کام جنھیں انسان دل سے اچھا نہیں سمجھتا، انھیں کیسے کر گزرتا ہے۔ شاید انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوتا ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ کر انجانی، ان دیکھی راہوں پر لے جاتا ہے۔

منجو بابا کو ہاتھ دکھا کر وہ ان کے جھونپڑی نما مکان سے نکلی تو اندر ہی اندر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ باہر آ کر اس نے خوفزدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے اسے منجو بابا کے جھونپڑی سے نکلتے دیکھا تو نہیں؟ روزانہ بیسیوں خواتین و حضرات منجو بابا کو ہاتھ دکھانے آتے تھے۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ مگر شمائلہ مجرموں ہی کی طرح آئی تھی۔ شام کے دھندلکے میں۔ دوسروں کی نظر بچا کر — گویا وہ ہاتھ دکھانے پر مجبور ضرور تھی مگر اب بھی یہ اس کی نظر میں کوئی اچھی بات نہیں تھی — وہ اب بھی اپنے اس فعل پر شرمسار تھی۔ یا پھر شاید یہ اس کے دل کا چور تھا۔

منجو بابا کوئی پیشہ ور نجومی یا دست شناس بھی نہیں تھے۔ وہ تو درویش صفت سے آدمی تھے۔ کبھی کبھی محنت مزدوری کر لیتے تھے' چار پیسے مل جاتے تھے تو اُس وقت تک بیٹھ کر کھاتے رہتے تھے جب تک ختم نہ ہو جاتے۔ اس دوران لوگوں کے ہاتھ دیکھ لیتے تھے' قسمت کا حال بتاتے تھے مگر کسی سے کوئی پیسہ دھیلا، نذر نذرانہ کچھ نہیں لیتے تھے۔ کوئی دینے کی کوشش کرتا تھا تو خفا ہو جاتے۔

شمائلہ ہوزری مل میں کام کرتی تھی۔ وہ بہت بڑی اور پرانی مل تھی۔ شمائلہ کی ماں نے بھی برسوں اسی مل میں کام کر کے بیوگی کے کٹھن دن گزارے تھے، شمائلہ کو پالا تھا اور اسے صرف کالونی کے اسکول میں ہی نہیں، قریبی شہر لاہور کے ایک کالج میں بھی تعلیم دلوائی تھی۔

مل کے قریب ہی کچھ فاصلے پر مل کی اپنی ایک بہت بڑی رہائشی کالونی تھی۔ کالونی کیا تھی' ایک طرح کا چھوٹا سا شہر تھا۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ مل کے افسران سے لے کر لیبر تک کو وہاں رہائش میسر تھی۔ صرف ان کارکنوں کو رہائش نہیں دی گئی تھی جن کی خدمات عارضی طور پر کنٹریکٹ کے تحت محدود مدت کے لیے حاصل کی جاتی تھیں۔

کالونی کے گرد بہت بڑی چار دیواری تھی۔ اس چار دیواری میں اب بھی بہت سی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی مگر مل کے مالک سعید احمد صاحب نے برسوں پہلے اس چار دیواری سے دو فرلانگ ہٹ کر کچھ اور زمین خریدی تھی اور اپنا عالیشان بنگلا وہاں ایک الگ چار دیواری میں تعمیر کرایا تھا۔ پہلے وہ بھی کالونی میں ہی ایک بنگلے میں رہتے تھے پھر نہ جانے کس مصلحت کے تحت انھوں نے وہ بنگلا جنرل منیجر کو دے دیا تھا اور خود دو فرلانگ دور نئے بنگلے میں چلے گئے تھے۔ سیٹھ سعید اب بوڑھے اور نیم معذور ہو چکے تھے، دل کے مریض تھے۔

شمائلہ کی ماں کو برسوں پہلے سے کالونی میں کوارٹر ملا ہوا تھا۔ وہیں شمائلہ کا لڑکپن گزرا تھا اور اب جوانی گزر رہی تھی۔ شمائلہ کے بی اے کرنے کے بعد ماں کے اعصاب جواب دے چکے تھے چنانچہ شمائلہ نے انھیں گھر بٹھا دیا تھا اور معاش کی ذمے داری خود سنبھال لی تھی۔ اسے ایکسپورٹ پروڈکشن ڈویژن میں سپروائزر کے طور پر رکھ لیا گیا تھا۔

یہاں تک زندگی کچھ زیادہ کٹھن نہیں رہی تھی۔ اور شاید یونہی گزرتی چلی جاتی اگر۔ ۔ ۔

وہ ایک بار پھر جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ منجو بابا کی جھونپڑی ایک پگڈنڈی کے کنارے تھی۔ آس پاس درخت اور جھاڑیاں تھیں کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔ یہ پگڈنڈی آگے جا کر ایک چھوٹی سڑک سے ملتی تھی۔

شمائلہ سڑک پر بائیں جانب چلتی تو مل کالونی میں پہنچ سکتی تھی اور دائیں ہاتھ چلتی تو سیٹھ سعید کے بنگلے پر پہنچ سکتی تھی۔ یہاں آس پاس یا سڑک کے کنارے روشنیاں نہیں تھیں۔ البتہ صنعتی علاقے میں کچھ فاصلے پر کارخانوں اور ان کی رہائشی کالونیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

شمائلہ سہمے سہمے سے انداز میں کچے ہی راستے سے سیٹھ سعید کے بنگلے کی طرف چل دی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک منجو بابا کے الفاظ

گونج رہے تھے۔ پہلے تو انھوں نے اس کا ہاتھ دیکھنے سے ہی انکار کر دیا تھا اور ڈانٹ دیا تھا۔ "یہ کوئی وقت ہے ہاتھ دکھانے کا؟ جس کا دل چاہتا ہے منہ اُٹھا کر چلا آتا ہے ہاتھ دکھانے۔ نظر نہیں آتا اب اندھیرا پھیل چکا ہے اور میری جھونپڑی میں صرف ایک لالٹین ہے — میں بوڑھا آدمی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ لالٹین کی روشنی میں لکیریں صحیح دکھائی نہیں دیتیں ۔ ۔ دن میں نہیں آ سکتی تھیں؟ آج کل تو میں دن میں بھی زیادہ تر نہیں ہوتا ہوں ۔ ۔"

شمائلہ کو معلوم تھا کہ لوگ منجو بابا کی ڈانٹ پھٹکار بھی خوشدلی سے سنتے تھے۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ میں بھی خلوص ہوتا تھا۔ وہ کسی کو بُرے دل سے نہیں ڈانٹتے تھے۔ ان کی ڈانٹ میں بھی پیار ہوتا تھا۔ شمائلہ نے بھی ان کی ڈانٹ سُن کر قطعاً بُرا نہیں مانا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اندر سے وہ دُکھی انسانوں کے کتنے ہمدرد تھے ۔ ۔ بالآخر وہ خود ہی شمائلہ کا ہاتھ دیکھنے بیٹھ گئے۔

چند لمحے بعد لالٹین کی روشنی میں ان کی دُھندلی آنکھیں کچھ اور دُھندلا کر رہ گئیں۔ سفید داڑھی میں پُرخیال انداز میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انھوں نے ایک لمحے کے لیے خلا میں گھورا اور دوبارہ ہاتھ پر جھک گئے۔

"لڑکی! ۔ ۔ ۔" بالآخر ان کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی۔ "مجھے ان لکیروں میں تیرے لیے بربادی چھپی نظر آ رہی ہے۔ تُو نے اپنے لیے کوئی راستہ نہیں چُنا۔ ۔ ۔ اب تو اسی راستے پر کہیں منزل تلاش کر ۔ ۔ ۔ ورنہ اسے ترک کر دے ۔ ۔ ۔ بربادیاں تیری منتظر ہیں ۔ ۔ ۔ بس میں تجھے اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔"

منجو بابا نے اس کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور اس کے بعد بس انھیں چُپ لگ گئی تھی۔ شمائلہ کا دل ڈوب سا گیا۔ اس نے انھیں کُریدنے کی بہت کوشش کی لیکن منجو بابا کی خاموشی کا قفل نہ ٹوٹا۔

وہ تو اپنی دانست میں منزل پر ہی تھی لیکن بے نام اندیشوں نے اسے ستا رکھا تھا۔ انھی اندیشوں سے مجبور ہو کر وہ منجو بابا کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا — اسے کسی بے عنوان سہارے کی ضرورت تھی ۔ ۔ ۔ کسی شیریں بیان کی ضرورت تھی جو اسے امید دلاتا ۔ ۔ ۔ کسی خوش کلام کی ضرورت تھی جو اسے نئے خواب دکھاتا — مگر منجو بابا نے تو نہایت کھرے لہجے میں کہہ دیا تھا کہ منزل تلاش کر۔

تو کیا جس مقام پر وہ کھڑی تھی، وہ اُس کی منزل نہیں تھی۔ یہ سوچ کر اس کے رگ و پے میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے لاشعور کے اندھیروں میں اُبھرنے والی کوئی غیبی سی آواز اسے پہلے ہی ڈرایا کرتی تھی۔ مگر شمائلہ نے آج تک اسے اپنا وہم قرار دیا۔

لیکن اب تو منجو بابا نے بھی کہہ دیا تھا ۔ ۔ ۔

وہ ایک بار پھر رات کی تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بنگلے کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگی میلوں میں پھیلے ہوئے اس صنعتی علاقے میں بیچ بیچ میں جہاں کہیں زمینیں خالی تھیں وہاں خواہ ویرانی ہو یا تاریکی — لیکن عام حالات میں وہاں آمد و رفت میں کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ شہری آبادیوں سے دور یہ علاقہ پھر بھی جرائم سے بہت محفوظ تھا آس پاس زیادہ تر دیکھے بھالے جانے پہچانے لوگ ہی رہتے تھے۔ تنہا عورتوں کو بھی راستے میں اِدھر اُدھر آتے جاتے کوئی خاص خوف محسوس نہیں ہوتا تھا یہی لگتا تھا کہ پاس پڑوس میں ہی کہیں اِدھر سے اُدھر جا رہے ہیں۔

لیکن آج شمائلہ کا دل لرز رہا تھا ۔ ۔ ۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ گرد و پیش کے حالات سے تو خوف جنم لیتا ہی ہے لیکن خوف انسان کے اندر بھی ہوتا ہے — اور وہ انسان کو زیادہ تیزی سے کھوکھلا کرتا ہے۔

بالآخر وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی کہ اسے منجو بابا کے الفاظ کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ غیب کا حال کسے معلوم ہے — وہ تو پہلے ہی ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی — خواہ مخواہ ہی راستے میں منجو بابا کے پاس رک گئی تھی۔

وہ اب بنگلے کے قریب پہنچ چکی تھی مگر وہ سامنے والے گیٹ کی طرف نہیں بلکہ عقبی دیوار کی طرف جا رہی تھی۔ بنگلے کے تین گیٹ تھے۔ پیچھے کار تر پر ایک اور بہت چھوٹا سا گیٹ تھا جس سے ایک وقت میں ایک ہی انسان گزر سکتا تھا۔ یہ یونہی فاضل سا گیٹ تھا جو عموماً بند رہتا تھا' شاذ و نادر ہی کوئی اِدھر سے آتا تھا۔

شمائلہ اسی گیٹ پر پہنچی۔ گیٹ گویا کسی نے شمائلہ کے انتظار میں پہلے ہی اندر سے کھولا ہوا تھا۔ نہایت خاموشی سے شمائلہ اندر پہنچی۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ وہ سرونٹ کوارٹرز کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ایک کوارٹر تک پہنچی جس کے آگے خاصی اونچی باڑھ تھی۔ بظاہر یہ کوارٹر خالی رہتا تھا مگر درحقیقت خالی نہیں تھا۔ وہ باڑھ کے درمیان سے گزر کر دروازے پر پہنچی تو دروازہ فوراً ہی کُھل گیا۔ سامنے تاریکی میں ایک ہیولا کھڑا تھا۔

شمائلہ اس کے قریب سے گزر کر اندر پہنچ گئی' ہیولے نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور شمائلہ کے قریب آ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ ہیولے کے وجود سے کلون کی مخصوص مہک اٹھ رہی تھی جو کبھی شمائلہ کے حواس پر سحر طاری

کر دیتی تھی مگر آج وہ اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"بہت دیر لگادی تم نے — میں آدھے گھنٹے سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں —" ہیولے نے کہا۔ اس کے لہجے میں خاصی ناگواری تھی۔ شمائلہ کا دل پہلے ہی خراش خراش تھا۔ اس پر ایک خراش اور پڑ گئی — آج تو اگر وہ اس سے اپنے لہجے میں محبتوں کا تمام تر رسیلا پن سمو کر بھی بات کرتا تب بھی شاید اس کے رگ و پے میں وہ سرور نہ تیرتا جس کے سہارے اس نے نہ جانے کتنے روز و شب گزار دیے تھے۔

"جاوید! کیا اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ میں آگئی ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی "تم سے تو شاید اتنا بھی نہ ہوسکے شام ڈھلے اپنی سیدھی اور بیتجی ماں سے بہانے کر کے ایک ایسی لڑکی کا یہاں آنا، جو اپنے آپ کو بہت باضمیر اور شریف سمجھتی ہے، کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ تم شاید کبھی نہ کرسکو۔"

"کیا بات ہے ... آج خوش نظر نہیں آرہی ہو۔" وہ دونوں کندھوں سے اسے تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تمھارے لہجے سے تلخی جھلک رہی ہے —"

وہ جاوید کو بتانا چاہتی تھی کہ کئی دن سے ان گنت اندیشے اسے دہلا رہے ہیں ... وہ حسین وعدے جو جاوید نے اس سے کیے تھے، وہ حسین مستقبل جس کے خواب ان دونوں نے مل کر دیکھے تھے، ان سب کی بنیادیں اسے لرزتی دکھائی دے رہی ہیں۔

وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ قسمت کا حال بتانے والے ایک درویش صفت آدمی سے مل کر آرہی ہے اور اس نے بھی اندیشوں کی تصدیق ہی کی ہے، کوئی خوشخبری نہیں سنائی، کوئی امید نہیں دلائی۔

مگر وہ اسے کچھ بھی نہ بتاسکی۔ وہ خود بھی صحیح طرح نہیں جانتی تھی کہ اس کے سامنے آکر وہ مسحور ہوجاتی تھی یا مرعوب؟ کب سے وہ سوچ رہی تھی کہ اس سے کھل کر بات کرے گی۔ فیصلہ کن بات کرے گی ... مگر اس کے سامنے آکر اسے نہ جانے کیا ہوجاتا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ محکوم سی بن جاتی تھی — اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں میں جاوید کو شریک کرے۔ وہ اپنی طرف سے اسے ہمیشہ صرف خوشیوں، لذتوں، راحتوں اور اچھے محسوسات کا نذرانہ ہی پیش کرنا چاہتی تھی کہیں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر ہی تو نہیں کھود رہی تھی؟

"بتاؤ نا ... کیوں دیر سے آئی ہو؟" جاوید پوچھ رہا تھا۔

"امّی نے چند کام بتادیے تھے" وہ بڑبڑا رہی تھی ... "پھر باہر آنے کے لیے امّی سے بہانہ کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ کالونی میں رہتے ہوئے ایک لڑکی روز روز کیا بہانے کر کے باہر نکل سکتی ہے۔ اور پھر مجھے بابر سے نظر بچا کر نکلنا ہوتا ہے اگر وہ گھر پہ ہو تو نکلنا اور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ وہ میرے بہانے کے کھوکھلے پن کو محسوس نہ کرلے ... کہیں چپکے سے میرے تعاقب میں نہ نکل آئے ... وہ امّی کی طرح سیدھا سادہ تو نہیں ہے نا —"

بابر رشتے میں اس کا کزن ہی تھا مگر وہ دنیا میں تنہا تھا۔ وہ بھی ہوزری مل میں ہی ملازم تھا مگر کنوارا ہونے کی وجہ سے اسے کوارٹر الاٹ نہیں کیا گیا تھا اور کچھ عرصے سے شمائلہ اور اس کی امّی کے کوارٹر میں ہی ایک کمرے میں تقریباً الگ تھلگ رہتا تھا مگر گھر بہرحال ایک ہی تھا۔ کھانا پینا ایک ہی جگہ تھا۔ ان حالات میں انسان کتنا ہی الگ تھلگ رہ لے، وہ الگ تھلگ محسوس نہیں ہوتا۔

"مجھے اس شخص پر بڑا خار آتا ہے۔" جاوید بے ساختہ بولا۔ "جب کبھی بھی تمھیں دیر ہوتی ہے میں اکثر سوچتا ہوں کہیں تم اس کے ساتھ گپیں لڑانے تو نہیں بیٹھ گئیں۔ کہیں اس نے تمھیں کسی مشغلے میں نہ الجھا لیا ہو!"

اس کے لہجے میں شک بول رہا تھا۔ شمائلہ کے دل پر ایک اور خراش سی پڑ گئی۔ مرد آخر مرد ہی رہتا ہے۔ خود جہاں مرضی ہو پھرے، جس کے ساتھ چاہے پھرے، جہاں تک بس چلے وہاں تک مراسم استوار کرے۔ مگر عورت انگشت نمائی نہیں کرسکتی، جواب طلب نہیں کرسکتی، وضاحت نہیں مانگ سکتی۔

عورت چاہے اپنے آپ کو وفاداریوں کے کتنے ہی مضبوط بندھنوں میں باندھ کر رکھے مگر اس کے پاس کوئی سایہ بھی منڈلا جائے تو شک کا اظہار ...

"میں تو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی — یہی تو اسے شکوہ رہتا ہے۔" شمائلہ سرگوشی نما لہجے میں بولی۔ وہ جاوید کو کوئی بھی سخت یا کھردرا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ویسے ہی مضطرب اور بے چین سا آدمی تھا۔ جلد اشتعال میں آجاتا تھا، جلد بھڑک اٹھتا تھا۔ مزاج متلوّن، فطرت سیمابی تھی۔ مگر شروع میں شمائلہ کو ان باتوں کا اندازہ نہیں تھا — اُن پہلی ملاقاتوں میں وہ جھیل کی طرح پُرسکون نظر آتا تھا جب شمائلہ اس کی اسیر ہوئی تھی ....

مگر وقت اپنے ساتھ آگہی کے بہت سے خزانے لے کر آتا ہے!

جاوید اس کا ہاتھ تھامے اسے کمرے میں لے کر آیا۔ کمرے میں بہت مدھم روشنی تھی۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے گرے ہوئے تھے۔ ایک طرف صاف ستھرا بیڈ لگا ہوا تھا۔ بہت خاموشی بہت سنّاٹا تھا یہاں — اور وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے تاکہ باہر کسی کو ان کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ اوّل تو اس طرف کسی کا آنا جانا ہی نہیں ہوتا تھا، یہ ایک فاضل سرونٹ کوارٹر تھا، اس کی چابی صرف جاوید کے پاس تھی۔ بظاہر یہ کوارٹر خالی تھا۔

اس بار تنہائی میں ان کی ملاقات پورے ایک ہفتے بعد ہو رہی تھی۔ شمائلہ کو معلوم تھا کہ جاوید کو ایک ہفتے کی اس جدائی نے کچھ اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس دوران مضطرب و ناآسودہ رہی تھی — دن میں، دفتر میں لوگوں کے ہجوم میں وہ اسے کئی کئی بار دیکھتی تھی، کئی کئی بار ان کے درمیان بات چیت ہوتی تھی — مگر وہاں تو ایک نادیدہ سی خلیج درمیان میں رہتی تھی، وہ اس کے لیے بالکل پرایا پرایا سا ہوتا تھا — آخر وہ مل کے مالک کا بیٹا تھا — شمائلہ کا باس تھا — دنیا والوں کی نظر میں ان کے درمیان صرف مالک اور نوکر ہی کا رشتہ تھا۔

وہ لرزتی سی آواز میں بولی — "جاوید! شک کے زہر میں لپٹے ہوئے اس لہجے میں مجھ سے بات مت کیا کرو — میں نے تمھاری خاطر اپنے آپ کو مصلوب کیا ہے ... ہر لمحہ ایک اذیت، ایک عذاب اور ایک خلش کے ساتھ گزارتی ہوں، صرف تمھاری خاطر اپنے آپ کو چور چور سی، مجرم سی بنائے ہوئے ہوں تمھارے کہنے پر چل رہی ہوں اور نہ جانے کس منزل کی طرف جارہی ہوں مگر بس یہی سوچ کر مطمئن ہوجاتی ہوں کہ تم میرے شوہر ہو... اور جلد ہی یہ حقیقت لوگوں کے سامنے آجائے گی میرے دل میں تمھارے سوا کون ہوسکتا ہے؟ میری نظر میں کون تمھارے سوا جچ سکتا ہے؟ میں تو اس دن کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی ہوں جب ہم بھی عام جوڑوں کی طرح سے روز و شب گزار سکیں گے — ہمیں چوروں کی طرح نہیں ملنا پڑے گا ...."

شمائلہ کی آنکھیں جیسے کہیں دور بھولے بسرے، گم گشتہ خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگیں — اُس زندگی کی تلاش میں، جو اَب گویا خواب ہی ہوتی جارہی تھی — اُس نے اس شاندار بنگلے میں، تمام تر رسوم کے ساتھ دھوم دھام سے دُلہن بن کر آنے کا خواب دیکھا تھا — مگر اس کے حصّے میں چوری چھپے کی شادی آئی تھی — اس کے حصّے میں وصل کی تشنہ سی راتیں آئی تھیں۔ اس کے حصّے میں یہ نیم تاریک سرونٹ کوارٹر آیا تھا۔

مگر وہ خوشی خوشی وقت گزار رہی تھی — محض جاوید کے وعدوں کے سہارے — وہ بہت خوش گمان تھی — یا پھر شاید محبّت نے اسے خوش گمان کر دیا تھا جس طرح وہ اکثر لوگوں کو بنا دیا کرتی ہے۔

انھوں نے لاہور جا کر خفیہ طور پر شادی کی تھی، تمام انتظامات جاوید نے ہی کیے تھے۔ نکاح خواں، دو گواہ اور دو تین دوسرے لوگ موجود تھے۔ شمائلہ ان میں سے کسی کو نہیں جانتی تھی۔ اس بات کو ایک سال گزر چکا تھا — شمائلہ اب سوچتی تھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک سال کیونکر گزر گیا تھا — بوجھ اور تناؤ سے اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کیوں نہیں گئے تھے اس پر تو ایک ایک لمحہ بہت بھاری گزرا تھا، وہ جب جاوید سے دور ہوتی تھی تب بھی گویا ایک آزمائش سے گزر رہی ہوتی تھی اور جب وہ دنیا کی نظر بچا کر قربتوں کے لمحے چراتے تھے تب بھی گویا اسے ایک امتحان درپیش ہوتا تھا۔

جاوید سگریٹ سلگاتے ہوئے مضطرب لہجے میں بولا — "ابھی ہماری آزمائش کا ایک سال اور باقی ہے۔ میں نے تمھیں پہلے ہی بتادیا تھا کہ ہمیں پورے پونے دو سال تک اس شادی کو خفیہ رکھنا ہوگا — ڈیڈی نے جو وصیت تیار کروا کے رکھی ہوئی ہے اس کی رُو سے مل، جائداد اور بینک اکاؤنٹس وغیرہ پر میرا اختیار اس وقت شروع ہوگا جب میں پورے تیس سال کا ہوجاؤں گا۔ میں ہر چیز میں اپنے بڑے بھائی راشد کے ساتھ آدھے کا حصّے دار ہوجاؤں گا ویسے تو زندگی کا کوئی بھروسا نہیں — ڈیڈی دل کے مریض ہیں۔ خدانخواستہ ... خدانخواستہ آج انھیں کچھ ہوجائے تو میں خود بخود ہر چیز میں حصّے دار ہوجاؤں گا کیونکہ ہم دو بھائیوں کے علاوہ ڈیڈی کا کوئی وارث نہیں ہے — لیکن ظاہر ہے ایک سعادت مند اور محبّت کرنے والے بیٹے کی حیثیت سے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ڈیڈی کو کچھ ہو ...."

اس نے ایک طویل کش لیا۔ اس کی گوری گوری مخروطی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ جاوید کی انگلیاں بڑی آرٹسٹک تھیں مگر اس میں آرٹسٹوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بڑا ہی حقیقت پسند آدمی تھا، خیال و خواب کی اس کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

سگریٹ کا دھواں اُگلتے ہوئے اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "گوکہ اب بھی مل کا آدھے سے زیادہ نظام میں ہی چلاتا ہوں لیکن میری حیثیت زیادہ تنخواہ پانے والے ایک ملازم سے زیادہ نہیں ہے۔ میں ڈیڈی کے سامنے شادی کا انکشاف اس وقت کرنا چاہتا ہوں جب میرے حصّے کی چیزیں میرے ہاتھ میں آجائیں میری کچھ حیثیت ہوجائے ...."

شمائلہ کا ذہن ایک بار پھر بیتے دنوں کی طرف رینگ گیا۔ بیشک یہ ساری باتیں وہ شادی سے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ مگر نہ جانے

کیوں پہلے میں اور اب میں بہت فرق سا پڑ گیا تھا۔ پہلے شمائلہ کو اس کی ہر بات میں وزن محسوس ہوتا تھا مگر اب دل میں ایک اضطراب نے گھر کر لیا تھا ایک احساسِ جرم نے اسے قیدی بنا لیا تھا۔ اور اسے اس قید سے نجات چاہیے تھی۔

بیتتے ہوئے دنوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اس وقت تو محسوسات بادلوں کے سنگ سنگ پرواز کرتے تھے جسم ہوا ؤں میں ہلکورے لیتا تھا اور رگ و پے میں نہ جانے کون سا خمار تیرا کرتا تھا۔

شروع شروع کے وہ دن جب جاوید نے اس کے ڈیپارٹمنٹ میں آنا شروع کیا تھا۔ وہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں پیکنگ کے شعبے میں تو تمام لڑکیاں ہی تھیں جاوید چاہتا تو اسے اپنے آفس میں بھی طلب کر سکتا تھا۔ کوئی بھی ہدایت دینے کے لیے، کوئی بھی وضاحت طلب کرنے کے لیے بلا سکتا تھا مگر وہ خود اس کے چھوٹے سے کیبن میں چلا آتا تھا جہاں وہ سیمپلز میں الجھی ہوتی تھی۔

کبھی کبھی وہ اس بڑے ہال میں بھی چلا آتا تھا جہاں پیکنگ ہوتی تھی اور جہاں شمائلہ لڑکیوں کی نگرانی کر رہی ہوتی تھی۔ ایکسپورٹ کا کام بہت زیادہ ذمّے داری کا کام تھا ذرا سی بے پروائی، ذرا سے نقص سے، اعتبار اٹھ جانے کا اندیشہ رہتا تھا شمائلہ کو بہت الرٹ رہنا پڑتا تھا اس کی تمام تر توجہ کام پر ہوتی تھی مگر دھیرے دھیرے وہ بے چین ہونے لگتی تھی ہر چیز سے اس کا دھیان ہٹنے لگتا تھا اس لیے کہ جاوید کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی ہوتی تھیں۔

دن میں کئی بار ان کے درمیان بات ہوتی۔ مگر جاوید کی نظریں کہتیں کہ وہ بات کچھ اور رہی ہے جو وہ درحقیقت اس سے کہنا چاہتا تھا نظریں تو وہ بات کہتی بھی تھیں مگر وہ جیسے اسے ہونٹوں تک لانے کے لیے بھی بے قرار تھا۔

شمائلہ کالونی کے محدود ماحول میں شہر کی تیز و طرار زندگی سے دور پلی بڑھی تھی مگر وہ ایک ذہین لڑکی تھی خیالوں خوابوں کی دنیا میں رہنا اسے پسند تھا کبھی کبھی وہ اس مشغلے کی آغوش میں پناہ بھی لیتی تھی۔ مگر خیالوں خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے کوئی زخم کھانا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔

...... اور اسے معلوم تھا انسان جب بہت اوپر دیکھتا ہے تو ٹھوکر ضرور کھاتا ہے، اسے زخم ضرور آتا ہے۔

جاوید کروڑپتی باپ کا بیٹا تھا۔ ہینڈسم تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ دل میں ہی کئی ایسی لڑکیاں موجود تھیں جو اس کی صرف ایک نگاہِ کرم کو ہی کافی سمجھتیں، اس سے کچھ بھی نہ مانگتیں اور اپنا کل زادِ راہ اس کی جھولی میں ڈال دیتیں۔ اور کوئی شکوہ بھی نہ کرتیں۔ تہی دست رہ جانے کا انھیں کوئی ملال بھی نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ شمائلہ ایک اور لڑکی کو بھی بہت اچھی طرح دیکھ چکی تھی حبیبہ اس کا نام تھا بہت امیر باپ کی بیٹی تھی۔ اسی سڑک پر، اسی صنعتی علاقے میں اس کے باپ کا شیشے کی مصنوعات کا بہت بڑا کارخانہ تھا دوسرے کاروبار بھی موجود تھے۔ رہائش فیکٹری میں بھی تھی اور لاہور میں بھی کوٹھی موجود تھی۔ وہیں ایک بلڈنگ میں ان کے دفاتر بھی پھیلے ہوئے تھے۔

وہ سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار میں ہر دوسرے تیسرے دن جاوید کے آفس آتی تھی اور۔ وہ خود بھی خوبصورت اور بھڑکیلی تھی اور اس کی کار بھی۔ پہناوا، رکھ رکھاؤ، انداز و اطوار ویسے ہی تھے جیسے عام طور پر آج کے دور کے زیادہ دولتمند گھرانوں کی لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔

شمائلہ کو معلوم تھا کہ حبیبہ ہی کا نہیں، اس کے تمام گھر والوں کا بھی جاوید کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ ان کے درمیان خاندانی مراسم تھے۔

شمائلہ اپنے بارے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خوبصورت ضرور ہے اور لوگ اس کی خوبصورتی کی تعریف بھی کرتے تھے۔ مگر اپنے آپ کو اس نے کبھی بہت زیادہ خوبصورت شمار نہیں کیا تھا کہ کہیں خود پرستی کے زمرے میں نہ آجائے۔

مگر اس خوبصورتی کو سہارے میسر نہیں تھے۔ دل میں اس کی ماں بھی ایک معمولی کارکن رہی تھی اور وہ خود بھی ایک معمولی کارکن ہی تھی۔ وہ زیادہ اونچے خواب دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا اس قسم کی باتیں قصّے کہانیوں اور فلموں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں ایسے خواب زخم ہی دیتے ہیں۔

مگر وہ جو زیادہ محتاط ہوتے ہیں، شاید وہی خوابوں کے زیادہ اسیر ہوتے ہیں۔ اس نے بہت مزاحمت کی۔ مگر وہ اس کے حواس پر چھاتا چلا گیا۔

وہی دزدیدہ نظروں کے تصادم۔ وہی ادھوری سی باتیں۔ وہی تشنہ سی ملاقاتیں۔ اور پھر دھیرے دھیرے اقرار، وہی عہد و پیماں۔ وہی مستقبل کے خواب۔ سب کچھ وہی بس وہی محبت کی پرانی کہانی، مگر پھر بھی سب کچھ نیا لگتا رہا۔

پھر ایک روز جب بات کچھ اور آگے بڑھنے لگی تو وہ گویا کسی نشیلے خواب سے چونکی اور سنبھل کر بولی "یہ نہیں ہو گا جاوید!"
اپنے حساب سے وہ پہلے ہی بہت سی حدیں پھلانگ کر آئی تھی۔ اب مزید کوئی حد پھلانگنا نہیں چاہتی تھی، شمائلہ کو بڑے گھر کی بہو

بننے کا کوئی شوق نہیں تھا، دولت اس کی کمزوری نہیں تھی، اس نے کبھی اپنی حیثیت پر کڑھ کر وقت نہیں گزارا تھا۔ اور اگر بہت خوش نہیں رہی تھی تو اپنے حال پر کبھی مغموم یا افسردہ بھی نہیں رہی تھی۔ مگر محبت پر بس کا اختیار نہیں تھا۔۔۔ اور محبت اسے جس راستے پر لے آئی تھی اس کی منزل تک پہنچنے کے لیے شادی ضروری تھی۔ خصوصاً جاوید کی بے تابیوں کو دیکھتے ہوئے۔۔۔ وہ کسی بھی قیمت پر کھلونا بننا نہیں چاہتی تھی۔

شادی کے سوال نے جیسے جاوید کو ایک بڑی الجھن میں ڈال دیا بہت دن تک وہ شمائلہ کو سمجھاتا رہا کہ اس میں کیا قباحتیں ہیں کیا کیا رکاوٹیں ہیں۔

"ڈیڈی کبھی اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔۔۔ میں ان کا چھوٹا بیٹا ہوں۔۔۔ شاید اسی لیے میری شادی کے سلسلے میں بھی ان کا رویّہ زیادہ سخت ہے۔۔۔" جاوید نے ایک روز مضطرب لہجے میں کہا۔ "انھوں نے صاف طور پر کہہ رکھا ہے کہ وہ میری شادی ہم پلّہ یا اپنے سے بھی اونچے لوگوں میں کریں گے اور ایسی شادی پر ہرگز آمادہ نہیں ہوں گے جس سے دولت اور کاروبار میں اضافہ اور تعلقات میں وسعت نہ آئے۔ انھوں نے تو میرے لیے گلاس انڈسٹریز والے حامد صاحب کی لڑکی حبیبہ کو پسند کر رکھا ہے۔ گو کہ ابھی ان لوگوں سے باقاعدہ طور پر کوئی بات نہیں ہوئی ہے لیکن انھیں علم ہے کہ ڈیڈی ایسا ارادہ رکھتے ہیں اور حبیبہ سمیت وہ سب لوگ اس بات پر بہت خوش ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔۔۔" شمائلہ کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی تلخی دَر آئی۔۔۔ "لیکن تمہارا اپنا بھی کوئی نظریہ ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے اب تم کافی بڑے ہو چکے ہو۔ اپنی کوئی رائے قائم کرنے کے قابل تو ہو ہی گئے ہو گے؟"

"طنز مت کرو۔۔۔" جاوید ملائمت سے بولا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا نظریہ، میری محبت، میری طلب سب کچھ تم ہو۔ لیکن میں فلمی یا افسانوی انداز میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ اس قسم کی کہانیاں فلم کی اسکرین یا کتابوں کے صفحات پر بہت اچھی لگتی ہیں لیکن حقیقی زندگی میں بڑا لہو رُلاتی ہیں۔ محبت کو بڑا بدصورت بنا دیتی ہیں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ ابھی ہم ڈیڈی کو ناراض کریں۔۔۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں اور ہم شادی کر کے دَر دَر کے دھکّے کھاتے پھریں یا پھر تنگ و تاریک مکانوں میں اپنی محبت کے مدفن تیار کریں۔ یقین کرو اگر ایسا ہوا تو بہت جلد محبت کا بھوت اتر جائے گا۔۔۔ عشق بہت بدصورت دکھائی دینے لگے گا۔ میں ان خوبصورت جذبوں کی موت نہیں چاہتا۔۔۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" شمائلہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

وہ گویا اپنی ہی دُھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی معذور ہیں، دل کے مریض بھی ہیں، وہیل چیئر پر رہتے ہیں۔ ان کے فیصلوں سے بغاوت کرنا انھیں غصہ دلانا ان کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ بھی میں نہیں چاہتا۔ انھوں نے ہمارے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔۔۔ وہ جوان ہی تھے جب ہماری ممی کا انتقال ہو گیا تھا لیکن محض ہماری بہتری کی خاطر انھوں نے دوسری شادی نہیں کی کیونکہ ہم دونوں بھائیوں کے ذہن میں سوتیلی ماں کا تصور بہت خراب تھا۔ انھوں نے ہمارے تمام تر بچپنے کے باوجود ہماری خواہش کو مقدم رکھا۔ وہ اتنے بڑے صنعتکار بھی نہیں تھے۔ یہ ہوزری مل زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن انھوں نے صرف ہمارے مستقبل کی خاطر دن رات شدید محنت کی اور اسے ملک کی سب سے بڑی ہوزری مل بنا دیا۔ ایکسپورٹ میں بھی اتنا نام پیدا کیا۔ میں ان کے اتنے بڑے ایثار اور قربانیوں کے جواب میں انھیں کوئی صدمہ پہنچا کر موت کا تحفہ دینا نہیں چاہتا۔"

"یہ تو تم وہ باتیں بتائے جا رہے ہو جو تم نہیں چاہتے۔" شمائلہ ہولے سے بولی۔ "مجھے ایک بار پھر اپنا سوال دُہرانا پڑے گا کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم شادی تو ضرور کر لیں۔۔۔ کیونکہ میں تمہارے بغیر اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔۔۔ لیکن فی الحال ہمیں اس شادی کو خفیہ رکھنا ہو گا۔ میں رفتہ رفتہ ڈیڈی کے کان میں یہ بات ڈالنا شروع کروں گا کہ حبیبہ اور اس کا گھرانا مجھے پسند نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے میں انھیں ذہنی طور پر تیار کر دوں گا کہ میری پسند کیا ہے۔۔۔ اور پھر جب میں دیکھوں گا کہ وہ دھچکا برداشت کرنے کے قابل ہیں تو پھر میں یہ انکشاف کر دوں گا کہ میں شادی کر چکا ہوں۔ اس دوران دو سال گزرنے پر مجھے اختیارات بھی مل چکے ہوں گے روپے پیسے پر میرا اختیار ہو گا۔۔۔ میں تمہیں لاہور میں کہیں کوٹھی اور گاڑی وغیرہ لے دوں گا۔ تم اور آنٹی آرام سے رہنا۔۔۔ میں زیادہ تر وہیں رہا کروں گا۔ اگر ڈیڈی نے زیادہ ہی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو پھر میں مستقل ہی لاہور منتقل ہو جاؤں گا۔۔۔ مل اور ایکسپورٹ کے کام سے اپنا حصّہ لے لوں گا اور لاہور میں کوئی کام شروع کر لوں گا۔۔۔"

"لیکن بات تو تقریباً وہی رہے گی۔۔۔۔" شمائلہ اُلجھن سے بولی۔ "مقصد یہ کہ تم جب بھی اپنے اس فیصلے کا اعلان کرو گے، ڈیڈی کو صدمہ تو ہو گا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ میرا نکتہ شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ کسی انسان کو رفتہ رفتہ ذہنی طور پر کسی بات کے لیے تیار کرنے کے بعد اس کے اظہار سے اتنا دھچکا نہیں لگتا۔۔۔ دوسرے یہ اگر میں کہوں میں فلاں لڑکی سے شادی کا ارادہ رکھتا ہوں تو یہ کچھ اور بات ہے۔۔۔ اور اگر میں کہوں گا کہ میں شادی کر چکا ہوں تو یہ کچھ اور بات ہو گی۔۔۔۔"

ان کے درمیان بہت دن اس موضوع پر بات چلی تھی۔ اور بالآخر جاوید نے اسے قائل کر لیا تھا، تیار کر لیا تھا۔ اب وہ سوچتی تھی تو فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ اس میں زیادہ دخل یا زیادہ کمال کس کا تھا؟ جاوید کی چرب زبانی کا۔۔۔ اس کی محبت کا۔۔۔ شمائلہ کی اپنی کم عقلی کا۔۔۔ کمزور لمحوں کا۔۔۔ جلتی بجھتی خواہشوں کا۔۔۔ ناآسودہ تمنّاؤں کا۔۔۔ یا بس محض تقدیر کا؟

شمائلہ کے ذہن میں یہ سارے امکانات گڈمڈ ہو جاتے تھے مگر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ اب نکتوں اور زاویوں میں اُلجھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔۔۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ بلکہ اُسے ہوئے تو ایک سال بیت چکا تھا۔ ایک سال سے چوری چھپے کی شادی نبھ رہی تھی۔ شمائلہ کی ماں کو بھی اس شادی کی خبر نہیں تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس شادی کا کوئی ثمر اس کی کوکھ میں پلنے نہیں لگا تھا ورنہ حالات نہ جانے کیا ہوتے۔

لیکن اب چند دنوں سے یہ سب کچھ نہ جانے کیوں شمائلہ کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔۔۔۔ یہ رازداری، یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں، یہ جرم کا سا احساس، سب کچھ شمائلہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔۔۔۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اس کی فطرت عود کر آئی تھی۔۔۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں اس طرح چھپ چھپ کر کوئی قدم اٹھانے کی درحقیقت قائل نہیں تھی۔ شاید اب پچھتاوا عود کر آیا تھا۔

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ حبیبہ کو اب بھی ہمیشہ کی طرح جاوید کے آفس میں آتے دیکھتی تھی۔ وہاں سے وہ دونوں اکٹھے ایک دوسرے کے گھر جاتے بھی دکھائی دیتے تھے۔ شمائلہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ دونوں اکٹھے لاہور تک کی تقریبات میں جاتے تھے جو صنعتی علاقے سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع تھا اگر تقریب کسی ہوٹل وغیرہ میں ہوتی تھی تو وہ رات گئے ہی واپس آتے تھے۔

شمائلہ نے اس سلسلے میں کبھی جاوید سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر اس کے اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ سی ہوتی رہتی تھی۔ وہ جو بیوی نہیں تھی، اس کے ساتھ تو وہ علی الاعلان ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتا تھا اور جو بیوی تھی اس سے وہ دوسروں کے سامنے اب نظر ملا کر بات بھی نہیں کرتا تھا۔

اب تمام مصلحتیں شمائلہ کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اعصاب تھک گئے تھے۔۔۔ دل اُکتا سا گیا تھا۔ رُواں رُواں پکار رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ بات کو اِدھر یا اُدھر ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ کوئی زندگی نہیں تھی۔

۔۔۔۔۔ اور آج اس نیم تاریک کوارٹر میں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا تھا۔ یہ در و دیوار جو نہ جانے کتنی راتوں تک اس کی خلوتوں کے امین رہے تھے، اسے بہت بُرے لگنے لگے تھے۔

جاوید نے اس کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے بیڈ کی طرف کھینچا مگر وہ اپنی جگہ زمین میں گڑا ہوا بُت سی بن گئی۔

"آج تم بدلی بدلی سی لگ رہی ہو۔۔۔۔" جاوید بیڈ کی پٹی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔۔" شمائلہ نے دھیمی آواز میں اقرار کیا اور ایک لمحے کے لیے جاوید کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ وہاں بس دُھند ہی دُھند تھی۔۔۔۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے سے انداز میں بولی۔ "جاوید! میرے خیال میں آج فیصلے کی رات ہے۔۔۔ میرے لیے اب اس احساسِ جرم کے بوجھ کو اٹھا کر مزید ایک قدم چلنا بھی ناممکن ہو گیا ہے آؤ۔۔۔۔ آج ہم دونوں تمہارے ڈیڈی کے سامنے چلتے ہیں اور انھیں بتا دیتے ہیں کہ ہم شادی کر چکے ہیں۔"

شاید شمائلہ کے لہجے کی قطعیت سے جاوید کو جھٹکا سا لگا۔ سگریٹ اس کی خوبصورت انگلیوں سے گرتے گرتے بچی۔ وہ اپنے مخصوص مضطرب سے انداز میں ہنسا۔۔۔۔ "کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔۔۔ تم تو اسی علاقے میں پلی بڑھی ہو۔۔۔ کیا تم میرے ڈیڈی کو نہیں جانتیں؟ تم ان کی شہرت سے واقف نہیں ہو؟ وہ ہم دونوں کو وہیں گولی مار دیں گے۔۔۔"

شمائلہ نے سیٹھ سعید کو دیکھا تو کم تھا لیکن ان کی سخت گیری کے بارے میں باتیں واقعی بہت سی سنی تھیں۔ بہت تند مزاج اور جاگیردارانہ طبیعت کے آدمی تھے۔ اب بھی جبکہ ایک عرصے سے وہ وہیل چیئر اور بیڈ کے ہو کر رہ گئے تھے اور ڈاکٹروں نے انھیں غصّے یا اشتعال میں آنے سے سخت منع کیا ہوا تھا، اب بھی ان کے غیظ و غضب کے افسانے سننے میں آتے رہتے تھے۔

لیکن جب جاوید نے شمائلہ کو شادی کے لیے منایا تھا تو اس نے اپنے ڈیڈی کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے لاشعوری طور پر ذہن میں ایک بیمار، کمزور اور قابلِ رحم آدمی کا تصوّر آتا تھا

لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اُس وقت شمائلہ کو یہ تصوّر بھی سچا محسوس ہوا تھا۔۔۔ اُس وقت وہ بھول گئی تھی کہ مِل میں کام کرنے والے لوگ اب بھی سیٹھ سعید کے نام تک سے ڈرتے تھے۔۔۔ مگر شمائلہ کو ان کے تصوّر سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

جاوید گویا اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "انھوں نے اگر ہمیں گولی نہیں بھی ماری تب بھی کھڑے پیروں مجھے عاق تو ضرور کر دیں گے' ہم کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں — میاں بیوی کی طرح رہ تو سکیں گے' دنیا کے سامنے سر اٹھا کر تو چل سکیں گے —" شمائلہ کی آنکھوں میں خوابوں کا رنگ لہرایا — عالیشان گھر میں بہو بن کر جانے کا اسے کبھی ارمان نہیں رہا تھا — اسے تو بس کوئی چھوٹا سا مسکن چاہیے تھا جہاں وہ بے خوفی سے جاوید کو اپنا کہہ سکے' اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس طرح کھڑی ہو سکے کہ کوئی ان پر اُنگلی نہ اٹھائے۔

"ہمارے خوابوں کو تعبیر ملنے میں کون سی دیر ہے۔ ایک سال ہی کی تو بات ہے۔۔۔ جس طرح ایک سال پلک جھپکتے میں گزرا ہے اسی طرح ایک اور سال بھی گزر جائے گا —" جاوید بولا۔

شمائلہ کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ شاید جاوید کے لیے واقعی ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا لیکن شمائلہ کے لیے ایک سال کس طرح گزرا تھا' یہ وہ خوب جانتی تھی۔ اس کے اعصاب پر کتنا بوجھ رہا تھا' کتنی راتیں اس نے جاگتے گزاری تھیں' کتنی کتنی دیر اندیشوں، واہموں اور وسوسوں کے سانپ اُسے ڈستے رہے تھے۔

"یہ صرف تمہارا خیال ہے کہ ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا ہے۔۔۔" شمائلہ نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "شاید اسی لیے اس پورے سال کے دوران تم نے اپنے ڈیڈی کے کان میں یہ بات ڈالنے کی کوشش نہیں کی کہ تمہاری پسند حبیبہ نہیں بلکہ۔۔!"

"تمہیں کیا معلوم کہ میں ڈیڈی سے کیا بات کرتا ہوں اور کیا نہیں۔۔۔" جاوید کے لہجے میں یکدم ہی تیزی آ گئی۔

"تم نے اس سلسلے میں کوئی بات ہی نہیں بتائی۔۔۔ ہمیشہ اس موضوع کو گول کرتے رہے۔۔۔ اور ایسے کوئی آثار بھی نہیں دکھائی دے رہے۔۔۔" وہ کہنا چاہتی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن تو تم حبیبہ کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں جاتے نظر آتے ہو۔۔۔ مگر وہ نہ کہہ سکی۔۔۔ وہ بیوی تھی۔۔۔ اسے حق حاصل تھا اعتراض کرنے کا۔۔۔ مگر وہ نہ کہہ سکی۔۔۔ اسے یہ بہت ہی چھوٹی سی بات لگی۔۔۔ مگر اندر ہی اندر جو زہر پھیل رہا تھا اسے روکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

جاوید نے شاید اسے کچھ اور سمجھانے کے لیے مُنہ کھولا مگر وہ اس سے پہلے بول اٹھی — "جاوید! نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اگلا سال بھی یونہی گزر جائے گا۔۔۔ اس کے دامن میں بھی میرے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہو گی۔"

"تم بداعتمادی کا شکار ہو رہی ہو —" اس کے لہجے میں صاف طور پر چڑچڑاہٹ محسوس ہونے لگی — "اور جلد بازی کا مظاہرہ بھی کر رہی ہو' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بداعتمادی اور جلد بازی دونوں ہی کی وجہ سے بنے بنائے کام بھی خراب ہو جاتے ہیں — ابھی وقت بالکل مناسب نہیں ہے — میں اس وقت ان کے سامنے یہ بات کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ میں نے مِل کی ایک معمولی ورکر سے شادی کر لی ہے۔۔۔"

شمائلہ کے دل میں پھر ایک ٹیس سی اٹھی — مِل کی معمولی ورکر' یہ الفاظ سماعت پر انگارے سے بکھیرتے ہوئے گزر گئے — اسے وہ وقت یاد آ گیا جب جاوید نے اسے شادی پر آمادہ کرنے کے لیے گھنٹوں اس کی منتیں کی تھیں' بس پاؤں چھونے ہی کی کسر رہ گئی تھی۔

وہ زہر کا یہ گھونٹ بھی خاموشی سے پی گئی اور بدستور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "بعض اوقات بس اچانک ہی زندگی میں کبھی فیصلے کا لمحہ آن پہنچتا ہے — میں اب ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتی۔۔۔ یہ کام ہمیں ایک نہ ایک دن تو کرنا ہی تھا۔۔۔ اور اس کے نتائج بھی جو مقدر میں ہوں گے' وہ سامنے آ جائیں گے۔۔۔ مجھے آج ہر حال میں تمہارے ساتھ چلنا ہے اور تمہیں اس شادی کا اعلان کرنا ہے۔۔۔"

"حکم دے رہی ہو مجھے؟" اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا ناچ اٹھا۔

"نہیں' اپنا حق مانگ رہی ہوں۔۔" وہ بدستور ملائمت سے بولی۔

"میں اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم وعدہ خلافی کی مرتکب ہو رہی ہو۔ تم نے ایک سال اور خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا۔۔۔"

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھ سے نہ جانے کتنی وعدہ خلافیاں ہو رہی ہیں۔۔۔ اور عدم تحفظ کے احساس نے مجھے وقت سے پہلے بولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ تہی دست تو میں پہلے ہی تھی' تم سے شادی کر کے کچھ اور تہی دست ہو گئی ہوں اور محسوس کر رہی ہوں کہ اگر ایک سال اور گزر گیا تو شاید میں بالکل ہی لُٹی پِٹی رہ جاؤں — شاید کوئی میری طرف مڑ کر دیکھنے والا بھی نہ ہو۔ میں

جو غلطی کر چکی ہوں اسے روز بہ روز سنگین تر بنانا نہیں چاہتی۔"

"تو گویا تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی ہے؟" جاوید نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"شادی تو غلطی نہیں ہے۔۔۔ لیکن ہم نے اسے غلطی کی طرح کیا۔۔۔" شمائلہ نے ذرا سے فرق سے اس کے الزام کو تسلیم کر لیا۔

"تو ابھی تمہارے پاس اس غلطی کی تصحیح کا موقع موجود ہے' واپسی کا راستہ کھلا ہے — ابھی تو کچھ نہیں بگڑا — کسی کو کیا پتا چلے گا کہ تم کیا کر چکی ہو — اس بات کو یہیں ختم کر دیتے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

شمائلہ آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے یہی شبہ ہوا کہ اس کی اپنی سماعت اسے دھوکا دے رہی ہے' اس کے کان اسے کسی اور دنیا کی آوازیں سنا رہے ہیں' جب اسے یقین آ گیا کہ الفاظ جاوید ہی کے ہونٹوں سے ادا ہوئے ہیں تو وہ چکرا کر گرتے گرتے بچی۔

"یہ تم کہہ رہے ہو جاوید۔۔۔؟ تم۔۔۔!" اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"میں کوئی بڑی بات تو نہیں کہہ رہا۔ تمہارے مسئلے کا حل پیش کر رہا ہوں۔۔۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اور تمہارا خیال ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا؟" وہ بدستور سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"نہیں۔۔۔ میرے خیال میں تو کچھ نہیں بگڑا۔۔۔ زندگی میں یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔" اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

"تو وہ محبتوں کے دعوے۔۔۔ وہ جینے مرنے کی باتیں' وہ ہجر و وصال کے قصّے۔۔۔ سب کچھ بس یونہی تھے؟ سب کچھ مٹا دو گے تم اپنے حافظے سے؟ جیسے سلیٹ سے چاک کا لکھا مٹایا جاتا ہے؟ کوئی دقت پیش نہیں آئے گی تمہیں؟ کوئی تکلیف نہیں ہو گی تمہیں؟" وہ غیر ارادی طور پر اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے وجود پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں ایسا لگتا تھا کہ اگر اسے خلافِ توقع کوئی جواب ملا تو وہ جاوید کے سر پر کچھ مار کر اسے ہلاک کر دے گی۔ اور خود بھی جان دے دے گی۔

جاوید اب گویا کچھ سنبھل کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں' یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اس روز تھی جب تم نے مجھے اپنایا تھا لیکن میں تو تمہاری یہ بے رُخی، تمہاری جلد بازی اور ہٹ دھرمی دیکھ کر ایک تجویز پیش کر رہا تھا۔۔۔ میں نے سوچا شاید تمہیں آزادی چاہیے — شاید تم اپنے آپ کو مقید محسوس کرتی ہو۔۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے آزادی چاہیے۔۔۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "مجھے آزادی چاہیے۔۔ تمہیں اپنا شوہر کہنے کی — تمہاری بیوی کہلانے کی — تمہارے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کی اور کسی چیز کی مجھے نہ ضرورت ہے، نہ پروا۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے — دو دن میں یہ بھوت بھی اُتر جائے گا جس طرح فی الحال محبت کا بھوت اُترا ہے اور یہ ازدواجیات کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔" وہ ناگواری سے بولا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے بولا — "ابھی تم غصّے میں ہو۔ فی الحال گھر جاؤ، کھانا کھاؤ اور بستر پر لیٹ کر ٹھنڈے دل سے حالات پر اور میری باتوں پر غور کرو — اپنے آپ کو جذباتیت کے دھارے میں مت بہنے دو۔ ہم پھر کبھی سکون سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کریں گے۔۔۔"

وہ واقعی اس وقت اپنے آپ میں سکت بھی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اسے ایک دم جیسے کوئی جھٹکا سا لگا تھا جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ اس کے وجود کے اندر کوئی سر بہ فلک عمارت ریت کے گھروندے کی طرح زمیں بوس ہو گئی تھی۔

شاید وہ دل کا صنم خانہ تھا۔

اس نے مشورہ قبول کر لیا۔ خاموشی سے وہ کوارٹر سے نکلی، پھر چار دیواری سے باہر آئی اور چناروں کی چھاؤں میں پگڈنڈی پر یوں شکستہ قدموں سے چل دی جیسے اپنا سب کچھ پیچھے کہیں چھوڑ آئی ہو — اب محض ایک موہوم امید کے سہارے کسی اجنبی سمت میں چلی جا رہی ہو — اپنے گھر کا تصوّر بھی اسے اجنبی لگ رہا تھا۔

جاوید کے مشورے کے مطابق وہ کھانا تو صحیح طور پر نہ کھا سکی لیکن بستر پر ضرور لیٹی — اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کر رہی تھی یا تپتے ہوئے دل سے؟ مگر غور ضرور کر رہی تھی — اور اس کے وجود کے کھنڈر میں دور کہیں کوئی غیبی قوت سرگوشیاں کر رہی تھی۔۔۔ "شمائلہ ڈیئر! تم نے دھوکا کھایا ہے۔۔۔ ان بہت سی نادان اور سیدھی سادی لڑکیوں کی طرح جو اپنے آپ کو بہت ذہین اور معاملہ فہم سمجھتی ہیں — تم کنوئیں کا مینڈک تھیں — ایک قصبے میں پیدا ہوئیں۔۔۔ بچپن وہاں گزارا۔۔۔ لڑکپن میں اس کالونی میں آ گئیں — تب سے اسی محدود دنیا میں ہو۔

اور سمجھتی ہو کہ تم نے بہت کچھ دیکھ لیا . . . . تم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا . . . . . دیکھو گی تو تم اب . . . . ابھی تک تو تمہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا کسے کہتے ہیں . . . . .'

وہ سوچتی رہی . . . مگر موہوم سی امید کی کمزور سی ڈور ابھی ہاتھ میں تھی رات کے نہ جانے کس پہر اسے گویا سُولی پر نیند آ گئی۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر وہ سر جھکائے چند لقمے زہر مار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ امی غور سے اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ مگر چونکہ میز پر بابر بھی موجود تھا اس لیے وہ کچھ کہنے سے گریز کر رہی تھیں مگر بالآخر وہ نہ رہ سکیں۔ "کیا بات ہے شمائلہ . . . . کئی دن سے میں دیکھ رہی ہوں کہ کھانے پینے میں تمہارا دھیان بالکل نہیں ہوتا . . . تمہاری صحت بھی مجھے گرتی دکھائی دے رہی ہے . . . . تم ٹھیک تو ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی!" وہ جلدی سے سنبھل کر بولی "آجکل کام بہت زیادہ ہے۔ دھیان اسی میں پھنسا رہتا ہے۔ کھانے کی طرف طبیعت ہی راغب نہیں ہوتی۔"

"کام کو اپنی صحت سے زیادہ اہم مت سمجھو۔ مصروفیت تو بھی کو رہتی ہے اور ہمیشہ رہتی ہے۔ اس کے پیچھے انسان کھانا پینا تو نہیں چھوڑ دیتا" امی نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

اس لمحے شمائلہ نے محسوس کیا کہ بابر بھی غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بابر بھی مل میں کام کرتا تھا اور اس کا شعبہ گو کہ دوسرا تھا مگر وہ آج کل زبردست مزدور لیڈر بنا ہوا تھا اس لیے اسے ہر شعبے کے بارے میں معلومات ہوتی تھیں۔ اسے یقیناً معلوم ہو گا کہ آجکل ایکسپورٹ کا کوئی بہت بڑا آرڈر نہیں آیا ہوا تھا اس لیے ایکسپورٹ کے شعبے میں کام معمولی سے بھی کم تھا۔ تاہم بابر نے خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا۔

ناشتا تقریباً جوں کا توں چھوڑ کر وہ کمرے میں گھستے ہوئے بولی "جانے کے لیے تیار ہو جاؤں آج مجھے دیر ہو گئی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر گھر سے نکلی تو بابر دروازے پر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے بولا "میں تمہیں مل لیے چلتا ہوں — دیر ہو چکی ہے۔ پیدل جاؤ گی تو اور دیر ہو جائے گی۔"

کالونی سے مل تک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ دیر واقعی ہو چکی تھی — اس سے پہلے دو تین مرتبہ دیر ہونے پر وہ بابر کے ساتھ موٹر سائیکل پر گئی تھی حالانکہ تاخیر سے آنے پر کوئی اس سے جواب طلبی نہیں کرتا تھا مگر وہ اپنے احساس فرض سے مجبور ہو کر خود ہی ہمیشہ صحیح وقت پر پہنچنے کی کوشش کرتی تھی اور بابر تو مزدور لیڈر تھا۔ اس سے تو جواب طلبی کی کسی میں جرات ہی نہیں تھی۔

بہرحال آج وہ اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ امی دروازے پر کھڑی تھیں۔ وہ جلدی سے بولیں "ہاں . . . ہاں — ٹھیک ہے تم بابر کے ساتھ ہی چلی جاؤ۔"

امی کے دل کی بات شمائلہ سے چھپی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ شمائلہ بابر کو اپنے قریب آنے کا موقع دے۔ بظاہر بابر میں لیڈری کے جنون کے علاوہ کوئی خرابی بھی نہیں تھی — لیکن نہ جانے کیوں شمائلہ نے اس میں کبھی کشش محسوس نہیں کی تھی — جاوید سے رسم و راہ بڑھنے سے پہلے بھی وہ اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا — اور اب تو بات ہی دوسری تھی۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی اور وہ بادلِ ناخواستہ اپنے آپ کو خوب سنبھال سمیٹ کر بابر کے پیچھے بیٹھ گئی۔ گھر سے ذرا دور آتے ہی وہ بولا . . . "شمائلہ کل رات تم فرح سے ملنے گئی تھیں نا؟"

فرح اس کی ایک دوست اور ساتھی کارکن کا نام تھا وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ کالونی ہی میں رہتی تھی۔ گزشتہ رات شمائلہ اس کے ہاں جانے کا بہانہ کر کے جاوید سے ملنے گئی تھی۔

"ہاں . . . کیوں . . . . کیا بات ہے؟" اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"کچھ نہیں . . . ." وہ سرسری سے لہجے میں بولا — "اتفاق سے میں نے تمہیں کالونی سے باہر جاتے دیکھا تھا — سیٹھ صاحب کے بنگلے کی طرف۔"

شمائلہ کا دل بیٹھ سا گیا۔ غنیمت تھا کہ بابر کا منہ دوسری طرف تھا اس نے کسی حد تک سچ بولنا بہتر سمجھا۔ قدرے رُکھائی سے بولی "فرح کے ہاں جانے سے پہلے میں ذرا نجومی بابا کے پاس گئی تھی . . . ہاتھ دکھانے —"

"یہ اتفاق بھی عجیب ہے کہ کل شام ہی میں نے فرح کو مل کی بس میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا . . . یقیناً وہ شہر جا رہی تھی۔" وہ اب بھی سرسری سے لہجے میں بولا۔ کالونی میں مقررہ وقت پر شٹل سروس چلتی تھی۔ اگر کوئی قریبی شہر یعنی لاہور جانا چاہتا تھا تو چلا جاتا تھا۔ قریب کی دوسری کالونیوں سے یا چھوٹے موٹے قصبوں وغیرہ سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

"تمہیں دھوکا ہوا ہو گا — وہ فرح نہیں کوئی اور ہو گی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔ کچھ عرصے سے اس میں جھوٹ بولنے کی جرأت پیدا ہو چکی تھی۔

"ہو سکتا ہے مجھے دھوکا ہوا ہو —" بابر ملائمت سے بولا۔ "اس کے باوجود میں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا شمائلہ . . .!" موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ کے باوجود اس کا ایک ایک لفظ سنائی دے رہا تھا اور خنجر کی طرح سماعت میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں یا برا — لیکن تم سے رشتے داری تو بہرحال ہے — اسے نہ تم ختم کر سکتی ہو نہ میں — ہمارا خاندان ایک ہے — اور میں کبھی پسند نہیں کروں گا کہ تمہاری وجہ سے خاندان کے نام پر حرف آئے۔"

شمائلہ کی کنپٹیاں سنسنانے لگیں وہ اسے سختی سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس میں جرأت نہیں تھی اسی دوران وہ فیکٹری میں داخل ہو چکے تھے۔ گیٹ کیپر انھیں اچھی طرح پہچانتے تھے کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بابر نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر لے جا کر روکی اور شمائلہ اتر کر ایک لفظ کہے بغیر اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل دی۔

آج اسے پیکنگ ہال میں جا کر پہلے اپنی نگرانی میں پیکنگ شروع کرانی تھی۔ اس نے پیکنگ شروع تو کرا دی لیکن اسے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ کون سی لڑکی کیا کر رہی ہے پیکنگ صحیح بھی ہو رہی تھی یا نہیں — وہ میزوں کے درمیان ٹہل رہی تھی لیکن اس کا ذہن نہ جانے کہاں بھٹک رہا تھا — وہ لڑکیوں کے پھرتی سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

"ٹیبل نمبر سات اور آٹھ کی لڑکیاں صحیح پیکنگ نہیں کر رہی ہیں مس خان!" شمائلہ اپنے عقب میں یہ بوجھل سی آواز سن کر بری طرح چونک اٹھی۔ ہڑبڑا کر اس نے مڑ کر دیکھا، نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس راشد اس کے پیچھے کھڑا تھا دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے اس کے قدرے چوڑے سے سرخ و سفید چہرے پر وہی گہری سنجیدگی تھی جو اس کی پہچان تھی۔

وہ اپنے چھوٹے بھائی جاوید ہی کی طرح دراز قد مگر اس سے ذرا بھاری جسامت کا تھا۔ وہ جاوید جتنا ہینڈسم نہیں تھا مگر اس کی شخصیت میں ایک الگ ہی قسم کی کشش تھی جس میں رعب اور دبدبے کی بھی آمیزش تھی۔ مل میں مشہور تھا کہ شخصیت کے اعتبار سے وہ باپ پر گیا تھا اور جاوید اپنی مرحوم ماں پر جو جوانی میں خوبصورت ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھی۔ جبکہ راشد کو اس کے باپ کی جوانی کی تصویر سمجھا جاتا تھا — پُرسکون مضبوط اور بارعب شخصیت کا مالک — وہ اگر غصے میں بھی ہوتا تھا تو اس کے غصے کو صرف محسوس کیا جا سکتا تھا، اس کے چہرے سے کبھی اس کے تاثرات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

اس کی شخصیت کسی چٹان سے مشابہ محسوس ہوتی تھی چہرہ ہمیشہ پُرسکون اور بادامی آنکھیں ہمیشہ سپاٹ نظر آتی تھیں۔ گویا بیشتر معاملات میں وہ اپنے بھائی سے بالکل متضاد تھا۔

وہ کسی ڈیپارٹمنٹ کی کارکردگی چیک کرنے کے لیے بہت کم آتا تھا — لیکن آج جبکہ شمائلہ خان کا دھیان اپنی ڈیوٹی میں نہیں تھا تو وہ آنکلا تھا۔ تاہم اس کے لہجے میں نہ تو تنبیہ تھی اور نہ ہی ناراضگی یا برہمی — ایک لمحے کے لیے تو گویا شمائلہ کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس نے کہا کیا تھا؟ وہ بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی اور اس لمحے ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا جس کا کم از کم اس صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں تھا جو فوری طور پر اسے درپیش تھی۔

اگر جاوید کی جگہ راشد ہوتا تو کبھی اپنے باپ سے چوری چھپے شادی نہ کرتا . . . . شاید وہ کسی سے نہ ڈرتا تھا . . . اس کی شخصیت میں خوف کا عنصر نہیں تھا . . . وہ بے شک پتھر کی طرح کھردرا تھا مگر پتھر ہی کی طرح اس کی ساخت میں کوئی پیچیدگی، کوئی فریب نہیں تھا . . . وہ جیسا باہر سے نظر آتا تھا یقیناً اندر سے بھی ویسا ہی تھا . .

شمائلہ نے جھرجھری سی لے کر ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ یہ بھلا کون سا موقع تھا ایسی باتیں سوچنے کا؟ اس نے جلدی سے ٹیبل نمبر سات اور آٹھ کی طرف دیکھا پھر دوبارہ راشد کی طرف مڑ کر بولی "آئی ایم سوری سر! میں ذرا چوک گئی تھی — میں ابھی ری پیک کراتی ہوں۔"

غنیمت تھا کہ غلطی جلد ہی پکڑی گئی تھی۔ ابھی زیادہ کام نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں میزوں پر جا کر اس نے ڈبے دوبارہ کھلوائے، لڑکیوں کو ہدایات دیں اور واپس آئی۔ راشد اپنی جگہ چٹان کی طرح جما کھڑا تھا مگر اس کی عقابی نظریں گویا ایک ایک میز کا جائزہ لے چکی تھیں، ایک ایک لڑکی کی کارکردگی کو پرکھ چکی تھیں۔

"جاوید آج نہیں آیا ہے . . . . اور شاید آئے گا بھی نہیں" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ اس

نے پچھلے دو دن کی اسٹاک رپورٹ آپ کی رپورٹ سے ٹیلی نہیں کی ہے کم از کم ایکسپورٹ کے معاملے میں یہ بے پروائی نہیں ہونی چاہیے تھی — میں اس سے بات کروں گا۔۔۔ لیکن فی الحال آپ وہ فائل لے کر میرے کمرے میں آجائیے — " جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مڑ گیا۔

شمائلہ نے اپنے کیبن میں آکر اسٹاک رپورٹ کی فائل نکال لی اور احتیاطاً ایک بار چیک کر لی کہ اس کی طرف سے تو کوئی غلطی نہیں ہے مطمئن ہو کر وہ فائل لے کر راشد کے آفس میں پہنچی۔ اسے بہت کم اس آفس میں آنے کا اتفاق ہوا تھا — اور اگر وہ آئی بھی تھی تو اس نے گرد و پیش پر غور نہیں کیا تھا۔

ان کی شخصیت کی طرح دونوں بھائیوں کے آفس کی آرائش میں بھی فرق تھا۔ جاوید کے آفس میں قالین، پردے اور صوفے وغیرہ شوخ رنگوں میں تھے، دیوار پر ایک غیر ملکی اداکار کا پوسٹر بھی آویزاں تھا جس کی ایک آفس میں کوئی تک نہیں تھی۔ اس کی میز پر ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری رہتی تھی۔

راشد کے آفس میں قالین اور پردے وغیرہ گہرے رنگوں کے تھے۔ ہر چیز شیشے کی طرح صاف ستھری چمکتی دمکتی نظر آرہی تھی وہ سگریٹ کے بجائے سگار پیتا تھا لیکن بہت کم۔ شاذونادر ہی اسے تمباکو نوشی کرتے دیکھا گیا تھا۔ اس کی ریوالونگ چیئر کے عقب میں دیوار پر چغتائی، صادقین اور شاکر علی کی تین پینٹنگز آویزاں تھیں۔۔۔۔ اس نے سرتاپا شمائلہ کا جائزہ لیا اور اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے اس کی اسٹاک رپورٹ اپنی آفس فائل سے ٹیلی کرنے لگا۔

رپورٹ پر بال پوائنٹ سے نشان لگاتے ہوئے وہ سر اٹھائے بغیر سرسری سے لہجے میں بولا — "مس خان! میں نے کئی بار آپ کو جاوید کے ساتھ ایسی جگہ پر دیکھا ہے جہاں میرے خیال میں آپ کو تو کیا، اسے خود بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔"

وہ اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی آج تک وہ اور جاوید اسی خوش فہمی میں رہے تھے کہ انھیں کوئی نہیں دیکھتا۔ نہ جانے کیوں اسے بہت شرم آئی۔ اس نے لاکھ خود کو سمجھایا کہ شوہر سے کہیں بھی ملنا کوئی معیوب بات نہیں تھی مگر پھر بھی اس کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

راشد نے اس کی طرف دیکھے بغیر بات جاری رکھی — شاید وہ اس کے چہرے پر خجالت کا رنگ دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے بدستور فائل پر نظر جمائے ہوئے تھا — "مس خان! آپ خوبصورت ہیں اور خوبصورتی بیشتر مردوں کی طرح جاوید کی بھی کمزوری ہے۔۔۔ میں بڑا بھائی ہوتے ہوئے یہاں آفس میں بیٹھ کر آفس کی ایک لڑکی کے سامنے بیٹھ کر چھوٹے بھائی کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتا اچھا تو نہیں لگوں گا — لیکن مجبوراً کر رہا ہوں — آپ کا خیال ہوگا کہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔۔۔ لیکن میں آپ کو کافی حد تک جانتا ہوں۔۔۔ میرے خیال میں آپ ایک مضبوط شخصیت کی مالک تھیں۔۔۔ شاید اب بھی ہوں۔۔۔ سنجیدہ طبیعت کی مالک پُروقار — اسی لیے مجھے آپ کی بھلائی مطلوب ہے میں آپ کو وعظ یا نصیحت نہیں کر رہا اور نہ ہی آپ پر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہوں، ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا اختیار ہے۔ میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرا بھائی کوئی مستقل مزاج آدمی نہیں ہے، اس سے زیادہ توقعات وابستہ مت رکھیے گا۔۔۔۔"

شمائلہ کا دل چاہا کہ میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔۔۔ اسے بتائے کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا، بہت تاخیر سے کہہ رہا تھا۔۔۔ پہلے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس کی باتوں کو جھٹلا کوئی جارحانہ سوال کرے۔۔۔ مگر پھر یکایک ہی شکست خوردگی نے اس پر غلبہ پالیا۔۔۔ یکدم ہی جیسے اس میں جھوٹ بولنے کی جرأت دم توڑ گئی تھی۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی۔۔۔ آخر مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں صاف کیوں نہیں کہہ دیتی کہ وہ میرا شوہر ہے۔۔۔ میں جہاں چاہوں اس سے مل سکتی ہوں۔۔۔

اور شاید وہ کہہ بھی گزرتی مگر اسی لمحے راشد نے فائل بند کر کے اس کی طرف بڑھا دی۔۔۔ گویا بات ختم ہو چکی تھی۔ تب شمائلہ کا بھی دل چاہا کہ وہ کوئی صفائی پیش کرے، حقیقت بیان کرے یا کچھ اور کہے۔۔۔ اس کا کچھ بھی کہنے کو جی نہ چاہا، اس کا بس رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے فائل لی اور خاموشی سے اپنے کیبن میں لوٹ آئی۔

❖

آج پھر جاوید کے آفس میں حبیبہ آئی ہوئی تھی۔۔۔ شمائلہ اس کے آفس سے کافی دور اپنے کیبن میں بظاہر ایک فائل پر نظر جمائے سکون سے بیٹھی تھی مگر وہ درحقیقت اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی بہت دیر تک وہ ساکت بیٹھی رہی، بالآخر فیصلہ کُن سے انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ مضبوطی سے قدم اُٹھاتی جاوید کے آفس کی طرف جا رہی تھی پختہ فرش پر اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ آج کچھ زیادہ ہی گونج رہی تھی۔ جاوید کے آفس کے دروازے پر باوردی چپراسی نے

اسے روک لیا۔ شمائلہ نے قہر آلود نظروں سے اُسے گھورا تو وہ ایک قدم پیچھے ضرور ہٹ گیا مگر راستہ اس نے پھر بھی نہ چھوڑا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا "وہ جی۔۔۔ صاحب نے منع کیا ہے کہ۔۔۔ جب حبیبہ بی بی بیٹھی ہوں تو کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔"

ایک شعلہ سا کسی رگِ جاں سے اٹھا اور دل کو جیسے خاک سا کر گیا اس کے نازک سے سراپا میں جیسے کوئی انجانی طاقت بھر گئی جس حرکت کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، وہ وہی کر گزری، اس نے ایک ہاتھ سے چپراسی کو ایک طرف دھکیل دیا۔

مگر جب وہ اندر پہنچی تو اس کا انداز طوفانی نہیں تھا۔ وہ جھیل کی طرح بالکل پُرسکون تھی۔ پہلے اس کی نظر حبیبہ پر ہی پڑی۔ وہ جاوید کے مقابل بڑی نخوت سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک کرسی پر براجمان تھی وہ خوبصورت نہیں، صرف کسی حد تک خوش شکل تھی مگر جب سر سے پاؤں تک خوبصورتی کے لوازمات موجود ہوں، دولت کی چمک دمک بھی شامل ہو تو بدصورت بھی اچھے بھلے نظر آنے لگتے ہیں۔ حبیبہ تو پھر بھی خوش شکل تھی۔ اس کے کلون کی مہک کمرے میں رچی ہوئی تھی۔۔۔ شمائلہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب انھیں ہر جگہ ملنے جلنے کے مواقع میسّر تھے تو پھر وہ آفس میں بھی کیوں چلی آتی تھی؟

حبیبہ نے عجیب سی نظروں سے شمائلہ کا سرتاپا جائزہ لیا ایک غیر اہم سی چیز کی طرح۔۔۔ جیسے انسان دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا ہو۔۔۔ مگر وہ یہ تاثر دینے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی تھی۔ شمائلہ کا چہرہ میک اپ سے محروم تھا، اس کا لباس معمولی تھا، اس کا وجود خوشبوؤں میں لپٹا ہوا نہیں تھا، پھر بھی وہ حبیبہ کی نظروں میں چبھتی ضرور تھی — حبیبہ اسے کئی بار رِل میں اِدھر اُدھر دیکھ چکی تھی۔

جاوید نے گڑبڑا کر شمائلہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے یہ تو نہیں پوچھ سکا کہ چپراسی نے اسے کیسے اندر آنے دیا مگر اس کی آنکھوں میں یہ سوال ضرور تھا۔

"سر۔۔۔!" شمائلہ نے نہایت تلخ اور چبھتے ہوئے لہجے میں یہ لفظ ادا کیا۔ "ذرا پیکنگ ہال میں تشریف لائیے۔۔۔ آپ کو ایک ضروری چیز دکھانی ہے۔"

"وہ۔۔۔ کیا کسی اور وقت نہیں دکھائی جا سکتی ہے، میں اس وقت ذرا بزی تھا۔" اس نے اپنے لہجے میں باس والی سرد مہری لانے کی کوشش کی۔

"نہیں سر! یہ بہت ضروری ہے۔ کنسائنمنٹ میں گڑبڑ

گھر بیٹھے انگلش سکھانے والی بہترین کتابیں

HOW TO WRITE A LETTER

خطوط نویسی کے لیے قیمت: ۶/- روپے

HOW TO WRITE AN ESSAY

مضمون نگاری کے لیے قیمت ۶/- روپے

HOW TO WRITE AN EXPLANATION

وضاحت و تشریح کے لیے قیمت: ۶/- روپے

HOW TO LEARN CORRECT SPELLING

صحیح ہجے لکھنے کے لیے قیمت: ۶/- روپے

HOW TO DO COMPREHENSION

ادراک و فہم کا اظہار کرنے کے لیے قیمت: ۶/- روپے

CORRECT POSITIONS OF PREPOSITIONS

پری پوزیشن کے صحیح استعمال کے لیے قیمت ۶/- روپے

HOW TO PUNCTUATE

رموزِ اوقاف جاننے کے لیے قیمت: ۶/- روپے

10 DAYS TO TRANSLATION

اُردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لیے قیمت: ۱۲/- روپے

○ اندرونِ ملک ڈاک خرچ ایک یا ایک سے زائد کتابوں کا ۱۰/- روپے ہوگا۔ پورا سیٹ منگانے پر ڈاک خرچ معاف (صرف اندرون ملک کے لیے) ○ کتابوں کی قیمت اور ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتا اور کتابوں کا نام ضرور لکھیں ○ کسی قسم کی نقد رقم خط میں ڈال کر ہرگز نہ بھیجیں۔ منی آرڈر ارسال کرنے کا پتا: مکتبہ نفسیات، پوسٹ بکس ۹۴۴ سعید منشن بلیریا اسٹریٹ، کراچی ۱ ○ بیرونِ ملک پورے سیٹ کی قیمتیں مع ڈاک خرچ: مشرقِ وسطیٰ ۱۰۰/- پاکستانی روپے، یورپ اور مشرق بعید ۱۵۰/- پاکستانی روپے، آسٹریلیا، امریکا، افریقہ ۲۰۰/- پاکستانی روپے ○ بیرون ملک کتابیں منگانے کے لیے رقم بذریعہ ڈرافٹ روانہ کریں۔ ڈرافٹ پر نام اس طرح لکھوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

Sales Office ذاتی طور پر حاصل کرنے کے لیے:

MAKTABA NAFSIAT 404 HUSSAIN
CENTRE, SHAHRAHE IRAQ SADDAR
KARACHI - PHONE: 526689

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

ہوسکتی ہے ۔" شمائلہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ۔

حبیبہ بے نیازی سے اپنی ناخن پالش کا جائزہ لینے لگی تھی ۔

جاوید نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"میں ابھی آیا حبیبہ! جانا نہیں ۔"

حبیبہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جاوید گویا بادلِ ناخواستہ اٹھ کر شمائلہ کے ساتھ باہر آیا۔ شمائلہ پیکنگ ہال کی طرف جانے کے بجائے راستے میں ایک راہداری میں رک گئی' جدھر سے کم ہی لوگوں کا گزر ہوتا تھا۔ ایک طرف لمبی دیوار تھی جس کے عقب میں مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور کچھ بلندی پر گول گول شگافوں سے ایگزھاسٹ فین گرم ہوا باہر پھینک رہے تھے ۔

وہ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے تلخ لہجے میں بولی "جاوید' کل تم نے خود فون پر مجھے کوارٹر میں آنے کے لیے کہا تھا لیکن میں مقررہ وقت پر پہنچی تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ آدھا گھنٹا میں باڑھ کے پیچھے چھپ کر انتظار کرتی رہی ۔تم میری پوزیشن کا اندازہ کرسکتے ہو؟ اب مجھے یہ وقت بھی دیکھنا ہوگا؟"

"میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا ۔مجبوری آن پڑی تھی جس کی وجہ سے میں نہیں آسکا تھا۔ لیکن کیا یہ بات بتلانے کے لیے مجھے اس وقت آفس سے اُٹھا کر یہاں لانا ضروری تھا؟ یہ بات پھر کسی وقت بھی ہوسکتی تھی ۔۔۔" اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی ۔

"بہت تکلیف ہوئی ہے حبیبہ کے سامنے سے اُٹھ کر آنے میں!" اس کے لہجے میں زہر چھلک رہا تھا ۔

"شمائلہ! تمہیں یکایک ہی کیا ہوگیا ہے؟ تم روز بہ روز صورتِ حال کو زیادہ سے زیادہ خراب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ الجھن سے بولا ۔

"میرا خیال ہے میری آنکھیں کھلنا شروع ہوگئی ہیں ۔" وہ بے خوفی سے بولی۔ "میں نے جب سے شادی کے معاملے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے تب سے تم نے مجھ سے کترانا شروع کر دیا ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں کہ مجھے تمہارے ارادے کچھ اچھے محسوس نہیں ہو رہے ہیں ۔۔۔۔"

سچی بات تو یہ تھی کہ شمائلہ اندر ہی اندر سخت خوفزدہ بھی تھی مگر وہ اپنے خوف کو چھپا کر بہادر بننے کی کوشش کر رہی تھی خوف کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاؤں کمزور تھے ۔ اس کے پاس نکاح نامہ تک نہیں تھا۔ شادی ہوئی تھی تو جاوید نے کہا تھا کہ نکاح نامہ رجسٹر ہونے کے بعد اس کی ایک کاپی ملے گی ۔۔۔ اور اس میں تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا ۔۔۔ شمائلہ اس وقت اس کی محبت میں مخمور تھی ۔۔۔ یہ باتیں اسے غیر اہم سی محسوس ہوئی تھیں ۔۔ بعد میں کئی بار سرسری انداز میں اس نے تذکرہ بھی کیا تھا مگر نکاح نامہ یا اس کی نقل ملنا تو درکنار اسے اس کی صورت دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی تھی ۔ جاوید نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ مکان لاہور کے کس علاقے میں واقع تھا جہاں اس کی شادی انجام پائی تھی' نکاح خواں کا نام کیا تھا یا گواہ کون تھے؟

"فار گاڈ سیک شمائلہ ۔۔۔!" جاوید دانت پیس کر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا "کیا یہ جگہ ایسی باتیں کرنے کے لیے مناسب ہے؟ اور یہ وقت ہے اس قسم کے جھگڑے نکالنے کا؟"

"جھگڑے ۔۔۔؟" شمائلہ نے حیرت سے دُہرایا "کون سے جھگڑے؟ اس میں جھگڑے والی کیا بات ہے؟ میں تمہاری بیوی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ اب تم تمام متعلقہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت کو قبول کرلو ۔۔۔ اپنی زندگی مجھے عجیب ذلت کی سی زندگی محسوس ہونے لگی ہے۔۔۔ میں اس طرح کے معمولات مزید برداشت نہیں کرسکتی ۔۔۔" اس کے سینے سے غم و غصے کا غبار اُٹھ کر واقعی اس کے حواس پر پھیل رہا تھا۔

"کون کس کی بیوی ہے بھئی ۔۔۔۔۔ اور کون سے جھگڑے ہیں ۔۔۔ کیا قصہ ہے؟" اچانک حبیبہ کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں ہی بُری طرح چونک کر بیک وقت بائیں طرف مڑے حبیبہ راہداری کے کونے سے نکل کر اچانک ہی سامنے آئی تھی' اس کے پیروں میں ہلکے پھلکے خوبصورت جوتے تھے اور شاید غیر ملکی تھے' اس کی ذرا سی بھی آہٹ سنائی نہیں دی تھی ۔ اور وہ یکدم ہی ان کے پاس ہی آن پہنچی تھی۔

جاوید کا چہرہ زرد پڑگیا تھا مگر وہ سنبھل کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا ۔ "کچھ نہیں ۔۔۔ کوئی قصہ نہیں ۔۔ وہ دراصل ۔۔۔ ایک مزدور اور اس کی بیوی کی بات ہو رہی تھی ۔۔۔ تم یہاں کیوں چلی آئیں ۔۔۔ آفس میں ہی بیٹھتیں ۔ میں ابھی آ رہا ہوں ۔"

"بس میں نے سوچا' میں چلتی ہوں' شام کو گھر آؤں گی ۔"

وہ بات جاوید سے کر رہی تھی مگر چہرہ بغور شمائلہ کا تک رہی تھی' اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ تھی پھر وہ اپنے گاگلز اتار کر شمائلہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ۔۔

"کس مزدور اور کس کی بیوی کا قصہ ہے؟"

شمائلہ کے ضبط کا بندھن گویا یک لخت ہی ٹوٹ گیا اسے نتائج کی بھی پروا نہیں رہی یکدم ہی وہ پھٹ سی پڑی ۔ "یہ ایک مزدور اور اس کی بیوی کا نہیں ۔۔ ایک مزدور بیوی اور اس کے سیٹھ شوہر کا قصہ ہے ایسا بزدل شوہر جس میں علی الاعلان اپنی بیوی کو بیوی کہنے کی جرأت نہیں ہے ۔۔ وہ مزدور بیوی میں ہوں ۔۔۔۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا پھر جاوید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ۔ "اور وہ بزدل شوہر یہ ہے ۔۔۔"

ایک لمحے کے لیے تو حبیبہ کو بھی جھٹکا سا لگا مگر وہ بہت زمانہ ساز لڑکی تھی اس جھٹکے کو پی گئی اور گاگلز کو ہاتھ میں تھامتے ہوئے جاوید کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "یہ میں کیا سُن رہی ہوں جاوید؟"

جاوید اب سنبھل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے بجائے غصہ جھلک آیا تھا۔ پہلے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اور تو نہیں آ رہا ۔۔۔۔ پھر وہ تیز لہجے میں بولا ۔۔۔ "اس لڑکی کا یا تو دماغ چل گیا ہے یا پھر یہ کوئی سنگین مذاق کر رہی ہے شاید اس مذاق کی سنگینی کا اسے خود بھی اندازہ نہیں ۔"

"اچھا ۔۔۔ تو یہ مذاق ہے؟ اور میں محض' ایک لڑکی' ہوں ۔۔۔" شمائلہ کی آواز رُندھ گئی ۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلانے لگیں ۔ وہ بہادر بن کر لڑنا چاہتی تھی مگر آنسوؤں نے اسے ایکدم شکست خوردہ سا بنایا ہوا تھا۔ اس لمحے اسے ان لوگوں پر بے حد غصہ آیا جو کہتے تھے کہ آنسو عورت کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں' اس کے خیال میں تو آنسو عورت کی سب سے بڑی کمزوری تھے' جن موقعوں پر انھیں نہیں بہنا چاہیے تھا ان موقعوں پر بھی بہہ نکلتے تھے ۔

"دیکھو لڑکی!" حبیبہ نخوت سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی ۔ "میں شاید اس فیملی کی ہونے والی بہو ہوں اس لیے مجھے دلچسپی لینا پڑ رہی ہے ۔۔۔۔۔ دیکھو ۔۔۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ یہ مرد بڑے ہرجائی ہوتے ہیں ۔۔۔ شادی سے پہلے تو کیا شادی کے بعد بھی اِدھر اُدھر منہ مارتے پھرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ انھیں چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھ کر نظر انداز کرنا ہی ہماری سماجی مجبوری ہے ۔ لیکن معاملہ اگر شادی کا ہے تو مجھے سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا ۔۔۔"

"حبیبہ!" جاوید اپنے مخصوص بے تابانہ انداز میں بول اٹھا ۔۔ "تم بھی اس کی باتوں میں آگئیں ۔۔۔ یہ جھوٹی ہے ۔۔ اسے ضرور کسی نے بہکایا ہے اور کوئی چکر چلانے پر اکسایا ہے ۔ تمہیں معلوم ہے ہم جیسے لوگوں کے خلاف اس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی ہیں لیکن میں اس معاملے سے نمٹ لوں گا ۔ تم اس چکر میں مت آؤ ۔۔۔۔ اس سے پوچھو کیا ثبوت ہے اس کے پاس اتنے بڑے دعوے کا؟"

شمائلہ کو ایک لمحے کے لیے چکر سا آگیا۔ آخر اس سوال کا عفریت اس کے سامنے آن ہی کھڑا ہوا تھا جس کی دہشت اسے پہلے ہی اندر ہی اندر کھا رہی تھی جس کی محبت میں دیوانی ہوکر اس نے آنکھیں بند کر کے اپنا کل زادِ راہ لٹا دیا تھا اس کا آنکھیں پھیر لینے کا صدمہ تو اپنی جگہ تھا مگر اب جبکہ اس نے اپنا راز ہونٹوں سے اُگل ہی دیا تھا تو اس سوال کی دہشت' صدمے سے بھی زیادہ تھی کہ اس کے پاس کیا ثبوت تھا؟

"ایک لڑکی جب اپنی زبان سے اقرار کرتی ہے کہ فلاں اس کا شوہر ہے تو اس کے پاس اپنے اس اعتراف کا کوئی بڑا ثبوت نہیں ہوتا ۔۔۔" وہ تیز و تند مگر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولی ۔ "بندھن میں باندھنے والے تو اصل میں چند کلمات ہی ہوتے ہیں ۔۔۔ یہ کاغذی کارروائیاں تو محض دنیاوی چیزیں ہیں ۔۔۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں لیکن اگر تمہاری نظر میں یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح نکل آئیں گی اب اتنا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا ہے ۔۔۔ تم نے آج تک مجھے بہلائے پھسلائے رکھا اور نکاح نامے کی نقل نہیں دی ۔ لیکن میں جلد یا بدیر ان لوگوں کا سراغ لگا ہی لوں گی جن کے سامنے نکاح ہوا تھا ۔۔۔ اور جن مولوی صاحب نے نکاح پڑھایا تھا ۔"

وہ یوں ہنس دیا جیسے شمائلہ نے کوئی نہایت بچگانہ بات کی ہو۔ پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ۔۔۔ "لگتا ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے اور وہ تمہارے ذہن پر نقش ہوکر رہ گیا ہے ۔۔۔ تم اپنے آپ کو کسی ماہرِ نفسیات کو دکھاؤ ۔۔۔ اخراجات کی فکر نہ کرنا ۔۔۔ وہ ہم ادا کر دیں گے ۔۔۔ آخر تم ہمارے اہم ورکرز میں سے ایک ہو ۔۔۔۔"

پھر وہ حبیبہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا ۔۔۔ "آؤ چلیں ۔۔ اس لڑکی سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں ۔۔۔۔ یہ خواہ مخواہ کا کوئی اسکینڈل کھڑا کرنے کی فکر میں ہے ۔۔۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ اس قسم کے اسکینڈل لڑکیوں ہی کو مہنگے پڑتے ہیں ۔۔"

شمائلہ کا ذہن غوطے سے کھا رہا تھا ۔۔۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر نہیں کہہ پا رہی تھی ۔ جاوید نے اس کے سامنے حبیبہ کا ہاتھ تھاما اور وہ باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے چلتے چلتے حبیبہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں شمائلہ کے لیے ترحم تھا جو شمائلہ کی روح پر مزید چرکے لگانے کے

لیے کافی تھا۔ وہ واپس اپنے کیبن میں پہنچی تو اس کا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے ہال میں کام اپنی اسسٹنٹ کے سپرد کیا اور خود اپنے کیبن کا دروازہ مقفل کرکے میز پر سر رکھ کر بیٹھ گئی، اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

اس نے دھوکا کھانے، اعتبار اٹھ جانے کے صرف قصّے افسانے پڑھے تھے اور کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی تھی کہ لوگ اتنے عاقل و بالغ ہوتے ہوئے بھی کس طرح دھوکا کھا جاتے ہیں۔۔۔۔ لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دھوکا کھانا تو شاید نظامِ فطرت کا ایک حصّہ تھا۔۔۔ کوئی بھی انسان کسی بھی وقت دھوکا کھا سکتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جاوید اسے دھوکا دے سکتا ہے، اس کے سامنے ہر تعلق سے منکر ہو سکتا ہے۔

ہر کمزور انسان کی طرح ایک لمحے کے لیے اس کا دل بھی غم و غصّے سے بھر گیا۔ اس کا دل چاہا کہ جاوید کو قتل کر ڈالے، اس کی بوٹیاں اُڑا دے، محبّتوں سے تراشا ہوا اپنا یہ صنم ریزہ ریزہ کردے۔۔۔۔ مگر دھیرے دھیرے اسے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ بھی تو اس کے بس کی بات نہیں تھی۔۔۔۔ وہ ایک کمزور اور بے سہارا لڑکی تھی۔

بلکہ اب تو اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خواہ مخواہ غصّے اور جذبات میں آکر اپنا راز اس لڑکی کے سامنے اگل دیا تھا جو نام کی حبیبہ لیکن درحقیقت اس کی، رقیبہ تھی، لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو تسلّی دی کہ خود حبیبہ کے لیے بھی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس معاملے کا کسی سے ذکر نہ کرے یہ چیز اس کے مفاد میں نہیں تھی۔ اور جاوید نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا۔

بے خوفی تو اب مجھے ہونی چاہیے، شمائلہ نے سوچا۔ اب ایک بار بات ہونٹوں پر آہی گئی تھی تو گویا جھجک سی جاتی رہی تھی۔ جس بات کو وہ دل کے بند کواڑوں میں چھپاتی رہی تھی اسے چھپائے رکھنے کا اب کوئی فائدہ تو رہا نہیں تھا۔ جاوید نے اسے اپنی اصل صورت تو دکھا ہی دی تھی۔۔۔ اب تو شمائلہ کو اپنے آپ کو بربادی کے اس صدمے سے سنبھالنا تھا اور فیصلہ کرنا تھا کہ سینے پر یہ زخم لے کر وہ کیونکر زندگی گزارے گی؟ یہ کوئی معمولی ٹھوکر نہیں تھی جس کے بعد وہ آسانی سے سنبھل جاتی۔

❖

شمائلہ کی نظر میں شادی دلوں کا سودا تھی، باقی معاملات توضیحی تھے۔ اور جب جاوید کے دل میں ہی اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اور پورے ایک سال تک اس نے محض ایک ڈراما کھیلا تھا۔ تو اب اس کا تعاقب کرنا، اس کے پیروں کی زنجیر بننے کی کوشش کرنا فضول تھا۔

لیکن وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہتی تھی۔ چھوٹا موٹا احتجاج ہی سہی، اپنے دل کا غبار نکالنے کی ایک کوشش ہی سہی۔

اس لیے اس شام اس نے اپنی تمام تر جرأتیں مجتمع کیں، اپنے آپ کو سنبھالا، تیار ہوئی اور سیٹھ سعید کے بنگلے پر جا پہنچی۔ آج پہلا موقع تھا کہ وہ چور دروازے سے بنگلے میں داخل نہیں ہو رہی تھی۔ مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار نے اسے روک لیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" چوکیدار نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب سے"، شمائلہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن سیٹھ صاحب سے تو کوئی نہیں مل سکتا ۔۔ کل سے اُن کی طبیعت بہت خراب ہے ۔۔ ڈاکٹر نے ان سے ملنے سے منع کر رکھا ہے بہت سے لوگ واپس جا چکے ہیں"، چوکیدار نے بتایا۔

"لیکن میرا ان سے ابھی اور اسی وقت ملنا ضروری ہے۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے"، وہ تیزی سے بولی۔ دراصل وہ ڈر رہی تھی کہ معلوم نہیں اس میں دوبارہ کبھی اس طرح جرأت مجتمع ہو پائے یا نہیں۔

"زندگی موت کا تو مجھے کچھ معلوم نہیں بی بی جی! مجھ کو تو بس اتنا معلوم ہے کہ سیٹھ صاحب سے کوئی ملنے نہیں جا سکتا"، چوکیدار بولا۔

"چلو ٹھیک ہے ۔۔"، شمائلہ کچھ سوچ کر بولی "لیکن تم مجھے اندر تو جانے دو۔ میں گھر والوں سے ان کی طبیعت کا پوچھ کر ہی واپس آجاؤں گی ۔۔"

چوکیدار ایک لمحے کے لیے تذبذب کا شکار رہا لیکن اسی لمحے اندر سے آواز آئی۔۔۔ "کیا بات ہے چوکیدار۔۔۔ کون ہے؟"

وہی شناسا سا اور بوجھل سی آواز سن کر شمائلہ کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئی۔ بھاری قدموں کی آہٹ گیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر کسی نے چھوٹا گیٹ پورا کھول دیا۔ راشد اس کے سامنے کھڑا تھا ۔۔ وہ کرتے پاجامے میں ملبوس شال لپیٹے ہوئے تھا ۔۔ انگلیوں میں سگار سلگ رہا تھا۔

"ارے۔۔۔۔ شمائلہ۔۔۔۔ تم!"، ہمیشہ سپاٹ رہنے والے اس کے چہرے پر حیرت کی ہلکی سی لہر ابھر آئی۔۔۔ "آؤ۔۔۔ آؤ۔۔ اندر آجاؤ۔۔۔۔"

چوکیدار ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اندر پہنچ گئی۔۔ راشد مزید کچھ نہیں بولا۔ اسے پیچھے آنے کا اشارہ کرکے اندر کی طرف چل دیا۔ ایک وسیع و عریض ڈرائیو وے سے گزر کر وہ کار پورچ میں پہنچے پھر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر راشد نے اس کے لیے بھاری بھرکم منقش چوبی دروازہ کھولا اور پُراحترام انداز میں اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

اندر قدم رکھتے ہی شمائلہ کے پاؤں ایک دبیز قالین میں دھنس گئے۔ وہ ایک بڑے ہال میں کھڑی تھی۔ چھت کے وسط میں ایک بہت بڑا فانوس جھلملا رہا تھا۔ راشد نے اندر کا رُخ نہیں کیا۔ وہ وہیں سے اسے بائیں ہاتھ پر سیڑھیوں کے راستے اوپر لے گیا۔ چند لمحے بعد وہ جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ایک آئیڈیل قسم کا آراستہ و پیراستہ، لکھنے پڑھنے کا کمرا تھا۔ چاروں طرف دیوارگیر شیلفوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں کھڑکیوں پر بھاری پردے پھیلے ہوئے تھے، درمیان میں ایک لمبی چوڑی میز تھی۔

راشد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میز کے دوسری طرف جا بیٹھا۔ ٹھوڑی مسلتے ہوئے اس نے پُرخیال انداز میں شمائلہ کی آنکھوں میں جھانکا۔۔ "بہت پریشان نظر آرہی ہو۔۔"

حالانکہ شمائلہ کا خیال تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں کو اپنے سینے میں بہت گہرا دفن کرکے آئی ہے۔۔۔ پھر اسے راشد کے لہجے پر بھی حیرت ہوئی۔۔۔ اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت کیوں تھی؟ وہ برسوں کا شناسا سا کیوں لگ رہا تھا؟ جبکہ شمائلہ نے اسے محض چند ایک مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ اور اس سے بات چیت تو صرف دو تین بار ہی ہوئی تھی۔

"میں آپ کے والد صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔"

وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے یکدم ہی بولی۔

"کیوں؟"

"یہ میں انھی کو بتاؤں گی۔۔۔"

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور گدیلی کرسی کے پشتے سے سر ٹکا لیا پھر وہ گہری سانس لے کر بولا "دیکھو شمائلہ! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔۔۔ ڈیڈی کی طبیعت کچھ ایسی زیادہ خراب نہیں ہے۔۔۔ لیکن ڈاکٹر کے مشورے سے ہم نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی ان سے ملنے نہ پائے۔۔۔ کیونکہ وہ گھر پر رہ کر بھی تمام کاروباری الجھنوں میں ٹانگ اڑانے سے باز نہیں آتے۔ نہیں بیٹھے بیٹھے ہر الجھن ہر مسئلے میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں اور احکامات جاری کرتے رہتے ہیں۔ اپنے معاملات میں بھی اُلجھتے رہتے ہیں جو ٹینشن کا باعث ہوتے ہیں۔ اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے بے حد نقصان دہ ہو سکتی ہے۔۔۔ چنانچہ ہماری کوشش ہے کہ اگر کوئی ان کے پاس جائے بھی۔۔۔ تو خوشی کی خبر لے کر جائے۔۔۔۔ اور تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تمہارے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

"غریبوں کے دامن میں خوشخبریاں تو شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں راشد صاحب!" وہ تلخ لہجے میں بولی "لیکن امیروں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں بُری خبروں سے بچنے کے لیے قلعہ بند ہو کر بیٹھ سکتے ہیں۔ کوئی ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جبکہ غریبوں کے گھر میں ہر کوئی منہ اٹھا کر آسکتا ہے خواہ وہ بربادیوں کا پیغام لے کر ہی آیا ہو۔۔"

راشد نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے کسی بچے کو اپنی عمر سے بڑی اور جذباتی تقریر کرنے سے منع کر رہا ہو۔۔۔ "یہ بیکار، طویل اور جذباتی باتیں چھوڑو ۔۔ سیدھی اور کام کی بات کرو۔ زمانہ بہت تیز رفتار ہوگیا ہے۔۔۔ تم بھی اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرو ۔۔ پریکٹیکل بنو۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ آپ جیسی فیملیز کے لوگوں سے مل کر احساس ہوتا ہے کہ زمانہ واقعی بہت تیز رفتار ہوگیا ہے۔۔" اس کے لہجے کی تلخی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔۔۔۔ "لیکن کیا کریں۔۔۔ ہم جیسے لوگ اگر آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔۔۔ شاید اس رفتار سے چلنے کے لیے پاؤں ہی ذرا دوسری قسم کے درکار ہوتے ہیں۔۔ ویسے بائی داوے۔۔۔۔۔۔ کیا آپ دولتمند لوگوں کی زندگی میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے۔۔۔ کیوں نہیں ہوتا۔۔۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟" وہ قدرے تھکے تھکے سے لہجے میں بولا "کم از کم میری زندگی میں تو بہت دخل تھا جذبات کا ۔۔ لیکن حادثات میں بعض لوگ جسمانی طور پر معذور ہو جاتے ہیں، میں ایک حادثے میں جذباتی طور پر معذور ہوگیا ہوں۔۔۔ میں چاہوں بھی تو جذباتی نہیں ہو پاتا۔ میرے جذبات مر چکے ہیں۔۔۔"

"افسوس کہ میں آپ کے جذبات کی ناگہانی وفات پر اس وقت تعزیت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔۔۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی "کیونکہ میرے اندر اس وقت ایک قبرستان پھیلا ہوا ہے۔۔۔"

راشد نے اس کے استہزائیہ لہجے کو نظرانداز کردیا اور میز پر قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ "ابھی تک تم نے اپنی آمد کا مقصد بیان نہیں کیا۔۔۔ جاوید کے بارے میں کوئی بات کرنے آئی ہو نا۔۔؟ تمہاری پریشانی کا تعلق جاوید سے ہے نا؟"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتی تھی

مگر غیر ارادی طور پر اس کا سر جھک گیا۔۔۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکی۔

”تم مجھے بتاؤ تو سہی۔۔۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ شاید ڈیڈی سے بات کر کے تمہیں کوئی مدد میسّر آنے کے بجائے تمہارے جذبات کچھ اور مجروح ہوں۔۔۔“ وہ بہت ملائمت۔۔ بلکہ محبّت سے بولا۔

شمائلہ کے دل میں غبار سا کھِل گیا۔ کافی عرصے سے کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر یکدم میز پر سر رکھ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ راشد کچھ بھی نہ بولا خاموشی سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے تو بوجھ ہلکا ہو جائے۔

کچھ دیر آنسو بہہ چکے تو یک بیک شمائلہ نے اپنے آپ کو بڑا شرمسار سا محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھایا۔ راشد کی طرف دیکھے بغیر اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور برابر کی کرسی سے اپنا پرس اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوتے مدّھم آواز میں بولی۔ ”میں اب چلتی ہوں۔۔۔ میں خوامخواہ ہی آئی۔۔۔۔ آپ کو بھی پریشان کیا۔۔۔۔“

اچانک اس نے اپنی کلائی ایک آہنی شکنجے میں پھنسی محسوس کی۔ اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ راشد نے میز کی دوسری طرف سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی گرفت آہنی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔ ایک لمحے کے لیے شمائلہ کو عجیب محسوس ہوا۔۔۔ شاید یہی سختی یہی فولادی پن راشد کے کردار میں بھی تھا۔۔۔ اس کے ارادوں میں بھی تھا۔۔۔۔ وہ سرتاپا مضبوطی تھا۔۔۔ اپنی جگہ پر، اپنے فیصلوں پر جم جانے والا۔ شمائلہ کے دل میں ہُوک سی اٹھی۔۔۔ کاش یہی مضبوطی یہی ٹھہراؤ۔۔۔ یہی سختی تھوڑی بہت جاوید میں بھی ہوتی۔۔۔ وہ اتنا ناقابلِ اعتبار نہ ہوتا۔۔۔ ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے پتّے کی طرح۔

”بیٹھ جاؤ۔۔۔۔“ راشد کے لہجے میں بیک وقت تحکّم بھی تھا اور اپنائیت بھی۔۔۔۔ ”اب تم وہ بات بتائے بغیر نہیں جا سکتیں جس کے لیے آئی تھیں۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ سن لیجیے آپ بھی میری رسوائی کی کہانی“ وہ دھم سے کرسی پر گر گئی۔۔۔ اور پھر اس نے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔۔۔ آج بل میں جیبہ کی موجودگی میں جو مکالمہ ہوا تھا وہ بھی بتا دیا۔۔۔ اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا اور تب اس نے اپنے آپ کو کچھ ہلکا پھلکا سا محسوس کیا جیسے اس کا بیشتر بوجھ کسی اور کے کندھوں پر منتقل ہو گیا ہو۔

راشد چند لمحے تک پُر خیال نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔۔۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا بالآخر وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔۔۔ ”شمائلہ میں تو تمہیں اچھی خاصی سمجھدار لڑکی سمجھتا تھا۔۔۔ تم کچھ ایسی کم عمر بھی نہیں ہو۔۔۔ مگر تم تو بہت بھولی بہت نادان نکلیں۔ تم نے تو اپنے آپ کو عجیب دلدل میں پھنسا لیا ہے۔۔۔ مجھے نہ جانے کیوں ایک بے عنوان سا صدمہ پہنچا ہے۔۔۔۔“ وہ شاید اپنے محسوسات کے بارے میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر ایک لمحے کے لیے خاموش سا ہو گیا۔

اس دوران اس کا سگار بجھ چکا تھا وہ اسے کرسٹل ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے بولا ”فرض کرو کسی بھی طریقے سے جاوید کو تمہیں اپنا لینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، تب بھی تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ تم اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار سکو گی؟ جس شخص کی نیّت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی۔۔۔ جس نے تمہیں ایک خطرناک دھوکا دیا۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ شادی محض ایک ڈراما تھی اس جیسے آدمی کے لیے اس قسم کے انتظامات کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تم چونکہ عام طریقوں سے اس کے ہاتھ نہیں آئیں اس لیے اس نے تھوڑا سا تردّد کیا۔۔۔ یہ اس کی فطرت ہے وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ہر حربہ اختیار کر لیتا ہے۔۔۔ جس شخص نے تمہیں اتنا بڑا دھوکا دیا۔۔۔ اور جو اب تم سے جان چھڑانا چاہتا ہے اگر وہ مارے باندھے تمہیں قبول بھی کر لے اور نئے سرے سے تمہاری شادی کرا بھی دی جاتے تو تمہیں یقین ہے کہ تم وہ زندگی گزار بھی سکو گی جس کے تم نے خواب دیکھے تھے؟“

شمائلہ نے بےبسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس موضوع پر اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ درحقیقت اس نے کسی بھی پہلو پر صحیح طرح سوچا ہی نہیں تھا اس کی سوچنے کی صلاحیت صحیح طور پر کام ہی نہیں کر رہی تھی جس کی محبّت میں وہ دُنیا جہان سے بیگانہ تھی، کیا واقعی وہ اتنا فریبی اور مکّار تھا؟ اس حقیقت کو ابھی تک اس کے ذہن نے قبول نہیں کیا تھا۔

”تو پھر کیوں اس کا تعاقب کر رہی ہو؟ اپنی مجروح انا کو کچھ اور مجروح کرنے کا سامان کیوں کر رہی ہو؟ یہ زندگی بھر کی رفاقتوں کے معاملے ہیں کسی کو مجبوری کی بندشوں میں باندھ کر اپنے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔۔۔ اور اگر تم اس سے لڑو گی زیادہ واویلا کرو گی تو اس کا سب سے زیادہ نقصان صرف تمہیں ہو گا۔ وہ تمہاری زبان بند کرانے کے لیے کوئی خطرناک قدم

بھی اٹھا سکتا ہے۔۔۔ آخر وہ ایک بڑے صنعتکار کا بیٹا ہے۔“ راشد اس کے بارے میں بالکل غیر متعلق اور غیر جانبدار ہو کر گفتگو کر رہا تھا جیسے وہ اس کا بھائی نہیں کوئی تیسرا فریق ہو۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔۔۔ ”زندگی تو لڑکی کی تباہ ہوتی ہے۔۔۔ اور پھر آجکل قوانین بھی دُہرے دُہرے چل رہے ہیں۔ جو لڑکی کے لیے تو بہت ہی زیادہ تباہ کُن ثابت ہو سکتے ہیں۔۔۔“

”آپ مجھے ڈرا کر بددل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ شکست مان لینے کی طرف راغب کر رہے ہیں۔۔۔ آخر بھائی ہیں نا اس کے۔۔۔ بھائی ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔۔۔“ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

”بہت خوب۔۔۔“ اس کے لہجے میں بھی ہلکی سی تلخی در آئی۔۔۔ ”یہی صلہ ملتا ہے آجکل ہمدردی کرنے کا۔۔۔ ۔۔۔۔ لیکن میں تمہیں بے وقوف اور نادان سمجھ کر تمہارے اس طنز کو نظرانداز کر رہا ہوں۔۔۔ تمہارا دل چاہے تو یقین کر لینا اور دل نہ مانے تو یقین مت کرنا۔۔۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اپنے بھائی کی حرکتوں کی وجہ سے میں اسے پسند نہیں کرتا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ دولت آج کے دور میں کچھ نہ کچھ برائیاں ضرور ساتھ لے کر آتی ہے اور انھیں نظرانداز بھی کرنا پڑتا ہے لیکن کسی کو دھوکا دینا میری نظر میں ناقابلِ معافی ہے۔۔۔ اور یہ غیر ضروری بھی ہے اگر عیاشی اس کی فطرت میں شامل ہے تو جس پوزیشن میں وہ ہے، وہاں وہ کسی کو دھوکا دیے بغیر بھی جتنی چاہے عیاشی کر سکتا ہے۔۔۔ لیکن کسی کم مایہ سیدھی سادی اور نادان قسم کی دُختر کو محبّت کا فریب دے کر لوٹنا محض بدفطرتی ہے اور کچھ بھی نہیں۔۔۔ اور صرف اپنی بدفطرتی ہی کی وجہ سے جاوید مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔۔۔ میں اسے تمہارے ’انتقام سے بچانے کی ہرگز کوشش نہیں کر رہا۔۔۔ میں تو نہایت غیر جذباتی انداز میں دلیل اور منطق کے سہارے تمہارے لیے کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ لیکن اگر تمہیں انتقام لینے کا شوق ہے تو ضرور لو۔۔۔ تم جو چاہتی ہو وہ کر گزرو۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔“ وہ یکدم ہی تھکے تھکے سے انداز میں واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

”میں۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں۔۔۔ میں نے آپ کی نیّت پر شبہ کیا۔۔۔ دراصل میرے حواس ٹھکانے میں نہیں ہیں۔۔۔“ وہ شرمسار سے لہجے میں بولی۔

اس کا غصّہ جیسے فوراً ہی دور ہو گیا چہرے سے بادل سے ہٹ گئے اور وہ لائٹر سے دوبارہ اپنا سگار سلگا کر بولا ”میں تو صرف یہی جاننا چاہتا تھا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ بغیر سوچے سمجھے تو ڈیڈی کے سامنے جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔۔۔ وہ تمہاری بات پر یقین ہی نہیں کریں گے ڈانٹ کر بھگا دیں گے۔۔۔ اگر تم خوفزدہ یا مرعوب نہیں ہو گی تو زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہیں گے کہ۔۔۔ ’اچھا تو تم ہمیں بلیک میل کرنے آئی ہو۔ اسکینڈل کھڑا کر کے ہمیں پریشان کرنا چاہتی ہو۔ بولو اپنی زبان بندی کی کتنی قیمت چاہیے تمہیں؟‘ یہ کہہ کر وہ دو چار لاکھ روپے تمہارے منہ پر مارنے کی کوشش کریں گے۔۔۔ کیا روپیہ تمہارے مسئلے کا حل ہے؟ کیا روپے پیسے کی کوئی اہمیت ہے تمہاری نظر میں؟“

”میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے روپے پر۔۔۔“ وہ تیزی سے بولی۔۔۔ ”میں نے تو آج تک جاوید سے کوئی تحفہ قبول نہیں کیا حالانکہ میں تو اپنی دانست میں اس کی منکوحہ بیوی تھی لے بھی لیتی تو کیا حرج تھا؟ میرا حق بنتا تھا۔۔۔ لیکن میں نے یہی سوچا کہ جب شادی ہی چھُپ کر کی ہے تو تحفے لے کر بھی کیا کروں گی؟ انھیں بھی کہاں چھُپاتی پھروں گی۔۔۔ اگر میں نے اس کی دولت سے متاثر ہو کر شادی کی ہوتی۔۔۔ اور دولت بھی وہ جو مستقبل میں کبھی اسے ملے گی۔۔۔ تو میں اس سے لڑنے کی نہیں، سمجھوتا کرنے کی کوشش کرتی۔۔۔۔“

”اس وضاحت کی ضرورت نہیں۔۔۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔۔۔ ”سوال پھر گھوم پھر کر وہیں آ جاتا ہے۔۔۔ کہ تم کیا چاہتی ہو؟“

”مجھے خود نہیں معلوم۔۔۔۔“ وہ بےبسی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی ”میں تو بس کسی ردِّعمل کا اظہار چاہتی تھی۔۔۔ میں اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ میں اتنی بےبس نہیں ہوں۔ غریب اور بےسہارا ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اتنی آسانی سے کسی لڑکی کو لوٹ لیا جائے اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔۔۔۔۔ اِٹ اِز ناٹ فیئر راشد صاحب! اِٹ اِز ناٹ فیئر۔۔۔۔“ ایک بار پھر اس کی آواز بھرّانے لگی۔۔۔ ”اس طرح تو اس کا حوصلہ بڑھتا رہے گا۔۔۔ مجھ سے پہلے نہ جانے کن کن طریقوں سے کون کون لڑکی بے وقوف بنی ہو گی۔۔۔۔ اور آئندہ بھی بنتی رہے گی۔۔۔ کسی کو تو آگے بڑھ کر اس کے شوقِ تعیّش پر بند باندھنا چاہیے۔۔۔۔“

”وقت خود ان بیماریوں کا علاج کر دیتا ہے۔۔۔ یا پھر کوئی سزا دیتا ہے۔۔۔ میں نے بارہا اسے سمجھایا ہے۔۔۔ کچھ

جوانی کا جوش ہے ۔ ۔ ۔ کچھ بڑے باپ کا بیٹا ہونے کا زعم ۔ ۔ ابھی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ ۔ ۔ سختی اختیار کرنے کا مجھے کوئی خاص حق حاصل نہیں ہے ۔ ۔ ۔ اور دنیا کے سامنے میں کوئی تماشا بھی کھڑا کرنا نہیں چاہتا ۔ ۔ ۔ ویسے بھی میرے خیال میں بدفطرتی کا کوئی علاج نہیں، بدفطرتی کا علاج فطرت ایک نہ ایک دن خود ہی کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تو اب اپنی نظر میں کسی قابل بھی نہیں رہی ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ ایک بار پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا ۔ ۔ ۔ سگار کا ایک کش لے کر وہ کرسی کے قریب آن رکا ۔ ۔ ۔ پھر میز کی طرف سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تم مجھ سے شادی کر لو ۔ ۔ ۔"

ایک لمحے کے لیے وہ اپنی جگہ سُن سی بیٹھی رہی۔ ایک ٹک اسی کی طرف دیکھتی رہی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے پھر دھیرے دھیرے اس کے کانوں کی لویں تپ اٹھیں۔

"تاکہ ایک سال بعد آپ بھی اس شادی سے منکر ہو جائیں" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"کیا بکواس ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ برف کی چوٹیوں کی طرح سرد نظر آنے والی اس کی آنکھوں میں انگارے دہک اٹھے۔ "کیا تمہیں مجھ میں اور جاوید میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ جس شادی کی میں بات کر رہا ہوں وہ چوری چھپے دو چار آدمیوں کی موجودگی میں کسی قریبی شہر کے نامعلوم مکان میں نہیں ہوگی ۔ ۔ ۔ میرے والد اور تمہاری والدہ کی رضامندی سے، اسی کالونی میں علی الاعلان، ہزاروں براتیوں کی موجودگی میں ہوگی۔"

"میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس پیشکش پر کم از کم دل ہی دل میں بہت خوش ہوتی ۔ ۔ ۔ لیکن میرا دل کچھ اور اداس ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی راشد صاحب!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"لیکن کیوں؟" وہ کچھ زیادہ حیران نظر نہیں آ رہا تھا جیسے اسے اپنے سوال کا جواب معلوم ہو۔

"لڑکی کوئی موم کی گڑیا تو نہیں ہوتی راشد صاحب! کہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی ۔ ۔ ۔ ۔" وہ افسردگی سے بولی ۔ ۔ ۔ "میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ملائمت سے بولا ۔ ۔ ۔ "تمہارا کیا خیال ہے شمائلہ! کیا ہمارے معاشرے میں سب شادیاں محبت ہی کی شادیاں ہوتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ نوے فیصد سے بھی زائد شادیاں ضرورت کی شادیاں ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک ہماری بھی ہوگی۔ ہر جگہ ضرورت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ۔ ۔ ۔"

"لیکن آپ کیوں کریں گے مجھ سے شادی؟ آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے؟" شمائلہ نے دھندلائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے جن خصوصیات کی بنا پر تم اچھی لگی ہو ان میں سے ایک خصوصیت تمہاری صاف گوئی بھی ہے ۔ ۔ ۔" راشد بولا۔ "تم اتنی صاف گو ہو کہ مجھے تمہاری شخصیت شیشے کی طرح شفاف نظر آتی ہے ۔ ۔ ۔ مجھے یقین ہے کہ تم جتنی صاف گو ہو اتنی ہی صاف گوئی دوسروں کی طرف سے بھی برداشت کرو گی ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی تمہاری ہر بات کا جواب نہایت صاف گوئی اور سچے طریقے سے دینا پسند کروں گا ۔ ۔ ۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں اچانک تمہاری محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں ۔ ۔ ۔ اور نہ مجھے واقعی شادی کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ میری عمر چالیس کے قریب ہو چکی ہے اگر میں ضرورت محسوس کرتا تو اب تک شادی کر چکا ہوتا لیکن یہاں یہ بات میری ضرورت کی نہیں تمہاری ضرورت کی ہے۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے سگار کے ٹکڑے کو انگلیوں میں گھمایا اور ایش ٹرے میں مسل دیا پھر وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی تلافی کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ تم ویسے ہی باعزت اور آسودہ حال گھرانے کی بہو بنو، تمہیں ویسا ہی محبت کرنے والا شوہر ملے جیسا کہ تم نے خواب دیکھا تھا ۔ ۔ ۔"

"لیکن آپ میرے لیے محبت کرنے والے شوہر کیسے ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ آپ کو مجھ سے محبت ہی نہیں ہے؟" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"میں اپنی سی کوشش کروں گا ۔ ۔ ۔" وہ رسان سے بولا۔ "ویسے بھی جب انسان لُٹ جاتا ہے تو اپنے نقصان کی تلافی کے لیے اسے تھوڑی کمی بیشی پر تو سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

شمائلہ خاموش رہی تو وہ بولا ۔ ۔ ۔ "دراصل میں اپنی ذمے داری محسوس کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے ساتھ جس نے دھوکا کیا وہ اس گھرانے کا فرد، میرا بھائی، میرا اپنا خون ہے ۔ ۔ ۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس کا کفارہ مجھے ادا کرنا چاہیے۔"

"آپ کی زندگی کیا اس شرمساری میں نہیں گزرے گی کہ چھوٹے بھائی نے جس احمق سی لڑکی کو دھوکا دے کر کچھ عرصہ

کھلونا بنا کر چھوڑ دیا، بڑے بھائی نے اسے گھر کی عزت بنایا۔ اس احساس سے آپ کی نظریں تو نہیں جھکیں گی؟ اور پھر یہ شرمساری اور پچھتاوا کہیں مجھ سے نفرت کی صورت تو اختیار نہیں کرلے گا؟"

"میں اور جاوید بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی ضد میں شمائلہ! میں قول نبھانے والا آدمی ہوں ... اگر میں نے زندگی میں شرمساری یا کوئی اور مسئلہ محسوس بھی کیا تو میں اس کا حل تلاش کروں گا ... نفرت یا کھسیاہٹ کی آغوش میں پناہ تلاش نہیں کروں گا ... یہ اصل میں بزدلی کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں ... اور میں بزدل نہیں ہوں ... ویسے بھی ہمارے ہاں شرمساری اور فخر، اچھائی اور برائی کے پیمانے بدل گئے ہیں ... شرمسار اسے ہونا چاہیے جس نے گناہ کیا ہو، غلط کام کیا ہو ... لیکن ہمارے معاشرے میں اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے ... یعنی الٹا وہ شرمندہ ہوتا ہے جس نے نیکی کی ہو۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ روایت کے اس دھارے میں نہ بہہ جاؤں ... میرا ضمیر مطمئن ہوگا ... میں جو کچھ کہہ رہا ہوں جذباتی ہوکر نہیں، بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں ... میں نے اپنی دانست میں ایک اچھا کام، نیک عمل کیا ہوگا تو میں تو سر اٹھا کر چلوں گا شرمندہ اسے ہونا چاہیے جس نے اتنا بڑا فریب کیا ہے ... اور اگر اسے شرمندہ ہونے کی توفیق نہیں ہوگی تو کوئی بات نہیں ... میں بہرحال اسے اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا کہ وہ ہمیں شرمندہ کرے۔"

وہ اب بھی خاموش تھی۔ راشد منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس کا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔

"کچھ تو جواب دو شمائلہ!" بالآخر وہ بولا۔

شمائلہ مضطربانہ انداز میں میز پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ کبھی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی تھی کبھی نظر جھکا لیتی ... پھنسی پھنسی سی آواز میں وہ بولی "راشد صاحب! آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو آج کے دور میں نایاب ہو چکے ہیں۔ آپ نے میرے لیے اتنا سوچا ... اس حد تک آگے جاکر فیصلہ کیا ... میں آپ کی شکر گزار ہوں ... یہ ایک ایسا احسان ہے جس کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں۔ لیکن راشد صاحب مجھے شوہر خیرات میں نہیں چاہیے ..."

"تم تو بہت مشکل لڑکی ہو ..." وہ گویا زچ ہوکر بولا۔

"میں حیران ہوں جاوید تم جیسی لڑکی کو بیوقوف بنانے میں کیونکر کامیاب ہوگیا؟"

وہ گویا تڑپ کر بولی "وہ دھوکا مجھے جاوید نے نہیں درحقیقت میری محبت نے دیا ہے ... اگر مجھے جاوید سے محبت نہ ہوتی تو وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا تھا!"

"کیا تمہیں اس کا اصل روپ دیکھنے کے بعد بھی اس سے محبت ہے؟ اور کیا درحقیقت وہی محبت مجھ سے شادی کے لیے ہامی بھرنے سے روک رہی ہے؟" اچانک اس نے پوچھا۔

"سائنس کا اصول ہے کہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا راشد صاحب کسی نہ کسی شکل میں مادہ ہمیشہ موجود رہتا ہے ..." شمائلہ عجیب سے لہجے میں بولی "محبت مادے سے بالکل مختلف اور بالکل الٹ چیز ہے ... محض ایک جذبہ ہے ... لیکن میرا خیال ہے محبت بھی کبھی فنا نہیں ہوتی راشد صاحب! آپ خود ہی اعتراف کر چکے ہیں کہ میں ایک صاف گو اور سچی لڑکی ہوں ... میں ریاکاری سے کام نہیں لوں گی ... جاوید سے مجھے جو محبت تھی تو وہ کبھی فنا نہیں ہوسکتی، وہ اپنی جگہ برقرار رہے گی لیکن چونکہ وہ ایک گھٹیا انسان ہے، اس محبت کا مستحق نہیں اس لیے میں نے اس محبت کو دل کے کھنڈر میں بہت گہرا دفن کردیا ہے مطمئن رہیے ... وہ محبت اب کبھی آسیب کی طرح مجھ پر غلبہ نہیں پائے گی ..."

راشد نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے سر ٹکا لیا، اس کے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے تھے اور وہ کھوئی کھوئی نظروں سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ شمائلہ نے اپنے آپ کو کچھ اور نروس، کچھ اور مضطرب محسوس کیا۔

جب وہ بولا تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی ... "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں شادی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتا؟ ٹھیک ہے، میں نوعمر یا نوجوان نہیں ہوں ... لیکن کچھ ایسا بوڑھا بھی نہیں ہوگیا ہوں۔"

"میں کسی کی نجی زندگی میں جھانکنا پسند نہیں کرتی راشد صاحب! آپ خود ہی جہاں تک مناسب سمجھتے ہیں بتاتے جارہے ہیں ... میں تو درحقیقت آپ سے کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتی ... یہ تو آپ کی نوازش ہے جو آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اتنا کھل کر باتیں کیں ..."

"ہاں ... اور اب میں ایک بات اور بھی بتا دینا چاہتا ہوں تاکہ میری زندگی کا کوئی گوشہ تمہاری نظر سے اوجھل نہ رہ جائے شاید اس کے بعد تمہیں فیصلہ کرنے میں کچھ آسانی

ہوجائے ..."

وہ اب ایک ٹک چھت کو گھور رہا تھا جیسے وہ کوئی اسکرین ہو اور اس پر یادوں کی فلم چل رہی ہو۔ چند لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا ... "محبت کے بارے میں میں تمہارے اس فلسفے سے متفق ہوں ... محبت کبھی فنا نہیں ہوتی ... میں بظاہر بہت پریکٹیکل انسان بن گیا ہوں لیکن اندر سے میں آج بھی آئن اسٹائن کی طرح جذبات پرست ہوں۔"

اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آنے لگی ... "کبھی مجھے بھی محبت تھی ایک لڑکی سے آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مگر آج وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح صاف گو، سیدھی، سچی اور شفاف تھی ... کوئی پیچ و خم نہیں تھا اس میں کوئی دھند نہیں تھی اس کی ذات میں ... برسوں گزر گئے ہیں اسے مرے ہوئے ... لیکن دل کا ویرانہ آج تک دوبارہ آباد نہیں ہوسکا ..."

یادوں کی گہری پرچھائیوں نے اس کے وجیہہ چہرے کو جیسے گہنا سا دیا۔ یکدم ہی وہ بہت زیادہ تھکا تھکا دکھائی دینے لگا تھا ... شمائلہ کے وجود میں ایک عجیب سا سناٹا پھیل گیا۔ آفاق کی اس کارگاہِ شیشہ گری میں ہر طرف کوئی نہ کوئی کہانی، ہر قہقہے کے پیچھے سسکی، ہر مسکراہٹ کے پیچھے آنسو کی چمک چھپی ہوئی تھی۔

"کیسے مری تھی وہ؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"مجھے فلائنگ کا شوق تھا ... لائسنس یافتہ پائلٹ تھا میں ... فلائنگ کلب کا ممبر تھا ... اس روز میں کلب کا ڈکوٹا طیارہ اڑا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ تھی، ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور انداز میں ہنس رہی تھی کہ طیارہ کریش ہوگیا۔ صرف میری غلطی کی وجہ سے ... شاید تمہیں یاد بھی ہو ... اخباروں میں خبر چھپی تھی نیو کیمپس کے قریب گرا تھا طیارہ ... صرف اس لیے کہ میں چند منٹ کے لیے سنجیدگی چھوڑ کر حد سے زیادہ شوخی دکھانے پر اتر آیا تھا ... ڈرا رہا تھا میں ثمینہ کو ... اور نیو کیمپس کے گرلز ہاسٹل میں لان پر کھڑی ہوئی لڑکیوں کو ... طیارہ کریش ہوگیا ... میں بدنصیب صرف زخمی ہوا اور آج بھی تمہارے سامنے بیٹھا ہوں ... لیکن وہ نہیں بچ سکی ..."

راشد کا سر خود بخود جھکتا چلا گیا۔ اس نے دوبارہ سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں ... وہ رو نہیں رہا تھا مگر آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ آنسو اندر ہی اندر روح کو انگارے بن کر جلا رہے تھے ... نہ بہہ سکنے والے آنسوؤں کی اذیت زیادہ ہوتی ہے ... یہ بات شمائلہ کو بہت اچھی طرح معلوم تھی۔

"اس کے بعد میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکا۔ محبت کو کھو دینے کا دکھ تو اپنی جگہ تھا ... لیکن غلطی کا پچھتاوا اس سے بھی سوا تھا۔ اپنے آپ کو اور ثمینہ کی روح کو تسکین دینے کے لیے بھلائی کے چھوٹے بڑے کام کرتا رہتا ہوں۔ ایک اچھا انسان بننے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہوں مگر وہ جو روح کی بے کلی سی ہے، وہ نہیں جاتی۔ سوچتا ہوں نہ جانے ثمینہ کی روح نے مجھے معاف کیا ہوگا یا نہیں؟"

"ثمینہ کو بھی آپ سے محبت تھی نا؟"

"ظاہر ہے ..."

"بس تو پھر آپ دکھی رہنا چھوڑ دیجیے راشد صاحب! محبت کرنے والوں کے ہاں تو معافی ہی معافی ہے ... ثمینہ کی روح بھلا آپ سے کیسے خفا رہ سکتی ہے؟" شمائلہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے جیسے گہن چھٹنے لگا۔ بہت دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا اجالا طلوع ہوا ... خود کلامی کے سے انداز میں اس نے دہرایا ... "محبت کرنے والوں کے ہاں تو معافی ہی معافی ہے ... واہ ... کیا اچھی بات کہی ہے تم نے ... دل پر سے گویا منوں وزنی کوئی نادیدہ سِل ان چند لفظوں نے کھسکا دی ہے ... بہت شکریہ ..."

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ... "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ حادثے بعض لوگوں کو جسمانی طور پر معذور کردیتے ہیں، مجھے ایک حادثے نے جذباتی طور پر معذور کردیا ہے۔ وہ یہی حادثہ تھا ... ثمینہ کے ساتھ ہی گویا میرے جذبات مرگئے ... میری حسیات مرگئیں ... میں بس ایک روبوٹ بن گیا ... شادی کے لیے ڈیڈی نے برسوں تک بہت ضد کی ... لیکن بس ... دل نہیں مانا ... اور آج تمہیں اپنانے پر آمادہ بھی ہوا تو تمہارا دل نہیں مانا ... تم نے ٹھکرا دیا۔"

پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا ... قدرے چونکتے ہوئے بولا ... "ایک اور بات بھی بتاتا چلوں ... یہ جو جیبہ ہے نا ... جس کا تم نے ذکر کیا ... جو آجکل جاوید کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے ... یہ پہلے درحقیقت اس خاکسار پر ہی دل و جاں سے مہربان تھی، شادی پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے

والدین بھی مجھ میں ہی انٹرسٹڈ تھے لیکن میں نے کہا نا کہ اپنا تو دل ہی برف زار بن گیا تھا... اور پھر حبیبہ جیسے جعلی اور مصنوعی مصنوعی سے لوگ مجھے اس حادثے سے پہلے بھی کبھی اچھے نہیں لگے...... اب کیسے اچھے لگ سکتے تھے؟ ان کے سینوں میں دل کی جگہ کیلکولیٹر فٹ ہوتے ہیں نفع نقصان کی بیلنس شیٹ فوراً نکال کر پیش کر دیتے ہیں۔ میری طرف سے مایوسی ہوئی تو حبیبہ کے کیلکولیٹر نے اسے مشورہ دیا ہوگا کہ چھوٹے بھائی پر ٹرائی کر کے دیکھو...... وہاں کامیابی ہوگئی۔ اب وہ خوش ہے۔ اس کے والدین بھی خوش ہیں... جاوید بھی خوش ہے..... ان لوگوں کے لیے خوشیاں حاصل کرنا کتنا آسان ہوتا ہے... آپ کی طرح نہیں ہیں یہ لوگ... مجھے شوہر خیرات میں نہیں چاہیے راشد صاحب!" اس نے شمائلہ کی نقل اتاری۔

لیکن وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "اس صورت میں تو میرے ساتھ شادی کرنا آپ کے لیے اور بھی برا ہوگا... حبیبہ نے اگر کچھ توہین محسوس کی ہوگی تو وہ اس کا حساب برابر کرنے کی ضرور کوشش کرے گی... میں غلطی کر بیٹھی ہوں کہ جذباتی ہو کر اس کی موجودگی میں اپنی کمزوری ظاہر کر چکی ہوں... بتا چکی ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے جس پر معلوم نہیں اس نے یقین کیا ہے یا نہیں... معلوم نہیں جاوید نے اسے کیا بتا کر مطمئن کیا ہوگا... لیکن بہرحال... اگر ہماری شادی ہو جاتی ہے تو کل کو وہ بھی میرے بارے میں کہہ سکتی ہے کہ اس لڑکی نے پہلے چھوٹے بھائی کو اسکینڈل میں الجھانے کی کوشش کی..... اور جب اس پر داؤ نہیں چلا تو بڑے بھائی کو پھانس لیا....."

"جب مجھے ان باتوں کی پروا نہیں ہوگی تو تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے..." وہ بے پروائی سے بولا۔ "اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے اپنی نجی زندگی میں دخل دینے والوں سے نمٹنا خوب آتا ہے۔ خواہ وہ میرا سگا بھائی اور ہونے والی بھابی ہی کیوں نہ ہو...... کیا اب بھی تمہارا جواب انکار میں ہی ہے؟"

"ہاں..." اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور گھڑی دیکھ کر جھرجھری سی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی... "اوہ... مجھے تو بہت دیر ہوگئی... امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"لیکن اتنی پریشان نہیں ہوں گی جتنا اس وقت میں ہوں..." راشد بھی طویل سانس لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا انکار اپنی جگہ سہی... لیکن میں اس سلسلے میں اپنی طرف سے پوری کارروائی کروں گا..... پہلے میں جاوید سے نمٹوں گا... پوری تحقیق کروں گا... اگر وہ شادی ٹھیک تھی، باقاعدہ نکاح ہوا تھا تو میں جاوید کو مجبور کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ باقاعدہ رخصتی کروا کے تمہیں لائے اور گھر بسائے... اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو اس سے باضابطہ تمہیں طلاق دلاؤں گا.... اور اگر ثابت ہو گیا کہ وہ شادی نہیں محض ڈراما ہی تھا۔ تو ظاہر ہے طلاق کی کارروائی کے جھنجٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پھر میں اپنے ڈیڈی کو تمہارے ہاں بھیجوں گا.... باقاعدہ طور پر تمہاری امی سے تمہارا رشتہ مانگنے کے لیے.... اس دوران تمہیں بھی سوچنے کے لیے کافی دن مل جائیں گے.... خوب سوچنا.... اور دل چاہے تو ڈیڈی کے سامنے بھی انکار کر دینا... میں یہ ذلت بھی برداشت کر لوں گا.... کم از کم میرا ضمیر تو مطمئن ہو جائے گا کہ میرے بس میں جو کچھ تھا وہ میں نے کر لیا... ویسے میں اس شادی میں تمہارے مسئلے کا حل ہی نہیں، اپنی روح کی تسکین بھی ڈھونڈ رہا ہوں..."

وہ اسے چھوڑنے باہر تک آیا... ڈرائیو وے میں چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ ایک مرسیڈیز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا... "آؤ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں... میں چلی جاؤں گی..." وہ جھرجھری سی لے کر جلدی سے بولی...۔ "دو فرلانگ سے بھی کم تو فاصلہ ہے"

"جیسے تمہاری مرضی..." اس نے اصرار نہیں کیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولا... "ڈیڈی کبھی کبھار ہی اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوتے ہیں زیادہ تر وہیل چیئر پر ہی رہتے ہیں... لیکن میں انھیں بہرحال تمہارے گھر ضرور بھیجوں گا.... انتظار کرنا...."

"پلیز....." وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ ایسا ہرگز نہ کرے... مگر راشد اس کی بات سنے بغیر اندر جانے کے لیے مڑ چکا تھا... وہ گیٹ سے نکل کر چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر تیز تیز قدموں سے کالونی کی طرف چل دی۔

✤

سیٹھ سعید کی گاڑی جس روز کالونی کی گلی میں شمائلہ کے گھر کے سامنے آکر رکی، اس روز پوری گلی میں ہلچل سی مچ گئی۔ پرانے ورکرز کو بھی جہاں تک یاد پڑتا تھا، اس کالونی کے افتتاح کے بعد سے آج تک سیٹھ سعید

دوبارہ کالونی میں نہیں آئے تھے۔ افتتاح کے موقع پر وہ کارکنوں کو چابیاں دینے کی تقریب میں آئے تھے اس لیے آج ان کا کالونی میں نظر آنا واقعی ایک بہت بڑی خبر تھی۔

شمائلہ نے ان دنوں مل میں ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے رکھی تھی اس کی بہت چھٹیاں ڈیو چلی آرہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ چھٹیاں کرنے کا یہی بہترین موقع تھا۔ وہ کچھ عرصہ منہ چھپا کر گزارنا چاہتی تھی۔ اس میں کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت..... یا شاید خواہش نہیں رہی تھی۔ جاوید، حبیبہ یا راشد...... وہ کسی کی بھی صورت دیکھنا نہیں چاہتی تھی..... اور نہ ہی انھیں اپنی صورت دکھانا چاہتی تھی۔ اگر ذریعۂ معاش کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ نوکری ہی چھوڑ کر کہیں بہت دور چلی گئی ہوتی... اور اپنے سے زیادہ تو اسے ماں کی فکر تھی۔

اُس وقت وہ اپنے کمرے میں لیٹی ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر الفاظ تھے کہ بے معنی لکیروں کی طرح نظر کے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے... ان دنوں اس کا یہی عالم تھا..... دل دماغ کسی چیز میں نہیں لگتا تھا... چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی وہ نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی۔ گلی میں ہلچل محسوس کر کے اس نے سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ لمبی سی چم چم کرتی نیلی مرسیڈیز اس کے دروازے پر کھڑی تھی اور باوردی ڈرائیور سہارا دے کر سیٹھ سعید کو نیچے اتار رہا تھا۔

گاڑی سے اُتر کر سیٹھ سعید نے ڈرائیور کو ایک طرف ہٹایا اور بغیر سہارے کے ذرا تن کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر یوں گہری گہری سانس لینے لگے جیسے کوئی قیدی بڑے عرصے بعد آزاد فضاؤں میں نکلا ہو... وہ چاہے کتنے ہی بوڑھے اور بیمار رہے ہوں مگر ان کی شخصیت میں اب بھی ایک رعب اور وقار تھا... جسمانی طور پر بھی وہ کچھ ایسے نحیف و نزار نظر نہیں آرہے تھے اچھے خاصے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ کمر میں خم بھی نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت تو جوانوں ہی کی طرح تن کر کھڑے تھے۔ بچے اور بڑے اپنے اپنے کوارٹروں کے دروازوں پر کھڑے انھیں دیکھ رہے تھے۔

شمائلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ خوشی کے بجائے اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا..... آخر راشد نے اپنے والد کو بھیج ہی دیا تھا... اس کا مطلب تھا کہ اس نے باقی معاملات طے کر لیے تھے... اپنی تسلی کر لی تھی..... اس نے شمائلہ کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ اطلاع دینے کے قابل کوئی بات نہیں تھی۔

شمائلہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور اپنے کمرے کے دروازے کی اوٹ سے اندر کا منظر دیکھنے لگی..... اس کی امی، نورالنسا بیگم سیٹھ سعید کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو دم بخود رہ گئی تھیں۔ انھیں تو پیشگی کسی کے ذریعے اشارہ تک نہیں ملا تھا کہ سیٹھ صاحب ان کے گھر آنے والے ہیں۔ اُدھر شمائلہ بغیر کسی خاص وجہ کے بیس دن سے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات آئے ہوئے تھے۔

وہ بُری طرح بوکھلا گئی تھیں کبھی دوپٹہ سنبھالتی تھیں، کبھی پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی تھیں کہ سیٹھ صاحب کو کہاں بٹھائیں کوارٹر میں کوئی بھی جگہ تو ان کے شایانِ شان نہیں تھی۔

"سیٹھ صاحب! آپ اس غریب خانے پر....؟" بالآخر نورالنسا ہکلائیں۔ "آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟ مجھے بلوا لیا ہوتا..... خیریت تو ہے؟"

اس وقت بابر بھی گھر پر نہیں تھا۔ مل میں اس کی مزدور لیڈری ان دنوں زوروں پر تھی اور اس نے نہ جانے کن کن مطالبات کی حمایت میں مزدوروں کی اکثریت کو ہڑتال پر آمادہ کر لیا تھا اور مل کی انتظامیہ کو ہڑتال کا نوٹس دے رکھا تھا جب وہ گھر پر ہوتا تھا تو ہر وقت مزدوروں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اور بند کمرے میں نہ جانے کیا کیا صلاح و مشورے ہوتے رہتے تھے۔ نورالنسا بیگم کو ان معاملات کی کوئی سمجھ نہیں تھی... وہ بابر کے ان معمولات سے تنگ تھیں مگر مروت میں کچھ نہیں کہتی تھیں..... وہ ایک وضعدار عورت تھیں۔

ان کے سیدھے سادے ذہن میں غالباً یہی خیال آیا کہ بابر ہی کی پھیلائی ہوئی کسی گڑبڑ کی وجہ سے وہ یہاں آنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ قدرے خوفزدہ سے لہجے میں وہ بولیں۔ "بابر تو اس وقت گھر پر نہیں ہے..... لیکن وہ کالونی میں ہی کہیں ہوگا..... شاید ہوٹل میں بیٹھا ہو..... میں ابھی کسی بچے کو بلا کر اسے تلاش کرواتی ہوں....."

"بابر..... وہ کون ہے؟" سیٹھ سعید نے گونجیلی آواز میں پوچھا۔

"وہ..... جی..... میرا رشتے کا بھانجا ہے... آجکل مزدور لیڈر بنا ہوا ہے سنا ہے اس نے ہڑتال کا نوٹس دیا ہوا ہے... کیا آپ اس سے ملنے نہیں آئے؟" نورالنسا ہکلائیں۔

"بابر۔۔۔ مزدور لیڈر۔۔۔؟ ہاں۔۔۔ نام تو کچھ سنا ہوا سا لگ رہا ہے۔ شاید جنرل منیجر نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔۔۔ لیکن یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے انتظامیہ اس سے نمٹتی رہے گی۔۔۔ میں ان ہڑتالوں وڑتالوں سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ ان چکروں میں میں نے کبھی اپنی راتوں کی نیندیں حرام نہیں کیں۔۔۔ میں نے کبھی کسی کا حق نہیں مارا ہے اس لیے میرا ضمیر مطمئن ہے۔۔۔ میں دھڑلے سے اپنی مل چلاتا ہوں۔ بڑے بڑے بحران آئے اور گزر گئے۔۔۔" وہ بولتے چلے گئے۔۔۔ ان کے لہجے میں اب بھی گھن گرج تھی۔ نورالنسا دم بخود ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پھر وہ اس موضوع کو وہیں چھوڑ کر بولے۔ "تم مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہو گی؟ تمہیں آداب میزبانی کا قطعاً کوئی خیال نہیں؟"

نورالنسا جیسے کسی خواب سے چونکیں اور شرمندہ سی ہو کر بولیں۔۔۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا آپ کو کہاں بٹھاؤں سیٹھ صاحب!" انھوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی کو ہی دوپٹے سے صاف کرنے لگیں۔

شمائلہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کیے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ باہر آسکے۔

سیٹھ سعید کرسی پر بیٹھنے کے بعد ایک طویل سانس لے کر بولے۔۔۔ "میں تم سے ملنے آیا ہوں۔۔۔ تم نورالنسا ہونا، حاجی نثار کی بیوہ؟ تم کبھی ہمارے ہوزری مل میں کام کرتی تھیں، اسپننگ کے شعبے میں؟"

"جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ بالکل صحیح پہچانا آپ نے۔۔" نورالنسا جلدی سے بولیں۔

شمائلہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ واقعی سیٹھ صاحب کی یادداشت اچھی تھی یا یہ تمام معلومات انھوں نے آنے سے پہلے جمع کی تھیں۔

نورالنسا کو جیسے آداب میزبانی کا کچھ اور خیال آیا اور وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں "آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ آجکل میں ڈاکٹروں کے مشورے کے بغیر کچھ بھی نہیں پی سکتا۔۔۔ تم ان چکروں کو چھوڑو۔۔۔ وہ آداب میزبانی والی بات میں نے صرف بیٹھنے بٹھانے کی حد تک ہی کی تھی۔۔۔ بات یہ ہے نورالنسا بیگم۔۔۔ اگو کہ آجکل میرے پاس وقت ہی وقت ہے کیونکہ میرے بیٹوں نے مجھے ریٹائر کر کے گھر بٹھا دیا ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔۔۔ میں اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنا اور تمہارا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کروں گا۔۔۔ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے بیٹے راشد کے لیے تمہاری بیٹی کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔۔۔ شمائلہ نام کی تمہاری کوئی بیٹی ہے نا۔۔۔؟"

نورالنسا بیگم کے لیے شاید یہ زندگی کی سب سے بڑی حیرت تھی۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سیٹھ سعید ان کی خاموشی کی پروا کیے بغیر بولے "دیکھو بھئی۔۔۔ میں کبھی پوز نہیں کرتا۔۔۔ اپنا ظاہر و باطن ایک رکھنے کی کوشش کرتا ہوں چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔۔۔ شاید میں کوئی بہت اچھا انسان نہیں ہوں۔ لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میں کم از کم منافق نہیں ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں غریبوں میں بہت زیادہ گھل مل کر بیٹھنے والا آدمی ہوں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ میں طبقاتی فرق کا قائل ہوں۔۔۔ میں نے اپنے اور ورکنگ کلاس کے درمیان ہمیشہ فاصلہ رکھا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرا زیادہ لائق بیٹا ایک مزدور بیوہ کی بیٹی اور اپنے مل کی ایک ملازمہ سے شادی کا فیصلہ کرلے گا۔۔۔ اور نہ مجھے اس کا رشتہ لے کر اس کالونی کے ایک کوارٹر میں آنا پڑے گا۔۔۔ شاید خدا اسی طرح انسانوں کو اپنی قدرت کا قائل کرتا ہے۔۔۔ خیر خدا کو اگر یہی طرح منظور ہے تو اسی طرح سہی۔۔۔ میں اور تم بیچ میں بھلا کیا کرسکتے ہیں۔۔۔" انھوں نے گردن کو خفیف سا جھٹکا دیا۔

پھر وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے "میں اپنا اصل بیٹا تو راشد کو ہی شمار کرتا ہوں۔ میری زیادہ تر امیدیں اسی سے وابستہ ہیں اور وہ ہمیشہ میری امیدوں پر پورا اترا ہے میرا دوسرا بیٹا جاوید تو اللہ تعالیٰ نے یونہی خانہ پُری کے لیے عطا کیا ہے۔۔۔ بہت نالائق ہے وہ۔۔۔ کوئی کیرکٹر نہیں ہے اس کا۔۔۔ تھالی کا بینگن ہے۔۔۔ متلون مزاج اور ناقابلِ اعتبار۔۔۔ بے اصولا بھی ہے اسی لیے اندر سے بودا ہے لیکن راشد پر مجھے فخر رہا ہے۔۔۔"

پھر انھوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور قدرے دھیمے لہجے میں بولے "مگر ایک پہلو سے راشد نے مجھے بہت پریشان کیا۔۔۔ شادی نہیں کرتا تھا احمق کہیں کا۔ چالیس سال اس کی عمر ہونے کو آرہی ہے۔ میں نے اسے رعب دکھایا، لالچ دیا، منت کی۔۔۔ کسی طرح مان کر ہی نہیں دیا ایک سے ایک اونچے گھرانے کی لڑکی دکھائی۔ اثر رسوخ والے گھرانوں کی خوبصورت دولتمند لڑکیاں۔۔۔ مگر وہ تو شادی کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ چھبیس سال کی عمر میں کہیں اسے چھوٹا سا حادثہ پیش آگیا تھا۔ اپنی کسی دوست لڑکی کو ساتھ بٹھا کر چھوٹا جہاز اڑا رہا تھا کہ جہاز گر پڑا۔ لڑکی مر گئی۔۔۔ اس کے غم کو آج تک سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ کسی قیمت پر شادی کے لیے راضی نہیں ہوتا تھا۔۔۔" سیٹھ سعید واقعے کا تذکرہ یوں کر رہے تھے جیسے وہ کوئی اہم بات ہی نہیں۔

پھر وہ گہری سانس لے کر بولے۔۔۔ "اور اب راضی ہوا بھی تو کہاں۔۔۔ میں نے اسے اب بھی بہت سمجھایا۔۔۔ بہت سی لڑکیاں تجویز کیں۔ لیکن اس کی بس ایک ہی فرمائش تھی۔۔۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ کوئی بات نہیں۔۔۔ میں ہی اپنے نظریات کی قربانی دے دیتا ہوں۔۔۔ کم از کم وہ رضامند تو ہوا ہے۔ پتھر میں جونک تو لگی ہے ورنہ مجھے تو امید ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کبھی شادی کرے گا۔ چلو گھاٹے کا سودا ہی سہی لیکن اس کا گھر تو آباد ہو جائے گا۔۔۔ ویسے بھی اب ہمارا کاروبار اتنا پھیل چکا ہے کہ ہم سوچ لیں گے کہ اگر ایک بہو کے آنے سے ہماری صنعتوں، ہماری دولت، ہمارے اثر رسوخ میں کوئی اضافہ نہ ہوا تو کوئی بات نہیں۔۔۔ میرے بیٹے کی خوشی تو پوری ہو جائے گی۔۔۔"

نورالنسا بیگم کتنی ہی حیران اور بدحواس سہی۔ لیکن جتانے کا یہ انداز انھیں کھٹک گیا۔۔۔ پسند نہیں آیا سنبھل کر محتاط لہجے میں بولیں۔۔۔ "سیٹھ صاحب! میں آپ کے نظریات سے متفق ہوں۔۔۔ یعنی میں بھی طبقاتی فرق کی قائل ہوں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ انسان اپنی حدود میں ہی رہے اسی میں عافیت ہے آپ کے اور ہمارے درمیان آسمان اور زمین کا جتنا فاصلہ ہے۔۔۔ میری غریب بیٹی کو آپ کے گھر میں کہاں عزت مل سکے گی؟ اور جہاں عزت نہ ہو وہاں سکھ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا خیال ہے ہم دونوں بڑوں کو مل کر چھوٹوں کی اس بات کو نہیں ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کم از کم ہماری آپ کی بہتری اسی میں ہے۔۔۔"

سیٹھ سعید نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا مگر پھر جلدی سے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا دھیمے سے لہجے میں بولے۔ "میرا خیال ہے مجھے اتنے زور سے نہیں ہنسنا چاہیے۔ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔۔۔ نورالنسا بیگم! تم تو بہت ہی ڈرپوک عورت نکلیں۔۔ انسان اپنی زندگی میں خود پہاڑ سر نہ کر سکا ہو تو کم از کم اپنی اولاد میں تو پہاڑ سر کرنے کا حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ جس انداز سے راشد نے تمہاری بیٹی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ وہ زندگی بھر اسے خوش رکھے گا۔۔۔ وہاں دوسرا اور کون ہے جو اسے کوئی دُکھ دینے کی کوشش کرے گا؟ تمہاری بیٹی کو ساس سے پالا نہیں پڑے گا۔۔۔ وہ بے چاری تو ساس کہلانے کا زمانہ آنے سے برسوں پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔۔۔ میری کوئی بیٹی بھی نہیں ہے۔۔۔ میرا اپنا کوئی بھروسا نہیں ہے پتا نہیں تم سے بات ختم کر کے گھر بھی واپس جاؤں یا نہیں۔۔۔ جاوید شادی کرے گا تو بالکل الگ تھلگ رہے گا۔۔۔ دونوں بھائیوں کا ایک دوسرے کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔۔۔ اتنا بڑا گھر ہے کہ میرے دس بیٹے بھی ہوتے تو الگ تھلگ اپنی اپنی جگہ آرام سے رہ سکتے تھے۔۔۔ اور بولو۔۔۔؟ کیا اندیشہ ہے تمہیں؟"

"بس میرا دل ڈر رہا ہے۔۔۔" نورالنسا بولیں۔

"دل کو مارو گولی۔۔۔" سیٹھ سعید تیزی سے بولے۔ "یہ دل بڑا دغاباز ہوتا ہے۔ اس کے کہنے پر زیادہ مت چلا کرو۔ مجھے دیکھو۔۔۔ کس عمر میں آکر یہ کمبخت دل میرا ساتھ چھوڑنے پر تلا ہوا ہے۔۔۔ بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر ساتھ چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب سے میں نے اس کی بات زیادہ ماننی شروع کر دی ہے تب سے ہی مجھے یہ زیادہ نخرے دکھانے لگا ہے۔"

"مجھے شمائلہ سے بھی پوچھنا پڑے گا۔۔۔" نورالنسا مر بدستور متذبذب تھیں۔

"وہ بچی ہے اُسے منانا مشکل نہیں ہوگا۔۔۔ اصل مشکل تو میرے اور تمہارے جیسے بڈھے کھوسٹوں کی ہوتی ہے۔۔۔ وہ مان گئے تو سمجھو مشکل حل ہوگئی۔۔۔ تمہاری بیٹی میرے سفید بالوں اور ڈوبتے دل کا کچھ تو خیال کرے گی میں پہلے بھی انکار سننے کا عادی نہیں تھا اب اس عمر میں تو بالکل نہیں رہا ہوں۔"

شمائلہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا وہ اپنے آپ کو ایک عجیب دوراہے پر کھڑا محسوس کر رہی تھی۔ ایک راستے پر اندھیرے اس کے منتظر تھے اور دوسرے راستے پر کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کا دل اندھیر راستے پر کہیں کھو گیا تھا اور عقل اسے دوسرے راستے کی طرف دھکیل رہی تھی اور وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

اس کی سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی وہ دھم سے اپنے

Faisal Ahmed

بیڈ پہ آگری اور تکیے میں مُنہ چھپا کر رونے لگی۔ باہر اس نے سیٹھ سعید کی آواز سنی… ”جاؤ اپنی بیٹی سے پوچھ لو اور مجھے اکٹھی جواب دو… میں بار بار آنا افورڈ نہیں کر سکتا…“

شمائلہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ چند لمحے بعد اس نے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی۔ نورالنسا بیگم دبے پاؤں اس کے قریب آکھڑی ہوئیں… چند لمحے کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ شمائلہ نے تکیے میں ہی مُنہ چھپائے رکھا۔

بالآخر نورالنسا بیگم دھیمے لہجے میں بولیں… ”اگر ایسی کوئی بات تھی تو تم نے کم از کم مجھے تو بتا دیا ہوتا بیٹی!“

تب شمائلہ کو سر اُٹھانا پڑا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا… ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں امّی! ایسی کوئی بات نہیں تھی… راشد سے چند دن پہلے تک تو شاید میری کبھی بات بھی نہیں ہوئی تھی… بس انھوں نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا… میرا اس میں کیا قصور ہے؟“

نورالنسا بیگم نے گہری سانس لی گویا اس جواب سے انھیں اطمینان ہوا ہو پھر وہ ملائمت سے بولیں… ”سچی بات تو یہ ہے شمائلہ بیٹی… کہ میں تھوڑا سا ڈر ضرور رہی ہوں… لیکن میں اس رشتے پر بہت خوش ہوں… اور میری خواہش ہے کہ تم ہاں کر دو… ویسے تو بیٹی کی شادی کہیں بھی کرو، یہ ایک جوا ہی ہوتا ہے… کسی بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی… بعض اوقات لڑکا، اس کا گھرانا اور سب لوگ بہت اچھے نظر آتے ہیں۔ ہر چیز آئیڈیل دکھائی دیتی ہے مگر شادی ناکام ہو جاتی ہے… اور بعض والدین بہت مجبوری کی حالت میں ڈرتے ڈرتے کسی نامناسب سی جگہ پر شادی کرتے ہیں مگر لڑکی کی زندگی سکھ سے گزرتی ہے سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے… یہ مقدروں کے سودے ہوتے ہیں۔ جب جوا ہی کھیلنا ہے تو پھر اونچی جگہ کھیلنے میں کیا حرج ہے؟“

شمائلہ نے ماں کا چہرہ دیکھا… اس پر اُمیدوں کے سائے لرز رہے تھے۔ اس نے چشمِ تصوّر سے سیٹھ سعید کا چہرہ دیکھا… وہ بہت بڑے آدمی تھے… انھوں نے اس دروازے پر آکر ایک غریب ماں بیٹی کو اعزاز بخشا تھا… اس نے چشمِ تصوّر سے راشد کا چہرہ دیکھا… وہ نیک دل اور نیک خو معلوم ہوتا تھا… اس نے ایک لُٹی پٹی، تہی داماں لڑکی کو اتنے باعزّت طریقے سے اپنانے کا فیصلہ کر کے بے شک بڑی جرأت، بڑے حوصلے کا ثبوت دیا تھا… کیا وہ مسلسل انکار کر کے عقلمندی کا ثبوت دے رہی تھی؟

فیصلہ کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس کی کنپٹیاں گویا پھٹنے کو تھیں۔ نورالنسا بیگم آہستگی سے بولیں… ”کیا تمہاری خاموشی کو میں تمہاری رضامندی سمجھوں؟“

اس نے بہت دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے دل سے یکدم کچھ بوجھ ضرور کم ہو گیا… خلا میں معلق رہنے سے کم از کم کسی ایک طرف ہو جانا پھر بھی کچھ بہتر تھا۔

*

جاوید سے زندگی کا بدترین دھوکا کھانے کے بعد شمائلہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا صنم خانۂ دل پھر کبھی آباد ہو سکتا ہے کسی کی محبت میں گرفتار ہونا تو درکنار، اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ وہ ظاہری طور پر ایک نارمل زندگی ہی گزار سکے گی مگر مری اور سوات وغیرہ میں سنوفال کے موسم میں ہنی مون گزار کر واپس آنے پر وہ یہ محسوس کر کے حیران رہ گئی کہ وہ راشد سے محبت کرنے لگی تھی… اور اس محبت میں اس سے کہیں زیادہ شدت تھی جس کا احساس اسے جاوید سے تعلق داری کے زمانے میں رہا تھا… اسے یوں لگا جیسے وہ محبت کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہی اب ہوئی تھی… اس سے پہلے تو اس نے محض ایک گھناؤنے سراب کے سہارے روز و شب گزارے تھے۔

شادی سے پہلے اسے جو اندیشے لاحق تھے، وہ بھی حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے نہیں آئے تھے… جاوید سے اسے اندیشہ تھا کہ وہ اس کی زندگی کو تلخ بنانے کی کوشش کرے گا اور حبیبہ کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ وہ اسے باقاعدہ بلیک میل کرے گی اور کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔

مگر شمائلہ کو کچھ زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔ شاید یہ بھی راشد ہی کا کمال تھا۔ شاید اسی نے ان دونوں کی زبانیں بند رکھنے کا کوئی بندوبست کیا تھا۔ شاید جاوید نے شکر بھی کیا ہو کہ ایک خوامخواہ کے بوجھ سے اس کی جان تو چھوٹ گئی تھی۔

شادی کی تقریبات کئی دن جاری رہی تھیں بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ مِل اور کالونی کی تاریخ کی وہ سب سے بڑی تقریب تھی۔ اس دوران جاوید سے شمائلہ کا صرف ایک مرتبہ سامنا ہوا تھا… ولیمے والے دن وہ اسے مُنہ دکھائی دینے آیا تھا… ایک نئی گاڑی کی چابیاں اس نے شمائلہ کو پیش کی تھیں اور موقع پا کر طنزیہ انداز میں سرگوشی میں صرف اتنا کہا تھا… ”خوب بدلہ لیا تم نے مجھ سے… میرا چھوٹا میرے ہی خاندان کو کھلا دیا۔“

اس نے تڑپ کر کوئی جواب دینا چاہا تھا مگر وہ جلدی سے اس کے پاس سے کھسک گیا تھا… حبیبہ نے بھی طنز کا ایسا ہی تیر چلایا تھا… وہ تو اس رات ہی اسے دیکھنے آئی تھی جب شمائلہ رخصتی کے بعد سسرال پہنچی تھی… اس نے تحفے میں سونے کے کنگن پیش کیے تھے اور زہریلے لہجے میں سرگوشی میں کہا تھا۔ ”بھئی مان گئے تمہیں… بہت اچھی رہیں تم! ایک بھائی کی داشتہ رہیں… دوسرے سے بیاہ رچا لیا…“

شمائلہ کا دل لہولہان ہو گیا تھا وہ بھاری بھرکم عروسی لباس میں تھی۔ یکبارگی اس کا دل چاہا تھا کہ حبیبہ کا مُنہ نوچ لے مگر وہ صرف زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی نئی زندگی میں پہلے ہی دن سے زہر گھل جائے… اس نے صبر کا دامن تھام لیا تھا اور دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ وہ صرف اُس وقت بولے گی جب پانی سر سے گزر جائے گا۔

اس کے پاس جو بھی تحائف اور نقد مُنہ دکھائی وغیرہ جمع ہوئی تھی، اس نے کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھا تھا… اور جاوید کی دی ہوئی گاڑی کی چابیاں اور حبیبہ کے دیے ہوئے کنگن تو اس نے خاص طور پر راشد کے حوالے کر دیے تھے کہ وہ انھیں استعمال کرنا تو درکنار، ایک دن کے لیے بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی… اور اگر راشد چاہے تو انھیں واپس بھی دے سکتا ہے… بہرحال اس کے بعد اس نے پلٹ کر راشد سے پوچھا نہیں تھا کہ اس نے ان کا کیا کیا… اور نہ ہی راشد نے خود کوئی ذکر کیا۔

تیسرے روز وہ ہنی مون پر چلے گئے تھے… پورا ایک ماہ گھر سے باہر گزرا۔ وہ واپس آئے تو جاوید کسی پارٹی سے معاملات طے کرنے لندن چلا گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں حبیبہ سے بھی شمائلہ کا سامنا نہیں ہوا… اور یوں روز و شب پُرسکون ہی رہے… اتنے عرصے میں شمائلہ کے لیے گویا ایک نئی دنیا تعمیر ہو گئی تھی اور وہ اس سے مانوس بھی ہو گئی تھی۔ پہلے پہل تو اس پر خوف ہی چھا رہا تھا مگر اب وہ رفتہ رفتہ اس نئی زندگی سے لطف اندوز بھی ہونے لگی تھی۔

راشد نے سچ مچ اُسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ شمائلہ کو ہرگز اُمید نہیں تھی کہ راشد جو محض ایک اخلاقی فریضے کے سے انداز میں اُس سے شادی کر رہا ہے، اُسے اتنی محبت دے سکے گا اور اتنی…

گرمجوشی کا مظاہرہ کر سکے گا — اور جوں جوں دن گزرتے گئے تھے، راشد کی شخصیت گویا پرت در پرت کھلتی چلی گئی تھی اور وہ شمائلہ کو زیادہ سے زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ خوشبو کی طرح اس کی روح میں آن بسا تھا — یہ کچھ عجیب سا عشق تھا جو شادی کے بعد شروع ہوا تھا۔

ایک شام وہ اپنے گھر بھی گئی۔ اُس کی ماں اُسے گلے لگا کر خوب روئی۔ شمائلہ کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور وہ حیرت سے سوچتی رہی ”ہم عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں، خوشی کے موقع پر بھی روتی ہیں اور غم کے موقع پر بھی آنسو بہاتی ہیں۔“

اُس وقت بابر بھی کھانے کی میز پر موجود تھا اور اُس کی امّی کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ شمائلہ ماں سے مل کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولی —”تم کیسے ہو بابر؟“

بابر نے قہرآلود نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور کپ میز پر پٹخ کر کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چلا گیا۔ شمائلہ حیران رہ گئی۔

”اسے کیا ہوا امّی؟“ اُس نے پوچھا۔

”معلوم نہیں بیٹی! جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے اس کا رویّہ ناقابلِ برداشت سا ہو گیا ہے۔ ہر وقت جلی کٹی سی باتیں کرتا رہتا ہے۔ جیسے ہم نے اُس کے ساتھ کوئی بڑا دھوکا کر ڈالا ہو۔“ نورالنسا دُکھی سے لہجے میں بولیں۔ ”یہ یہاں رہنے سہنے اور کھانے پینے کا جو تھوڑا بہت خرچا دیتا ہے اُس سے گھر کو کچھ سہارا مل جاتا ہے۔ اگر مجھے اس کا لالچ نہ ہوتا تو میں اسے اب تو جواب دے ہی چکی ہوتی کہ اپنے رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لے۔“

”لیکن میری شادی سے اُس کے ناراض ہونے کی کیا تُک ہے امّی؟“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”میرے اُس سے کوئی عہد و پیمان تو نہیں تھے — میں نے تو اسے کبھی اشارہ تک نہیں دیا کہ میں اُس کی ذات میں کوئی دلچسپی رکھتی ہوں۔“

”میں خود حیران ہوں۔ میں نے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ بات میرے دل میں ضرور تھی کہ اگر تمہاری شادی اس سے ہو گئی تو اچھا ہی ہوگا۔ گھر کی بات گھر ہی میں نمٹ جائے گی۔ ہم غریب لوگ ہیں، وہ بھی کچھ ایسا آسودہ حال نہیں۔ ہماری نبھ جائے گی۔ لیکن تمہارا اس کے ساتھ سنجوگ نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے مُنہ سے بات نہیں نکالی تھی ورنہ یہ تو شاید جان کو آجاتا۔ خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔“

”آپ خرچ وغیرہ کی فکر نہ کریں امّی!“ وہ ہچکچاتے ہوئے

بولی۔ "اگر بابر آپ کے ذہن پر بوجھ بنتا ہے تو اُسے جانے کے لیے کہہ دیں۔ آپ کو کوئی تنگی نہیں ہوگی۔ میں سب انتظام کر دوں گی۔ راشد بھی یہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ ہی آرام و آسائش سے رہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ سیٹھ سعید کی سمدھن مزدوروں کی کالونی کے ایک کوارٹر میں رہے۔"

"نہیں بیٹی! یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہوگا۔" نورالنسا تڑپ کر بولیں۔ "میرا تمہیں اپنے حالات بتانے کا خدانخواستہ یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اللہ نے جہاں اتنی اتنی مشکل گھڑیاں گزار دی ہیں وہاں زندگی کے بچے کھچے دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ تمہاری ذمے داری سے سُرخرو ہو جانے کے بعد تو اب میں ویسے بھی اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہوں۔ ضرورت پڑی تو میں دوبارہ جا کر مل میں مزدوری کر لوں گی۔ شادی کے بعد مائیں، بیٹیوں کے در پہ پڑی کوئی اچھی نہیں لگتی ہیں؟"

"مائیں دامادوں کی ملوں میں مزدوری کرتی بھی تو اچھی نہیں لگ سکتیں امی!" وہ اُن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ یہ پُرانے زمانے کی باتیں جانے دیجیے۔"

"اچھا خیر... فی الحال یہ باتیں جانے دے۔ ابھی تو تیری شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ جو خدا کو منظور ہوگا، وہ ہو جائے گا۔ یہ بتا... تو وہاں خوش تو ہے نا؟ سچی سچی بات بتانا۔ بیٹیوں کی روایات کے مطابق بھرم رکھنے کی کوشش نہ کرنا۔" ماں نے والہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ قدرے سادہ سے ہی حلیے میں تھی مگر دولت کی خوشبو اتنے تھوڑے سے ہی دنوں میں اُس کے وجود میں رچ بس گئی تھی۔ باہر بڑی سی گاڑی اُس کے انتظار میں کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور موجود تھا۔

"میں بہت خوش ہوں امی! بلکہ مجھے شاید معلوم ہی اب ہوا ہے کہ خوشی کسے کہتے ہیں..." وہ سر جھکا کر بولی۔ اُس کے چہرے کی دمک نے ماں کو بتا دیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

اس دوران بابر نے اپنے کمرے میں ٹیپ ریکارڈر پر کیسٹ لگا دی اور خاصی بلند آواز میں گانا گونجنے لگا ؎

دل تجھے دیا تھا رکھنے کو، تُو نے دل کو جلا کے رکھ دیا۔

نورالنسا ایک لمحے خاموشی سے شمائلہ کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "تمہیں سُنا رہا ہے۔"

"وہ تو میں سمجھ رہی ہوں۔" شمائلہ ناگواری سے سر ہلا کر بولی۔ "میں تو اُسے معقول آدمی سمجھتی تھی مگر یہ تو عجیب چیز نکلا۔ راشد کی رائے بھی اُس کے بارے میں اچھی نہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ مل میں بھی اُس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خوش قسمتی سے یا اپنی چرب زبانی کی وجہ سے یونین کا صدر کیا منتخب ہوگیا ہے کہ کسی کو چین سے بیٹھنے ہی نہیں دے رہا۔ برسوں سے مل کا جو ماحول اتنا پُرسکون چلا آرہا تھا، وہاں اس نے ہلچل مچا کر رکھ دی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ کسی کو بھی صحیح طرح پتا نہیں چلتا کہ آخر یہ چاہتا کیا ہے..."

وہ زیادہ دیر باتیں نہ کر سکیں۔ محلّے گلی کی عورتیں قطار در قطار اُسے دیکھنے، اُس سے ملنے کے لیے آنے لگیں اور ذرا سی دیر میں گھر بھر گیا۔ کل تک وہ ان سب کے درمیان رہتی تھی مگر آج وہ اُسے یوں دیکھنے آرہی تھیں جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔

*

شمائلہ کی سسرال میں اصل افراد صرف چار ہی تھے لیکن بنگلا بہت بڑا تھا اور تمام افراد کے معمولات اور طرزِ زندگی اتنا مختلف تھا کہ کبھی تو ہفتوں تک اُن کا ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوتا تھا۔ کبھی تو شمائلہ کو لگتا جیسے گھر میں صرف وہ اور راشد ہی رہتے ہیں یا پھر نوکر چاکر۔

جاوید سے اُس کا سامنا شاذ و نادر ہی ہوتا اور ابتدا میں وہ ریزرو ہی رہا۔ اُس نے کوئی اوچھی حرکت نہیں کی۔ ماضی کا کوئی حوالہ دینے کی کوشش نہیں کی لیکن اُس کے لندن سے واپس آنے کے بعد جب ایک مرتبہ شمائلہ کا اُس سے سامنا ہوا تو اُسے نہ جانے کیا سوجھی کہ راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ شمائلہ اس وقت اوپر جانے کے لیے ہال سے گزر رہی تھی اور وہ باہر سے آیا تھا۔ اس نے بازو پھیلا کر شمائلہ کا راستہ روک لیا۔ شمائلہ نے قہر آلود نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"اس شادی کے بعد تو تم کچھ اور زیادہ نکھر گئی ہو۔" وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "قسم سے... مجھے اگر معلوم ہوتا کہ روز بہ روز تم حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاؤ گی تو تمہاری تمام تر غربت کے باوجود میں سچ مچ ہی تم سے شادی کر لیتا۔"

شمائلہ کو اپنے رخسار اور کانوں کی لَویں تپتی محسوس ہوئیں، وہ گھٹے گھٹے لیکن غضب آلود لہجے میں بولی۔ "بکواس مت کرو اور میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"اوہو... اب ہم سے اس لہجے میں بات کی جائے گی؟" وہ چُبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو... اور دیور بھابی کا رشتہ تو اب بھی چلا آرہا ہے۔ دیوروں سے بھی اس طرح تو بات نہیں کی جاتی۔"

"یقیناً۔ لیکن بے غیرتوں سے اسی طرح بات کی جاتی ہے۔"

"شمائلہ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔" جاوید کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی آگئی۔ "وہ دن بھول گئیں......"

"اس سے آگے ایک لفظ نہ کہنا۔ اس وقت مجھے تمہاری اوقات معلوم نہیں تھی۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"ہاتھ تو تم نے بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر مارا ہے۔ ہم تو خیر ویسے ہی دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ ہم پر تو تمہاری صورت کا جادو خود بخود چل گیا تھا۔ لیکن بھیّا پر تمہارا جادو کیسے چل گیا؛ وہ تو پتھر تھے پتھر..... اس پتھر میں جونک کیسے لگ گئی؟"

"اپنے بھیّا سے ہی جا کر پوچھ لو نا۔ وہ تمہیں اچھی طرح سمجھا دیں گے۔"

"ویسے شمائلہ..... تمہیں اتنی زیادہ اکڑ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" دفعتاً وہ خطرناک سے انداز میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بھیّا اگر تم پر فدا ہو ہی گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس گھر میں مالک و مختار ہو گئی ہو۔ اگر آج میں جا کر ڈیڈی کو بتا دوں کہ ایک سال تک تمہارا میرا کیا تعلق رہا ہے تو تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اُن کی نظر میں تمہارا کیا مقام ہو جائے گا؟"

"تم میں اتنی جرأت ہے؟" شمائلہ نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔ "اگر جرأت ہے تو چلو ابھی چل کر بتا دو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں کیونکہ تم تو ازلی جھوٹے ہو۔ تمہارے جھوٹے بیان میں جگہ جگہ تصحیح کی ضرورت پڑے گی۔ وہ میں کروں گی۔ آؤ۔ چلو....." اُس نے قدم بڑھایا۔

"بہت جرأت آگئی ہے تم میں۔" جاوید مسکرایا۔

"جرأت نہیں۔ عقل آگئی ہے۔ میں اب تمہارے یا تمہاری اس چھچھوری منگیتر کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوں گی۔ میں نے تمہارے بھیّا سے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے اور مجھے ان پر کوئی جادو چلانے کی بھی ایسی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس گھر کی مالک و مختار بننے کا کوئی شوق ہے۔ میں نے تو اب صرف دو چیزوں کے سہارے باقی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے، بہت سا سچ اور تھوڑی سی محبت۔ خدا کی ذات کے بعد میرے یہی دو سہارے ہوں گے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آگئی۔ میک اپ سے بے نیاز اُس کا چہرہ سفید دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا تھا اور اُس پر ہلکی سی تمتماہٹ تھی۔

"اوہو... بالکل ملّانی جی بن گئی ہو اب تو۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔

"مجھے تو جو کچھ بننا تھا، بن گئی ہوں لیکن ہو سکے تو تم بھی کچھ بننے کی کوشش کرو۔ شاید تم سمجھ رہے ہو کہ در در بھٹکتا ہوا کتا بنے رہنا ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔" اُس نے زہریلے لہجے میں کہا اور اُس سے کترا کر آگے بڑھ گئی۔ جاوید وہیں کھڑا اُس وقت تک اُسے گھورتا رہا جب تک وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر نظر سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

اُس کے بعد شمائلہ کا اُس سے سامنا ہی بہت کم ہوا۔ اور جب ہوا تو اُس نے اس قسم کی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شمائلہ نے اُس کی جتنی بے عزتی کی تھی اُس نے اُس کے جواب میں بھی بدلہ لینے کی کوئی حرکت نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے مزاج میں بس اچانک ہی کوئی اُبال اٹھا تھا اور فوراً ہی بیٹھ گیا تھا۔

شمائلہ کی نئی زندگی کے کئی ماہ تقریباً سکون سے ہی گزر گئے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ ہلچل اُس روز پیدا ہوئی جب دوپہر سے کچھ پہلے خبر آئی کہ مل میں ہڑتال ہوگئی ہے۔

راشد اور جاوید دونوں اس روز علی الصباح ہی مل گئے تھے۔ راشد ہر حال میں پُرسکون رہنے والا آدمی تھا لیکن شمائلہ کئی دن سے اُسے بھی مضطرب دیکھ رہی تھی۔ پوچھنے پر اُس نے یہی بتایا تھا کہ مل میں کشیدگی چل رہی ہے اور آج اچانک خبر آئی تھی کہ ہڑتال ہوگئی ہے۔

سیٹھ سعید فوراً تیار ہو کر مل جانے کے ارادے سے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ شمائلہ نے انھیں روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانے اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا حکم دیتے ہوئے بولے۔ "آج تو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے.... اور میں غصّے میں بالکل نہیں آؤں گا۔ آرام سے بات کروں گا۔ مجھے معلوم ہے، ان مسائل سے میں ہی نمٹ سکتا ہوں۔ ابھی راشد کو بھی اتنا تجربہ نہیں ہوا ہے۔"

"اچھا۔ تو پھر میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔" شمائلہ بولی۔

"کوئی حرج نہیں۔" سیٹھ صاحب بے پروائی سے بولے۔

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر مل پہنچے تو دونوں بڑے گیٹ بند تھے۔ جنرل منیجر وغیرہ کو چھوڑ کر باقی تمام کارکنان اور مزدور باہر اِدھر اُدھر بڑی بڑی ٹولیوں کی صورت میں جمع تھے۔ ان میں... عورتیں بھی شامل تھیں۔ عورتیں یونین کی ممبر ضرور تھیں لیکن اس سے پہلے وہ کبھی ہڑتال میں شریک نہیں ہوئی تھیں۔ بابر ان سب کی قیادت کر رہا تھا۔ سیٹھ سعید کو دیکھ کر مزدوروں نے اُن کے خلاف بھی نعرے لگائے حتیٰ کہ شمائلہ کے خلاف بھی نعرے لگائے گئے جس پر شمائلہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اُس کا تو مل کے معاملات سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا مگر ہڑتالی مرد اور عورتیں

اس کے لیے کبھی نہ جانے کیوں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ شاید صرف اس لیے کہ وہ مالکان کے گھرانے کی ایک فرد بن گئی تھی۔

وہ اندر پہنچے تو راشد انھیں دفتری بلاک کے قریب ہی باہر کھڑا مل گیا۔

"آپ دونوں کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ بولا۔ "یہاں ہنگامہ بھی ہوسکتا ہے۔" وہ باپ اور بیوی دونوں ہی سے مخاطب تھا۔

"میں نے بہت بڑے بڑے ہنگامے دیکھے ہیں.... اور میں ہی ان سے نمٹ سکتا ہوں۔" سیٹھ صاحب بے پروائی سے بولے۔ وہ چھڑی کے سہارے کھڑے تھے اور اُن کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا مگر اُن کے چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔

"میں انھیں خود موقع دے رہا ہوں کہ وہ کچھ دیر نعرے بازی کرلیں، دل کی بھڑاس نکال لیں۔ کچھ دیر بعد میں بابر کو مذاکرات کے لیے اندر بلواؤں گا۔" راشد بولا۔

"بس اب تمھیں اس سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ساری باتیں میں خود کروں گا۔" سیٹھ صاحب بولے۔ "ہڑتال شروع کیسے ہوئی ہے؟"

"میں نے آج علی الصباح بابر کو ملازمت سے برخاست کردیا تھا۔" راشد نے بتایا۔ "بہت دنوں سے مل میں کبھی مشینوں میں اور کبھی بجلی کے تاروں میں بریک ڈاؤن ہورہا تھا جس کی وجہ سے کام کا بہت حرج ہورہا تھا۔ ہم بہت سے غیر ملکی آرڈرز پورے کرنے میں پیچھے رہ گئے اور آپ کو معلوم ہے کہ باہر کی پارٹیاں کتنی اصول پرست ہوتی ہیں۔ دو دن کی تاخیر ہوجائے تو آرڈر کینسل کردیتی ہیں۔ ہمارا بے اندازہ نقصان ہوچکا تھا اور وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ آج میں نے اور جنرل منیجر نے رنگے ہاتھوں بابر کو پکڑلیا۔ وہ بجلی کے سرکٹ میں گڑبڑ کررہا تھا۔ وہ چونکہ انجینئرنگ کے شعبے میں ہے اس لیے اُس کے لیے مشینری میں یا الیکٹرک سرکٹ میں گڑبڑ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلے بھی وہی گڑبڑ کررہا تھا۔ کوشش کررہا تھا کہ مل دیوالیہ ہوجائے۔ یہ لوگ ذاتی پرخاش میں اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اُسی میں چھید کرنے پر تل جاتے ہیں اور ہزاروں دوسرے لوگوں کا روزگار بھی تباہ کردیتے ہیں۔ اس لیے میں نے اُسے کھڑے کھڑے بیرون نکالا ہے اور کہہ دیا ہے کہ وہ چاہے تو لیبر کورٹ میں جاسکتا ہے۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لیبر کورٹ میں جانے کے بجائے مزدوروں کے جذبات اُبھار کر ہمیں بلیک میل کرے گا۔ میں کل سے مزدوروں کو سمجھانے کی مہم شروع کروں گا۔"

"تم اب کچھ نہیں کروگے۔" سیٹھ سعید فیصلہ کُن لہجے میں بولے۔ "بلکہ تم اور شمائلہ چاہو تو اب گھر جاسکتے ہو۔ میں بابر کو بلواتا ہوں اور اُس سے بات کرتا ہوں۔"

وہ جنرل منیجر کے ساتھ اُس کے کمرے کی طرف چل دیے۔ آج کل جنرل منیجر جس کمرے میں بیٹھ رہا تھا وہی کچھ عرصہ پہلے تک سیٹھ سعید کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اُن کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ صرف راشد اور شمائلہ راہداری میں کھڑے رہ گئے۔ آج ماحول بہت عجیب لگ رہا تھا۔ چاروں طرف ایک وحشت آمیز سکوت طاری تھا۔ مشینیں بھی خاموش تھیں اور کہیں کارکنوں کی چہل پہل بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

راشد، شمائلہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "تم کیوں اتنی غم زدہ سی شکل بنائے کھڑی ہو، تمھیں ان معاملات میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا جیون ساتھی کی پریشانیاں میری پریشانیاں نہیں ہیں؟" وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"مگر میں تو پریشان نہیں ہوں۔" راشد پُرسکون لہجے میں بولا۔ "میرا سکون اور اطمینان ہی تو بابر کو زیادہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کررہا ہے۔ وہ بہت دنوں سے مجھ سے سرد جنگ لڑ رہا ہے۔ اگر تم مزید پریشان نہ ہو تو میں تمھیں ایک بات اور بتاؤں؟"

"میں اگر پریشان ہوئی بھی تو آپ کی رفاقت کے سہارے اس پریشانی کا مقابلہ کرلوں گی۔ آپ بات تو بتائیں۔"

"بابر اور حبیبہ نے ہماری نجی زندگیوں کو مزدور طبقے تک لے جانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ بابر کی ذہنیت سے تو چلو اس بات کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن مجھے تو حبیبہ پر حیرت ہے۔ اتنی بڑی فیملی کی لڑکی اتنی تھرڈ کلاس ذہنیت کی مالک ہے۔" راشد کے لہجے میں نفرت جھلک آئی۔

"ہوا کیا؟" شمائلہ نے متوحش ہوکر پوچھا۔

"بابر نے کارکنوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ میں اُس کے خلاف ذاتی وجوہات کی بنا پر انتقامی کارروائی کررہا ہوں۔ یعنی اُس کا دراصل تم سے کچھ سلسلہ چل رہا تھا... شادی سے پہلے.... اور یہ بات مجھے بھی معلوم ہوچکی ہے..... اس لیے اب میں ڈرتا ہوں کہ کہیں بابر میری عزت کے لیے کوئی خطرہ نہ بنے..... یہی وجہ ہے کہ میں اُسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کررہا ہوں۔" راشد نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"اُس کی یہ جرأت.....!" شمائلہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور

مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "میں ابھی جاکر پورے مجمع کے سامنے اُس کا گریبان پکڑ کر پوچھ لیتی ہوں....."

"نہیں — نہیں — تم ایسی کوئی حرکت نہیں کروگی۔" راشد فوراً ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اس سے تمھاری سچائی ضرور ظاہر ہوگی لیکن عقلمندی نہیں۔ ہم لوگ اپنے معاملات اس طرح نہیں نمٹایا کرتے۔ ویسے بھی انسان غصّے میں جو کچھ کرتا ہے اس سے کبھی اچھے نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ تم بالکل مطمئن رہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اگر ہماری نیّت صاف ہے تو ہمارے راستے خود بخود صاف ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ میرا ایمان ہے۔"

شمائلہ اُس کے لہجے کی مضبوطی کو محسوس کرتے ہوئے حیران بھی ہوئی اور اُسے اس سے سہارا بھی بہت ملا۔ وہ پہلے کی نسبت پُرسکون آواز میں بولی۔ "اور حبیبہ نے کیا گُل کھلایا ہے؟"

"اُس کے سامنے تم نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز اُگل دیا تھا۔ وہ بھلا اُسے کیسے ہضم کرسکتی تھی۔ اتنا ظرف تو نہیں ہے اُس کا۔ اُس نے کارکنوں میں یہ بات پھیلانے کی کوشش کی کہ شادی سے پہلے تمھارا جاوید سے چکّر تھا۔ ان دونوں کا مقصد یہ ہے کہ میں کسی طرح مُنہ چھپا کر پیش منظر سے غائب ہوجاؤں اور جاوید زیادہ سے زیادہ اختیارات کے ساتھ سامنے آجائے۔ وہ ایسا انسان ہے جسے جلدی بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ جلدی گھبراہٹ میں مبتلا کیا جاسکتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے اشاروں پر چلایا جاسکتا ہے۔"

شمائلہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دُھندلاہٹ پھیلنے لگی۔ راشد کے سامنے کھڑے کھڑے اُس نے اپنے آپ کو بے حد گھٹیا اور قابلِ نفرت محسوس کیا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ اس وقت راشد کے حقیقتاً کیا جذبات تھے لیکن کم از کم اُس کا یہی جی چاہا کہ مُنہ چھپا کر کہیں جنگلوں کی طرف نکل جائے اور پھر لوٹ کر مکروہ انسانوں کے اس بازار میں واپس نہ آئے۔

راشد نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے برابر کھڑا کرلیا اور نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "دل شکستہ ہونے اور ذہن میں اُلٹے سیدھے خیالات کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے — ہر انسان کی زندگی میں بُحران آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ جب میں تمھارے ساتھ ہوں تو تمھیں کسی اور کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اُس کا ڈوبتا دل جیسے سنبھل گیا۔ وہ جھرجھری سی لے کر اُس کے اور قریب ہوگئی۔ وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر شمائلہ کے لیے محبت کا جو پرتو تھا، اس کے لیے شمائلہ وہیں کھڑے کھڑے جان دے سکتی تھی۔

مالوہ (ہندوستان) کا حکمران غیاث الدین، جس نے ۱۴۶۸ء سے ۱۴۲۸ء تک حکومت کی شعائر اسلامی کا سختی سے پابند تھا۔

ایک مرتبہ جب وہ شدید علیل ہوا تو اس کے معالجین نے اس کے لیے ۱۲۰۰ اجزا پر مشتمل ایک دوا تیار کی، جس پر تقریباً ۴ لاکھ روپے خرچ ہوئے لیکن بادشاہ نے یہ دوا یہ سنتے ہی پینے سے انکار کردیا اور اسے زمین پر گرادیا کہ اس دوا میں اونس کے آٹھویں حصّے کے مساوی شراب ملائی گئی ہے۔

کراچی سے خانزادہ نعیم کی تلاش
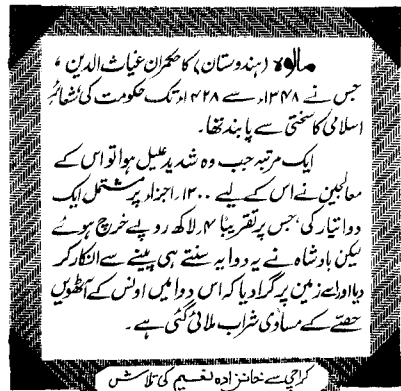
دفعتاً سامنے سے حبیبہ آتی دکھائی دی۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی آرہی تھی اور سخت ہیجان زدہ سی دکھائی دے رہی تھی مگر اس ہیجان کی تہ میں گویا ایک نامعلوم سی خوشی بھی پوشیدہ تھی۔

شمائلہ اور راشد کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کرکے یہاں تک آتے میں اُس کی سانس پھول گئی تھی — شمائلہ اور راشد کو یوں مطمئن انداز میں شانہ بشانہ جُڑے کھڑے دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ وہ غالباً اپنے لہجے کو متفکرانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے پتا چلا کہ ہڑتال ہوگئی ہے.... میں فوراً دوڑی دوڑی آئی۔ پاپا آج کل اسٹیٹس گئے ہوئے ہیں ورنہ وہ بھی آتے۔"

"پھر کیا ہوتا؟" راشد نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

"فار گاڈ سیک — راشد! تمھیں کیا ہوتا جارہا ہے؟ آخر کرائسس کے وقت اپنے ہی لوگ جمع ہوتے ہیں۔" وہ گاڑی کی چابی ٹھوڑی پر ٹکاتے ہوئے بڑی اُداسی سے بولی۔

"یہ کوئی کرائسس نہیں ہے۔" راشد بے پروائی سے بولا۔ "تم خود ایک مِل اونر کی بیٹی ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ اس لائن میں اس قسم کے موقع آتے رہتے ہیں۔ اور جو میرے اپنے لوگ ہیں وہ میرے پاس موجود ہیں....."

حبیبہ کے چہرے پر میک اَپ کی سُرخی کے علاوہ کچھ حقیقی سُرخی بھی جھلک آئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، راشد ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم چاہو تو جاوید کے پاس جاکر اپنی تسلّیاں دینے کا شوق پورا کرسکتی ہو۔ وہ بے چارہ بہت پریشان ہے۔"

جواب کا انتظار کیے بغیر وہ شمائلہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "آؤ... اپنے آفس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے بابر سے

ی کے مذاکرات شروع ہوگئے ہیں۔"

رخصت ہوتے وقت اُس نے نظر اُٹھا کر بھی حبیبہ کو نہیں دیکھا اور شمائلہ کا ہاتھ تھامے اپنے آفس کی طرف چل دیا۔ حبیبہ وہیں کھڑی، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے انھیں جاتے دیکھتی رہی پھر وہ پاؤں پٹخنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی جاوید کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

شمائلہ راشد کے آفس میں پہنچتے ہی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی ـــ "آپ کے آفس کے ساتھ اٹیچ باتھ ہے یا نہیں؟" اُس کے چہرے پر قدرے تکلیف کے آثار تھے۔

"کیوں .... خیریت تو ہے؟" راشد جلدی سے بولا۔

"خیریت ہی ہے۔ مجھے اُبکائی سی آرہی ہے۔" شمائلہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ایک تندرست اور صحت مند عورت کو اُبکائی آنے کے عام طور پر دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ ...." اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکراتے ہوئے پُراشتیاق نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"آپ دوسرا ہی مطلب ٹھیک سمجھے۔" شمائلہ سر جھکاتے ہوئے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ اُس کے رخساروں پر شفق کی سرخی جھلک آئی۔

"اوہ .... نو ....!" راشد تقریباً چلا اُٹھا۔ وہ ہر بات سُن کر پُرسکون رہتا تھا اور دوسروں کو بھی یہی درس دیتا تھا۔ لیکن اس وقت اُس کے چہرے پر گویا بھونچال آگیا تھا۔ "تم نے یہ خوش خبری اتنی تاخیر سے کیوں سُنائی؟ میں باپ بننے والا ہوں .... دل چاہ رہا ہے خوشی سے ناچنے لگوں لیکن میرا خیال ہے مجھ جیسا سنجیدہ آدمی یہ حرکت کرتا ہوا اچھا نہیں لگے گا ـــ جاؤ جاؤ .... تم جلدی سے باتھ روم میں جاؤ ...." وہ ایک کونے میں پھیلے ہوئے دبیز پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جس کے عقب میں باتھ روم کا دروازہ تھا۔

کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلنے پر اور کچھ فریش ہونے کے بعد شمائلہ واپس آکر راشد کے مقابل بیٹھی تو وہ دنیا بھر کے تمام مسائل کو بھول چکا تھا۔ بابر اور حبیبہ کی سازشیں، ہڑتال، مالی نقصانات، غرضیکہ سب کچھ گویا اُس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ بس ایک ہی خوشی اُس کے حواس پر غالب تھی۔ وہ باپ بننے والا تھا! شمائلہ خود بھی ایک حسین تجربے سے گزر رہی تھی۔ ماں بننا! کیسا انوکھا اور عجیب احساس تھا۔

وہ خنک روشنی میں، اس کمرے میں بند، اپنی ایک الگ ہی دنیا میں بیٹھے تھے۔ باہر کی دنیا سے بے خبر اور لاتعلق ـــ وہ ننھے مہمان کے اس دنیا میں آنے کے بعد کی باتیں کررہے تھے۔ کیا کیا انتظامات کرنا ہوں گے، کس کمرے میں اُس کی نرسری بنے گی۔ لڑکا ہوا تو کیا نام رکھا جائے گا اور لڑکی ہوئی تو کیا؟

حتیٰ کہ انھوں نے تو اس کے لیے اسکول بھی منتخب کرلیا تھا۔

دفعتاً راشد کو جیسے کچھ خیال آیا اور وہ چونک کر بولا "ہم کچھ شیخ چلی سے نہیں ہورہے ہیں؟"

شمائلہ بھی جیسے خواب و خیال کی دنیا سے باہر آئی۔ پھر دونوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور اُن کا رُواں رُواں انوکھی مسرتوں سے کچھ اور سرشار ہوگیا۔

دفعتاً کسی نے دروازے پر دستک دی اور وہ دونوں سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

"یس ـــ کم اِن۔" راشد نے پکارا۔

اُس کا پی اے اندر آیا۔ اُس کے چہرے پر حد سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ راشد نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا مُنہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟ مذاکرات ناکام ہوگئے کیا؟"

"نہیں سر ....!" پی اے ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مذاکرات توخلافِ توقع بہت جلدی کامیاب ہوگئے تھے۔ سیٹھ صاحب نے بابر کو نوکری پر بحال کردیا تھا.... مزید ایک بونس کے .... اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مطالبات بھی مان لیے تھے .... مزدور کام پر واپس آرہے تھے۔ لیکن اب تو شاید کام کل ہی شروع ہوسکے۔"

"کیوں؟ آخر کیا ہوا؟ تم اتنے غم زدہ کیوں نظر آرہے ہو؟" راشد کے لہجے میں بھی اضطراب جھلک آیا۔

"سر .... اوہ .... جاوید صاحب کے آفس میں حادثہ ہوگیا ہے ... حبیبہ بی بی مرگئی ہیں ....!" پی اے اٹک اٹک کر بولا۔

"کیا بکتے ہو ....!" راشد بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی آدھا گھنٹا پہلے تو وہ ہمارے سامنے جوش و خروش سے پاؤں پٹختی جاوید کے آفس گئی ہے .... اور تم کہہ رہے ہو وہ مرچکی ہے؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر .... آپ خود چل کر دیکھ لیں۔" پی اے ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔

شمائلہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ وہ اُٹھ کر راشد کے پیچھے لپکی۔ وہ دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے جاوید کے آفس تک پہنچے۔ آفس کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا ـــ باہر سے ہڑتالی کارکنوں کی کافی تعداد اندر آچکی تھی۔ شمائلہ اور راشد کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا گیا۔

وہ اندر پہنچے تو جاوید انھیں ایک کرسی پر وحشت کے سے

عالم میں بیٹھا نظر آیا۔ ہڑتال کی وجہ سے چونکہ پولیس پہلے ہی مل کے گیٹ پر موجود تھی۔ اس لیے اس حادثے کی خبر سنتے ہی گیٹ سے ایک انسپکٹر اور دو سپاہی اندر آچکے تھے اور جاوید کا بیان لینے کی تیاری کر رہے تھے۔

قالین پر ایک انسانی جسم آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا جس پر موزری ہن کی ایک سفید چادر ڈھانپ دی گئی تھی۔ وہ یقیناً جیبیہ کی لاش تھی۔ اس کے قریب ہی اونچی ایڑی کا ایک سرخ سینڈل پڑا تھا۔

راشد کو دیکھتے ہی جاوید اٹھ کر بچوں کی طرح اس سے لپٹ گیا اور رو دینے والے انداز میں بولا" بھیا.... ! مجھے بچا لیجیے.... قسم سے میں نے جیبیہ کو قتل نہیں کیا.... یہ لوگ مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے میں نے ہی اسے جان سے مارا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں.... میں نے اسے نہیں مارا۔ میں بھلا [illegible] کیوں مارتا؟ یہ ایک حادثہ تھا بھیا.... !"

[illegible] ہذیانی سی تھی اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرہ زرد [illegible] نے اس کی پیٹھ تھپکی اور پیار آمیز انداز میں ڈانٹا [illegible] "[illegible] تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟ آرام سے بیٹھ کر بات کرو [illegible] وقت کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے [illegible] بالکل سچ سچ انسپکٹر صاحب کو بتا دو ـــ"

" یہی [illegible] ہم ان پر کوئی الزام تھوڑا ہی لگا رہے ہیں" [illegible] بولا" ہم تو صرف بیان لے کر پرچا درج کریں گے [illegible] تو عدالت کا کام ہے۔"

انسپکٹر شمائلہ اور [illegible] چلے تو راشد نے آگے بڑھ کر چادر ہٹا کر دیکھا۔ جیبیہ کا [illegible] ویسا کا ویسا ہی تھا جیسا انھوں نے دو چار گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی ناک سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر قالین میں جذب ہو چکی تھی۔ ورنہ اسے دیکھ کر یہی گمان گزرتا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ شمائلہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کانپ کر رہ گئی۔

ایک سپاہی نے قلم کاغذ سنبھال لیا اور انسپکٹر جاوید کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا" اب آپ مجھے شروع سے سب کچھ بتائیں جناب!"

" بتانے کے لیے ہے ہی کیا.... " جاوید خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا" یہ میری منگیتر ہے.... میرا مطلب ہے، تھی..... مزاج کی یہ بھی تیز تھی اور میں بھی تیز ہوں۔ کئی دن سے شادی کی تاریخ طے کرنے اور دوسرے کئی چھوٹے موٹے گھریلو قسم کے مسائل پر میری اس سے پہلے ہی بحث چل رہی تھی۔

آج ہڑتال اور دوسرے کئی بھی مسائل کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ اوپر سے اس نے آکر جلی کٹی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے آگے سے اور بھی بدتمیزی کی... مجھے آنکھیں دکھائیں۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے سخت غصہ آگیا تھا۔ میں نے اٹھ کر میز کے دوسری طرف سے اسے ایک چانٹا رسید کر دیا۔ یہ بھلا کہاں برداشت کرنے والی تھی۔ بچپن سے یہ بالکل لڑکوں والے انداز میں پلی بڑھی تھی۔ اس نے میز پر سے اسکیل اٹھا لیا۔ اور انتہائی غصے کے عالم میں مجھے مارنے کے لیے میز کے اس طرف سے آنے لگی۔ کیونکہ میں پیچھے ہٹ چکا تھا ـــ یہ کرسی میں الجھ کر گر پڑی..... میز کا کونا بہت زور سے اس کی کنپٹی پر لگا... اب معلوم نہیں، اس میں غصے کی زیادتی بھی شامل تھی یا صرف چوٹ کی وجہ سے ہی ایسا ہوا کہ یہ وہیں کی وہیں ساکت ہو گئی... میرا خیال ہے کہ دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی ہے... چند سیکنڈ بعد اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔ میں نے اس کے دل کی دھڑکن دیکھی..... رک چکی تھی..... چیخ چیخ کر میں نے مل کی ڈسپنسری کے ڈاکٹر کو تلاش کروا کے بلوایا۔ اس نے آکر بتایا کہ اب تو اسپتال لے جانا بیکار ہے.... یہ مر چکی ہے.... بس اتنی سی بات تھی۔ میری خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا ہو گیا.... " وہ ہچکی سی لے کر خاموش ہو گیا۔

" ہوتا ہے جی ـــ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے" انسپکٹر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اب اس کے لہجے میں ہمدردی جھلک آئی تھی" میں پہلے بھی ایسا کیس دیکھ چکا ہوں۔ ایک صاحب کچھ اسی قسم کے حالات میں صرف ٹھوکر لگ کر گرنے سے مر گئے تھے، ان کے تو سر پر چوٹ بھی نہیں لگی تھی"

" اب آپ کیا کریں گے انسپکٹر صاحب؟" راشد نے پوچھا۔

" لاش پوسٹ مارٹم کے لیے جائے گی جناب" انسپکٹر ٹوپی درست کرتے ہوئے بولا" جاوید صاحب کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ تفصیلی پوچھ گچھ اور تفتیش ہوگی۔ جن جن لوگوں کے بیانات ضروری ہوتے، وہ ہوں گے۔ پھر ہم چالان عدالت میں پیش کر دیں گے۔ معاملہ تو میرے خیال میں سیدھا سادہ ہی ہے۔ ایک دو پیشیوں ہی میں فیصلہ ہو جائے گا"

راشد، جاوید کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا ـــ" تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے وکیل آج کل میں ہی تمہاری ضمانت کرالیں گے۔ تمہیں ایک آدھ دن سے زیادہ حوالات میں نہیں رہنا پڑے گا" پھر وہ بہ آواز بلند مگر خود کلامی کے سے انداز میں بولا" کاش ڈیڈی کو کم از کم آج کے دن کوئی جا کر یہ منحوس

نہ سُنائیے — وہ پہلے ہی کافی ٹینشن برداشت کرچکے ہیں۔"

اسی لمحے عقب سے سیٹھ سعید کی ٹھہری ٹھہری سی آواز سُنائی دی۔ "میں سب کچھ سُن چکا ہوں برخوردار! مجھے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے.... اس کے باوجود میں زندہ سلامت ہوں۔"

وہ بغیر کسی سہارے کے چلتے ہوئے اندر آگئے اور ایک کرسی پر ڈھیر ہونے کے بعد گہری سانس لے کر جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "مجھے حبیبہ کی موت کا بہت افسوس ہے بیٹا! ابھی بچی ہی تھی..... بہت کچھ دیکھنا تھا اس کو.... لیکن اس واقعے میں قدرت کی نہ جانے کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ کیا سکھانا چاہتی ہے قدرت نہ معلوم ہمیں — ہم آج کل میں تمہاری ضمانت کرالیں گے۔ لیکن شاید اس ایک آدھ دن کی اذیّت میں تمہیں اندازہ ہوسکے کہ حد سے زیادہ غصّہ، طیش، متلوّن مزاجی، مادّہ پرستی، ایک دوسرے کا عدمِ احترام، یہ سب چیزیں کتنی نقصان دہ ہیں۔ کبھی کبھی ایک پل میں انسان کی زندگی کا رُخ بدل جاتا ہے۔ شاید آج کے بعد تم بھی اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرسکو۔"

جاوید دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپاکر بچّوں کی طرح رونے لگا۔

*

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سیٹھ سعید، شمائلہ اور راشد ایک ہی گاڑی میں گھر واپس جارہے تھے۔ سیٹھ سعید تھکے تھکے سے انداز میں سیٹ کے پُشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔ "بہت عرصے بعد آج مجھے اندازہ ہوا کہ میرا بیمار دل اب بھی کتنا بوجھ برداشت کرسکتا ہے..... لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج میں بُری طرح تھک گیا ہوں۔ سر سے پیر تک بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔ کاش! اتنی بُری خبروں کے بعد آج کوئی خوش خبری ہی سننے کو مل جاتی جس سے روح اور ذہن کا کچھ بوجھ ہلکا ہوتا..... دل میں ہلکی سی مسرّت کی لہر ہی دوڑ جاتی — کاش.... !" وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

راشد ایک لمحے خاموش رہا پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا اور وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "ڈیڈی! ایک خوش خبری ہے تو سہی لیکن وہ میں آپ کو نہیں سُنا سکتا.... گھر پہنچیں گے نا.... تو میں بی خالہ کو بتادوں گا.... وہ آپ کو بتادیں گی.... مجھے ذرا شرم آتی ہے۔"

شمائلہ نے بھی جلدی سے کھڑکی کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ بی خالہ اُن کے گھر میں کام کرنے والی ایک بہت ہی پُرانی ملازمہ تھی جو گھر کے فرد ہی کی طرح تھی۔

سیٹھ سعید چونک کر پچھلی سیٹ کی طرف مُڑتے ہوئے بولے۔ "تم خود کیوں نہیں سُناتے؟ کیوں شرم آرہی ہے تمہیں؟ چالیس سال کے ہونے کو آرہے ہو اور ابھی تک باپ سے شرماتے ہو۔"

"وہ ڈیڈی..... بعض معاملات میں شرمانا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے......" راشد نے سر جُھکالیا۔ اُس کے چہرے پر واقعی بچّوں جیسی معصومیت تھی۔

قارئین متوجہ ہوں

سسپنس، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ کو بھیجے جانے والے خطوط اکثر ادارے کو تاخیر سے موصول ہوتے ہیں اور خصوصاً اُن دنوں جب شہر میں ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوجائے تو ڈاک کی تقسیم کا نظام بالکل ہی بگڑ جاتا ہے لہٰذا آپ کے انتہائی محنت سے لکھے اور محبت سے بھیجے ہوئے خطوط ہم تک پہنچ ہی نہیں پاتے اور شاملِ اشاعت ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اگر ارجنٹ میل سروس یا ایسے ہی دیگر ذرائع اختیار کیے جائیں اور پوسٹ بکس کے بجائے دفتر کا مکمل پتا تحریر کیا جائے تو آپ کے خط ہم تک پہنچنے کے امکانات زیادہ ہوجائیں گے۔ لفافے پر پتے کے ساتھ متعلقہ پرچے اور شعبے کا نام ضرور تحریر کریں۔

دفتر کا مکمل پتا: ۳۱ رمضان چیمبرز بلیموریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

ماہنامہ جاسوسی، سسپنس ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ کی تعداد میں کمی بیشی کی اطلاع ہمارے پاس ہر ماہ کی دس تاریخ تک آنا ضروری ہے بصورتِ دیگر سابق آرڈر کے مطابق ہی پرچے روانہ کیے جائیں گے۔ چونکہ خطوط اکثر کافی تاخیر سے موصول ہوتے ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے آرڈر میں کمی بیشی کی اطلاع بذریعہ تار یا ٹیلی فون کریں۔

ٹیلی فون نمبر: ۲۱۱۳۲۸—۴۳۷۹۶۰

تار کا پتا:

"جاسوسی" کراچی

شکریہ

منیجر سرکولیشن

Faisal Ahmed